ماہنامہ
کرن
جون 2014
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM
ہر شمارے کے ساتھ
کرن کتابچہ
پھل اور سبزیاں
SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 6000 روپے

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار کراچی

جون 2014

جلد 37 شمارہ 3

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ

کرن جون کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
علم و حکمت کو مومن کی میراث قرار دیا گیا اور تلقین کی گئی کہ یہ جہاں سے بھی ملے حاصل کرو۔ مسلمانوں نے جب تک ان ہدایات پر عمل کیا، دنیا کی قیادت ان کے پاس رہی۔ روم اور ایران جیسی اپنے وقت کی سپر پاورز ان کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکیں۔ انہوں نے تحقیق اور تجربے کے ذریعے تمام شعبوں میں علمی ترقی کی راہیں ہموار کیں لیکن جب علم کی روایت سے روگردانی اختیار کی گئی اور مسلمانوں کے علمی کاموں کی بنیاد پر مغرب نے اس سفر کو آگے بڑھانا شروع کیا تو عروج اور غلبہ اس کا مقدر بنا اور مسلم دنیا غلامی کے اندھیروں میں ڈوبتی چلی گئی۔ انگریزوں نے آدھی دنیا پر حکومت کی تو اس کا اصل سبب ان کا مستحکم تعلیمی نظام اور ان کے ترقی یافتہ تعلیمی ادارے ہی تھے۔
مسلم دنیا بھی تعلیم کے فروغ کے راستے سے ہی از سرِ نو عزت و سربلندی اور ترقی و خوش حالی سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔ پاکستان انتہائی باصلاحیت افرادی قوت سے مالا مال ہے۔ تعلیم کے ذریعے ان کی صلاحیتوں کو نکھارنے کا کام لیا جائے تو آج ہمارا شمار بھی دنیا کی بڑی ترقی یافتہ اقوام میں ہو کیونکہ تعلیم ہی زندگی کے ہر میدان میں ترقی کی کلید ہے، اس کے لیے مستقل قومی تعلیمی پالیسی اور حکمت عملی وضع کی جانی چاہیے تاکہ تعلیمی ترقی کا سفر جاری رہ سکے اور پاکستان جلد از جلد عالمی سطح پر علم کے میدان میں ممتاز مقام کا حامل بن سکے۔

اس شمارے میں،

- اداکار فارس شفیع سے شاہین رشید کی ملاقات،
- عینی جعفری کہتی ہیں "میری بھی سنیے"،
- آواز کی دنیا سے۔ اس ماہ کے مہمان ہیں "آر جے ابو راشد"،
- عائشہ خان سے "مقابل ہے آئینہ"،
- نبیلہ عزیز اور فرحانہ ناز ملک کے سلسلے وار ناول،
- "زخم بکھرے گلاب ہوں" نگہت سیما کے مکمل ناول کا دوسرا اور آخری حصہ،
- "میرے دل میرے مسافر" رفاقت جاوید کا مکمل ناول،
- "محبت ہم سفر میری" سحاب مجتبیٰ کا دلکش ناولٹ،
- "سنہری خواب" بی بی سحر ملک کا ناولٹ،
- حمیرا خان، سویرا فلک، ردا ایم سرور اور لبنیٰ طاہر کے افسانے،
- اور مستقل سلسلے،

مفت،

کرن کتاب "پھل اور سبزیاں غذا اور شفا" پھلوں اور سبزیوں سے علاج سے متعلق ہے جو کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت پیش خدمت ہے۔

حمد باری تعالیٰ

حمد ربِ جلیل کیا کہیے
جو بھی کہیے وہ سب بجا کہیے

حمد کا حق ادا نہیں ہوتا
لفظ کتنے ہی خوشنما کہیے

وہ علیم و خبیر ہے تو پھر
حال کہیے نہ ماجرا کہیے

نعمتوں سے نوازنا اس کا
یاد آتا ہے بارہا کہیے

مالک و خالقِ حقیقی کو
دو جہانوں کا آسرا کہیے

اور کیا کیا تمہیں نہ بخشے گا
جس نے بخشا ہے مصطفیٰؐ کہیے

ہم سے مسرور یہ کہاں ممکن
حرف اس کی صفات کا کہیے

مسرور کیفی

رسولِ مجتبیٰ کہیے، محمدؐ مصطفیٰ کہیے
خدا کے بعد بس وہ ہیں پھر اس کے بعد کیا کہیے

شریعت کا ہے یہ اصرار ختم الانبیا کہیے
محبّت کا تقاضا ہے کہ محبوبِ خدا کہیے

جبین و رُخ محمدؐ کے تجلّی ہی تجلّی ہیں
کسے شمس الضحیٰ کہیے، کسے بدرالدجیٰ کہیے

جب ان کا ذکر ہو دُنیا سراپا گوش بن جائے
جب اُن کا نام آئے مرحبا صلّی علیٰ کہیے

صداقت پر بنیاد رکھی گئی ہے دینِ فطرت کی
اسی تعبیر کو انسانیت کا ارتقا کہیے

محمدؐ کی نبوت دائرہ ہے جلوۂ حق کا
اسی کا ابتدا کہیے، اسی کا انتہا کہیے

مدینہ یاد آتا ہے تو پھر آنسو نہیں رُکتے
مری آنکھوں کو ماہرؔ چشمۂ آبِ بقا کہیے

ماہر القادری

فارس شفیع سے ملاقات

شاہین رشید

فارس شفیع کا اپنا ایک تعارف تو ہے ہی کہ یہ بہت اچھے فنکار ہیں نکھری اداکاری کرتے ہیں۔ دھیمے لہجے میں بات کرتے ہیں اور وہی کردار قبول کرتے ہیں جس میں کچھ کر کے دکھایا جا سکتا ہے۔ اور فارس شفیع کا دوسرا تعارف یہ ہے کہ یہ معروف اور ہر دل عزیز فنکارہ صبا حمید کے صاحبزادے ہیں۔ انہیں اداکاری ورثے میں ملی ہے اور یہ اس ورثے کا استعمال بہت خیال سے کر رہے ہیں۔ کوئی اکڑ کوئی غرور نہیں ہے۔ بہت نرم لہجے میں بات کرتے ہیں۔ اداکاری کے علاوہ انہیں میوزک سے بھی لگاؤ ہے اور کیا کیا کرتے ہیں۔ یہ بھی معلوم کرتے ہیں۔

✻ "کیسے ہیں؟ "قرض" سیریل اور "کبھی کبھی" میں آپ کی پرفارمنس بہترین تھی۔ مزید کیا مصروفیات ہیں؟"

★ "جی الحمد للہ میں بالکل ٹھیک ہوں اور تعریف کا شکریہ اور مزید بھی کام ہو رہا ہے۔ اور مصروفیات بھی کافی ہیں۔"

✻ "گڈ۔ ڈرامہ سیریل "قرض" میں پوزیٹو رول تھا اور دکھایا گیا تھا کہ آپ محبت کے اظہار کے معاملے میں بہت ہی کنجوس ہیں۔ اصل میں بھی ایسے ہی ہیں؟"

★ قہقہہ "ہو سکتا ہے۔ آپ کو پتا ہے کہ محبت تو کنفیوژنگ ہی ہوتی ہے اور پھر جو گھر دکھایا گیا ہے وہاں تو حالات بہت ہی خراب تھے تو ان حالات میں محبت کا اظہار مشکل ہی تھا۔"

✻ "میں نے آپ کا "من جلی" دیکھا "قرض" دیکھا "کبھی کبھی" بھی۔ اور کیا کیا کر چکے ہیں؟"

★ "میں نے ابھی تک بہت زیادہ کام نہیں کیا ہے 2011 میں ایک سیریل کیا تھا "تیرے حضور" پھر "من جلی"، قرض اور "کبھی کبھی" کیا ہے باقی کچھ انڈر پروڈکشن ہے کچھ "جیو کہانی" کے لیے کام کیا۔ یوں سمجھیں کہ دو سال میں پانچ چھ ہی سیریلز کیے ہیں۔"

✻ "ایوارڈ کی ایک تقریب میں آپ کو ڈانس کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا اس کا بھی شوق ہے آپ کو؟"

★ "جی بالکل اس کا بھی شوق ہے اور میوزک کا شوق بھی ہے ——— مگر اس کی آڈینس بالکل مختلف ہے۔ وہ ینگ لوگ جو انٹرنیٹ پر زیادہ بیٹھتے ہیں اور ٹی وی نہیں دیکھتے میری میوزک ان کے لیے ہے تو گزشتہ سال ان نوجوانوں کے لیے میں نے ایک گانا بنایا تھا جو انٹرنیٹ پہ ہی چلایا تھا اور اس کا مجھے بہت اچھا فیڈ بیک ملا تھا۔"

✻ "اس کو پروفیشن بنائیں گے اور ڈانس کی ٹریننگ لی ہے آپ نے؟"

★ "میں شوق کی خاطر ہی ڈانس کرتا ہوں مجھے ٹی وی شوز کے لیے آفرز آتی ہیں تو میں پھر خود ہی پروڈیوس کرتا ہوں اور میری پہچان میری اداکاری سے زیادہ میری میوزک بنی' لکس ایوارڈ کے لیے میری نامزدگی بہ حیثیت اداکار کے نہیں ہوئی بلکہ میوزک کے حوالے سے ہوئی اور خود مجھے بھی یہ بات بہت حیران کن لگی تھی کہ "من جلی" کو لوگوں نے اور خاص طور پر میری پرفارمنس کو ناظرین نے بہت پسند کیا تھا۔ جبکہ گانا تو انٹرنیٹ پہ چلا تھا۔ تو شاید ان کو یہ زیادہ اچھا لگا۔"

✻ "اس فیلڈ میں کہاں تک جانے کا ارادہ ہے؟ کیونکہ فیلڈ تو بہت وسیع ہے؟"

★ "بڑی کٹھ جوڑ کی فیلڈ ہے اگر آپ کا کام اچھا ہے

تب ہی آپ سروائیو کر سکتے ہیں ورنہ نہیں، جس طرح ڈھیروں ڈرامے بن رہے ہیں اور نیا ٹیلنٹ سامنے آرہا ہے تو مقابلہ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے اور اگر کام اچھا ہے لوگ پسند کررہے ہیں تو اس حساب سے آپ کو کام کی آفرز بھی ہوتی ہیں اور جاب کی آفرز بھی ہوتی ہیں۔ اور مجھے اس فیلڈ کے ہر شعبے میں کام کرنے کا شوق ہے اور انشاء اللہ میں کام کرتا رہوں گا۔"

※ "کس شعبے میں اپنے آپ کو "ان" رکھنا چاہیں گے۔ اداکاری میں ڈانسنگ میں یا میوزک میں؟"

★ "ڈانسنگ، میوزک اور اداکاری یہ تینوں فیلڈز ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں اور میں تینوں میں ہی اپنے آپ کو "ان" کرنا چاہوں گا کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ اللہ نے مجھے ان کاموں کی صلاحیت دی ہے، ٹی وی کا اینگل کچھ اور ہے اور ذرا عوامی میڈیم ہے بہت لوگ دیکھتے ہیں، بہت لوگ پسند کرتے اور ڈانس مجھے ذاتی طور پر پسند ہے۔ اس کی آڈینس ذرا کم ہے لیکن اس کو میں چھوڑنا نہیں چاہتا۔"

※ "آپ کی والدہ "صبا حمید" بھی اس فیلڈ سے نوجوانی سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی کو انٹرویو نہیں دیا تو مجھے ایسا لگا تھا کہ شاید آپ بھی نہیں دیں گے؟"

★ ہنستے ہوئے! "جی وہ کسی کو انٹرویو نہیں دیتیں اور انہوں نے مجھے بھی کہا ہوا ہے کہ "بیٹا زیادہ انٹرویو زنہ دیا کرو" تو پرنٹ میڈیا اور ریڈیو میں انٹرویو دینا کوئی مسئلہ نہیں ہے مگر ٹی وی میں تو عجیب عجیب سے سوالات کیے جارہے ہوتے ہیں کہ بندہ حیران ہی رہ جاتا ہے۔"

※ "قرض" ڈرامے کی بات کروں گی، ماشاء اللہ بہت ہٹ گیا تھا تو یہ بتائیے کہ قصور کس کا ہوتا ہے اولاد کا یا ماں باپ کا کہ اولاد ان سے دور ہوجاتی ہے؟"

★ "میں سمجھتا ہوں کہ قصور دونوں کا ہی ہوتا ہے اور چاہے اولاد ہو یا والدین اگر ایک دوسرے کو موقع دیں تو میرا نہیں خیال کہ اختلافات جنم لیں۔ ہر آنے والی

لڑکی اپنے انداز میں گھر چلانا چاہتی ہے اور ماں اپنی حکومت قائم رکھنا چاہتی ہے اور میرا خیال ہے کہ ساس بہو کے مسائل کا حل اب اس سوسائٹی کو ڈھونڈ لینا چاہیے۔"

* "آپ کس طرح کے بیٹے ہیں؟"

★ "ارے یہ تو بڑا بولڈ سوال آپ نے پوچھا۔ مگر اس کا جواب تو میری امی ہی دے سکتی ہیں۔ اگر انہوں نے کبھی آپ کو انٹرویو دیا تو ضرور پوچھیے گا۔"

* "آج کل ترکش ڈرامے کثرت سے ہو رہے ہیں اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟"

★ "کوئی بھی مقابلے کی چیز جب بھی مارکیٹ میں آتی ہے اور اس کا کام دوسروں کے مقابلے میں اچھا ہو تو وہ اپنی جگہ جلدی بنا لیتی ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ اچھا ہی ہوا ہے کیونکہ اب ہمارے ڈرامہ انڈسٹری میں کچھ لوگوں نے اپنی مونوپولی چلانی شروع کر دی تھی اور ہر طرح کا معیاری اور غیر معیاری کام جسے ہم چل چلاؤ والا کام کہہ سکتے ہیں ٹی وی پہ چلا رہے تھے۔ تو جب سے ترکش ڈرامے آئے ہیں تو چونکہ ہم انڈسٹری میں ہیں تو ہمیں احساس ہو رہا ہے کہ پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز کے ہاتھ پاؤں تھوڑے پھولنا شروع ہو گئے ہیں اور انہیں اندازہ ہو گیا ہے کہ اگر کام اچھا نہ ہوا تو پھر کوئی بھی ہمارا کام نہیں دیکھے گا اور اس طرح ہماری مارکیٹ ڈاؤن ہونے کا خطرہ ہے۔"

"فارس شفیع کے بارے میں آپ کو بتائیں کہ یہ 2 نومبر 1987 میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کا اسٹار اسکارپیو ہے اور قد 6 فٹ اور 6 انچ ہے اور یہ دو ہی بہن بھائی ہیں۔ میشا اور یہ خود۔ میشا ان سے بڑی ہیں اور ترکی سے گریجویشن کیا ہے ایڈورٹائزنگ میں۔"

* "کیا بننا چاہتے تھے اور کیا بن گئے۔ یا جو سوچا وہی ہوا؟"

★ "اگر آپ سچ سننا چاہتی ہیں تو میں آپ کو بتاؤں کہ میں ہمیشہ ہی ایکٹر اور سنگر بننا چاہتا تھا اور میں اس لحاظ سے بہت خوش قسمت ہوں کہ میں نے جو بننا چاہا بن گیا ورنہ لوگوں کی اکثریت اپنے خوابوں کی تعبیر نہیں پاتی تو جب میں گریجویشن کر کے 2011 میں پاکستان آیا تو امی کی خواہش تھی کہ میں جاب کروں میں نے ان سے کہا کہ آپ ایک بار مجھے اداکاری میں

ٹرائی کرنے دیں کیونکہ مجھے اس فیلڈ میں آنے کا شوق ہے۔ اگر کامیاب ہو گیا تو ٹھیک ورنہ پھر جاب کر لوں گا۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اتنی کامیابی ملی کہ امی بھی بہت خوش ہیں۔"

٭ "من جلی" میں آپ کی والدہ نے آپ کی خالہ اور "قرض" میں والدہ کا ہی کردار کیا تو جب آپ امی ہی کے ساتھ اداکاری کر رہے ہوتے ہیں تو کیسا فیل کرتے ہیں۔ جھجک آتی ہے؟"

★ "نہیں جی بالکل بھی جھجک نہیں آتی۔ اور میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے اور چونکہ انہیں بھی لوگ کہتے ہیں کہ فارس اچھا پرفارم کرتا ہے تو پھر انہیں بھی خوشی بھی ہوتی ہے اور تسلی بھی۔"

٭ "شادی کے لیے تو کہتی ہوں گی؟"

★ "بالکل۔ لیکن میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ ابھی اس فیلڈ میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ اپنا فیوچر بنانا چاہتا ہوں۔"

٭ "پہلا سیریل "میرے حضور" تھا پہچان کس نے دی۔ اور تواتر کے ساتھ کیوں نہیں آتے؟"

★ "میرے حضور" بھی کافی ہٹ گیا تھا ایکسپریس پر چلا تھا مگر سب سے زیادہ شہرت مجھے "من جلی" سے ملی۔ مطلب جتنا بھی کام کیا وہ میری شناخت بنا۔ اور تواتر کے ساتھ اس لیے نہیں آتا کہ میں نے دیکھا ہے کہ جب لوگ بہت زیادہ اسکرین پہ آنا شروع ہو جاتے ہیں تو پھر ایک دو سال کے بعد ان کی ڈیمانڈ کم ہونی شروع ہو جاتی ہے اور لوگ ہر وقت ایک ہی چہرہ دیکھ دیکھ کر بور ہو جاتے ہیں۔ تو میں اپنے پسندیدہ رائٹرز اور ڈائریکٹرز سے کہتا ہوں کہ جب آپ کوئی بڑا کام کریں تو مجھے ضرور خدمت کا موقع دیجیے گا کیونکہ ان کے ساتھ کام کر کے بہت سیکھنے کا موقع ملتا ہے میں ان کا نام ضرور لینا چاہوں گا خلیل الرحمٰن خلیل جنہوں نے "من جلی" لکھا۔ انجم شہزاد بہت اچھے ہیں۔ نعمان

اعجاز، سید عاطف حسین اس طرح کے لوگوں کے ساتھ کام کر کے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔"

* "آپ کی امی تو ماشاء اللہ کافی ٹائم سے ہیں آپ اب آئے ہیں تو وہ کچھ بتاتی ہیں اپنے وقت کی باتیں، کوئی برائی اس انڈسٹری کی یا اچھائی؟"

★ "میری امی اور میری خالا میں بتاتی ہیں کہ انہوں نے ایسا پاکستان نہیں دیکھا تھا جیسا اب ہے۔ اور شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں تعلیم کی بہت کمی ہے۔ اب دیکھیں کہ اگر ڈرامے میں کسی کو شراب پیتے دکھایا گیا ہے تو کوئی یہ نہیں سمجھے گا کہ یہ ڈرامہ ہے اور وہ شراب "فروٹ جوس" بھی ہو سکتا ہے۔ لوگ اسے اصلی زندگی میں بھی برا کہنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اگر ہمارے یہاں کوئی دوپٹہ نہ پہنے یا لباس ذرا ماڈرن پہن لے تو لوگ خوامخواہ ہی باتیں بنانا شروع ہو جاتے ہیں۔"

* "فارس آپ لاہور میں رہتے ہیں جبکہ کام زیادہ تر کراچی میں ہے اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

★ "ہماری بہت چھوٹی سی دنیا ہے۔ جس میں میں، میری بہن، میری ماں اور نانا نانی تھے اور میرے گھر والے میرے رول ماڈل رہے ہیں۔ میری والدہ اپنی زندگی میں بہت مصروف رہتی ہیں اور جب بھی ہماری ملاقات ہوتی ہے بہت اچھا لگتا ہے اور بہت انجوائے کرتے ہیں۔ میں نے زیادہ وقت اپنے نانا نانی اور بہن کے ساتھ گزارا ہے میری بہن کی شادی ہو گئی ہے وہ ملک سے باہر چلی گئی اور میرے نانا کا انتقال دو سال قبل ہو چکا ہے تو اب میں اور میری نانی رہتے ہیں اور نانی کی وجہ سے ہی میں کراچی شفٹ نہیں ہوا۔"

* "کام کے سلسلے میں تنقید کا سامنا کرنا پڑا؟"

★ "ہاں کہیں نہیں۔ مگر بہت کم تنقید کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ لوگوں نے میرے کام کو پسند ہی کیا ہے اور میں ان لوگوں کا شکر گزار ہوں۔ ویسے میں نے دیکھا کہ ہمارے یہاں ہر شخص سمجھتا ہے کہ وہ تنقید کرنے کے لیے کوالیفائیڈ ہے حالانکہ نہ انہوں نے شوٹنگ دیکھی ہوتی ہے نہ انہیں کام کی نوعیت معلوم ہوتی ہے بس آسانی سے تنقید کر رہے ہیں۔ تو یہ بات بھی بری لگتی ہے۔"

* "زیادہ تر کس قسم کے رول کرنا پسند کریں گے؟"

★ "ہمارا ڈرامہ لینڈ ہوتا ہے لیکن فلم میں کردار کے ڈیولپمنٹ کی بہت گنجائش ہوتی ہے۔ مجھے زیادہ تر نگیٹو رول کا شوق ہے کیونکہ نگیٹو میں اداکاری کا مارجن ہوتا ہے اور میرے حساب سے اپنے کرداروں میں بہت کچھ کیا جا سکتا ہے تو میں ایسا کردار کرنا پسند کروں گا جس میں کردار ڈیولپمنٹ پہ فوکس ہو۔ تب ہی مزا آئے گا۔"

* "آپ فلم کی بات کر رہے ہیں تو فلم سے کوئی آفر ہے آپ کو لالی ووڈ سے یا بالی ووڈ سے؟"

★ "تقریباً" سال پہلے جب پرانی فلموں کے پروجیکٹس پہ کام ہو رہا تھا تو مجھے بھی آفرز آئی تھیں۔ لیکن میں اس وقت ڈرامہ سیریل "قرض" میں مصروف تھا۔ لیکن مجھے فلم میں کام کرنے کی جلدی نہیں ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ڈرامہ انڈسٹری نے بہت اوپر جانا ہے۔"

* "انڈسٹری کو تو بہت اوپر جانا ہے۔ ملک کے بارے میں کیا خیال ہے۔ آپ اگر اس ملک میں اہم عہدے پر آ جائیں تو کیا کریں گے؟"

★ "اپنے ملک کا نظام چینج کرنا چاہتا ہوں اور ہمارا جو بجٹ ہے اس میں تھوڑی سی تبدیلی لانا چاہوں گا مثلاً" وفاقی بجٹ میں تو تبدیلی لاؤں گا ہی۔ 80 فیصد بجٹ انہی کا ہوتا ہے تو تھوڑا کم ہونا چاہیے اور تعلیمی بجٹ زیادہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ تعلیم ہوگی تو ملک ترقی کرے گا۔ ورنہ نہیں۔"

* "ڈرامے میں کتنے فیصد اداکاری ہوتی ہے اور کتنے فیصد وہ کردار آپ کی شخصیت کا عکس ہوتے ہیں؟"

★ "فیصد والی بات ذرا مشکل ہے۔ جہاں تک عکس کی بات ہے تو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کردار کی بیک گراؤنڈ کیا

ہیں اور ہر کردار آپ کے اندر ہوتا ہے خواہ وہ کم ہو یا زیادہ آپ نے بس بریکٹ لگائی ہوتی ہے کہ کہاں سے کہاں تک اس کی لمٹ ہے۔"

※ "مصروف رہتے ہیں یا دوستوں سے میل ملاپ رہتا ہے؟"

★ "میل ملاپ رہتا ہے لیکن میرے کام اور دوستوں کے کام میں فرق ہے جو جاب کرتے ہیں وہ پیر تا ہفتہ کام کرتے ہیں جبکہ میرا معاملہ تو یہ ہے کہ کبھی میں دو مہینے فرصت نہیں پاتا اور کبھی دو مہینے میں بالکل فارغ بیٹھا ہوا ہوتا ہوں۔ تو میرا میل ملاپ اس طرح کا ہوتا ہے۔"

※ "کچھ ہلکی پھلکی باتیں ہو جائیں۔ آپ چار سال ترکی میں رہے' کیسا لگا وہ ملک۔ اور وہاں اپنے کام خود کرتے تھے؟"

★ "ترکی میں رہنا اچھا لگا۔ چونکہ اکیلا ہوتا تھا تو کھانا وغیرہ بھی خود ہی پکاتا تھا۔ وہاں تو ہر کام خود ہی کرنے پڑتے تھے۔ ترکی کی ترقی نے مجھے بہت متاثر کیا جس طرح رولز کو فالو کیا جاتا ہے دل خوش ہو جاتا ہے۔ کاش ہمارے یہاں بھی ایسا ہی ہو ترکی مسلمان ملک ہے اور میں سعودی عرب بھی جا چکا ہوں مگر میں نے دیکھا ہے کہ ترکی والوں کا لیول بہت ہائی ہے۔ وہ کسی بھی بات میں اپنی حدود کو پار نہیں کرتے وہ دین کے معاملے میں بھی بہت انتہا تک نہیں جاتے۔ اس وقت تک کہ اگر انہوں نے عالم بننا ہو۔ اگر کسی نے داڑھی رکھی ہے تو لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا آپ "عالم" ہیں وہاں اس طرح کا رواج نہیں ہے کہ کوئی بھی آپ کو نصیحت کرنے بیٹھ جائے دین کے بارے میں یا کسی بھی بارے میں۔ ہر مسجد میں دین کا ایکسپرٹ بیٹھا ہوتا ہے۔ مسجد میں عیسائی بھی جا سکتے ہیں رشین عورتیں ٹورزم کرتی ہیں اور وہ مسجدوں میں جاتی ہیں تو گیٹ پر وہ انہیں اپنے آپ کو کور کرنے کے لیے چادر دیتے ہیں وہ مسجد میں جا کر ٹورزم کرتی ہیں پھر واپسی پہ ان سے چادر لے لی جاتی ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے یہاں تو ہر بلاک پہ ایک مسجد ہوتی ہے اس میں ایک مولوی بیٹھا دیا جاتا ہے۔ جس کو دین کی کچھ نالج نہیں ہوتی اور بعض اوقات تو ان کے خطبے سن کر شرم آتی ہے کہ یہ مولوی کیا کہہ رہا ہے۔ تو بس میری خواہش ہے کہ ہمیں ترکی کے اچھے قوانین کو ضرور فالو کرنا چاہیے۔"

※ "حجاب کیا ہے۔ فیشن ہے یا ضرورت؟"

★ "کچھ سوسائٹیز میں تو یہ بہت ضروری ہے۔ کیونکہ یہ ان کا کلچر ہوتا ہے' جیسے ہمارے یہاں نارتھ میں یہ کلچر ہے مگر ہم لوگ انہیں شدت پسند کہتے ہیں جبکہ ہمیں پہلے ان کی ہسٹری سے واقف ہونا چاہیے۔ اگر وہ لوگ حجاب کو پسند کرتے ہیں تو ہمیں کوئی حق نہیں کہ ان پر تنقید کریں۔"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔" اور اس کے ساتھ ہی ہم نے فارس تشفیع سے اجازت چاہی اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔

✡ ✡

ابوراشد

شاہین رشید

تحقیقی ذہن رکھنے والے لوگ کبھی بھی اپنے آپ کو کسی ایک کام پر فوکس نہیں کرسکتے۔ وہ ہر وہ کام کرتے ہیں جس میں تحقیق و تعمیر کا عمل جاری رہے۔ ابو راشد اس کی ایک مثال ہیں۔ اپنی آواز سے لوگوں کے ذہنوں میں اچھی باتیں بھی اتارتے ہیں اور ٹی وی کے لیے ٹیلی فلمز لکھ کر اور دیگر رائٹرز کے اسکرپٹ کی نوک پلک سنوار کر ناظرین کو ایک اچھی تفریح بھی مہیا کررہے ہیں۔

✻ "کیسے ہیں ابوراشد صاحب۔ اور جو نام آپ کا ہے۔ بہت کم لوگوں کے ہوتے ہیں۔ تو اس کی کوئی خاص وجہ۔ ہے؟"

★ "جی میں ٹھیک ہوں۔ اور ہم سب بھائیوں کے نام ایسے ہی ہیں جیسے میں ابو راشد "ابو عزیز" ابو عامر اور یہی سوال میں نے بھی اپنے بابا سے کیا تھا تو انہوں نے کہا کہ راشد تو بہت ہوں گے لیکن ابو راشد کوئی دوسرا نہیں ہوگا اور سچ بات تو یہ ہے کہ میں نے ابھی تک تو کوئی دوسرا ابو راشد نہیں دیکھا نہ سنا۔"

✻ "کیا مصروفیات ہیں آپ کی آج کل؟"

★ "آج کل میں نجی چینل کے ساتھ اور ایف ایم 103 کے ساتھ وابستہ ہوں اور گزشتہ چار سال سے ریڈیو کے علاوہ ڈرامہ سائیڈ پر بھی ہوں۔ تقریباً" ڈیڑھ سال میں میں نے نو ٹیلی فلمز لکھی ہیں مثلاً "دھنک رنگ" "پیار میں کبھی کبھی" "مجھے کچھ کہنا ہے" "دیا جلائے رکھنا" اور کچھ کے نام ابھی یاد نہیں آرہے اور ایک سیریل لکھا ہے زیبا بختیار کے لیے اور ایک نجی چینل کے لیے لکھ رہا ہوں۔ اور ایک لحاظ سے اسکرپٹ ایڈیٹر بھی ہوں۔ جو اسکرپٹ آتے ہیں ان کی نوک پلک سنوارنا میرا کام ہوتا ہے۔ رائٹر کے ساتھ میٹنگ کرنا۔"

✻ "آپ نے یہ محسوس نہیں کیا کہ آج کل دو چار ہی موضوعات ہیں جن پر بار بار ڈرامے لکھے جارہے ہیں۔؟"

★ "میں "دیما" کا گریجویٹ ہوں۔ جرمن —— اور رشین لٹریچر پڑھ کر آیا ہوں۔ مگر ساری بات یہ ہے کہ ڈرامہ ابھی بھی عورت کے ہاتھ میں ہے" ناظر عورت ہے اور آپ کا بھی یہ ماننا ہوگا کہ عورتیں تو ہمیشہ ایک جیسی باتیں کرتی ہیں اور آپ کہہ رہی ہیں ناکہ ایک جیسے موضوعات ہیں تو ڈرامہ ایک جگہ سے نہیں گزرتا کئی مراحل سے گزرنے کے بعد مارکیٹنگ کے لیے جاتا ہے اور کوئی ایسا ڈرامہ جن کو آپ سمجھتے ہیں کہ بہترین ہے نیا ٹرینڈ ہے تو مارکیٹ والے کہتے ہیں کہ نہیں بکے گا۔ اور اس کی تازہ مثال "بشر مومن" کی ہے اور یہ ایک تجربہ کیا گیا جو کہ بری طرح فلاپ ہوگیا۔ ڈرامہ مرد کا ہے ہی نہیں ابھی بھی عورت کے ہاتھ میں ہے انڈیا میں بھی اور ہمارے یہاں بھی۔"

✻ "ریڈیو کے بارے میں بھی کچھ بتایئے؟ کچھ اپنے گھر کے ماحول کے بارے میں بتائیں؟"

★ "ریڈیو 2004 نومبر میں جوائن کیا اور 10 سال ہوگئے ہیں ریڈیو سے وابستہ —— ہوئے میرے والد بھی شاعر ہیں اور میری بہن بھی شاعرہ ہیں

والد کو تو ادبی حلقے پہچانتے ہیں 16 برس پہلے ان کا انتقال ہوا ثاقب اجمیری ان کا نام ہے۔ اور بہن نے اپنا کلام پبلش نہیں کروایا جبکہ وہ بہت اچھی شاعرہ ہیں ان کا ایک شعر ہے کہ۔

محبتوں میں بچھڑنا محال ہوتا ہے
دلوں میں آئیے پیدا کدورتیں کر لیں

اور والد کا شعر ہے کہ

دنیا سے گریزاں ہو گیا ہوں
نہ جانے کیوں پریشان ہو گیا ہوں

ایم 103 میں ہی ہوں۔"

* "کہاں مزا آتا ہے' رائٹنگ میں یا ریڈیو میں' کیا ایزی فیل کرتے ہیں؟"

★ "ریڈیو یہ تخلیقی کام نہیں ہوتا' بلکہ جو کچھ آپ نے پڑھا ہوتا ہے جو آپ کی زندگی کا تجربہ ہوتا ہے اسے خوبصورت الفاظ کے ساتھ آپ دوسروں میں منتقل کر دیتے ہیں۔ یہ کوئی بڑا کام یا کارنامہ نہیں ہے اگر کوئی کہے کہ ریڈیو کا آر جے آرٹسٹ ہے تو میں یہ بات ماننے کو بھی تیار نہیں ہوں۔ ایک اچھا بولنے والا تو

تو گھر کا ماحول بہت ادبی تھا اور اسکول کے زمانے میں کمپیئرنگ وغیرہ بھی کی تو لوگوں نے کہا کہ آپ کی آواز تو ریڈیو جیسی ہے تو بس اتفاق دیکھیں کہ ہمارے ایک دوست جو کرنٹ الیفر میں 103 ایف ایم میں گئے۔ انہوں نے مجھے بلایا اور ساحر لودھی سے ملوایا ساحر لودھی نے میرا انٹرویو کیا اور پھر میں چوتھے یا پانچویں دن آن ایئر ہو گیا۔ اور تب سے اب تک ایف

کوئی بھی ہو سکتا ہے کچھ لوگ کینٹے میں بیٹھ کر بہت خوبصورت گفتگو کرتے ہیں کچھ شادی کی محفلوں میں اور کچھ ہماری طرح ہوتے ہیں جنہیں مائیک کے سامنے گفتگو کرنے کا موقع مل جاتا ہے ہاں جو رائٹنگ ہے یہ ایک کریٹو ورک ہے اور اس کو کر کے واقعی دل کو تسکین ملتی ہے اور میں آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ ایف ایم 103 میں آنے سے پہلے میں نے کسی بھی قسم

کا ریڈیو نہیں دیکھا تھا 103 میں ہی ریڈیو پہلی بار دیکھا' مائیک بھی پہلی بار دیکھا اور یہاں سے بھی دوسرے چینل پہ جانے کا میں نے نہیں سوچا کیونکہ یہ میرے مزاج کا ریڈیو ہے۔"

* "کہتے ہیں کہ جی سیاست بڑی چلتی ہے۔ ایک دوسرے کے بندے کھینچنے کے لیے بڑی اچھی آفرز بھی آتی ہیں۔ تو آپ کو ایسی آفرز نہیں آئیں کیا؟"

★ "سب تو چلتا ہے۔ کیونکہ مارکیٹ چھوٹی سی ہے تربیت یافتہ لوگ نہیں ہیں اتنے۔ جیسے کہ لکھاریوں کی تعداد بہت کم ہے یعنی اچھا لکھنے والوں کی۔ اسی طرح اچھا بولنے والوں کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ تو کھینچا تانی ہوتی ہے۔ مگر میں کہیں نہیں گیا کہ مجھے یہی ایف ایم پسند ہے۔"

* "آپ کے پروگرام کا فارمیٹ کیا ہے اور کس کس دن آپ پروگرام کرتے ہیں؟"

★ "پہلے تو میں ہفتے میں پانچ دن پروگرام کرتا تھا اور اس میں دن کے شوز بھی ہوتے تھے لیکن اب میں ہفتے میں تین دن پروگرام کرتا ہوں اور وہ بھی رات بارہ سے تین بجے تک پروگرام کرتا ہوں پیر' منگل اور بدھ۔ پیر کے دن یو کٹری شو ہوتا ہے کوئی ایک ٹاپک رکھ لیتے ہیں اور منگل بدھ کو ہمارے رویوں سے جڑا کوئی عام سا موضوع ہوتا ہے۔"

* "یہ بتائیں کہ رات کے سامعین زیادہ ہیں یا دن کے سامعین زیادہ ہیں؟"

★ "سامعین تو ہر وقت کے ہیں' لیکن رات کے سامعین خاص طرح کے ہوتے ہیں جو کہ بہت ہی میچور بہت فوکس اور خاص مزاج رکھنے والے ہوتے ہیں اسی لیے میں نے اپنے پروگرام کا نام "بروکن ہارٹ" رکھا ہوا ہے کیونکہ میرا خیال ہے کہ ہمارا دل کہیں نہ کہیں کسی بھی حوالے سے ٹوٹا ضرور ہے تو رات کو وہ لوگ جمع ہوتے ہیں جو کسی ایشو پر ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں جو کسی تعلق پر ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں کسی خواہش پر' کسی کی محبت میں ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں۔"

* "پھر لوگ اپنی کہانیاں بھی سناتے ہوں گے' لمبی لمبی کالز ہوتی ہیں یا مختصر؟"

★ "اچھی گفتگو میں یقیناً" لمبی کالز بھی ہوتی ہیں اور میں اپنے بولنے کے لیے نہیں آتا لوگوں کو سننے کے لیے آتا ہوں ان کا شو ہوتا ہے اگر میں نے ہی بولنا ہے تو پھر ایسے شو کا کیا فائدہ۔ اور میرے سامعین 18 سے لے کر 72 سال تک کے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ اور مجھے زیادہ وہ لوگ کال کرتے ہیں جو بیس سال کی عمر میں بھی میری طرح ہلکے رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں۔ ہمارے خاندان میں ایسے لوگوں کے لیے کہا جاتا تھا کہ یہ تو بچپن میں ہی بوڑھے ہوگئے ہیں تو اٹھارہ بیس سال والے اور 72 سال والے ایک ہی مزاج کے لوگ مجھے فون کرتے ہیں۔"

* "ایسی کالز کبھی آئیں کہ آپ کو اچانک بند کرنی پڑی ہو۔ کسی نے اچانک ـــ ہی اظہار محبت کردیا ہو؟"

★ "ایسی تو بہت سی کالز آتی ہیں اور میں ایسی کالز کو بند نہیں کرتا بلکہ انجوائے کرتا ہوں اور کوئی آئی لو یو کہہ دے تو میں بڑے اعتماد کے ساتھ کہہ دیتا ہوں کہ "آئی لو یو ٹو" میں بھی آپ سے بہت پیار کرتا ہوں کیونکہ اگر آپ لوگ پیار نہیں کریں گے تو پھر یہ شو نہیں ہوگا میری محبت آپ سب کے لیے ہے۔ تو جب میں محبت کی وضاحت کردیتا ہوں تو پھر وہ لوگ سمجھ جاتے ہیں۔ یعنی محبت کی شدت کو ختم کرکے دوسرے معنی پہنا دیتا ہوں۔"

* "آپ نے کہا کہ آپ نے کبھی ریڈیو دیکھا نہیں تھا تو ریڈیو سنتے تو ہوں گے آپ؟"

★ "میں ریڈیو کا پرانا سامع ہوں میں نے بہت ریڈیو سنا ہے۔ بہت زیادہ اور میں بہت سے لوگوں کا فین ہوں۔ صادق الاسلام صاحب ۔ شبینہ افتخار ایس ایم سلیم صاحب کا۔ طلعت حسین تو میرے استاد ہیں انہوں نے مجھے پڑھایا ہے تو میں ان سب کا فین ہوں اور طلعت حسین صاحب کی تو میں آواز نکالا کرتا

تھا اسکول اور کالج کے زمانے میں اور انہی سے سیکھا ہے میں نے سب کچھ۔"

✵ "بہت سے ٹی وی چینلز آنے کے بعد اکثریت کا خیال ہے کہ ریڈیو کی ویلیو کم ہو گئی ہے۔ لوگ صرف ڈرائیو ٹائم کے وقت ہی ریڈیو سنتے ہیں۔ ایسا ہے کیا؟"

★ "میں اپنے تجربے کی روشنی میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ ٹی وی کا شاید ہی کوئی شو ایسا ہو جو ہم اور آپ پورے انہماک کے ساتھ دیکھتے ہوں درمیان میں ہم چینلز بدلتے رہتے ہیں لیکن مجھے اس وقت بہت حیرت ہوتی ہے کہ جب آپ ریڈیو کا دو گھنٹے کا شو کر رہے ہوں اور کوئی کالر آپ کو ایک بج کر پچپن پر یعنی ایک گھنٹہ پچپن منٹ گزرنے کے بعد کال کرنے والا یہ کہے کہ جو بات آپ کی پہلی کالر نے کی تھی اس سے اتفاق نہیں کرتا یا کرتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ بندہ دو گھنٹے سے ہمیں سن رہا ہوتا ہے تو یہی ریڈیو کا جادو ہے۔ ریڈیو کے ساتھ لوگوں کی بانڈنگ بہت زیادہ ہوتی ہے اور لوگ ریڈیو کا اپنا بہترین دوست سمجھتے ہیں۔ اور آپ جانتی ہیں کہ ایف ایم کے آنے سے پہلے ریڈیو تقریباً" ختم ہو چکا تھا اور صرف ۔ کنٹری تک محدود ہو گیا تھا لیکن ایف ایم نے سامعین کا ایک بڑا حلقہ پیدا کیا ہے پورے پاکستان میں اور اس کی ویلیو کا اندازہ تو آپ اس بات سے لگایئے کہ اب ہر موبائل میں ریڈیو ہے ہر گاڑی میں ریڈیو ہے۔"

✵ "رات بارہ بجے گھر سے نکلنا بلکہ پہلے نکلنا شہر کے حالات خراب ہیں گھر میں کوئی پریشانی ہے۔ اپنی طبیعت ٹھیک نہیں تو پھر چھٹی کرتے ہیں یا جاتے ہیں آپ؟"

★ "چھٹی نہیں کرتا' مشکل ضرور ہوتی ہے مگر جاتا ہوں اور اس کیفیت کو لوگ محسوس بھی کر لیتے ہیں حالات کی نزاکت اور طبیعت کی نزاکت کو بھی لوگ

محسوس کر لیتے ہیں پھر لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کیوں آئے تو لوگ دعائیں بھی بہت دیتے ہیں۔"

✻ "مزید باتیں ہوں گی، لیکن پہلے تھوڑا فیملی بیک گراؤنڈ بتایئے؟"

★ "میں 26 دسمبر کو کراچی میں پیدا ہوا، میرے والدین کا تعلق اجمیر شریف راجستھان سے ہے۔ ہم چار بھائی اور ایک بہن ہیں۔ میں دوسرے نمبر پر ہوں، بہن بڑی ہیں، شاعرہ ہیں اور تدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ مجھ سے چھوٹا بھائی میڈیا مارکیٹنگ میں ہے۔ ایک بھائی فارما کی مارکیٹنگ میں ہے اور سب سے چھوٹا بھائی بزنس پلس میں ہوتا ہے۔"

✻ "شادی؟"

★ "جی میری شادی کو ماشاء اللہ 14 سال ہو گئے ہیں دو بیٹے اور ماشاء اللہ ایک بیٹی ہے اور ہماری چھوٹی سی فیملی ہے۔ بڑے بیٹے کا نام ابو صارم ہے۔ دوسرے کا نام ابو شہریار اور بیٹی ارفع ہے بڑا بیٹا اولیول کر رہا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ وہ فلم میکنگ کی طرف جائے۔"

✻ "آپ اس فیلڈ میں اپنے ٹیلنٹ سے آئے یا کسی نے ہاتھ پکڑا؟"

★ "ہاتھ تو کوئی نہ کوئی ضرور پکڑتا ہے یہ تو بڑی احسان فراموشی ہوگی کہ ہم کہیں کہ ہم خود آئے۔ مجھے یاد ہے کہ فرحت عباس شاہ نے کہا تھا کہ ابو راشد ریڈیو کی آواز ہے۔ تو انہوں نے میرے لیے کہا اور ریڈیو پر بلایا۔ تو ہاتھ تو کوئی نہ کوئی پکڑتا ہی ہے باقی کام پھر اپنا ٹیلنٹ دکھانا ہوتا ہے۔ اور جب میں نے ریڈیو پر پروگرام کیا پچویشن اس طرح بناتا تھا کہ جو بہت ہی ڈرامینک قسم کی ہوتی تھی۔ بارش ہے، جدائی ہے، تو ایسی چیزوں پر میں پورا ایک مونولوگ لکھتا تھا تو جب کچھ دوستوں نے سنا تو کہا کہ آپ لے ڈائیلاگ فارم میں کیوں نہیں لکھتے، آپ تو اچھا خاصا ڈرامہ لکھ سکتے ہیں آپ دو طرف کا مکالمہ کیوں نہیں لکھتے ایک طرف کا کیوں لکھتے ہیں۔ میں خود بھی اس بات پر چونک گیا۔ پھر میں نے "تیلا" جوائن کیا اور وہاں سے میں نے بہت کچھ سیکھا، پھر وہاں مجھے زیبا بختیار ملیں انہوں نے مجھے آفرز دیں تو پھر میں نے ان کے لیے شو لکھا "باادب باملاحظہ" کا اسکرپٹ میں نے لکھا۔ پھر مجھے ایکسپریس سے آفر آئی جہاں میں نے 18 ماہ کام کیا اس کے بعد جیو سے آفر آگئی اور پھر میں یہاں آگیا۔"

✻ "آپ کام کرتے ہیں، اتنے مصروف رہتے ہیں۔ تو مزاج کیسے رہے۔ نرم یا گرم؟"

★ "جیسا آواز سے لگ رہا ہوں ویسا ہی ہوں۔ لیکن لوگوں کو مجھ سے ایک شکایت رہتی ہے کہ میں روڈ ہو جاتا ہوں اور مجھے بھی اس کا احساس ہے جب لوگ شو کو خراب کرتے ہیں اور اپنی ہی بات کرتے ہیں شو کے بارے میں بات نہیں کرتے تو میں آن ایئر بھی روڈ ہو جاتا ہوں۔ جو کہ شاید غلط ہے اور مجھے کنٹرول کرنا چاہیے مگر پھر سوچتا ہوں کہ میں نے اس کا دل توڑا ہے جس کی وجہ سے شو خراب ہو رہا تھا لیکن ان لاکھوں دلوں کو میں نے بچالیا ہے جو میرے پروگرام کو شوق سے سن رہے ہوتے ہیں۔"

✻ "آواز کی دنیا کے لوگ کیمرے کے پیچھے، اسکرین سے اوجھل ہو کر کام کر رہے ہوتے ہیں، کبھی دل چاہا کہ ہم بھی دوسروں کی طرح پہچانے جائیں؟"

★ "اگر آپ کو پہچانے جانے کا شوق ہے تو پھر آپ ریڈیو نہیں کر سکتے۔ ریڈیو کا کریز ہی کچھ اور ہے۔ اس کا جادو ہی کچھ اور ہے۔ ریڈیو کا جادو یہ ہے کہ کریڈٹ کارڈ کالر نے مجھے فون کر کے کہا کہ ابو راشد صاحب آپ نے "ڈیوس" نہیں دیے گزشتہ مہینے کے اور میں نے کہا کہ ہاں میں اسلام آباد چلا گیا تھا پھر وہ آہستہ سے بولا کہ آپ وہی ابو راشد ہیں جو ایف ایم 103 میں آتے ہیں تو میں نے کہا ہاں۔ تو اس نے کہا کوئی مسئلہ نہیں آپ آرام سے جمع کرا دیجیے گا تو اس کا جو مزا ہے وہ آمنے سامنے پہچانے جانے کا نہیں ہے اس طرح اسلام آباد میں ایک صاحب سے گفتگو ہو رہی تھی پوچھنے لگے کیا کرتے ہیں میں نے بتایا تو نام

پوچھا میں نے نام بتایا تو کہنے لگے او اچھا اور گلے لگالیا کہ جب میں کراچی میں تھا تو آپ کو سنتا تھا۔ اس پہچان کا مزا ہی کچھ اور ہے۔"

✻ "کھانے پینے کے معاملے میں کیسے ہیں۔ بہت شوقین ہیں یا نہیں؟"

★ "بہت ہی سادا خوراک کا قائل ہوں، لیکن جب عیاشی کا موڈ ہوتا ہے تو پھر "باربی کیو" پسند کرتا ہوں۔"

✻ "خود بھی کوکنگ کرلیتے ہیں۔ بیگم کا ہاتھ بٹاتے ہیں؟"

★ قہقہہ "کچھ نہیں آتا۔ سلاد وغیرہ کٹ لیتا ہوں بس۔"

✻ "وائس اوور بھی کرتے ہیں؟"

★ "ایک ترکش پروجیکٹ کیا تھا "ارتی" لیکن محسوس کیا کہ یہ تو فل ٹائم جاب ہے اور میرے پاس اس کا ٹائم نہیں ہے۔ کمرشلز کیے ہیں مگر بہت زیادہ نہیں رائٹنگ سائیڈ پر زیادہ مصروف رہنے لگا ہوں۔"

✻ "گھر آتے ہیں تو کیا خواہش ہوتی ہے کہ گرم گرم کھانا مل جائے یا کچھ اور؟"

★ "بالکل جی بالکل۔ میری بہترین عیاشی یہ ہے کہ میں بیوی کے سامنے بیٹھوں کھانا رکھا ہوا ہو۔ میں بہت انڈور قسم کا بندہ ہوں۔ گھر میں رہنا پسند کرتا ہوں دوست میرے گھر آجائیں تو میں بہت خوش ہوتا ہوں۔ اور دوستوں کے بغیر میں خود کو ادھورا سمجھتا ہوں۔"

✻ "فیملی کے لیے کون سا ٹائم ہوتا ہے؟"

★ "ہر اتوار کا دن فیملی کے لیے ہی ہوتا ہے اور ہم کچھ نہ کچھ ضرور کرتے ہیں اگر کہیں نہیں جاتے تو گھر میں ہی کوئی تفریح کرلیتے ہیں۔"

✻ "اور آخر میں آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟"

★ "میں سب کو ایک بات کہنا چاہوں گا کہ آپ کسی کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کریں آپ کسی کو غلط مت کہیں اگر وہ غلط ہے تو زمانہ خود ہی اس کا فیصلہ کرے گا۔ آپ پوزیٹو رہیں۔ سب کے لیے اچھا سوچیں سب کا بھلا چاہیں پھر دیکھیں کہ آپ کی زندگی کتنی آسان ہو جائے گی۔"

عینی جعفری

شاہین رشید

★ "ہم تین بہنیں ہیں اور میں بڑی ہوں۔"
❊ "تعلیم؟"
★ "O اور A لیول پھر بیچلر بی کام کینیڈا سے۔"
❊ "میری شادی؟"
★ "جی ہو چکی اور میری پسند بھی شامل تھی۔"
❊ "شوبز میں کس کے تعاون سے آئی؟"
★ "اپنی خالہ عذرا محی الدین کی وجہ سے۔"
❊ "شہرت کا باعث بنے؟"
★ "میرے ڈرامے "زپ' مایا میری بہن' اسیرزادی"۔ خاص طور پر اسیرزادی نے تو بہت ہی شہرت دی۔"
❊ "تھکن میں کیا دل چاہتا ہے؟"
★ "ہائے۔۔۔ کوئی مساج کر دے۔"
❊ "کس سے ڈرتی ہوں؟"
★ "اپنے بابا کے غصے سے۔"
❊ "اس فیلڈ کو کیوں اپنایا؟"
★ "جنون کی حد تک شوق تھا اور شوق ہے۔ پہلے تھیٹر میں کام کیا پھر خالہ کے ذریعے اس فیلڈ میں آئی اور پھر اللہ کا کرم ہو گیا۔"
❊ "کب فریش ہوتی ہوں؟"
★ "جب لمبی نیند لے کر اٹھتی ہوں۔"
❊ "اور جب کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"
★ "بہت غصہ آتا ہے۔۔۔ نیند بہت پیاری ہے مجھے۔"
❊ "پورا نام؟"
★ "قرۃ العین جعفری اور یہ بھی واضح کردوں کہ جو انگریزی میں میرا نام لکھے وہ Ainy کی اسپیلنگ کے ساتھ لکھے کیونکہ اسپیلنگ سے بہت فرق پڑتا ہے۔"
❊ "جنم دن، جنم سال، شہر؟"
★ "9 جون، سال نہیں بتاؤں گی اور شہر کراچی ہے۔"
❊ "بہن بھائی؟"

* "گھر میں میرا پسندیدہ لباس؟"
★ "گھر میں تو میں ڈھیلے ڈھالے لباس ہی پہننا پسند کرتی ہوں۔ یہ بہت آرام دہ ہوتا ہے۔"
* "گھر آتے ہی کیا کرتی ہوں؟"
★ "جوتے اتارتی ہوں' ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں چلنا اچھا لگتا ہے۔ پھر اپنا میک اپ اتارتی ہوں اور جیسا کہ میں نے کہا ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنتی ہوں۔"
* "خواب دیکھتی ہوں؟"
★ "جی نیند والے بھی دیکھتی ہوں اور فیوچر کے بھی۔ مجھے خواب دیکھنا اور پھر ان کو عملی جامہ پہنانا اچھا لگتا ہے۔"
* "غلطی تسلیم کرلیتی ہوں؟"
★ "کبھی تو کرلیتی ہوں مگر کبھی نہیں بھی کرتی۔"
* "اپنی کمائی سے اپنے لیے کیا خریدا؟"
★ "ویسے تو بہت کچھ خریدتی رہتی ہوں' لیکن سب سے پہلے کمپیوٹر خریدا کیونکہ میرے لیے بہت ضروری تھا۔"
* "شادی پر خرچ کرنا کیسا لگتا ہے؟"
★ "مجھے شادی کی رسمیں اچھی لگتی ہیں' مگر فضول خرچی اچھی نہیں لگتی۔"
* "میرے پاس ذخیرہ ہے؟"
★ "بہترین قسم کی جیولری کا' ہینڈ بیگز کا' کپڑوں کا' خوب صورت جوتیوں کا' مجھے موویز دیکھنے اور کتابیں پڑھنے کا بھی شوق ہے ان کا بھی ذخیرہ ہے میرے پاس۔"
* "میری اچھی عادت؟"
★ "خود بھی خوش رہتی ہوں اور دوسروں کو بھی رکھتی ہوں۔"
* "ایک کردار کرنے کی بہت خواہش ہے؟"
★ "میں Vampire کا اور فیری ٹیل کا کردار کرنا چاہتی ہوں۔ بے نظیر بھٹو اور مدر ٹریسا بھی میری پسندیدہ شخصیات ہیں۔"
* "فارغ اوقات کیسے گزارتی ہوں؟"

★ "اپنے ڈرامے دیکھتی ہوں۔ پھر ان میں سے خامیاں تلاش کرتی ہوں۔"
* "شادی میں پسندیدہ رسم؟"
★ "مہندی۔"
* "کس کے ہاتھ کے پکے کھانے شوق سے کھاتی ہوں؟"
★ "صرف اور صرف اپنی امی کے ہاتھ کے۔"
* "گھر سے نکلتے وقت کیا چیزیں لازمی لیتی ہوں؟"
★ "موبائل فون' گھر کی چابیاں' بیگ اور اس میں بھی ڈھیر ساری چیزیں ہوتی ہیں میری۔"

* "کس ملک کی شہریت لینا چاہتی ہوں؟"
★ "اب کسی ملک کی نہیں' میرے پاس کینیڈا کی شہریت ہے اور میں جب چاہوں کینیڈا جاکے مستقل قیام کر سکتی ہوں۔"
* "پاکستان میں قیام کی وجہ؟"
★ "میرا اپنا ملک ہے' پھر میری فیملی' پھر یہاں کا کام۔ میں بہت خوش ہوں پاکستان میں۔"
* "میرا پروفیشن؟"
★ "یہی شوبز۔ یہ بھی تو ایک طرح سے جاب ہے۔ ہم بھی صبح نکلتے ہیں اپنے کام پر اور رات گئے واپس آتے ہیں۔ جاب والے تو پھر بھی 9 to 5 کی جاب کرتے ہیں جبکہ ہم فل ٹائم جاب کرتے ہیں۔"

* "کون سا کردار میری زندگی کے قریب تھا؟"
★ "ابھی تک ایسا کوئی رول نہیں کیا جو میری زندگی کے قریب ہو۔"
* "میک اپ پہننا کتنا ضروری ہے؟"
★ "میرا نہیں خیال کہ میک اپ ضروری ہے۔ اگر آپ گھر سے باہر اچھے اور ڈیسنٹ حلیے میں نکلیں تو کوئی

* "میری مقبولیت کا راز؟"
★ "ایک وقت میں ایک یا دو سیریلز کرتی ہوں' کئی کئی پروجیکٹس میں اپنے آپ کو بک نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب میرا کوئی سیریل آتا ہے تو لوگ شوق سے دیکھتے ہیں اور میرے ڈراموں کا انتظار کرتے ہیں۔"
* "جسمانی طور پر مجھ میں کمی ہے؟"
★ "میری ہائیٹ کم ہے' کاش تھوڑی لمبی اور ہوتی۔"

پر اہم نہیں ہو گی۔"

✻ "شاپنگ کے لیے پسندیدہ جگہ؟"

★ "ویسے تو دبئی ہے' مگر جب کچھ بہت ضروری خریدنا ہو تو پھر کراچی کا سنڈے بازار' ڈالمن مال اور نورم بہترین جگہ ہے۔"

✻ "میں حیران ہوتی ہوں؟"

★ "کراچی کے سنڈے بازار جاکر' ہر طرح کی ورائٹی وہاں سے مل جاتی ہے۔ ایک مکمل بازار ہے۔ سنڈے بازار۔"

✻ "کبھی کام نہیں کروں گی؟"

★ "بالی ووڈ کی فلموں میں۔ کیونکہ ان کی فلموں میں جس طرح کے سین ہوتے ہیں' جس طرح کا لباس ہوتا ہے اور جس طرح کے ڈانس ہوتے ہیں ان کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتی' کام کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔"

✻ "کون سے رول کرتے ہوئے جھجک آتی ہے؟"

★ "سچ بتاؤں۔ رومانٹک رول کرتے وقت' اتنے لوگ سامنے ہوتے ہیں' عجیب سا لگتا ہے' مگر پھر بھی کر لیتی ہوں کہ یہ بھی زندگی کا ایک حصہ ہے۔"

✻ "بہت کوفت ہوتی ہے؟"

★ "جب کوئی اہم کام کر رہے ہوں اور لائٹ چلی جائے' سخت غصہ آتا ہے۔"

✻ "پسندیدہ چینلز؟"

★ "مزے کی بات کہ میں ٹی وی دیکھتی ہی نہیں ہوں' کوئی فلم دیکھنی ہو تو یو ایس بی لگا کر یا ڈی وی ڈی پہ دیکھ لیتی ہوں۔"

✻ "کن لوگوں پر خرچ کرکے خوشی ہوتی ہے؟"

★ "فیملی پر۔"

✻ "کس ایم ایس سے دلچسپی؟"

★ "صرف اتنی دلچسپی ہے کہ ضروری ایس ایم ایس کے فوراً" جواب دے دیتی ہوں باقی کو اگنور کر دیتی ہوں۔"

✻ "صبح کب اٹھتی ہوں؟"

★ "کام پر منحصر ہے' جب جلدی جانا ہو تو جلدی اٹھ جاتی ہوں ورنہ آرام سے سوتی رہتی ہوں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں کہ جنہیں جلدی ہی اٹھنا ہوتا ہے۔"

✻ "مارننگ شو ہوسٹ کرنے کی آفر آئے تو؟"

★ "تو نہیں کروں گی' کیونکہ مجھے صبح صبح جلدی اٹھنے کی عادت نہیں ہے اور نہ ہی مجھے مارننگ شوز اچھے لگتے ہیں۔"

✻ "برے لگتے ہیں وہ لوگ؟"

★ "جو محبت کا اظہار بے ہودہ انداز میں کرتے ہیں۔"

✻ "کس طرح کے مرد اچھے لگتے ہیں؟"

★ "ایسے مرد اچھے لگتے ہیں جو عورتوں کی عزت کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ان سے افضل نہیں سمجھتے۔"

★ "جب کبھی کبھار والدین سے بدتمیزی کر بیٹھتی ہوں۔"
✳ "فیس بک اور انٹرنیٹ سے میرا لگاؤ؟"
★ "بہت زیادہ ہے۔ اب تو ان کے بغیر گزارہ ہی نہیں ہے۔"
✳ "کھانا کہاں کھانا پسند کرتی ہوں۔ زمین پر اپنے بیڈ پر یا ڈائننگ ٹیبل پر؟"
★ "برابر طریقے سے ڈائننگ ٹیبل پر۔"
✳ "نیند جلدی آجاتی ہے یا دیر سے؟"
★ "کہاں جلدی آتی ہے کروٹیں بدلتی رہتی ہوں تب کہیں جا کر نیند آتی ہے مجھے۔"
✳ "گھر میں کہاں سکون ملتا ہے؟"
★ "صرف اور صرف اپنے کمرے میں۔"
✳ "مہمانوں کی آمد....؟"
★ "بعض اوقات بہت اچھی لگتی ہے اور بعض اوقات بہت بری مگر پھر بھی بڑے اخلاق سے ملتی ہوں۔"
✳ "کیا اچھا پکالیتی ہوں؟"
★ "سچ بتاؤں۔ کچھ بھی نہیں۔" قہقہہ "میں اتنی اچھی کک نہیں ہوں۔"
✳ "گالیاں دیتی ہوں؟"
★ "جب بہت غصے میں ہوتی ہوں اور کوئی چھوٹی موٹی گالیاں نہیں دیتی۔ بڑی بڑی نکلتی ہیں۔"
✳ "سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا رکھتی ہوں؟"
★ "سیل فون کتاب لیمپ اور بالوں کا کلپ۔"
✳ "فضول خرچ ہوں؟"
★ "بالکل بھی نہیں۔ پیسے کی اہمیت کو سمجھتی ہوں اور وہی چیز خریدتی ہوں جس کی ضرورت ہوتی ہے۔"

☼ ☼

✳ "چھٹی گزارنے کے لیے بہترین جگہ؟"
★ "اپنا گھر۔ اور فیملی کے ساتھ گھومنا پھرنا۔ مزا آجاتا ہے چھٹی کا۔"
✳ "موبائل سروس آف ہو تو؟"
★ "تو۔ تو حکومت وقت پر بہت غصہ آتا ہے۔"
✳ "جھوٹ بولتی ہوں؟"
★ "جب کسی کو مصیبت میں دیکھتی ہوں اور اسے بچانا چاہتی ہوں تب جھوٹ کا سہارا لیتی ہوں۔"
✳ "14 فروری مناتی ہوں؟"
★ "ویلنٹائن ڈے۔ ؟ ہرگز نہیں۔ بہت فضول تہوار لگتا ہے۔"
✳ "تہوار جو مجھے پسند ہیں؟"
★ "عید، رمضان المبارک اور 14 اگست۔"
✳ "شرمندگی محسوس کرتی ہوں؟"

عائشہ خان

اداکارہ

✻ "آپ کا نام؟ گھر والے کس نام سے پکارتے ہیں؟"

★ "ثمینہ خان فلمی نام عائشہ خان ہے۔ پیار کا کوئی نام نہیں ثمینہ ہی کہتے ہیں۔"

✻ "کبھی آئینے نے یا آپ نے آئینے سے کچھ کہا؟"

★ "آئینے میں دیکھ کر الٹے سیدھے منہ کے زاویے بنا کے دیکھتی ہوں۔ میرے میاں جی کو میری آنکھیں پسند ہیں' تو آنکھوں پر غور کرتی ہوں' اور آئینہ مجھ سے کہتا ہے کہ اب تو منہ دھولو' بہت گندی لگ رہی ہو" (ہاہاہا)۔

✻ "اپنی زندگی کے دشوار لمحات بیان کریں؟"

★ "ابو کے بیماری کے دن' پھر جب ابو کا انتقال ہو گیا تو امی کا سہارا تھا' مگر جب امی کا انتقال ہوا تو پھر اکیلا پن ہو گیا' امی کے بیماری کے دن اور ڈاکٹر کا جواب دے دینا' یہ دن مشکل ترین تھے۔"

✻ "آپ کے لیے محبت کیا ہے؟"

★ "سچی محبت صرف اور صرف والدین کر سکتے ہیں۔ ویسے شوہر اور بچے اور بہن بھائی بھی۔"

✻ "مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ جس پر عمل کرنا آپ کی ترجیح میں شامل ہو؟"

★ "دیکھا جائے تو یہ منصوبہ بہت دیرینہ ہے مگر میں چاہتی ہوں کہ جلد از جلد گھر شفٹ کر لوں خود کو کچھ قابل بناؤں۔ بچوں کی تعلیم' تربیت' اور شوہر کی جاب ٹرانسفر جلد ہو جائے ان شاء اللہ تعالیٰ۔"

✻ "پچھلے سال کی بڑی کامیابی' جس نے آپ کو مسرور و مطمئن کیا ہو؟"

★ "میرے شوہر جو پہلے میرا خیال نہیں کرتے تھے اب کرنے لگے ہیں' میرے لیے یہ کامیابی ہے کہ مجھے اہمیت دینے لگے ہیں۔"

✻ "آپ اپنے گزرے کل' آج اور آنے والے کل کو ایک لفظ میں کیسے واضح کریں گی؟"

★ "کوشش' جدوجہد ایک اچھا انسان' سچی پکی مسلمان' نیک بننے کی۔"

✻ "اپنے آپ کو بیان کریں؟"

★ "میں مضبوط ہوں۔ بہادر ہوں (صرف کاکروچ اور بلی سے ڈرتی ہوں) حالات کیسے بھی ہوں اعصاب کو مضبوط رکھتی ہوں۔ لوگوں پر جلدی بھروسا کرلیتی ہوں اور پھر بعد میں علم ہوتا ہے کہ یہ تو غلط تھا۔"

✻ "کوئی ایسا ڈر جو آپ میں آج بھی اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہو؟"

★ "زلزلے۔ زلزلے سے بہت ڈرتی ہوں۔ 2005 کا زلزلہ ذہن میں آجاتا ہے اور مارگلہ ٹاور منہدم ہونا' اور ہر طرف تباہی ذہن میں آجاتی ہے۔ اور قبر کے عذاب اور اندھیرے کے بارے میں سوچتی ہوں تو بہت ڈر لگتا ہے۔"

✻ "آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟"

★ "میرا گھر بچے شوہر (ماں باپ تو حیات نہیں)۔ بہن بھائی۔ ان سب میں میری جان ہے۔"

✻ "آپ کی کمزوری اور طاقت کیا ہیں؟"

★ "میرا خیال ہے وہی کامن جواب ہے۔ کمزوری

بچے اور طاقت شوہر۔"

* "آپ خوشگوار لمحات کیسے گزارتی ہیں؟"

★ "ایک بڑا سا کپ چائے اور تینوں ڈائجسٹ' اور جب میرے تینوں بچے عبداللہ' محمد حسن' اور سجاد اور شوہر ہنسی مذاق کرتے ہیں۔"

* "آپ کے نزدیک دولت کی اہمیت؟"

★ "بہت زیادہ دولت مجھے تو پسند نہیں۔ جتنی دولت ہوگی' آخرت میں اتنے ہی سوال ہوں گے' اور ہم جواب کس طرح دیں گے اس لیے ضرورت پوری ہو جائے بس بے تحاشا کی طلب نہیں۔"

* "گھر آپ کی نظر میں؟"

★ "ایک پناہ گاہ۔ سکون' اپنی حکومت' اپنی مرضی' سب سے اچھی نیند اپنے گھر میں آتی ہے۔"

* "کیا بھول جاتی ہیں معاف کر دیتی ہیں؟"

★ "بالکل بھول جاتی ہوں ماشاء اللہ سے' اور اگر دوبارہ ذہن میں آنے ـــــ لگے تو میں اپنا ذہن جھٹک دیتی ہوں۔ بھئی ہم کوئی ایسے نیک نہیں کہ دوبارہ یاد نہ آئے' یاد تو ضرور آتا ہے یہ ایک فطری عمل ہے مگر اسے جھٹک دینا بھی ہمارا ہی کام ہے۔ الحمد للہ میں اپنی اس عادت کے سبب' بہت پر سکون رہتی ہوں۔ بھئی اتنا ٹائم بھی نہیں کہ ایک بات کو لے کر بیٹھے رہیں۔"

* "اپنی کامیابیوں میں کسے حصہ دار ٹھہراتی ہیں؟"

★ "شادی سے پہلے تک تو ماں باپ کو' اب میرے شوہر۔ وہ مجھے ان کریج کرتے ہیں کہ تم یہ کرو۔ وہ کرو۔ جب کہ میں تو کچھ بھی نہیں۔ آج جو میرا رشتہ کرن شعاع اور خواتین سے ہے' وہ بھی میرے شوہر کے مرہون منت ہے۔ میری حوصلہ افزائی بہت کرتے ہیں۔"

* "سائنسی ترقی نے ہمیں مشینوں کا محتاج کر کے کاہل کر دیا۔ یا واقعی یہ ترقی ہے؟"

★ "بقول میرے' ٹائم کی بچت ہوتی ہے۔ بھئی یہ تو اچھی بات ہے نا کہ ہم صرف کاموں میں وقت صرف نہیں کرتے۔ کام جلدی بنٹ جاتا ہے تو ہم اپنی بھی ایکٹوٹی کر سکتے ہیں اور بقول میرے دادی کے حق ہا کیا زمانہ تھا' تازہ چکی کا پسا ہوا آٹا گرم گرم گوندھتے تھے کیا پیاری روٹی پکتی۔ ساتھ میں دادا بھی بولتے۔ اب کی عورتیں تو سست ماری ہو گئی ہیں۔"

* "کوئی عجیب سی خواہش یا خواب؟"

★ "اب تو عجیب سا کچھ نہیں' ماضی میں کرکٹر بننے کا شوق تھا' خیر اب بھی اپنے بچوں کے ساتھ یہ شوق پورا کر لیتی ہوں۔ اور یہ کہ کاش میں لڑکا ہوتا کیونکہ عورت ہونے کے ناتے میں یہ کام نہیں کر سکتی نا۔ پتنگ اڑانا' بائیک چلانا' کرکٹ کھیلنا' یہ سب کھیل میرے فیورٹ ہیں۔"

خواب یہ کہ کبھی مفتی طارق جمیل صاحب سے ملاقات کروں۔

* "برکھا رت کو کیسے انجوائے کرتی ہیں؟"

★ "وہی بڑا سا چائے کا کپ پکوڑے بھی اگر بنے ہوں تو کیا بات ہے۔ ڈائجسٹ تینوں۔ اوپر ـــ یا صحن میں چلی جاتی ہوں۔ کہانی پڑھتی ہوں یا جھولا جھولتی ہوں۔ بارش میں بھیگتی ہوں۔"

* "آپ جو ہیں وہ نہ ہوتی تو کیا ہوتیں؟"

★ "زیادہ تعلیم یافتہ ہوتی تو شاید ورکنگ لیڈی ہوتی۔ ویسے ہمارے معاشرے میں زیادہ تر شادی کر کے گھر کی ہو جاتی ہیں۔ ایسی بھی ٹھیک ہوں۔"

* "آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں جب؟"

★ "تمام کام نبٹا کر سکون سے مطالعہ کرتی ہوں چائے کے ساتھ۔"

* "کامیابی کیا ہے آپ کے لیے؟"

★ "کچھ نہیں' کامیابی اور ناکامی دونوں اللہ کی طرف سے ہیں۔ زیادہ نہ سوچتی ہوں نہ اتراتی ہوں۔ کیونکہ اللہ سے خوف آتا ہے کہ کامیابی دی ہے جو واپس بھی لے سکتا ہے۔ اور نہ زیادہ سر پر سوار کرتی ہوں۔ بھلے سے ناکامی ہو۔

* "مطالعہ کی اہمیت آپ کے لیے؟"

★ بہت زیادہ اہمیت ہے۔ مطالعہ سے ذہن کھلتا ہے۔ روح کی غذا ہے۔ کتابیں میری بہت اچھی دوست ہیں۔ میرے مشکل وقت میں جب میرے ساتھ کوئی نہ تھا۔نہ کوئی امید کی کرن تھی۔ تب کتابیں ہی تھیں جنہوں نے مجھے سہارا دیا۔ اچھی کتابیں پڑھنے سے سوچ مثبت ہوتی ہے بقول میرے۔"

✻ "آپ کی پسندیدہ شخصیت؟"

★ "دو جہانوں کے سردار' پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم' حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ' حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا میری زندگی میں بہت بڑا بدلاؤ آیا ہے)

✻ "متاثر کن کتاب مصنف' مووی۔

★ (1) کتاب قرآن پاک' مصحف' جنت کے پتے (2) عمیرہ احمد' نمرہ احمد' ثمر بخاری' فائزہ افتخار' راحت جبیں۔ (3) مووی مزاحیہ اچھی لگتی ہیں۔

✻ آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟"

★ "سامنے والے کا اخلاق۔ ذہانت' قابلیت' صورت نہیں دیکھتی سیرت دیکھتی ہوں اردو کیسی بولتا ہے اور کس لہجے میں' توجہ ضرور دیکھتی ہوں۔"

✻ "کیا آپ نے اپنی زندگی میں وہ سب پالیا جو پانا چاہتی تھیں؟"

★ "پانا تو بہت کچھ چاہتی ہوں' انسان کی خواہشیں تو مرتے دم تک بھی ختم نہیں ہوں گی میں ایک صاف ستھرا چھوٹا سا پیارا سا گھر چاہتی ہوں۔ کیونکہ میں کچے گھر میں رہتی ہوں تو چاہتی ہوں کہ بچوں کے لیے کچھ ایسا کر دوں بچوں کو تعلیم یافتہ کرنا ان کے مستقبل کے لیے کچھ بہتر زندگی مہیا کرنا۔ مگر میں پھر بھی اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ ——— اس نے جو بھی دیا۔ اس کی مہربانی۔ چاہتی تو یہ سب ہوں مگر اب آگے اللہ کی مرضی۔"

✻ "آپ کا غرور؟"

★ "غرور نہیں کرنا چاہیے۔ فخر کہہ سکتے ہیں۔ میرا فخر میرے بچوں کی سعادت مندی ہے ماشاء اللہ میرے تینوں بچے بہت سعادت مند ہیں۔ صرف محمد حسن شرارت بہت کرتا ہے۔ باقی عبداللہ اور سجاد تو ایک آواز میں میری بات سن لیتے ہیں۔ محمد حسن میں شرارتی اور مزاحیہ باتیں کرنے کی عادت ہے۔ وہ ہم سب کو ہنساتا رہتا ہے۔"

✻ "کوئی ایسی شخصیت جو آپ کو آج بھی اداس کر دیتی ہے؟"

★ "ماں باپ کی یاد ان کے ساتھ گزارا وقت۔"

✻ "آپ کے نزدیک زندگی کی فلاسفی کیا ہے جو آپ علم تجربہ اور مہارت میں استعمال کرتی ہیں؟"

★ "زندگی کی فلاسفی یہ ہے کہ اس دنیا میں سب کو اپنا اپنا کردار ادا کر کے چلے جانا ہے تو کیوں نہ کچھ ایسا کیا جائے جو ہمیں لوگوں کے دلوں میں زندہ رکھے۔ درگزر سے کام لیں اور وہ خوشیاں جو ہمیں نصیب نہیں ہوتیں وہ آنے والی نسلوں کو ملیں۔ المختصر درگزر اور خوشیاں بانٹنا' سب سے اچھا فارمولا ہے زندگی کی فلاسفی کا۔"

✻ "کیا آپ مقابلے کو انجوائے کرتی ہیں یا خوفزدہ ہو جاتی ہیں؟"

★ "خیر میں اتنی ڈرپوک نہیں نہ نازک ہوں کہ خوفزدہ ہو جاؤں۔ اگر کوئی بحث مباحثہ ہے تو دل گھبراتا ہے کہ جلدی سے ختم ہو جائے ایسا نہ ہو کہ بات طول ہو جائے اور اگر کوئی گیم ہے' تو انجوائے کرتی ہوں' خاص طور پر کرکٹ' کچھ لوگ کرکٹ میں پہلے سے ہی رائے دے دیتے ہیں کہ اب تو یہ ٹیم ہار گئی۔ میرا ایسا ماننا ہے کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں آخری گیند تک کھیل دیکھتی ہوں۔

۞ ۞

فرحانہ ناز ملک

عقیدت اپنی اماں اور جمیلہ کے ساتھ اپنے آبائی شہر کو چھوڑ کر لاہور شفٹ ہو گئی ہے۔ اس بات سے عقیدت کے بہن بھائی تحریم اور شہریار سخت ناراض ہیں۔ عقیدت ایک کم ہمت، کم گو اور اپنی ذات میں بند رہنے والی لڑکی ہے اس کی اماں بے حد حسین ہیں۔ سنعان ماں باپ کی توجہ کو ترسا بکھرا ہوا نوجوان ہے۔ اس کے گھر میں دولت کی ریل پیل ہے۔ وہ اکلوتا ہے مگر محبتوں سے محروم ہے۔ اس کی ماں فائزہ شوہر کی بے رخی اور ظلم کی وجہ سے نفسیاتی مریضہ بن چکی ہیں۔ "غوری منزل" میں تین پورشنز ہیں۔ جہاں کریبی تین بیٹوں، بہوؤں اور پوتے، پوتیوں کے ہوتے بھی تنہا ہیں۔ نورین اور سلمان صاحب کی بیٹی حبہ سلمان ٹی وی پر اینکر ہے۔ اس کے چچا کا بیٹا حارث اسے پسند کرتا ہے۔ لیکن حبہ شادی کرنے کے حق میں نہیں۔ عالم صاحب ایک مشہور و معروف جاگیردار ہیں۔ زندگی کی تمام عیاشیوں کے مزے لوٹنے کے بعد وہ اب احتسابی دور سے گزر رہے ہیں۔ ان کا ایک مفلوج و اپاہج بیٹا جلال بھی ہے۔ جوان کی بہو سحر کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ عالم صاحب کو جلال کی فکر ہے۔

۴
چوتھی قسط

یہ ایک ڈھلتی ہوئی شام کا منظر تھا۔

جمیلہ کی مہربانی سے وہ اس پارک میں تنہا بیٹھی تھی جس کا خیال تھا یہاں کی گہما گہمی شاید اس کی طبیعت پر اچھا اثر ڈالے گی۔ اتنے دنوں سے چھائی اس کے دماغ کی کثافت شاید دور ہو جائے گی مگر کون جان سکتا تھا گزشتہ تین روز سے جو کچھ ہوا تھا یا جو جو کچھ اس نے سا تھا وہ شاید نقش ہو چکا تھا اور پارک کی گہما گہمی نے کیا ہی اثر ڈالنا تھا۔ دماغ پر تو ابھی بھی گزرے تین روز دھمک رہے تھے۔ جب وہ کس قدر بے باکی و جرات کا مظاہرہ کرتی اپنی بات پر قائم ہوئی تھی۔

"میں نے پڑھائی کی بس کر دی ہے میں آئندہ کالج نہیں جاؤں گی۔" اس کے انداز میں خاصی مان بھری ہٹ دھرمی تھی۔ اماں نے ذرا بھی اہمیت نہیں دی بلکہ ایک انوکھا سا قہقہہ بھی لگا ڈالا اور اس بے وجہ اور بے تکے قہقہے نے پہلی بار اسے ناگواری کی شدید احساس سے دوچار کیا تھا تنے کھوکھلے اور بے جان قہقہے لگاتی تھیں وہ۔

"جمیلہ۔ دیکھو ذرا اس کو۔" اور اپنے قہقہے کو مزید دمدار بنانے کے لیے انہوں نے مخاطب بھی کیا تو کس کو۔ جمیلہ کو۔ جیسے وہ ایم بی ایس کر چکی ہو۔

"کوئی بھلا ایک ہی دن میں کتنا جانچ پرکھ سکتا ہے ابھی تم نے اپنی کتابیں تو کیا کالج بھی پورا نہیں دیکھا اور پڑھائی ختم کرنے چلیں۔"

"میرا دم گھٹ جائے گا۔ مجھ سے نہیں پڑھا جائے گا۔ میرا دماغ بند ہو چکا ہے یہاں آکر۔" وہ اپنی عادت کے برخلاف وضاحتیں دینے پر مجبور ہوئی۔

"ایسی کیا مشکل بات ہے، دو چار دن کالج کے بیٹے دیکھو گی دماغ آپوں آپ کھل جائے گا۔" اماں کو ایسے ہی نہیں جمیلہ کی صلاحیتوں پہ بھروسہ تھا وہ ایک کے بعد ایک اپنی زنبیل میں سے دلیلیں برآمد کرتی جاتی اور عقیدت کو زبح کیے جاتی جیسا کہ ابھی کر رہی تھی۔

"بہت مشکل ہے، میں بہت مختلف ہوں۔ یہاں میرے جیسا کوئی نہیں۔" جانتی تھی جمیلہ جیسی علامہ کے آگے اس کی تمام تاویلیں بے کار جائیں گی، مگر وہ دونوں خواتین کو حیرت میں مبتلا کیے ڈٹی رہی۔ خلاف توقع ہر بات کے جواب میں بولتی رہی۔

"او میرا بچہ۔" اماں نے اسے بھینچ لیا تھا ان کی طرف سے ممتا کے ایسے مظاہرے بہت نایاب مرحلوں میں رونما ہوتے تھے وہ ماؤں کے اس قبیل سے تعلق رکھتی تھیں جن کے دلوں میں تو ممتا بھرے سوتے پھوٹتے تھے لیکن یوں گلے لپٹا کر پیار کے ثبوت وہ خال خال ہی دیتیں۔

"ہر نئی جگہ نئی پڑھائی یوں ہی تنگ کرتی ہے مگر آہستہ آہستہ ہم عادی ہو جاتے ہیں۔ ابھی سب کچھ تمہیں بہت مشکل لگ رہا ہو گا۔ پڑھنا، یہاں رہنا، کالج تک جانا سب۔ مگر یہ سب وقتی ہے تم جب اسے اپنی زندگی کا حصہ بنا لو گی تب تمہیں خود بھی حیرانی ہو گی اچھا ہے یہ مشکل مرحلے پہلے ہی طے ہو جائیں۔" گو اس نے چونکہ طے کر لیا تھا کسی بھی دلیل کو خاطر میں نہیں لانا چنانچہ بے تاثر بیٹھی رہی۔ اماں بھی اس کی اکتاہٹ محسوس کر کے خاموش ہو گئی تھیں۔ یہ اس ایک رات کی بات تھی۔

اگلی صبح اماں اور جمیلہ کے چہروں پر "رات گئی بات گئی" والے تاثرات تھے۔

"چلو بھی۔ باجی نے چنگ چی والے کو فون کر لیا ہے تم دو منٹ میں تیار ہو جاؤ۔" غصے کی شدید لہر اس کے سر تک گئی تھی اس معاملے میں جمیلہ کی حد درجہ عمل اندازی کھل گئی۔

"مگر میں نے نہیں جانا۔" گو اس سارے عرصے میں پہلی بار اماں کی فراخ پیشانی شکن آلود ہوئی۔

"تم نے اس کے کپڑے استری کر دیے تھے نا؟" نا اس کی طرف متوجہ ہوئے اماں نے جمیلہ سے کہا تھا۔ ان

کے سرد لہجے کی سختی عقیدت کی ریڑھ کی ہڈی میں بھی سنسنی دوڑا گئی تھی مگر یہ کالج اور پڑھائی کی نسبت قابل برداشت تھا۔

"اماں۔" اور اماں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال لیں۔ اس کا ارادہ بری طرح سے ڈانواڈول ہوا۔

"عقیدت تم۔"

"میں نے کالج نہیں جانا۔" اس نے اماں کی بات پوری ہونے سے پہلے جلدی جلدی کہہ دیا۔ سیاہ گھور موٹی موٹی آنکھوں میں سے نمی جھانکنے لگی تھیں۔ اماں نے دانت پہ دانت جما کر خود کو مزید کچھ کہنے سے باز رکھا۔ یوں بحث ہو گئی' یہ دن بڑا بوجھل تھا۔ گزرنے میں نہیں آ رہا تھا اماں کھنچی کھنچی اور چپ رہیں اور گھر میں کوئل بن کر کوکتی جمیلہ ان کی چپ پر چپ۔

اور وہ جو چپ زادی تھی اس گمبھیر خاموشی پر وحشت زدہ سی ہو گئی۔ دل میں کئی بار خیال آیا جا کر اماں سے معافی مانگ لے' گلے لگ جائے' کہہ دے جو آپ کی مرضی وہ میری مرضی' مگر ایسی بے تکلفی کب تھی ان ماں بیٹی کے بیچ اور پھر وہ کالج جانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ خود کو جانتی تھی اسے اس بھیڑ کا حصہ بننے میں عرصہ لگ جاتا اور جانتی تو اماں بھی اسے تھیں پھر نا معلوم کیوں مصر تھیں۔ اس سے اگلی صبح بہت خاموش اور بھید بھری تھی۔

اماں کھانے پینے کے معاملے میں عقیدت کی سستی ذرا بھی برداشت نہیں کرتی تھیں اور اس وقت عقیدت نے دکھاوے کے لیے بھی دو نوالے لینا ضروری نہیں سمجھا اور اماں نے جیسے دیکھا ہی نہیں۔ نہایت تمکنت سی چائے کے گھونٹ بھرتی رہیں۔ ان کی مزاج آشنا جمیلہ کا دل زور زور سے دھڑکتا رہا۔ باجی کی اس خاموشی میں جو بھی پنہاں تھا۔ اچھا نہیں تھا اور جمیلہ کے خوف کی تصدیق بھی ہو گئی۔

"جلدی کرو۔" کپ رکھتے ہی انہوں نے ایسے کہا جیسے معمول کا دن ہو۔ عقیدت چونک گئی۔ اس نے جیسے یقین کر لیا تھا اماں نے اب اسے تنگ نہیں کرنا انہوں نے اس کی ضد سے سمجھوتا کر لیا۔ مگر یہ محض خام خیالی تھی اس کی وہ ہراساں سی ہو گئی کہ اماں بہت عجیب سی لگ رہی تھیں بے گانہ اور بالکل بے تاثر پتھر کے جیسی۔

"اماں۔" عقیدت سے کہنا محال ہو گیا۔ "میں نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔" مگر پتا نہیں کس جذبے کے زیر اثر اس نے کہہ دیا اور اسے لگا اس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا۔ اماں کا رد عمل اس کی سوچ کے بالکل برعکس تھا۔ وہ اچانک پھٹ پڑی تھیں۔

"تم۔ تم آئی کیوں ہو ہماری زندگیوں میں؟" جمیلہ کے ہاتھ سے کپ گرتے گرتے بچا۔ اپنا غصہ نکالنے کے لیے انہوں نے ایک بالکل الگ نوعیت کی بات چیخ کر کہی تھی۔ عقیدت پل بھر کے لیے تو گم صم ہی ہو گئی۔

"تم بدبخت' تم نامراد۔ تم پیدا ہوتے ہی مر کیوں نہیں گئیں۔" اور جب وہ پہلے جملے کا مفہوم سمجھنے کے قابل ہوئی تابڑ توڑ اسی کے جیسے جملوں کی بوچھاڑ ہو گئی۔ اماں رو رہی تھیں چلاتی جا رہی تھیں۔

"کاش کہ پیدا ہوتے وقت میں اپنے ہاتھوں سے تیرا گلا گھونٹ ڈالتی۔ تجھے زندہ دفن کر دیتی۔ کاش۔" وہ آنکھیں پھاڑے اماں کو دیکھتی رہی۔ اماں کیا کہہ رہی تھیں۔ وہ کیوں کہہ رہی تھیں؟ اس نے صرف پڑھائی نہ کرنے کی بات ہی تو کہی تھی بس۔ اور۔ اسے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا' مگر اس کا وجود جیسے زلزلے کی زد میں تھا۔ وہ رو نہیں رہی تھی' مگر اس کے حلق سے برآمد ہوتی عجیب ہچکی نما آوازوں سے ظاہر تھا وہ رونے سے بھی کہیں آگے پہنچی ہوئی ہے۔

"باجی نہیں۔ مت بولیں۔ کچھ مت بولیں۔ حوصلہ کریں۔ خود پر قابو رکھیں۔" جمیلہ ان کے اور باجی کے بیچ پھنس کر رہ گئی' مگر ابھی اسے سنبھالنے سے کہیں ضروری تھا اماں کو چپ کرانا۔ جمیلہ نے وہی کیا۔ وہ انہیں کچن سے باہر لاؤنج میں لے گئی۔

"تم۔۔۔ تم گواہ ہو جمیلہ۔۔۔ اس کی خاطر میں نے کتنی تکلیفیں اٹھائیں۔۔۔ اپنی ہستی مٹا ڈالی۔ میں۔۔۔"

"پانی پی لیں۔۔۔" مگر انہوں نے جھٹکے کے ساتھ جمیلہ کا پانی کے گلاس والا ہاتھ پرے کیا تھا۔

"اس کا مستقبل بنانے کے لیے' اس کو سربلند کرنے کی خاطر میں نے سگی اولاد کی نفرت سہی۔۔۔ میرے بعد وہ نفرت اس کے مقدر میں نہ آئے۔ میں نے اس کی بہتری چاہی' اپنی کشتیاں جلا کر اسے یہاں تک لے آئی اور یہ مجھے یہ صلہ دے رہی ہے۔۔۔ مزید تماشا بنوانا چاہ رہی ہے میرا۔۔۔" نہ جانے کتنی دیر لگی تھی جمیلہ کو انہیں ٹھنڈا کرنے میں۔۔۔ وہاں سے مطمئن ہونے کے بعد وہ جب اس کے پاس آئی وہ بے جان ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کے ہونٹ تک سفید ہو رہے تھے۔ جمیلہ نے اس کے ہچکولے کھاتے وجود کو خود سے لگا لیا۔

"بی بی بہت بہادر ہے۔۔۔ سب سے بہادر ہے۔۔۔ ہے نا۔" اس کے لفظوں کی نرمی بے اثر گئی وہ یوں ہی ہچکیاں لیتی بے دم ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اور اب۔۔۔ یہ ایک ڈھلتی ہوئی شام تھی۔

اس کے ارد گرد کے تمام مناظر دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ دور کسی خاندان کو مفت خدمت فراہم کیے' پارک میں غدر مچاتے ان کے بچوں کو زدوکوب کرنے کی خاطر ان کے پیچھے بھاگتی جمیلہ تک دھند کی لپیٹ میں آئی ہوئی تھی کسی لایعنی منظر پر جمی اس کی سرخ ہوتی آنکھوں میں سے نمی جھانکنے لگی۔ وہ خود سے' جمیلہ سے اس پارک کے ہر منظر سے۔ حتیٰ کہ اس شخص سے بھی لاتعلق ہوئی بیٹھی تھی جو چپکے سے اس کی بینچ پر آبیٹھا تھا اور اب اسے ٹشو پیپر دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تم مجھے اس انسان کا پتا بتا دو جس نے کہا ہے تم روتے ہوئے بڑی حسین لگتی ہو اور تم اس کے کہے میں آکر اس شد و مد سے روتی ہو کہ بس روتی ہی چلی جاتی ہو۔" عقیدت کو اس دھواں ہوتی شام میں پلکیں جھپک جھپک کر بڑی محنت کرنی پڑی انہیں پہچاننے میں۔ وہ کھچپا سے والے بابا جی تھے۔۔۔ آنکھوں کے سامنے دھند کا پردہ چاک ہوا تو عقیدت نے دیکھا وہ نرم مسکراہٹ لیے اسے ہمیشہ کی طرح بغور دیکھ رہے تھے۔ وہ اٹھنے کو بے تاب ہوئی مگر وجود ہلنے سے انکاری تھا۔ اسے پھر سے رونا آنے لگا۔

"نہ۔۔۔ نہ۔۔۔" بابا جی نے خود ٹشو کی مدد سے اس کی آنسو پونچھے۔ عقیدت جوں کی توں بیٹھی رہی۔

"مانا کہ رونا صحت کی علامت ہے' مگر اتنا بھی نہیں کہ الٹا نقصان ہو۔۔۔ دیکھو ذرا اتنی پیاری پیاری سی آنکھیں اتنی خوف ناک ہو گئی ہیں۔ یعنی دو طرفہ نقصان۔ میرا بھی تمہارا بھی۔" عقیدت رونا بھول گئی۔ وہ بابا جی اس بے تکلفی سے بات کر رہے تھے گویا پرانے محلے کے ہوں۔ اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ یوں مقابل بٹھا کر کسی بھی مرد سے بات کرنے کا تجربہ کہاں تھا اسے۔۔۔ بھلے ہی بابا جی تھے عمر میں اس سے کئی منزلیں آگے لیکن پھر بھی۔۔۔

"میں جانتا ہوں تم مجھے اپنے رونے کی وجہ نہیں بتاؤ گی۔" انہوں نے بڑا ہی مسنا سا منہ بنا لیا تھا۔ گویا رونے کی وجہ نہ جاننے کا غم ہو۔ عقیدت ہونق سی انہیں دیکھ رہی تھی۔

"مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں بہت قابل بھروسہ دوست ثابت ہوں گا۔" اب کے وہ مسکرا رہے تھے۔ عقیدت دزدیدہ نظروں سے یہاں وہاں دیکھنے لگی۔ جمیلہ نہ جانے کس کونے میں جا چھپی تھی۔

"اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں تھوڑا تھوڑا تمہارے جیسا ہوں۔۔۔ تھوڑا روندو۔۔۔ تھوڑا ڈرو۔۔۔ تھوڑا گھبراؤ۔۔۔ لیکن میں روندو بالکل بھی نہیں ہوں۔" جمیلہ نظر آہی گئی۔ وہ ایک بچے کو بغل میں دبوچے دوسرے کو کالر سے کھینچے ہنکائے آرہی تھی۔ عقیدت کا بس نہیں چلا زوردار آواز کے ساتھ اسے یہاں بلانے اور بابا جی کے

زنے سے جان چھڑائے۔
"روتے وہ لوگ ہیں جو حالات کے آگے ہتھیار ڈال دیں اور رونے سے اگر مسائل کم ہوتے تو میں تین ٹائم رونا۔۔۔ بلا ناغہ۔" جمیلہ آئی۔ دور سے بابا جی کو دیکھ کر باچھیں پھیلائیں۔
"بابا جی۔۔۔" قریب آکر وہ چہکی تھی۔ "بلکہ نہیں۔۔۔ مشکل نام والے بابا جی۔" بابا جی کھل کر ہنسے۔
"تم نے مجھے بہت مزے کا گاجر کا حلوہ دیا تھا اس لیے تمہیں اجازت ہے تم جو مرضی کہو۔" جمیلہ اس عنایت پہ کھل کھل گئی۔
"بلی یہ ہمارے بہت اچھے ہمسائے ہیں۔"
"یہ بلی واحد بلی ہے جو بولتی نہیں۔۔۔"
"نہیں جی۔" جمیلہ نے شدت سے بابا جی کا بیان رد کیا۔
"ہماری بلی بہت بولتی ہے۔ قسمے یہ جب بولتی ہے نا تو بس۔۔۔"
"تو بس پھر سب بلیوں کو پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔" بابا جی نے فقرہ پورا کیا اور جمیلہ کی ہنسی بے مہار ہو گئی۔ رکنے میں نہ آئی۔
"اب ہم چلتے ہیں بابا جی۔ رات ہو جائے گی نہیں تو۔" وہ فوراً کھڑی ہوئی تھی۔ بقول جمیلہ کے آس پاس تو گھر تھے۔ چنانچہ بابا جی بھی ساتھ ہو لیے۔ راستے میں ہی عقیدت کو پتا چلا ان کا نام سبکتگین تھا۔ وہ جمیلہ کی بات دل میں دوہرا کر رہ گئی۔
"مشکل نام والے بابا جی۔"

٭ ٭ ٭

اور کبھی کبھی ہر جگہ شام ایک سی ہی اترتی ہے۔ "غوری منزل" والوں کے لیے بھی آج کی شام تناؤ بھری تھی۔
نورین کے لیونگ روم میں اس وقت گھر کی سب ہی خواتین حبہ اور کشف کو چھوڑ کے جمع تھیں اور چونکہ ایسا یکجا غوری منزل میں کم ہی دیکھنے کو ملتا تھا۔ چنانچہ لوہ لینے کے خیال سے معوذ نے بھی یہیں دھرنا مار لیا۔ اسے پہلا دھچکا ہی تب لگا جب نورین کو صفورا سے کہتے سنا۔
"گریجی کو لے آؤ۔" معوذ کے کان کھڑے ہو گئے۔ یوں اہتمام کے ساتھ گریجی کو کہاں بلایا جاتا تھا۔ وہ بھی تب جب محفل اکٹھی ہو۔
ادھر صفورا کی زبانی بڑی بہو کے بلاوے پر گریجی میں جیسے پھرپری پھر گئی۔
"ضرور میری بات رکھ لی ہے۔" انہیں خوش گمانیاں بھی جلدی گھیر لیتی تھیں۔ ابھی بھی کسی دوسری، تیسری سوچ کی طرف دھیان لگائے بغیر، صفورا کے سہارے بڑی پرجوش سی لیونگ روم میں آئیں۔ جہاں موجود تینوں بہوؤں کے چتون جتلا گئے کہ یہاں ان کی بات لوٹانے کے سامان جمع ہیں، رکھنے کے نہیں۔ وہ یک دم پھیکی پڑی تھیں آکر پچھتانے کا فائدہ نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ آگے بڑھیں اور مخصوص نشست پر سمٹ کر بیٹھ گئیں۔ سب کی طرف دانستہ دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے بھی وہ جان سکتی تھیں کہ وہ مرکز نگاہ بنی ہوئی ہیں گو کہ بہوویں مہر بہ لب تھیں پوتیاں اپنی اپنی مصروفیات سنبھالے۔ شانزے پیروں پر جمی ناخنوں کو دیکھنے پرکھنے میں لگی تھی ملیکہ نے ابریک نگار رکھے تھے۔ علاوہ معوذ کی طرف سے پھینکے ہر کشن سے بچتی ہلکان ہوئی بیٹھی تھی مگر پھر بھی انہیں یقین تھا وہ مرکز محفل ہیں۔
"گریجی۔۔۔ آپ کی طبیعت اب ٹھیک ہے؟" وہ تین دن سے کچھ ست اور نڈھال تھیں، معوذ شاید اس بابت

پوچھ رہا تھا۔ بالکل ایک نامحسوس سی سنسنی گریبی کے سر سے پیر تک
''ان کو کیا ہوتا ہے؟'' بالآخر نورین چارج ہوئیں۔ ''اور ملیکہ نے ایر بیگ نکال لیے۔ شانزے نے
دوڑی تھی۔ ''ان کی بلا سے اب تو جو ہوتا ہے ہمیں ہی ہوتا ہے۔
پیروں کی جان چھوڑ دی۔ علیزہ بھی اچھی بچیوں کی طرح وہ سب سننے کی طرف متوجہ ہوگئی جسے سننا سب سے
ضروری تھا۔

''آپ نے جرات کیسے کی یہ سب کرنے کی؟ آپ سوچ بھی کیسے سکتی ہیں ایسا ہو سکتا ہے؟ مکار، چالاک
عورتوں کی طرح بیٹوں کو ورغلانا چاہ رہی تھیں آپ؟'' اور گریبی کو جائے پناہ ملنی مشکل ہوگئی۔
''میں پوچھتی ہوں آپ ہماری اولاد کی مختار کب سے ہوگئیں؟'' گریبی نے بے ساختہ علیزہ کی طرف دیکھا
تھا۔ کب سے گریبی کی طرف دیکھتے معیز نے بھی ان کی نظروں کے تعاقب میں نظریں دوڑائیں اور سمجھ گیا گریبی
کسی اور کا کیا بھگت رہی تھیں مگر اب صفائی وضاحتوں کا وقت گزر چکا تھا وہ جب بوکھلا بوکھلا کر کہنے لگیں۔
''میں خود نہیں... مجھے تو...'' تب علیزہ کسی ناگن کی مانند پھنکاریں۔
''آپ ہوتی کون ہیں ہماری اولاد کے فیصلے کرنے والی؟'' اس کے بعد گریبی نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے وہ
واقعی کون ہوتی تھیں اتنی بڑی باتیں سوچنے والی۔
''کمال ہے۔'' نورین نے تمسخر اڑایا۔ ''ان کی سوچ تو دیکھو... حارث کے لیے حبہ... اور عاشر کے لیے
علیزہ۔'' اس پر علیزہ کا پورا کا پورا منہ کھل گیا جو بات وہ نیند میں نہیں سوچ سکتی تھی وہ گریبی نے بقائمی ہوش
وحواس کیسے سوچ لی۔ چلو سوچ بھی لی کہنے کی جرات کیوں کی؟ عاشر بقول نورین کے اس گھر کا ہیرا تھا... آنکھوں کو
خیرہ کرتا... دل میں اترتا... اس کے لیے انہوں نے کیسی کیسیوں کے خواب دیکھ رکھے ہوں گے۔ کجا کہ علیزہ
کے۔

یہاں معیز کو بھی نورین حق بجانب نظر آئیں۔ گریبی نے سراسر ''آ بیل مجھے مار'' والا کام کیا تھا۔ ملیکہ مذاق
اڑاتی نظروں سے گریبی اور پھر علیزہ کو دیکھ رہی تھی۔
''آپ سے...'' نورین اٹھ کر ان کے سر پر آکھڑی ہوئیں اور اب چبا چبا کر کہہ رہی تھیں۔ ''اپنی اولاد تو
سنبھالی نہیں گئی۔ چلی ہیں دوسروں کی اولاد کے فیصلے کرنے۔'' کہہ کر وہ چلی گئیں۔ گریبی پر صدمے بھرا سکتہ
طاری کر کے۔
''معاف کیجیے گا امی جان، لیکن آپ نے غلط کیا... آج کے دور میں اولاد ماں باپ کی نہیں سنتی آپ کی کیسے سنے
گی۔'' جانے سے پہلے زینب نے بھی کہنا مناسب سمجھا اب علیزہ کے بھی یہاں بیٹھنے کے جواز ختم تھے وہ جب
کچھ کہنے کے لیے گریبی کی طرف متوجہ ہوئیں۔ گریبی نے اسی پل ان پر نظریں ڈالیں۔ انتہائی شاکی اور تاسف
بھری۔ علیزہ الوداعی نادہی کلمات پر دو حرف بھیجتی نسبے سے نظریں چراتی فوراً وہاں سے غائب ہوگئیں۔ گریبی
کے چہرے پر ملال دوڑنے لگا۔ کل کی شام گزرے دیر گنتی ہوئی تھی۔
جب حبہ مسز انور کے امریکا نشین بیٹے کا رشتہ ماں کے سامنے مسترد کر رہی تھی۔ عین اسی لمحے حارث علیزہ
سے ضد منوانے پر تلا تھا۔
''آپ جب جانتی ہیں میں حبہ کو پسند کرتا ہوں پھر کیوں نہیں کچھ کر رہیں؟''
''تم بھی جانتے ہو نورین بھابھی کا دماغ ساتویں آسمان پر رہتا ہے۔ اپنی اولاد کو بھی وہ ساتویں آسمان سے کم پر
نہیں رکھتیں... میں کیسے ان سے بات کروں؟''
کیا مطلب؟'' حارث شدید جھنجلاہٹ کا شکار ہوا۔ ''ان کی اولاد ساتویں آسمان پر تو آپ کی اولاد میں کوئی کمی

ہے کیا؟"

"اللہ نہ کرے کی کیوں ہونے لگی؟" وہ ہول کر رہ گئیں۔

"تو بس آج کے آج بات کریں۔" حارث کو ایسے ہی کہیں ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی فکر ہو رہی تھی جب کے لیے ایک عدد شاندار رشتہ اس کی راتوں کا چین ختم کر چکا تھا۔ اور علیزہ سوچ رہی تھیں وہ کیسے بات بڑھائیں۔!

اس میں کوئی شک نہیں تھا نورین کے بچے غوری منزل کے آسمان کے دمکتے ستارے تھے۔

نورین اور سلمان کی تینوں بیٹیوں کے اپنے قبیلے تھے جب کی منزل سب کے سامنے تھی۔ کشف نے بھی ماں کو مایوس نہیں کرنا تھا۔ ملیکہ کے تو ابھی سے بتا رہے تھے کہ مستقبل قریب میں اس نے بھی چاند چڑھانے ہیں اور عاشر کے لیے نورین نے وزیراعظم نہ سہی اس سے کم کی بیٹی کو بھی بہو بنانے پر راضی نہیں ہونا تھا۔ اس کے بعد زینب اور ارمغان کے بچے تھے۔ شانزے بہت ہوشیار بہت کائیاں لڑکی تھی ہاتھوں پیروں سے باتیں کرنے والی۔ اس کی طرف سے بھی ماں باپ بے فکر تھے۔ معیذ اس سے دو گنا چالاک۔ اب رہ گئے علیزہ کے بچے۔

حارث بھلے ہی کاروبار میں قدم جما چکا تھا' لیکن خود سے بڑی جب کو پسند کر کے اس نے علیزہ کے کئی خواب مسمار کر دیے۔ وہ عاشر جیسا باکمال نہ سہی' لیکن ایسا گیا گزرا بھی نہیں تھا کہ گھر کی مرضی پر راضی ہو جاتا اور علیزہ کے متعلق تو علیزہ جب جب سوچتیں اذیت میں مبتلا ہو جاتیں۔ ایک نمبر کی کوڑھ مغز تھی۔ غوری منزل کی باقی لڑکیوں کی نسبت حسن کے معاملے میں بھی ہاتھ کافی تنگ تھا اس کا اور عقل تو جیسے دور سے سلام کرتی تھی اسے۔

اور اب جب رشتوں تک بات آہی گئی تھی تو علیزہ کو نئی راہ سوجھی۔

"نورین بھابھی کی شروع سے ہی نزدیک کی نظر کمزور ہے۔ انہیں حارث کے ہوتے کیا پڑی ہے جب کے لیے ایرے غیروں کو لفٹ کرانے کی۔" انہوں نے برہان کے آتے ہی بات چھیڑ دی۔ وہ بھی سوچنے پر مجبور ہوئے۔

"تم چاہتی ہو میں بات کروں ان سے۔"

"نہیں۔" انہوں نے شدت سے انکار کیا۔ "میں چاہتی ہوں آپ گرینی کو بیچ میں لائیں۔ ان کے تھرو سلمان بھائی تک بات پہنچائیں۔" برہان ٹھیک ٹھاک متاثر نظر آئے۔

"اور... گرینی سے کہیے گا۔ سلمان بھائی کو عاشر کے لیے علیزہ کا نام تجویز کریں۔ آخر گھر کی بچی ہیں۔ وہ یہ سب نہیں دیکھیں گی تو کون دیکھے گا۔" برہان صاحب اسی رات گرینی کے حضور جا پہنچے۔ گرینی بیٹے کی خاص طور پر اس آمد پر ویسے ہی خوش۔ مدعا گوش گزار کرتے ہی جیسے آپے سے باہر ہو گئیں۔ باقی بیٹوں کو بھی بلوا لیا گیا یوں ان کے بند کمرے میں جو اجلاس ہوا اس کا اعلامیہ' سلمان اور ارمغان نے نہ جانے کیسے اپنی اپنی بیگمات تک پہنچایا کہ نتیجہ ایسا کرب آمیز نکلا۔

گرینی سے بے دردی کے ساتھ لمحاتی خوشی چھین لی گئی۔ وہ بھی محفل جما کر۔

"صفورا۔ مجھے کمرے میں لے چلو۔" "عموماً" اس قسم کا کوئی حکم معیذ دیا کرتا کہ گرینی کو کچھ کچھ ہی سہی وہ سمجھتا ضرور تھا' لیکن اس وقت وہ ماحول کی گمبھیرتا کے زیر اثر آیا ہوا تھا۔ گرینی کو خود کہنا پڑا۔ صفورا انہیں سہارا دے کر لے چلی۔ آتے وقت گرینی کے قدموں کی دھمک ہی اور تھی اور اب جب وہ جا رہی تھیں تو جیسے ہستی گنوا کر جا رہی تھیں۔

"مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آرہا۔ عاشر بھائی اور..." اس کے بعد ملیکہ نے دل جلاتی ہنسی کا فوارہ چھوڑا اور رخصت ہو گئی۔ لیونگ روم میں اب معیذ' علیزہ اور شانزے تھے۔

"تائی نے یہ کیوں کہا آپ سے اپنی اولاد تو سنبھالی نہیں گئی۔؟" معیذ اتنی دیر سے شاید کسی سوچ میں تھا۔

"کون سی اولاد؟" کسی نے سوالیہ نظروں سے شانزے اور علیزہ کو دیکھا۔
"مطلب ہم سب کے ڈیڈی؟" پھر خود ہی جواب بھی دے دیا۔ "ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ گریجی بے چاری کہاں سنبھال پائیں تینوں بیٹوں تک۔ تینوں ہی بیویوں کو پیارے ہو گئے۔" شانزے اور علیزہ نے اس ادریس خیال پر ذرا بھی توجہ نہیں دی۔
"ضرورت نہیں آپ کو دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں۔ عاشر بھائی نہ سہی۔ میں ہوں نا۔ بس پانچ سال دے دیں۔ عاشر بھائی بھی بھول جائیں گی آپ۔ ایسا نکھار آ جائے گا مجھ میں۔"
"تمہارے ساتھ یہ سوٹ کرتی ہے۔" علیزہ نے اس طرف اشارہ کیا جدھر ملیکہ گئی تھی۔
"اچھا تو آپ بھی مذاق اڑاتی ہیں؟" معیز ہنسا تھا۔ علیزہ منہ پھلائے بیٹھی رہی۔
"بری تو بالکل بھی نہیں ہے۔" تبھی روک کر معیز نے ملیکہ کے بارے میں انکشاف کرنے چاہے۔
"مگر پرابلم یہ ہے کہ اس کی اپر بلڈنگ میں 'دو' دو دماغ ہیں۔ جس کی وجہ سے میرا گزارا ممکن نہیں۔" علیزہ نے قطعی ناسمجھی کے انداز میں اسے آنکھیں سکوڑ کر دیکھا تھا جبکہ شانزے مسکرا رہی تھی۔
"مجھے ایسی چاہیے جس کی اپر بلڈنگ خالی ہو۔" وہ مسکین بنا بولا۔ علیزہ اب بھی نہ سمجھی۔
"جس کے دو تو کیا ایک بھی دماغ نہ ہو۔"
"تو میں کیا کروں؟" علیزہ نے چشمہ ناک پر ٹکا کر منہ بنایا تھا۔
"ہاں کریں نا" وہ جل بھن کر بولا۔ شانزے کی ہنسی چھوٹ گئی۔
"ملیکہ کے پاس جاؤ" علیزہ اگر علیزہ کو لے کر پریشان تھیں تو صحیح ہی پریشان تھیں شانزے کو ان سے ہمدردی محسوس ہوئی۔
"کہا تو ہے ان کے دو دو دماغ ہیں۔"
"جب تائی بھی اس گھر میں رہتی ہیں؟" علیزہ نے اپنے تئیں نئی سمت دکھانی چاہی۔
"ان کے تین تین ہیں۔" معیز کراہا۔
"آپ کیا سمجھتی ہیں۔ آپ کے چار ہیں؟"
"کیا؟" علیزہ ٹھیک ٹھاک بوکھلا گئی۔
"دماغ۔" معیز چیخا۔
"نہیں۔" شاید دماغ کی دہی بنانا اس کو کہتے تھے جو اس وقت علیزہ کی بن رہی تھی۔
"تو ہاں کریں نا۔"
"مین سینس۔" شانزے کی قل قل کرتی ہنسی اور معیز کی دبی دبی مسکراہٹ علیزہ کے دماغ کا ڈھکن اب جا کے کھلا۔
"تم کہنا چاہ رہے ہو میری اپر بلڈنگ خالی ہے؟" وہ نتھنے پھلاتی صدمے سے چیخی۔
"دیکھ لیں آپ خود کہہ رہی ہیں۔ بعد میں الزام مجھ پر لگاتی ہیں۔" معیز نے دونوں ہاتھ اٹھا کر خود کو بری الذمہ کرنا چاہا۔ مگر اب علیزہ کا دماغ بیدار تھا۔ وہ چپل جھاڑتی معیز کے پیچھے پڑ گئی۔ معیز کو اپنے پورشن کی طرف بھاگ کر جان بچانی پڑی۔
"ایڈیٹ کہیں کا۔ اس کو بڑے چھوٹے کی بھی تمیز نہیں۔" علیزہ شانزے کے سامنے دیر تک کلستی رہی۔

✡ ✡ ✡

یوں آگے بڑھ رہا تھا جیسے پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہا ہو۔

زکریا آفندی کی موجودگی گھر کی فضا کو ایسے ہی کرفیو زدہ بنا دیا کرتی تھی۔ وہ زیادہ وقت گھر سے باہر رہنے کو ترجیح دیتے اور فائزہ کمرے سے نکلنا چھوڑ دیتیں۔ مگر کبھی کبھی زکریا کی ضد اور جنون بھری حاکمیت کے آگے وہ بے بس بھی ہو جاتیں۔

جیسا کہ اس وقت۔

سنعان کے سامنے قد آدم شیشے کی کھڑکی کے پار کا منظر تھا۔

جہازی سائز میز پر ڈنر کے لوازمات سجے تھے۔ انتہائی رغبت و لگن سے کھاتے زکریا آفندی کے عین سامنے والی کرسی پر فائزہ بیٹھی تھیں۔ ان کے حواس حسب توقع مخدوش نظر آ رہے تھے۔ وہ گرد و پیش کی دنیا سے بے زار و بے نیاز ہوئی بیٹھی تھیں۔ وہ زکریا آفندی۔ جن کی پرچھائیں بھی ان کے لیے دہشت کا باعث بن جایا کرتی۔ اس پل ان کی بنفس نفیس موجودگی کا بھی گویا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا ان پر۔ نہ خوف و دہشت بھرا۔ اور نہ نفرت و محبت کے لائق 'وہ ایسی فیز میں آئی ہوئی تھیں۔ جب احساسات مرجاتے ہیں۔ اور زکریا آفندی کو یہ کب گوارا تھا۔

ہمہ کل وقتی توجہ چاہنے والے زکریا کے لیے فائزہ کے یہ بدلے احساسات و جذبات ناقابل برداشت تھے۔ اور سنعان جانتا تھا ابھی بھی ان کی گرفت میں آ رہے تھے۔

"تم کھانا سونگھنے آئی ہو؟" اور سنعان صحیح کہتا تھا۔ ان دو انسانوں سے دور رہنے کے باوجود بھی وہ انہیں ان سے زیادہ جانتا تھا۔ اس کی عین توقع کے مطابق۔ بظاہر کھانا کھاتے زکریا کے دھیان کی سب کڑیاں مقابل بیٹھی فائزہ سے مل رہی تھیں۔ جو ان کی خواہش و فرمائش کے آگے مجبور و بے بس ہوئی آ تو بیٹھی تھیں مگر ہاتھ پر ہاتھ دھرے۔ انہوں نے سامنے دھرے لوازمات کو سونگھنا تو درکنار نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ ایک ستی ساوتری 'پتی ورتا بیوی کا کردار نبھاتی آ بیٹھی تھیں محض۔ اور کون جانتا تھا کس دل سے آ بیٹھی تھیں۔ کسی میکانکی انداز سے عمل کرتی ہوئیں کہ ہاں شوہر گھر پہ ہے تو انہیں آس پاس موجود ہونا چاہیے۔ وہ کھانے کی میز پر ہے تو ان کی حاضری لازم ہے۔ چاہے دل کرے یا نہ کرے۔ چاہے حواس اختیار میں ہوں یا نہ ہوں۔ انہیں کسی روبوٹ کی طرح یہ عمل دہراتے رہنا تھا۔

"نہیں۔ وہ۔ سنعان۔" یہ شاید سنعان کو گزشتہ کچھ دنوں سے مستقل سوچنے کا نتیجہ تھا۔ کہ اس وقت قطعی طور پر غیر ارادتاً "فائزہ کی زبان سے بیٹے کا نام بر آمد ہوا۔ حالانکہ نہ تو وہ چاہ رہی تھیں اور نہ حواس پر وہ چھایا ہوا تھا۔ ایک بالکل ناشناسا والی کیفیت میں۔ جب وہ خود سے بھی بے گانہ ہو جایا کرتی تھیں انہوں نے اگر سنعان کا نام لے لیا تھا تو ضرور وہ اسے حواسوں پر سوار کر چکی تھیں۔

"سنعان۔" زکریا کھانے کی طرف سے ہاتھ کھینچ چکے تھے۔ زیر لب دہراتے ہوئے انہوں نے ایک جھٹکے سے ہاتھ مار کر سامنے موجود کراکری کو میز سے دور تک اڑایا تھا۔ ان کی آنکھوں سے غصہ اور ناراضی ہی نہیں عجیب قسم کی رعونت جھلکنے لگی تھی۔

"تمہارا اور تمہارے بیٹے کا مسئلہ کیا ہے؟" وہ غرائے تھے۔ فائزہ بے چارگی کی تصویر بنی انہیں دیکھ رہی تھیں۔

"میری زندگی عذاب بنا کر رکھ دی تم دونوں نے۔ تم نے گھر کو پاگل خانہ بنا رکھا ہے۔ وہ نفسیاتی مریض بنا گلیوں' بازاروں میں چکراتا ہے۔" وہ گرج رہے تھے۔ فائزہ پر کپکپی طاری ہونے لگی۔ لیکن ابھی بھی ان کی توجہ کا مرکز زکریا نہیں تھے۔ وہ ہنوز میز کی سطح پر نظریں ٹکائے ہوئے تھیں۔

"میرا کھاتا ہے' میرے ٹکڑوں پر پلتا ہے' اور مجھے ہی ہمیشہ دکھاتا ہے' بے غیرت۔" سنعان کی غیر موجودگی اس پر فائزہ کا لاتعلق انداز ہمیشہ کی طرح زکریا کا اشتعال بڑھتے دیر نہیں لگی۔

"آج اگر میں ہاتھ کھینچ لوں تو کشکول لیے پھرے گا۔ سب تمہاری غیر ذمہ دار تربیت کا نتیجہ ہے۔ سب تمہارا

کیا مرا ہے۔ لوگ چھ چھ بچے پال لیتے ہیں' تم سے ایک نہیں سنبھلا گیا۔" وہ گرج رہے تھے' برس رہے تھے۔ اور فائزہ جوں کی توں ہوش و خرد سے بے نیاز۔ جیسے زکریا کے غصے کا سبب وہ نہیں کوئی اور ہو یا جیسے زکریا ہوں ہی نہ۔

"تم سن رہی ہو؟" ان کی برداشت کی طنابیں جلد ٹوٹ جایا کرتی تھیں۔ فائزہ کا یہ انداز انہیں اپنی اہانت کرتا محسوس ہوا تو وہ حلق کے بل چیخے۔ فائزہ کی ہچکی میں اضافہ ہو گیا۔

"تم نہیں سن رہی ہو۔" فائزہ کو لحظہ بھر شعلے برساتی نظروں سے گھورنے کے بعد انہوں نے دانت پیسے اور گلاس میں پانی انڈیل کر وہیں بیٹھے بیٹھے وہی پانی فائزہ پر اچھال دیا۔ ان کا سارا چہرہ تر ہوا تھا۔ ایک بے ساختہ سی جھرجھری انہوں نے لی تھی۔ چہرے پر ہوئی پانی کی بوچھاڑ میں ان کے آنسوؤں کی برسات بھی شامل ہو گئی تھی۔

"ڈرامے باز عورت۔ سکون تباہ کر دیا۔" وہ نپکن سے ہاتھ پونچھ کر یہ جاتے کھڑے ہوئے۔

"ایسے ہی مر جاؤ گی۔" فائزہ کے قریب سے گزرتے ہوئے انہوں نے کرسی پر ٹانگ ماری تھی۔ فائزہ گرتے گرتے بچیں۔ زکریا وہی زکریا تھے قارن نور سے وہ نئے نہیں آئے تھے۔ لیکن فائزہ نئی ہوتا جا رہی تھیں۔ وہ اس وقت شدت سے سنعان کی موجودگی کی خواہاں ہوئیں۔

☼ ☼ ☼

اور وہ قد آدم شیشے کی کھڑکی سے لگا یہ سب دیکھ رہا تھا۔

فائزہ رو رہی تھیں۔ بکھر رہی تھیں۔ وہ اذیت میں لگ رہی تھیں۔ یقیناً" ان پر سے بے حسی کا خول اتر چکا تھا۔ وہ ٹوٹ رہی تھیں۔ اور اس منظر کی کرچیاں سنعان کی آنکھوں میں چبھتی اسے پیچھے کہیں بچپن کی دہلیز کی طرف کھینچ رہی تھیں۔ جب وہ اس گھر اور ان دو انسانوں کے لیے بالکل غیر ضروری تھا۔ ایک ان چاہا وجود۔ جس کی پروا ڈیڈی تو کرتے ہی نہیں تھے۔ مما بھی نہیں کرتی تھیں کہ ان کے نزدیک وہ خود قابل رحم ہوتی تھیں۔ جس حساب سے وہ شوہر کے مظالم برداشت کرتی تھیں۔ شوہر کی بے اعتنائیاں اور نفرت سہتی تھیں۔ اس کے بعد ان سے زیادہ اس گھر میں اور کسی مظلوم کی اہمیت و حیثیت نہیں بچتی تھی۔ اس کی بھی نہیں۔!!!

ڈیڈی کیا چاہتے تھے یہ وہ نہیں جانتا تھا۔ مگر مما کیا چاہتی تھیں اس کی اسے سمجھ تھی۔ ڈیڈی کی نفرت و حقارت کا شکار مما یقیناً" ان سے محبت کی طلب گار رہتی تھیں۔ اور عزت کی بھی۔!!! اس کے برعکس ڈیڈی سے نفرت' حقارت اور تشدد برداشت کرنے والی مما اگر اسے نظر انداز کیے محض اپنی بے عزتی' اپنی ذلت کا غم سناتی تھیں۔ خود کو مظلوم تصور کرتی تھیں تو کیا غلط کرتی تھیں؟ وہ اسے یکسر بھلائے اگر خود ترسی میں مبتلا رہتی تھیں تو حق بجانب تھیں۔

لیکن ڈیڈی۔ وہ کیوں ایسے تھے؟ وہ کیوں اسے نظر انداز کرتے تھے؟ وہ کیوں اسے لائق توجہ نہیں سمجھتے تھے؟۔ یہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ تب سوچتا تھا اور جواب سے محروم رہتا تھا اور اب وہ کھتا تھا تو سمجھ سکتا تھا کہ دنیا میں ہزار ہا مزاج رکھنے والے انسانوں میں ڈیڈی بھی ایک الگ مزاج کے انسان تھے۔ انتہائی پیچیدہ اور مشکل مزاج انسان۔ جو مما سے پرخاش رکھتے تھے تو نہ جانے کس وجہ سے۔ اور اسے اولاد سمجھ کر بھی نہیں سمجھتے تھے۔

بچپن کے وہ گہرے ان مٹ نقش ابھی بھی تر و تازہ تھے۔

ڈیڈی کی پھٹکار۔ اور مما کی ہار۔ ہر دو صورتوں میں وہ مجبوں ہو تا۔ ایسے میں وہ شدت سے دعا گو ہوتا۔

"اللہ پاک آپ کے ممی ڈیڈی کو میرے ممی ڈیڈی بنا دیں۔ یا ہارون کے ماڈیڈ میرے ماڈیڈ بن جائیں۔ پلیز اللہ پاک۔ پلیز۔" کبھی دل میں' کبھی چھپ کر رات کو تکیے میں منہ گھسیڑے گورہاتھ اٹھا کر اس دعا کو دہرا اس نے

www.paksociety.com

اس شدت سے کیا تھا کہ اسے بعض اوقات لگتا اس کی دعا پوری بھی ہو جائے گی۔ وہ نیند سے جاگے گا تو وہاں اس کے نہیں ہارون کے مام ڈیڈ ہوں گے۔ بے حد شفیق، محبت خیال رکھنے والے۔ اسکول کی ہر پیرنٹس ٹیچرز میٹنگ میں ہمیشہ حاضر رہنے والے، اس کی ہر کامیابی پر اس کے ہم قدم کھڑے، اسے ایوارڈز، شیلڈز اور سرٹیفکیٹس لیتے دیکھ کر خوشی سے بے قابو ہوتے۔

مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دعا کی شدت اور تکرار میں کمی آتی گئی۔ اس نے جان لیا اس کے ممی ڈیڈی اس کے ممی ڈیڈی رہیں گے۔ اور ہارون کے ممی ڈیڈی صرف ہارون کے۔

اس نے سدا اس محروم ماحول میں رہنا ہے۔ جہاں بستے تین بہت قریبی نفوس جذباتی دوریوں کے ایسے مقام پر آجائیں گے کہ جہاں فاصلے پاٹنا مشکل تر ہو تا جائے گا۔

بالکل ابھی کی طرح

مما ٹوٹ کر بکھر رہی تھیں۔ اور وہ کھڑکی سے لگا یک ٹک انہیں دیکھتا اسی کیفیت کا شکار ہو رہا تھا۔ جو کسی زمانے میں مما پر طاری ہو کر انہیں اس سے دور کرنے کا سبب بنی تھی۔

"میں اور صرف میری ذات" والا قانون۔ مما رو رہی ہیں۔ اذیت میں ہیں، انہیں اس کی ضرورت ہے۔ اسے ان کے پاس جانا ہے۔ انہیں اپنے ہونے کا یقین دلانا ہے کہ بچ جائے۔

وہ بالکل انہی کی طرح خود ترسی کا شکار ہوا انہیں تادیر دیکھتا رہا جب تک وہ دھندلا نہ گئیں۔ اسے لگ رہا تھا اس وقت وہ قابل رحم ہے، مما نہیں، وہ مظلوم ہے مما نہیں۔ وہ توجہ کا مستحق ہے سب سے زیادہ اور سب سے پہلے مما نہیں، کرچیاں آنکھیں زخمی کر رہی تھیں شاید۔ وہ تیز تیز چلتا وہاں سے ہٹ گیا۔ فائزہ یوں ہی بکھر بکھر کر روتی رہیں۔

☼ ☼ ☼

سحر کے قیمتی جہیز کے سامان سے آراستہ اس لمبے چوڑے کمرے میں گمبھیر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بیڈ پر مختلف کاغذات بکھیرے، محو مطالعہ طلال جب کبھی ایک کے بعد دوسرا کاغذ الٹتے پلٹتے تو ہلکا سا ارتعاش خاموشی کی چادر میں چھید کرتا پورے کمرے میں پھیل جاتا۔ آئینے کے سامنے بیٹھی ہاتھوں پر رگڑ رگڑ کر کریم ملتی سحر کیوں معنی خیز خاموشی اوڑھے ہوئے ہے۔ طلال مصروف نہ ہوتے تو جاننے کی کوشش ضرور کرتے۔ مگر لگتا تھا ابھی کاغذات کی جانچ پڑتال زیادہ ضروری تھی۔ سحر کے چہرے پر سوچ کے عکس تھے۔

"طلال۔" یوں ہی سوچوں میں گم اس نے پکارا۔ طلال ہنوز مصروف رہے۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہم یہاں سے کہیں اور چلے جائیں؟" اس کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔

"کیوں؟" طلال نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر کاغذات میں گم ہو گئے۔

"میں یہاں تک بھر چکی ہوں۔" سخت اکتائے ہوئے انداز سے سحر نے اپنے ناک پر ہاتھ مار کر اشارہ کیا تھا۔

"اس کا کیا مطلب ہوا؟" طلال واقعی نہ سمجھے۔ سحر ان کے قریب آ بیٹھی۔

"مطلب میں اب تھک گئی۔ گھر میں ہر وقت جلال جلال ہوتی ہے۔ جلال کو یہ کرو، جلال کو وہ کھلاؤ، جلال کو وہاں سلاؤ جلال کو یہاں بٹھاؤ۔"

"ایسا کرنے سے جلال تھکے ہم کیوں تھک رہی ہو؟" طلال کا انداز مزاحیہ تھا۔ سحر کو برا لگا۔

"تو اور کنیز گھر پر نہیں تھے۔ آپ سوچ نہیں سکتے میں نے اس غلیظ، پلید انسان کی۔" سحر نے منہ پر ہاتھ رکھ کر جیسے ابکائی کو روکا ہو۔

گیا ایک ہی ذہن ہوا۔" طلال جانے کون سے ہوئے۔ سحر کی جھنجلاہٹ دو گنی ہو گئی۔

"آپ کو مجھ پر ترس نہیں آرہا؟" وہ دبی دبی آواز میں چیخی تھی۔

"میں کیسے ترس کھاؤں تم پر۔ مجھے بتاؤ؟" طلال نے کاغذات ایک طرف کر کے گویا ساری توجہ سحر پر مرکوز کی۔

"میں جب سے دلہن بن کر اس گھر میں آئی' مجھے جلال کا منہ دیکھنا پڑ رہا ہے۔ ماں قبر میں سو کر آزاد' باپ کے گناہوں کی دین میری جان کو چمٹ گیا۔"

"گناہوں کی دین۔" طلال نے ابرو چڑھائے۔ سحر کچھ جز بز ہوئی۔

"ہاں نہیں تو۔ سسر صاحب اپنے زمانے کے کم تھے کیا؟ دو شادیاں آنکھوں کے سامنے کیں۔ ڈھکی چھپی پتا نہیں کتنی ہوں؟"

"سحر۔" جوش کی وجہ سے سحر کی آواز اونچی ہو گئی تھی۔ طلال کو ٹوکنا پڑا۔

"نہ جانے اور کیسے کیسے سبز نیلے دھندے کیے۔ مجرے والیاں تو بھرے گاؤں کے سامنے ڈیرے پر لائی جاتی تھیں۔"

"سحر۔" طلال نے بے ساختہ سحر کی کلائی پکڑ کر دانت پیسے۔ پکڑنے کے بہانے کلائی تک مروڑ ڈالی۔ مگر سحر لگتا تھا حقیقتاً "ناک تک بھر چکی تھی۔

"اتنے تو کالے کرتوت ہیں سسر صاحب کے۔"

"یہ کالے کرتوت تمہارے باپ اور بھائی بھی کرتے آرہے ہیں۔ زبان سنبھالو۔"

"ہاں لیکن آپ کے باپ سے کم۔ اور ایسی پکڑ اللہ پاک نے کسی کی نہیں کی۔ جلال جیسی اولاد کسی کے گھر پیدا ہوئی بتائیں مجھے؟"

"یہ اللہ کے کام ہیں۔"

"یہ سسر کا کیا ہے جو آنکھوں کے سامنے آیا ہے۔ ویسے نہ سہی ایسے ہی بھگتنا پڑا ان کو۔ ورنہ جیسی رنگین ان کی زندگی تھی۔ بڑھاپے میں بھی آپے سے باہر رہتے۔" اب کی بار طلال محض ہونٹ بھینچے سحر کو دیکھتے رہے۔

"میں اب جلال کے ہوتے اس گھر میں نہیں رہنا چاہتی۔" قدرے توقف کے بعد سحر نے اپنا مطالبہ پھر سے دوہرایا طلال بھنویں سکوڑے عجیب تاثرات کے ساتھ اسے دیکھتے رہے۔

"کہاں رہو گی؟" پھر پوچھا تو آواز نہایت مدھم تھی۔

"کہیں بھی۔ مگر اس حویلی میں نہیں۔" طلال نے کچھ دیر خاموشی سے کسی ایک کاغذ پر نظریں جمائیں۔ پھر بولے تو سحر کو حیران کر گئے۔

"پوری حویلی جلال کو سونپ کر۔" کچھ تھا ان کے لہجے میں۔ سحر کو چونکنا پڑا۔

"مطلب۔؟" سحر کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی۔

"تم نے اس حویلی کو وارث دیا ہے۔ میں اس حویلی کی واحد ہوش مند اولاد ہوں۔ تمہیں نہیں لگتا اس حویلی پر میرا سجاول کا تمہارا حق زیادہ ہے۔ حویلی چھوڑ کر جانے کا مطلب اسے ہاتھوں سے گنوا دینا۔ اور میں وہ دن نہیں آنے دینا چاہتا۔ آئی سمجھ۔" سحر کو کیسے سمجھ نہ آتی۔ اس قسم کے سبق وہ زرینہ سے بھی ہر دوسرے روز سنتی تھی۔ مگر شوہر کے منہ سے سننا ایک الگ ہی تجربہ تھا۔

"میں سمجھ گئی۔" اس کے سر سے جیسے ایک دم جلال نام کا بھوت اترا۔

"لیکن۔ جلال سے اس معاملے میں خوف کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ ذہنی معذور' اپاہج۔ اسے جائیداد زمین کی کیا سمجھ اور ضرورت۔ جو کچھ ابا جان کا ہے۔ ہمارے سجاول کا ہی ہے۔"

طلال نے بیوی کو بات سمجھادی تھی۔ اب انہیں کوئی تبصرہ نہیں کرنا تھا۔ محض سر ہلا کر وہ کاغذوں کے پلندے میں گم ہوئے۔ جو یقیناً ان کی جائیداد میں اضافے کا باعث بنی نئی زمینوں کے ہی ہوں گے۔

☼ ☼ ☼

عالم صاحب کو لگ رہا تھا۔ ان کے بستر پر کانٹے اگ آئے ہیں۔ کسی طور چین نہیں آرہا تھا۔ طبیعت یوں بھی بے کل تھی۔ سحر کی سحر طرازی اور برکت چاچا کے معنی خیز مشورے نے گویا اندر بھانبڑ سے جلادیے۔ ٹھیک ٹھاک خنکی ہو رہی تھی۔ پھر بھی کمرے میں گھٹن کا ایسا جاں بلب احساس کہ وہ باہر آگئے۔ لمبے لمبے سانس لینے کے بعد۔ طویل برآمدے سے گزرنے کے دوران۔ سحر کی بام و در پر بازگشت کی طرح پڑتی آواز نے قدم جکڑ لیے۔ اپنے بند کمرے میں وہ طلال سے کہہ رہی تھی۔

"جلال سے اس معاملے میں خوف کھانے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ ذہنی معذور اپاہج۔ اسے زمین جائیداد کی کیا سمجھ اور ضرورت۔ ؟ جو کچھ ابا جان کا ہے۔ ہمارے سجاول کا ہے۔" سحر جو گفتگو شوہر کے سامنے کر چکی تھی۔ خوش قسمتی سے عالم صاحب کی سماعتیں اس کے اختتامی جملے سن پائیں۔ واپس اپنے کمرے میں جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ برکت چاچا کی بیٹھک کی طرف لمبے لمبے قدم بڑھاتے۔ عالم صاحب یہ ضرور سوچتے جارہے تھے کہ سحر نے اس اختتامی گفتگو سے پہلے نہ جانے اور کون کون سی تسبیح پڑھی ہوگی۔

برکت چاچا کو رات دیر تک جاگنے کی عادت تھی۔ عالم صاحب کو اپنی بیٹھک میں دیکھ کر وہ بوکھلا سا گیا۔

"خان۔ اس وقت؟" عالم صاحب کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ برکت چاچا پر پریشانی حملہ آور ہوئی۔

"طبیعت ٹھیک ہے نا ؟ جلال تو۔۔۔"

"سب ٹھیک ہے منشی۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔" منشی کی بات بیچ میں کاٹ کر وہ تھکے تھکے لہجے میں بولے تھے۔ منشی کی کہاں تسلی ہونی تھی۔ نیند نہ آنے پر خان اس کی بیٹھک میں کیونکر آسکتے تھے؟

"خان آئیں آپ کے کمرے میں چلتے ہیں۔ میں آپ کو دباؤں گا۔ نیند آجائے گی۔" یہ ایک آزمودہ نسخہ تھا۔ مگر ابھی سونا کون چاہتا تھا۔ عالم صاحب منشی کی چارپائی کے بائیں طرف رکھی چارپائی پر بیٹھے رہے۔ منشی کو گڑبڑ کا احساس ہوا۔

"منشی۔"

"جی خان۔" برکت چاچا مستعد ہوا۔

"مجھے مشورہ دو۔" اتنا کہہ کر وہ جیسے سوچنے لگے بات کیسے اور کہاں سے کریں۔ منشی ہمہ تن گوش تھا۔

"میں اپنی جائیداد کی تقسیم چاہتا ہوں۔" انہوں نے کہہ کر سوالیہ نظریں برکت چاچا پر گاڑدیں۔ جیسے وقتی طور پر سمجھ ہی نہ آیا کیا ردعمل دکھائے۔

"کیا کہتے ہو؟" برکت چاچا مسلسل چپ رہا تو عالم صاحب کو پھر سے کہنا پڑا۔ برکت چاچا گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"خان۔ ایسا کیوں؟"

"وجہ مت پوچھو۔ مشورہ دو۔"

"یہ بہت جلدی ہوگا اگر ہوا تو۔ آپ سلامت رہیں۔ جیتے جی کیوں زمین کے ٹکڑے کرتے ہیں؟"

"منشی۔ جیتے جی ہی کرنا چاہتا ہوں۔ نہ جانے مرنے کے بعد کیا ہو۔ زمین حق کے ساتھ تقسیم ہوگی بھی یا نہیں۔" ان کا لہجہ پراسرار تھا۔ برکت چاچا کو سمجھنے میں دقت ہوئی۔

"خان۔ ابھی بہت جلدی ہے۔ مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ آپ جانتے ہیں ایک بڑی جائیداد تو آپ جلال کے نام سے خرید چکے ہیں۔ تقسیم میں اونچ نیچ ہوئی تو چھوٹے خان محسوس کریں گے۔" برکت چاچا کا اشارہ طلال خان کی طرف تھا۔ عالم صاحب کی پیشانی پر بے شمار شکنیں ابھر آئیں۔ سحر کے جملے من و عن کانوں میں گونجے تھے۔

"تم جانتے ہو۔ جلال کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ ہمارے خاندان میں پشتوں تک کسی کے گھر ایسی اولاد پیدا نہیں ہوئی۔ خدا نے پیدا کیا بھی تو میرے گھر۔ میری رسی کھینچنے کے لیے۔ مجھے عرش سے فرش تک لانے کے لیے۔ میں زندہ ہوں۔ تو بھی بے سکون۔ اور مروں گا تو بھی بے سکون۔ یہ سب جلال کی وجہ سے ہو گا۔" برکت چاچا دم سادھے عالم صاحب کو سنتا رہا۔ خان کی بے سکونی اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ وہ راتوں کو سونا بھول چکے تھے۔ ایک بے نام سا اضطراب انہیں ہمہ وقت گھیرے رکھتا۔ اور اس کے پیچھے کیا وجہ تھی منشی سے بہتر کون جانتا تھا۔

"خان۔" گلا کھنکار کر اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ اس کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔ "آپ کی جائیداد واقعی انصاف کے ساتھ تقسیم ہونی چاہیے۔" عالم صاحب بے تاثر سے منشی کی طرف متوجہ تھے۔

"صرف سردار جلال' اور سردار طلال ہی میں نہیں۔ کسی اور میں بھی...." عالم صاحب کی پتلیاں سکڑ گئیں۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھے۔

"چھوٹا منہ بڑی بات کہہ دی خان۔ میرے منہ میں خاک۔ معافی مانگتا ہوں۔" برکت چاچا ہاتھ باندھے گھگھیانے لگا۔ عالم صاحب اسے سن ہی کہاں رہے تھے۔ وہ اگلے پل اس کی بیٹھک سے نکل آئے۔ یوں لگ رہا تھا باہر بھی حبس اور گھٹن نے قبضہ جما لیا ہو۔ انہیں اپنا دل بند ہوتا محسوس ہوا۔ تا دیر کھلی فضا میں رہنے کے بعد وہ اب بستر پر کروٹیں بدلتے تھک نہیں رہے تھے۔ ان جانے میں برکت چاچا کا مشورہ ان کے گھر پڑا تار گیا تھا۔

ان کی زندگی میں ایک وہی "کسی" نہیں تھا جس کی طرف برکت چاچا نے دھیان دلایا تھا۔ ایک اور "کسی" بھی تھا۔ جو ان کے ذمہ داری تھا۔ اور جو آج بالکل اچانک یاد آیا تھا!!!

☼ ☼ ☼

تمام دن اسپتال میں ایمرجنسی کال نمٹانے کے بعد وہ جب گھر آیا۔ بچے سوتے ملے اور تحریم کچن میں چائے بناتی نظر آئی ۔ مضمحل اور قدرے برگشتہ۔ اس پر نظر پڑتے ہی ساری مصروفیت ترک کر دی۔ اویس جانتا تھا۔ اب وہ اسے نظر انداز کیے فوراً یہاں سے چلی جائے گی۔ اویس کو ہر صورت اسے روکنا تھا۔

"ایک کپ مجھے بھی چاہیے۔" وہ آہستہ روی سے چلتا قریب آنے لگا' تحریم کی بھنویں تن گئیں۔ وہ اس کی راہ مسدود کیے ہوئے تھے۔ اماں اور عقیدت سے کہے دو بول ہمدردی کے اویس کو اچھے خاصے مہنگے پڑے۔ تحریم نے اس دن سے نہ صرف بول چال ترک کر رکھی تھی۔ بلکہ اس کا سامنا کرنے سے بھی کترانے لگی تھی۔ وہ گھر پر ہوتا تو وہ کمرہ بند ہو جاتی۔ ہر ممکن کوشش کرتی اس کے سامنے نہ آئے۔ وہ ایسی ہی شدت پسند تھی۔ محبت کرتی تو اپنا آپ بھلا دیتی۔ اور ناراضی دکھاتی تو اویس کے چھکے چھڑانے پر آ جاتی۔

"نسرین جاگ رہی ہے' اس سے بنوا لو۔" اویس کا بڑھا ہوا ہاتھ جھٹک کر اس نے رکھائی سے کہا۔ اویس ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ ناراض رہ کر وہ اس کو ہی نہیں۔ خود کو بھی تکلیف دیتی تھی۔ اس کا قاتل حسن اس وقت بے توجہی کا شکار ہو رہا تھا۔ بے تحاشا گوری رنگت میں ہلکی سی زردیاں گھلتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"مجھے تمہارے ہاتھ کی چاہیے۔" اویس ٹھنکا۔ اپنے سامنے روکے رکھنے کا کوئی تو بہانہ چاہیے تھا۔ چائے کا ہی سہی۔

"مجھے نیند آرہی ہے مجھے سونا ہے۔" آنکھوں میں شدید ناراضی بھرے وہ دانت پیس کر بولی تھی۔

"مجھے تو نہیں آرہی نا۔" اویس نے چہرے پر مسکینیت طاری کرلی۔

"اپنا علاج خود کرو۔" کہہ کر وہ اس کے دائیں طرف سے ہو کر نکلنے لگی اویس نے اس کی کلائی پکڑلی۔ اب جب ہاتھ لگ گئی تھی تو اتنی آسانی سے کیسے جانے دیتا۔

"مجھے نیند آرہی ہے' چھوڑو مجھے۔" اس کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔ اور یہ اس کے کمزور پڑنے کا پہلا سگنل ہوتا تھا۔ وہ دھونس' زبردستی' ضد' بھول بھال رونے پر آجاتی تو جیسے ساری ناراضی' ساری غلط فہمی آنسوؤں میں بہا دیتی۔

"تحریم مت کرو یار' بس کرو' بہت ہو چکی اب ختم کرو۔" وہ نرمی و محبت سے کہہ رہا تھا۔ اس کے اسی لہجے کی عادی تحریم کے آنسو تواتر سے بہہ نکلے۔ اویس نے اسے بے اختیار خود سے لگایا تھا۔

"تمہاری اماں اور عقیدت ہماری آمد کو بھول بھی چکے ہوں گے۔ اور تم نے اس بات کو پکڑے اتنے دن مجھ سے دشمنی کی۔" وہ اس کا سر سہلاتا نرمی سے کہہ رہا تھا۔

"اس لیے کہ تم برے ہو۔ ان کی وجہ سے تم مجھ سے ناراض ہوئے' تم نے مجھے غلط کہا' مجھے ہرٹ کیا۔" اس کے شکوے آج کی رات ختم نہیں ہونے تھے اور ہمیشہ کی طرح اویس کو سننے میں تامل نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم جانتے ہو۔ ہم نے کتنی محروم زندگی گزاری ہے۔ بہت چھوٹی سی عمر میں' میں اور شہری بورڈنگ بھیج دیے گئے۔ بورڈنگ کے دوران ہی ہم سے سب کچھ چھن گیا اویس۔" وہ اس کے بازو سے سر اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے خود ترسی کے عالم میں بولی۔ "ہم یتیموں کی طرح پلے۔ ہم سے ہر رشتہ دور ہو گیا۔ ہم بلاوجہ لوگوں کی۔ اپنوں کی نفرت کی بھینٹ چڑھے۔ سب نے۔۔۔" شدید گریہ زاری اس کے بولنے میں رکاوٹ بن رہی تھی' مگر وہ پھر بھی بول رہی تھی۔ اویس جانتا تھا۔ وہ جب یوں اپنی زندگی کھول کر دکھاتی تھی تو خود پر خود ہی ترس کھاتی اتنا روتی تھی گویا رونے سے اس کی زندگی کی محرومیاں۔ اور وہ دکھ جو اس نے محسوس کیے دھل جاتے ہوں۔

"ایک ایک نے ہم سے منہ موڑ لیا۔ ہم سب کے ہوتے ہوئے لاوارث ہو گئے۔ تم جانتے ہو میں بہت چھوٹی تھی۔ اور میں تب بھی محسوس کر سکتی تھی کہ ہم پر قیامت آئی ہے۔ ہمارا سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ میں بہت روتی تھی۔ دل سے دعا مانگتی تھی کہ یہ خواب ہو۔ میں جاگوں تو میری لائف وہی پہلے جیسی ہو۔ میرے اردگرد وہی محبتیں ہوں۔ وہی چہرے ہوں۔ لیکن۔۔۔"

"شش۔" اویس نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر گویا الفاظ کے آگے بند باندھا۔ مگر وہ کسی بند سے رکنے والی کہاں تھی۔

"تم جانتے ہو۔ ہم ایسے ہی پل گئے۔ محروم اور مجبور۔ ہم بڑے بھی ہو گئے۔"

"میری جان میں سب جانتا ہوں۔ پچھلے پندرہ سالوں سے تم یہ سب نہ جانے کتنی بار مجھے بتا چکی ہو۔ آئی سوئیر مجھے حفظ ہو چکا ہے۔ تم بار بار بتا کر کیوں خود کو تکلیف دیتی ہو؟" اویس صحیح کہہ رہا تھا۔ ہر دوسرے روز وہ قنوطیت کا شکار ہو جاتی تھی۔

"پھر شہری کینیڈا چلا گیا۔ مجھے تم مل گئے۔ میں نے تمہاری شکل میں کسی رشتے سے اتنا شدید پیار پایا۔ میری دنیا تم تک محدود ہو گئی۔"

"میری بھی۔"

"میرا سب کچھ تم ہو گئے۔ میں نے اپنا سب کچھ تمہیں وان کر دیا۔"
"میں نے بھی۔" اویس نے مسکراتے ہوئے اس کے بالوں کو چھوا۔
"میں نے شہری سے کہہ دیا۔ وہ مستقل کینیڈا اسکونت اختیار کرے۔ بہت ضروری ہوتا ہے تو میں اس سے خود مل آتی ہوں۔ بس اتنا کافی ہے۔ اور اس کا یہاں کوئی نہیں جس کی خاطر وہ دوڑا دوڑا آئے۔" تحریم کے لب و لہجے میں رعونت تھی۔ اویس نے بلا ارادہ دائیں بائیں سر ہلایا۔ شہریار کی دنیا یہاں تھی جنت یہاں تھی اور وہ کہہ رہی تھی اس کا یہاں کوئی نہیں۔
"شہری کے بعد میرا بھی تمہارے علاوہ کوئی نہیں۔ اس لیے۔۔۔" اتنا کہہ کر اس نے باقاعدہ اویس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔
"اس لیے مجھ سے وعدہ کرو۔ تمہیں بھی صرف مجھ سے اور میرے بچوں سے سروکار ہو گا۔ کسی عقیدت۔ یا میری اماں سے نہیں۔" وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے جواب طلب کر رہی تھی۔
"سو فیصد کھرا وعدہ۔" اویس نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر جذب سے کہا تھا۔ اگرچہ اسے وعدے کے مندرجات پر شدید اعتراض تھا۔ کون اپنی ماں بہن سے یوں لاتعلق رہ سکتا ہے؟
"اب چائے ملے گی؟"
"ابھی بھی چاہیے؟" تحریم کی ہلکی سی چیخ حیرت سے بھرپور تھی۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔
"ابھی بھی چاہیے۔" اویس نے بڑی معصومیت سے باقاعدہ آنکھیں پٹپٹائیں۔
"مگر۔۔۔" اس سے قدرے دور ہوتی وہ بیڈ کے کنارے پر جا ٹکی۔ "مجھے تو نیند آ رہی ہے۔"
"کون کافر سونے دے گا تمہیں؟" اویس کے تیور خطرناک تھے۔ تحریم "چائے لائی" کہتی اس کی پہنچ سے دور بھاگی تھی۔

☆ ☆ ☆

راحیل اور اس کی نئی نویلی دلہن کے ہمراہ راک فیلر سنٹر کو کھنگالتے اسے گمان بھی نہیں تھا وہ سبز کرنجی آنکھوں والی، دلفریب نقوش کی حامل لڑکی ایک بار پھر اس کے سامنے آ جائے گی۔
ونڈرلینڈ کی ایلس کی طرح۔ وہ بڑے اشتیاق و حیرانی سے یہاں وہاں دیکھتی نظر آئی۔ فہد کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ راک فیلر سنٹر کی اس رات کو اس کا پھر سے سامنے آ جانا محض اتفاق ہی ہو سکتا تھا۔ وہ گردو پیش کی عمارات کو دھڑا دھڑ اپنے کیمرے میں قید کرتے تھک نہیں رہی تھی۔ بہت بار فہد کو لگا۔ اس کے کیمرے کے فلیش کی زد میں وہ بھی آیا ہے۔ مگر یہ خام خیالی بھی ہو سکتی تھی۔
راحیل اور اس کی نئی دلہن آپس میں گم اسے مکمل طور پر فراموش کیے ہوئے تھے۔ وہ پہلے ناک تک بور ہو رہا تھا مگر اب حیرت انگیز حد تک اسے اردگرد کی دنیا میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔
ونڈرلینڈ کی ایلس یقیناً سنیوبار کر نہیں تھی۔ ورنہ وہ اس شدومد سے کیمرے کی میموری نہ بھر رہی ہوتی۔
مسلسل دو دن سے صبح ہی صبح سینٹرل پارک کی ہری جنت میں اس نے فہد کا راستہ کاٹا۔ ٹی شرٹ، ٹراؤزر اور کانوں میں ایئر پیگ لگائے وہ بڑے ردھم سے جاگنگ کرتی فہد کی توجہ کا مرکز بنی تھی۔ اور وہ حیران تھا اتنی آسانی سے کوئی لڑکی کیونکر اس کی توجہ کھینچ سکتی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ مختلف و منفرد لگ رہی تھی۔ اس کے نقوش یورپین تھے مگر کچھ تھا جو اسے ممتاز بنا رہا تھا۔ اور فہد کو اسی کچھ نے ہی اپنی طرف مائل کیا تھا۔ اور اب راک فیلر سنٹر میں وہ جب راحیل کی باتونی بیوی کے تابڑتوڑ سوالوں کی زد میں آیا چغد بنا ہوا تھا۔ وہ نظر آ گئی۔

"فہد بھائی آپ کب سے امریکہ میں ہیں؟"
"آپ شادی کب کریں گے؟"
"آپ نے پاکستان کیوں چھوڑا؟"
"راحیل بتا رہے تھے آپ نے پوری دنیا گھومی ہے۔"
"بچی آپ اکیلے رہتے ہیں۔ کوئی تو ہو گا آپ کا اپنا؟"
اسے راحیل سے حقیقتاً ہمدردی محسوس ہوئی۔ چند لمحوں کی ملاقات میں بھابھی صاحبہ۔ اس کی پوری ہسٹری جاننے کی متمنی تھیں۔ گول مول جواب دیتا وہ سوچ رہا تھا ہر دم ساتھ رہنے والے راحیل کا بھی یہی حشر کرتی ہوں گی۔
"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" وہیں ایک ریسٹوران پر نظر پڑتے ہی بھابھی بولیں تو اسے بھی خیال آیا بھوک لگ رہی ہے۔
"یہاں نہیں۔ تمہیں حلال خوراک کھلاتا ہوں۔" راحیل نے "حلال خوراک" یوں کہا تھا جیسے پالتو جانوروں کی خوراک کا کہہ رہا ہو فہد نے منہ پھیر کر مسکراہٹ چھپائی تھی۔
"تم دونوں چلو۔ میں یہیں ہوں۔" فہد نے دونوں میاں بیوی کے گویا دل کی بات کہہ دی۔ یہیں کسی بلاک میں مختلف ٹھیلوں پر حلال گوشت کی دستیابی عام تھی۔ ان اعلا ذائقوں پر مسلمان ہی نہیں۔ امریکی بھی مرتے تھے۔ راحیل دلہن کو لیے وہیں روانہ ہوا۔
اور اب وہ تھا۔ اور چکا چوند روشنیوں کا حصہ بنی وہ گلاب چہرہ۔
"کیا تم میری تصویر اتارو گے؟" فلک کی بلندیوں کو چھوتی عجوبہ عمارتوں کو بلا ارادہ تکتا وہ چونکا کہ وہ مہرتاب کیمرا اس کی طرف بڑھائے ہم کلام تھی۔ فہد نے خاموشی سے کیمرا لے لیا۔ وہ یقیناً "اکیلی یہاں گھوم رہی تھی۔
فہد نے حسب خواہش اس کی کچھ تصویریں اتاریں۔ اور کیمرا واپس اس کے حوالے کیا۔ وہ خوش دلی سے شکریہ ادا کرتی، مسکراتی ہوئی اپنے دوستوں کی ٹولی کی طرف بھاگی تھی۔ یعنی وہ اکیلی نہیں آئی تھی۔
منظر بے رونق ہو گیا تھا۔ اس کی دلچسپی کا سامان تمام ہوا تھا۔ اس پر بوریت پوری شدت کے ساتھ حملہ آور ہوئی تھی۔ راحیل اور اس کی نئی نویلی بیوی کی سنگت میں وہ کہاں تک دیکھی ہوئی جگہوں پر انجوائے کر پاتا۔ اچھا خوار کروا رہا تھا راحیل۔

☼ ☼ ☼

صفورا رات گئے کچن سمیٹنے میں لگی تھی جب کانوں کو ہاتھ لگاتی نرگس اندر داخل ہوئی۔
"ہم بھی بھی نہ آتیں۔" صفورا نے طنزاً کہا۔ نرگس بیرونی گیٹ کھلنے بند ہونے کی آواز سن کر برتن دھونا بیچ میں چھوڑتی باہر بھاگی تھی اور واپسی تب کی جب صفورا نے سارے برتن دھو کر خشک بھی کر لیے۔
"سچی کہوں۔ بڑی مہارانی کو کرنی کی آہ لگنے والی ہے۔" آتے ہی ذو معنی سرگوشی کی۔ بڑی مہارانی سے مطلب نورین سے تھا۔
"کرنی کو اولاد نہ سنبھال سکنے کے طعنے دے رہی تھیں۔ اور اپنی اولاد کے کرتوت نظر نہیں آرہے۔"
"کچھ ہوا ہے؟" صفورا کو ٹوہ ہوئی۔
"مہارانی کی منجھلی شہزادی ابھی گھر آئی ہے۔" نرگس کا اشارہ کشف کی طرف تھا۔
"ہم بھی؟" صفورا کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔
"ہاں آگے سنو۔ مہارانی کے کمرے میں عدالت لگی ہوئی ہے۔ کشف پہ خوب نزلہ گر رہا ہے۔ مہارانی کا بس

نہیں چل رہا کشف کو مار مار کر غصہ نکالیں۔"

"کشف کیا کہہ رہی ہے؟" کشف جب سے چھوٹی تھی۔ آج کل نہ معلوم کن مصروفیات میں مگن تھی کہ گھر میں کم کم ہی نظر آتی۔

"یوں بولو کیا نہیں کہہ رہی' ہر بات کا منہ توڑ جواب دے رہی ہے۔ ماں باپ ایک کہہ رہے ہیں۔ یہ دس سنا رہی ہے۔"

"اتنی رات کو اس گھر کی کوئی اور بیٹی گھر سے باہر رہتی تو نورین بیگم نے اینٹیں ہلا دینی تھیں گھر کی۔"

"اور نہیں تو کیا۔ اب بند کمرے میں دانت بھینچ بھینچ کر بیٹی کو ڈانٹ رہی ہیں۔ اور بیٹی کا کہنا ہے وہ دوست کی شادی پر تھی۔ میں نے کان لگا کر سب سنا۔" نرگس نے بڑا کام کیا تھا۔ صفورا نے اس کے فی الوقت کے سبھی قصور بخش دیے۔

"گرینی کتنی اداس لگ رہی تھیں' نورین بیگم نے ان کا کچھ نہیں چھوڑا۔ بزرگ کی آہ لیں گی۔ اس کشف کی وجہ سے نہ ذلیل ہوئیں تو کہنا۔"

"اپنے لیے گڑھا کھود رہی ہیں۔ ہم کیا کریں۔"

"ویسے مجھے کشف کسی چکر میں لگتی ہے۔" نرگس نے بڑے پراسرار انداز میں رائے ظاہر کی۔

"چپ۔" صفورا نے خوفزدہ نظروں سے یہاں وہاں دیکھا تھا۔

"جیسے تم سن آئیں۔ ایسے کوئی اور بھی سن سکتا ہے۔"

"چل ناں۔" نرگس نے مکھی اڑائی "میرے جتنے کان اس گھر میں کسی کے نہیں۔"

"اچھا بس۔ اب چھوڑو کچن کی جان۔ نیند آرہی ہے۔"

"تم جاؤ سونے۔" نرگس دروازے کی طرف جاتے جاتے بولی۔

"میں ذرا گرینی کو دیکھ آؤں۔ جاگ رہی ہوں گی بے چاری۔ دو چار منٹ ٹانگیں داب لوں گی۔" نرگس پر ایسے ہی کبھی کبھی گرینی کی ہمدردی کا بخار چڑھ جاتا تھا۔

✡ ✡ ✡

جس دن سے عقیدت پر غصہ نکالا تھا۔ اس دن سے نیندیں ہی اڑ گئی تھیں۔ وہ پہلے بھی جلدی نہیں سوتی تھیں۔ اب تو رات کاٹنا محال ہو جاتا۔

ابھی بھی۔ غیر ضروری مصروفیت میں سر کھپانے کے بعد انہوں نے گھڑی دیکھی۔ ایک بجنے والا تھا۔ جمیلہ کو سوئے دو گھنٹے ہو چلے تھے۔ اور عقیدت۔ اسے نیند آئی یا نہ۔ سب سے پہلے بستر میں ضرور جا گھستی۔ ڈانٹا اماں نے اسے تھا' اور نظریں وہ چراتی پھر رہی تھی۔ جیسے صحیح معنوں میں گناہ گار ہو۔ کچن اور داخلی دروازے سے مطمئن ہونے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آئیں۔ نیم تاریک کمرے میں ڈبل بیڈ پر وہ سمٹی سمٹائی سوئی ہوئی تھی۔ وہ اس کے سرہانے جا بیٹھیں۔

کس قدر کریہہ جملے بولے تھے انہوں نے۔ کیا ضروری تھا وہ اپنا صبر اور تحمل کھوتیں۔ وہ اسے نارملی بھی کچھ کہہ کر ڈانٹ سکتی تھیں۔ مگر وہ سب کہنا۔

اور عقیدت نے کیا سوچا ہو گا؟ کتنی مرجھا گئی تھی ۔۔۔ کتنی ڈر گئی۔۔ کتنی تکلیف' کتنا درد محسوس کیا ہو گا ان کے ان سخت نفرت بھرے جملوں کو سن کر۔ اسے یقین کرنا بھی مشکل ہو رہا ہو گا کہ یہ سب اس کی اماں نے کہا۔ جو ماں چھاؤں بن کر سایہ کرتی رہی اس نے لمحوں میں تپتی دھوپ میں لا کھڑا کیا۔

"میری بچی۔" وہ سسک پڑیں۔ عقیدت کی اسی تکلیف کا سوچ کر دل پر آرے چلنے لگے۔ انہوں نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنا شروع کیا اس نے کروٹ لی ہوئی تھی اس کے معصوم چہرہ کی پاکیزگی اس کے بہت خاص ہونے کی گواہی دے رہی تھی۔

"میری جان۔ میری بچی۔ میرے جگر کا ٹکڑا۔" وہ رو رہی تھیں بے آواز۔

"مجھے معاف کردے۔ معاف کردے۔ میں گناہ گار ہوں تمہاری میں گناہ گار ہوں۔" انہوں نے اس کے بالوں پر اپنے لب رکھ دیے تھے۔

☼ ☼ ☼

ناشتے کے وقت جمیلہ پر ہمیشہ والی افراتفری سوار نہیں تھی' وہ بڑے سکون سے کام کر رہی تھی۔ عقیدت جھجک اور خاموشی سے ناشتا کرتی رہی۔ اس نے رات سونے سے پہلے ایک عہد کیا تھا اور اب اس عہد کو نبھانے کی خاطر ہمت مجتمع کر رہی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" وہ ناشتا ختم کر کے کمرے میں جا رہی تھی جب جمیلہ نے حیرت سے پوچھا۔ اسے جواب دینے میں گھبراہٹ محسوس ہوئی۔

"تم نے میرے کپڑے تیار کیے؟" انگلیاں مروڑتے ہوئے اس نے الٹا سوال کیا۔

"نہیں۔ کیوں؟" اسے لگا جمیلہ جان بوجھ کر انجان بن رہی ہے۔

"کالج۔ جانا ہے۔" اٹک اٹک کر کہہ دیا۔ جمیلہ کے تاثرات معنی خیز ہو گئے۔

"پر باجی نے تو ایسا کچھ نہیں کہا۔"

"تم کہہ دو ان سے۔ میں جاؤں گی کالج۔" دھیمے لہجے میں اس نے خود سے کیے عہد کی پاسداری کی۔

"باجی تو گھر پر نہیں۔" جمیلہ کی بات پر وہ بری طرح سے حیران ہوئی۔

"کہاں گئیں؟"

"بتا کے نہیں گئیں۔" جمیلہ نے کندھے اچکائے۔

"میں سمجھی تیرے لیے رکشا کرنے گئیں۔ پر کالج کا تو ٹیم ہو گیا۔ باجی ابھی تک نہیں آئیں۔"

"تم ساتھ جاتیں نا۔" عقیدت کو بے طرح فکر لاحق ہوئی۔ پتا نہیں کہاں چلی گئیں۔

"میں نے کہا تھا۔ بولیں میں تمہارے ساتھ رہوں۔" عقیدت کے چہرے پر سراسیمگی نمایاں ہونے لگی۔

"اچھا منہ نہیں لٹکا۔ باجی ہیں کوئی بلی نہیں کہ شہر میں گم ہو جائیں گی۔" اپنے تئیں جمیلہ نے ہنسانا چاہا' لیکن اب عقیدت کو بندوق کی نوک پر بھی پریشان ہونے سے نہیں روکا جا سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

آئی سی یو سے نکل کر وہ ڈاکٹر حماد کو متلاشی نظروں سے دیکھ رہا تھا جب ایک ایچ او نے آکر اطلاع دی۔

"سر۔ متین کہہ رہا تھا آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔" اس نے فوراً گھڑی دیکھی۔

"صبح صبح۔" اسے حیرت ہوئی۔

"کوئی خاتون ہیں۔" وہ مزید حیران ہوتا ایچ او کی تقلید میں آگے بڑھنے لگا۔

بینچ پر بیٹھی وہ خاتون کوئی اور نہیں تحریم کی اماں تھیں۔ اویس کے قدم سست پڑ گئے۔

"السلام علیکم بیٹا۔" وہ کھڑی ہو گئی تھیں۔ اویس کے تاثرات عجیب بے بسی و لاچاری جیسے ہو گئے۔

یہ کیوں آگئی ہیں یہاں؟ جب کہ وہ ایک وعدے کا پابند ہو چلا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

رداء مسرور
زندگی گلزار نہیں

اتنی مہلت کہاں کہ گھٹنوں سے
سر اٹھا کر فلک کو دیکھ سکوں
اپنے ٹکڑے اٹھاؤں دانتوں سے
ذرہ ذرہ کرید تا جاؤں
چھیلتا جاؤں ریت سے الشاں
وقت بیٹھا ہوا ہے گردن پر
توڑتا جارہا ہے ٹکڑوں میں
زندگی دے کے بھی نہیں چھٹتے
زندگی کے جو قرض دینے ہیں

ماریہ کمال بھی ایسی ہی تھی۔ زندگی کے دکھوں میں خود کو سمیٹ کر چلنے والی۔ وہ خود کو اتنا مصروف رکھتی کہ لوگ اس سے بات کرنے کے لیے ہیلو بھی نہ کہہ پاتے۔

وہ اپنی ذات میں گم، کمپیوٹر میں آنکھیں گھسائے، آس پاس سے بے نیاز رہتی۔

"آج کے دور کی لڑکی اور اتنی سمٹی سمٹائی۔ اور وہ بھی میڈیا ایج کی لڑکی۔"

لوگ تبصرہ کرتے "نازک سی ہے" "اسمارٹ ہے۔ ڈریس اپ ہونے میں ملکہ ہے۔ صرف دوپٹا چادر کی طرح لیتی ہے۔ موتیوں جیسا نکھرا ہے۔"

"خود کو بہت کچھ سمجھتی ہے۔ دور ہی رہو اس سے۔"

اس کے خلاف گروپ بن گیا تھا۔ مگر وہ بکھری سوچیں، بکھری باتیں اور بکھرے خدوخال کے ساتھ اپنے مخصوص سیاہ رنگ کا بیگ کندھے پر لٹکائے جب آفس کی سیڑھیاں چڑھتی تو آفس کا ہر فرد اس کو پہلی نظر دیکھنے میں مشتاق نظر آتا۔

وہ تھی ہی ایسی کہ لوگ اسے مڑ مڑ کر دیکھیں۔ مگر اس کی شخصیت کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ وہ اپنی ذات میں تنہا تھی۔ اور یہ تنہائی شاید اس کا مقدر تھی۔ اپنے قلندرانہ مزاج کے ساتھ نہ جانے وہ کیوں ایسی تھی اور زندگی سے کیا چاہتی تھی۔ وہ اتنے کھردرے لہجے کی مالک تھی کہ مقابل کو اس سے بات کرتے ہوئے پسینہ چھوٹنے لگتا تھا۔ سلام کے بعد اسے کلام کرنے کا قطعی شوق نہ تھا۔

اتفاقاً" کسی نے اگر اسے "سنیے مس ماریہ کمال" کہہ کر مخاطب کر بھی لیا تو بے چارہ خود نادانستگی میں یہ جملہ کہہ کر دن میں سو بار پچھتایا ہوگا۔ کم از کم مس ماریہ کمال کے خشک اور اجنبی لہجے کی نسبت تو راہ چلتے مسافر سے بات کرنا بہتر تھا۔

عجیب سی لڑکی تھی، اپنی دھن میں چلتی، اپنے انداز میں کام کرتی، لیکن اپنے وجود میں تمام تر اجنبیت کے ساتھ اپنے کام میں مخلص تھی۔ وقت کی پابند تھی۔ زندگی کے نشیب و فراز سے بے نیاز اس کا رویہ سوائے اپنے سینئرز کے باقی سے روکھا ہوتا۔

چھ ماہ پہلے ہی ماریہ کمال نے رفحان ایڈورٹائزنگ ایجنسی کو جوائن کیا تھا اور چھ ماہ کے ٹریننگ پیریڈ میں ہی اس نے اپنے آپ کو کامیاب ثابت کیا تھا۔ نہ صرف کامیاب بلکہ افسران کی نظروں میں اس کی حیثیت بہت اہم ہوتی جارہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی محنت اور مسلسل جدوجہد سے آج کری ایشو ڈیپارٹمنٹ میں تھی۔ کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر فرہاد خان اور ثریا ماتھر اس کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔

بظاہر دیکھا جائے تو عمر کے لحاظ سے اس کی دوستی ان سے عجیب ہی لگتی تھی۔ شاید ذہنی تعلقات یا پھر۔

فرہاد خان لگ بھگ پینتالیس کے قریب تھے۔ بے حد گریس فل شخصیت کے مالک تھے کنپٹیوں کے قریب بال سفید تھے، موٹے شیشوں کی عینک لگاتے تھے، جب کہ مسز ثریا ماتھر ایک پارسی خاتون تھیں۔ بہت ملنسار تھیں، تجربے کار ہونے کے ساتھ ساتھ رکھ رکھاؤ ان کی فطرت میں شامل تھا۔ یوں ماریہ کمال کا بیشتر وقت ان دونوں کی صحبت میں گزرتا۔ اس کے بارے میں سب کی متفقہ رائے یہ تھی کہ دنیا کی بے شمار لڑکیوں جیسی وہ نہیں ہے بلکہ زمین و آسمان کے درمیان کی مخلوق ہے تیز مزاج ہے۔ عجیب و غریب بے مقصد باتیں کرتی ہے۔ ایسی باتیں جن میں فلسفیانہ رنگ زیادہ ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو بہت ملپ ٹول کر رکھتی ہے۔ زندگی کو برتنے کا فن نہیں جانتی۔

خود پسند ہے' محتاط ہے اور نہ جانے کیا کیا تبصرے اس کی ذات ناتواں پہ ہوتے لیکن ان تمام باتوں سے بے نیاز ماریہ کمال اپنی دنیا میں گم رہتی۔

ٹھیک نو بج کر پانچ منٹ آفس کی سیڑھیاں چڑھنا اور اپنے کمرے میں قدم رکھنے تک ہیل کی "ٹھک ٹھک" اور پندرہ منٹ بعد مسز ثریا باقر کے کمرے میں پچیس منٹ گزارنا پھر واپس اپنے کمرے کی طرف "ٹھک ٹھک" کرتے ہوئے آنا اور لنچ کے بعد فرہاد خان کے کمرے کا رخ کرنا اور پھر تمام وقت اپنے کام میں الجھے رہنا۔ اس کی روز کی روٹین میں شامل تھا۔

گزشتہ چھ ماہ سے وہ اسی ڈگر پر قائم تھی۔ وہی اس کے بے نیازی' وہی اس کا روکھا پن۔ یوں لگتا تھا کہ اسے کسی خاص مرکز کو حاصل کرنا ہے اور اس خاص مرکز کے لیے سب کی نگاہوں کا مرکز بنتی جا رہی ہے۔ اس کی شخصیت میں گریز کا پہلو بے حد نمایاں تھا۔ آفس میں کام کرنے والے اس کے تمام ساتھی اس سے الرجک نظر آتے مگر کامل حلیم اس کی خاموشی کے سحر کو توڑنے میں وہ تمام گر آزماتا جو ماریہ کمال کو موم کر سکتے تھے۔ مگر کامل حلیم کے کسی جملے پر پگھلنا اور کسی ادا پر ٹھہرنا ماریہ کی عادت نہ تھی۔

اس روز وہ جب معمول کی طرح آفس پہنچی تو اس کے قدموں کی مخصوص ٹھک ٹھک سن کر نہ جانے کیوں کامل حلیم اس کو مخاطب کر بیٹھا۔ "سنیے آپ کسی کو احساس دلائے بغیر یہاں سے نہیں گزر سکتیں؟"

"کیا مطلب؟" اس نے اپنے مخصوص لہجے میں ایڑیوں کے بل گھوم کر پوچھا۔

"مطلب واضح ہے خاتون۔" کامل حلیم نے اسی کے انداز میں کہا اور بولا۔ "ان سینڈلوں میں آپ سائلنسر لگوائیے۔"

"اف! آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں اور ان سینڈلوں میں سائلنسر' یہ کیسی فضول بات ہے؟" وہ بری طرح الجھ کر بولی۔

"یہ فضول بات نہیں ہے آپ خود غور کیجیے۔ آپ تو کبھی کسی سے بات تک نہیں کرتیں۔ خاموش رہتی ہیں۔ تو پھر آپ اپنی ان سینڈلوں کی بھی زبان بند کر دیں۔ یہ کیوں خوامخواہ راز و نیاز کی باتیں کرتی گزرتی ہیں۔"

"او شٹ اپ' نہ جانے آپ کس قسم کی فضول باتیں کر رہے ہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ ٹھک ٹھک کرتی آگے بڑھ گئی اور کامل اس کو جاتے دیکھتا رہا اور جب وہ اپنے کمرے کی جانب مڑی تو وہ مسکراتا ہوا اپنی ٹیبل کی سمت بڑھ گیا۔

"یار' کیا حماقت تھی بھلا اس کا راستہ روکنے کی ضرورت کیا ہے۔" کمپیوٹر پہ پروگرام فیڈ کرتے ہوئے فراز نے کہا۔

"ہاں واقعی' کامل تمہیں کیا ہوا تھا۔ اس خاموش بت سے الجھنے کی کیا ضرورت تھی۔" ثمو نے بھی فراز کی تائید کرتے ہوئے حیرت سے کہا۔

"بس اس بت خاموش کی خاموشی توڑنا چاہتا تھا۔ اس سے الجھنا چاہتا تھا۔" کامل نے کی چین گھماتے ہوئے بڑی ادا سے کہا۔

"ارے واہ۔" ثمو حیرت سے بولی۔

"تو تمہیں کیا ملا' اس کی خاموشی توڑ کر' اس سے الجھ کر۔"

"مجھے کیا ملا ہے اور کیا ملے گا' تم نہیں سمجھو گی۔" وہ ذو معنی لہجے میں بات کہہ کر ان لوگوں کا رد عمل دیکھنے لگا۔

"بات سن کامل' وہ مختلف لڑکی ہے۔ اس پر یہ داؤ پیچ مت آزما۔" فراز نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"سب لڑکیاں ایک سی ہوتی ہیں۔ بس ذرا ٹائم لیتی ہیں۔" وہ دھیرے سے جھک کر سرگوشی کے لہجے میں فراز کے کان میں بولا۔

"یار تم اپنے ماں باپ کے اکلوتے فرزند ہو۔ اس لیے تمہیں شاید خواتین کی حرمت کا احساس نہیں۔" فراز نے اس کے انداز کو برداشت کرتے ہوئے بہت ضبط سے کہا۔ مگر وہ ایک ڈھیٹ تھا۔

"دیکھ یار! میرے ساتھ حضرت ناصح نہ بنا کر۔ زندگی کو انجوائے کر۔" وہ اس کی باتوں کو ہنسی میں اڑا کر عالیہ اور ثمینہ کی طرف بڑھ گیا۔

"ہائیں' اس کو کیا ہوا۔ یہ کیسی بے ربط اور عجیب باتیں کر رہا ہے۔" ثمو نے کہا اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"جو بھی ہوا ہے' دیکھتی جاؤ۔ ان موصوف کے آثار کچھ اور ہی بتا رہے ہیں اور کیا بتا رہے ہیں' یہ فی الحال میں نہیں بتا سکتا۔ مجھے کام ہے اور تمہیں بھی۔"

فراز نے ثمو کو مزید سوال کرنے سے روکا اور اپنے کمپیوٹر پر جھک گیا اور ثمو حیرت کا بورڈ بنی کامل' عالیہ اور ثمینہ کے قہقہوں کو سنتی ہوئی فراز کی باتوں پر غور کرتی رہ گئی۔

اور پھر غور کرنے سے کیا ہوتا ہے' اصل چیز دیکھنے والی آنکھ ہوتی ہے۔ جو حقیقت کو افسانہ اور افسانے کو حقیقت بنا دیتی ہے۔ اور حقیقت میں ماریہ کمال کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ آفس میں ہر فرد کی نظریں ایک دوسرے سے سرگوشی کرتی ہوئی ان دونوں کے چہروں کو ٹٹولتیں۔ جونہی ماریہ کمال کے آنے کا وقت ہوتا' سب معنی خیز انداز میں پہلے ماریہ کمال کو اور پھر کامل حلیم کو دیکھتے اور کامل حلیم ان کی نظروں کو مایوس نہیں کرتا اور بھرپور مسکراہٹ کا مظاہرہ کرتا۔

کامل حلیم اپنی مسکراہٹوں کے جال اس پر پھینکتا رہتا مگر وہ نظر انداز کرکے آگے بڑھ جاتی۔ اس روز وہ تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہی تھی تو وہ عالیہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"ضد ہماری ادا ٹھہری۔"

"پھر۔" عالیہ اس کا مطلب سمجھ کر شوخ انداز میں ہنستی ہوئی بولی۔

"پھر یہ کہ مجھ کو ضدی لوگ اچھے لگتے ہیں۔ ضدی ادائیں اچھی لگتی ہیں۔" وہ مسلسل ماریہ کمال کو تعاقب میں رکھتے ہوئے بول رہا تھا۔ اس کے ہر اٹھتے قدم پر اس کی نظریں تھیں۔

"مگر کامل' ضدی لوگ ضدی ہوتے ہیں۔ ان کی ضد نہیں ٹوٹتی۔"

"کامل حلیم کے سامنے ہر پتھر موم ہو جاتا ہے۔ ضد کیا چیز ہے۔" وہ بہت شان سے بولا تو عالیہ اس کی تائید میں بولی۔

"یہ تو ہے شہزادے کامل' تمہارے لیے ہر دروازہ کھلتا جاتا ہے۔"

اور کامل بھرپور قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور دیر تک ہنستا ہی رہا' جب تک ماریہ کمال نظروں سے اوجھل نہ ہوئی۔

ماریہ کمال کے وہی ڈھب تھے۔ اپنے کام میں مگن' آگے بڑھنے کی جستجو' اسے کچھ سوچنے کا شاید موقع نہ دیتی مگر ہر دوسرے تیسرے روز کامل حلیم کا اسے مخاطب کرنا بلاوجہ تکرار' اور پھر ماریہ کمال کا اسے بے رخی سے نظر انداز کرکے آگے بڑھ جانا خاص انداز تھا مگر کامل حلیم اپنی جگہ مطمئن' مسرور اس پتھر کو پگھلانے کی ضد میں ڈٹا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼
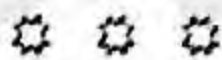
اس روز وہ ثریا ماتھر اور فرہاد خان کے ہمراہ جب میٹنگ ہال سے باہر نکلی تو فراز کے ساتھ کھڑے کامل حلیم نے اس کی طرف دیکھا اور غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے بولا۔

"ہم سے بات کرتے ہوئے اس کی عزت پہ حرف آتا ہے۔ ان لوگوں میں کیا ہیرے جڑے ہیں۔" وہ اپنے اطراف سے بے نیاز' ان دونوں کی معیت میں ٹھک ٹھک کرتی گزر گئی تو فراز نے کامل کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"بس کرو یار اس کو معاف کرو اور خود کو بھی معاف کرو کب تک لے آزماتے رہو گے وہ بالکل منفرد اور الگ لڑکی ہے۔ وہ تمہارے دام میں آنے والی نہیں۔" عاشر' ثمینہ اور عالیہ بھی اس کی طرف آگئے۔ ماریہ کمال موضوع پھر زیر بحث آگیا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" کامل نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "کتنے بڑے اوارے میں جاب کرتی ہے پھر

کیسے وہ ہم سے الگ ہو گئی۔ آخر اسے ایسا کیا غرور ہے جو ہم میں گھلتی ملتی نہیں۔ ہمارے ساتھ لنچ نہیں کرتی' چائے نہیں پیتی' آخر ثمینہ ہے' عالیہ ہے۔ ثمو ہے وہ بھی تو ہم سے فرینک ہیں۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہیں' آخر ہماری دوستی ہے' ہم شاپنگ پر ساتھ جاتے ہیں۔ چائنیز جاتے ہیں ساحل پر جاتے ہیں ہوٹلنگ کرتے ہیں۔ بہت اچھی دوستی ہے ہماری' ہم زندگی کو انجوائے کرتے ہیں۔ تو یہ کیوں سب سے منفرد بنتی ہے۔ اسے کیوں زعم ہے خود پر' ان سے خوب دوستی ہے اس کی جو اس کی عمر سے مطابقت نہیں رکھتے۔" اس کا واضح اشارہ مسز ثریا ماتھر اور فرہاد خان کی طرف تھا۔

"اُفوہ کامل یار بس کرو' اس کی مرضی۔ ہر لڑکی ایک سی نہیں ہوتی' تم نے تو اس لڑکی کو چیلنج سمجھ لیا ہے۔" عاشر نے زچ ہو کر اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"ویسے کامل صحیح کہہ رہا ہے۔" ثمینہ نے عاشر سے کہا "نہ جانے وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے۔ خوب صورت ہے تو اپنے لیے' لمبے لمبے بالوں کو بکھرا کر نہ جانے خود کو کیا سمجھتی ہے۔"

"ہونہہ چاہتی ہے اس کی دراز زلفوں کے قصیدے پڑھے جائیں۔" ثمو نے نخوت سے کہہ کر ثمینہ کی بات کے جواب میں کہا۔

"مجھے تو لگتا ہے اسے خال و خد پہ زعم ہے۔ اس کے نقوش غصے کے وقت کیسے زبردست لگتے ہیں۔ کیوں ثمینہ۔" عالیہ نے کہا۔

"ارے بالکل سچ کہا۔ جبھی تو ہر وقت غصے میں رہتی ہے۔" اور سب ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگے۔

"یار وہ کسی شاعر نے بھی اس موقع پر اپنے محبوب کے لیے کہا ہے نا اور بہت خوب کہا ہے۔" شاہد نے کہا۔

ان کو آتا ہے پیار پہ غصہ
ہم کو ان کے غصہ پہ پیار آتا ہے

کامل نے ترنگ میں آکر دوسرا مصرعہ اپنی مرضی کے مطابق لوفرانہ انداز میں پڑھا اور ہنس پڑا۔

"یار تیرا کوئی مسئلہ لگتا ہے' تو ایسا ہی ہے۔" شیراز نے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو لگتا ہے' محبت اس کا مسئلہ ہے۔" فراز نے اس کو گھورتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہے تو مگر وہ بت خاموش سمجھے تب نا۔" کامل نے شوخی سے کہا۔

"یار تم اپنی طبیعت کو روکو۔ تمہاری منگیتر کو خبر ہو گئی تو تمہاری خیر نہیں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ محبت سے اس کا کیا تعلق۔" اس نے بے نیازی سے کہا۔

"ویسے یار کامل' لفظ محبت کو اس قدر ارزاں نہ کرو۔ اسے اپنی انا کا مسئلہ نہ بناؤ۔ اس کا اپنا کوئی ذاتی مسئلہ ہو گا۔ تمہیں اس کے راستے میں آنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ نوکری کرتی ہے۔ مگر اس کے فرائض میں تم سے دوستی کرنا شامل نہیں' جبکہ محبت تو دور کی چیز ہے۔"

"تو پھر اس کو بھی ضرورت کیا ہے۔ اس اتنے بڑے ادارے' ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں جاب کرنے کی۔ جب وہ ہمارے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتی تو گھر بیٹھے۔"

کامل نے تیزی سے کہا۔

"تو پھر تمہارا کیا ہو گا پیارے' تم جو اس کی بے نیازی پر دل ہار بیٹھے ہو۔" شاہد نے شوخی سے کہہ کر بائیں آنکھ دبا دی تو اس کی حرکت پر کامل کو بہت مزا آیا اور دل تھام کر لہرا سا گیا۔ اس کی بے ساختہ اداکاری پر سب کے قہقہے برس پڑے اور کامل حلیم کا قہقہہ بھی ان قہقہوں میں شامل ہو گیا۔ سب کے بلند قہقہے گونج رہے تھے اور اس گونج میں کسی کو پتا ہی نہ چلا کہ ٹھک ٹھک کرتی ایک خود سر مغرور عجیب و غریب لڑکی ان کے پیچھے کھڑی ہے جب قہقہوں کی برسات تھمی تو سب اسے دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔

اس نے بہت مضبوط لہجے میں کامل حلیم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"بات صرف اتنی سی ہے مسٹر کہ ہر فرد کو اپنی زندگی جینے کا اختیار ہوتا ہے مگر ہمارے معاشرے میں یہ حق

ایک دوسرے سے چھین لیا جاتا ہے۔ یہاں نہ مل کر رہنے سے بات بنتی ہے اور نہ تنہا رہنے سے۔ میری خاموشی' میری چپ میری مجبوریاں ہیں اور انہی میں میری نجات ہے۔ آپ لوگوں کا جتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ شادی کے ڈیڑھ سال بعد ہی وقت کے بے رحم ہاتھوں نے مجھے بیوگی کی چادر اوڑھا دی ہے۔"

"کیا کیا کہہ رہی ہیں آپ!" کامل حلیم نے بے انتہا چونکتے ہوئے کہا۔ "آپ شادی شدہ ہیں اور پھر بیوہ۔" وہ ہکلا سا گیا۔ باقی سب بھی سکتے کی کیفیت میں تھے۔

"جی ہاں۔" وہ زخم خوردہ مسکراہٹ سے بولی۔

"اتنی کم عمری میں شادی پھر بیوگی کا دکھ اور ایک معصوم سی بچی۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ جواں عمر بیوہ کو یہ معاشرہ کس انداز سے برتتا ہے۔ اس کے اپنے گھر میں' خاندان کے اندر اور باہر بیوہ کی شخصیت کا ایک الگ ہی خاکہ ذہن میں پلنے لگتا ہے۔ ماں باپ اس کی جوان بیوگی پر اس کی قسمت کو روتے ہیں۔

بھائی اس کو بوجھ سمجھ کر اپنی بیویوں کی زبان کا سہارا لیتے ہیں۔

خاندان کی جہاں دیدہ خواتین اپنے شاندار بیٹوں کو بیوہ لڑکی کے سائے سے دور رکھتی ہیں۔ اس گھر میں آنے سے روکتی ہیں کہ کہیں نصیبوں جلی ان کے بیٹوں کے دامن سے نہ وابستہ ہو جائے۔ اور باہر نکلنے پر تو یہ معاشرہ اسے ذلت کی وادیوں ہی دھکیل دیتا ہے تو چادر میں لپٹی یہ لڑکی جائے تو کہاں جائے کہاں ہے جائے پناہ۔ اور جب جائے پناہ کتابوں میں تلاش کی تو سکون ملا' ایک خاموشی ملی' وقار ملا' دکھ اپنی ذات کا حصہ لگنے لگے۔ معصوم بچی کے ساتھ تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع کیا تو کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر خدائے عزوجل کی مہربانیاں نہ ہوں تو ہم کہاں۔ مگر خدا کے ناشکرے تم جیسے بندے کسی کو بھی نہیں بخشتے۔

مسٹر کامل میں یہاں نوکری کرتی ہوں کیونکہ یہ میری مجبوری ہے۔" وہ سب اس کو خاموشی سے بولتا دیکھ رہے تھے اور سن رہے تھے۔ ثمینہ اور عالیہ کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور وہ کہہ رہی تھی۔

"میں ہنسنا نہیں چاہتی۔ آپ لوگوں کے ساتھ چائے نہیں پینا چاہتی' باہر گھوم پھر نہیں سکتی' آپ لوگوں کے ساتھ کیونکہ کسی کا ایک جملہ' ایک طنز ایک الزام' میری ذات کو بہ آسانی زخمی کر سکتا ہے۔

میں اپنی بیٹی کے ساتھ ہنستی ہوں۔ اپنے والدین کے ساتھ ہنستی ہوں کیونکہ مجھے انہیں خوش رکھنا ہے۔ اپنے گھر کو سکون دینا ہے کہ یہ میری مجبوری ہے۔ مجبوری کے اپنے رنگ ہوتے ہیں ہم جیسی حماں نصیب لڑکیاں بیوگی کے داغ نہیں چھپا سکتیں' صرف چھپا سکتی ہیں تو زندگی سے بھرپور جذبے۔ سو انہی جذبوں کو چھپائے زندگی کی جدوجہد میں صرف اپنی ذہانت اور محنت کے بل بوتے پر اپنے آپ کو منوا رہی ہوں۔

کسی تہمت کو اپنے دامن سے وابستہ نہیں کرنا چاہتی کیونکہ میری بیٹی کا مستقبل میرے سامنے ہے اور یہی سب سے بڑی مجبوری ہے۔" بہت مضبوط لہجے میں اپنی بات مکمل کر کے وہ ایک وقار کے ساتھ ایڑی کے بل گھومی اور ٹھک ٹھک کرتی سیڑھیاں اتر گئی۔ اور کامل حلیم اس کی مجبوری کے سحر میں جکڑا جیسے اپنی قوت گویائی کھو چکا تھا۔ جبھی تو لبوں پر۔ طنز تھا' نہ کوئی نشتر' انسان بھی کتنا مجبور ہوتا ہے۔ ✡ ✡

۲

دوسرا اور آخری حصہ

مکمل ناول

عینا نے حمیدہ سے کہہ کر اس کے لیے کھانا بنانے کو کہا تھا۔ اور باہر آکر اماں کو فون کرنے لگی تھی۔ تیسری بار نمبر ملانے پر انہوں نے فون اٹھایا تھا۔ ان کی آواز مدھم تھی۔
"اماں آپ ٹھیک ہیں نا" وہ پریشان ہو گئی تھی۔
"ہاں میں ٹھیک ہوں تیری مامی ابھی باہر نکلی ہے۔ اور بچیاں اندر ٹی۔وی کے سامنے بیٹھی ہیں۔ باہر نکل آئیں تو بات کرنی مشکل ہو جائے گی۔"
"اماں آپ کے پاس کچھ پیسے ہوں تو موبائل فون منگوا لیں ——— وہ پڑوس میں رشیدہ خالہ کا بیٹا ہے نا اس سے کہیں۔ پھر رات میں جب آپ سونے کے لیے جایا کریں گی تو روز بات کروں گی۔ مجھے آپ کی بہت فکر رہتی ہے اماں۔"
"تو میری فکر نہ کیا کر عینا۔ بس اپنی پڑھائی کر لے پھر تیری پھپھو تیرا رشتہ کروا دیں گی کسی اچھی جگہ تو اپنے گھر کی ہو جائے گی تو میں سکون سے مر سکوں گی۔"
"اماں پلیز ایسی باتیں مت کیا کریں؟"
"سن اگر سیال سے کوئی تمہیں لینے آئے تمہارا ماما مظفر یا ظفر تو ہرگز ہرگز نہ آنا۔ بھلے وہ تم سے کچھ بھی کہیں۔ میری موت کا ہی کیوں نہ بتائیں۔"
"اماں۔" اور ساتھ ہی فون بند ہو گیا تھا۔ فون بند ہونے سے پہلے اس نے ثنا کی آواز سنی تھی جو اماں کو بلا رہی تھی۔
اس نے ایک گہرا سانس لے کر ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔
"پتا نہیں اماں اس طرح کی باتیں کیوں کرتی ہیں۔" وہ پریشان سی ہو گئی تھی۔
تب ہی فون کی بیل ہونے لگی تھی وہ پاس ہی بیٹھی تھی اس نے فون اٹھا لیا۔ دوسری طرف صائم تھا۔
"ہے کیسی ہو عینا۔" وہی بے تکلف انداز۔
"اچھی ہوں لیکن تم شاید بھول گئے ہو کہ میں تم سے دو سال بڑی ہوں۔"
"او ہاں۔" اس نے قہقہہ لگایا تھا۔
"تھینکس تم نے یاد دلا دیا تو کیا اب میں تمہیں آپا کہہ کر بلاؤں۔" وہ پھر زور سے ہنسا۔
"مجھ سے یہ توقع مت رکھنا۔ ویسے تمہیں یاد دلا دوں دو سال بڑا ہونے کے باوجود تم مجھ سے ڈرتی تھیں اور بے وقوف بھی تھیں۔ میرا اچھا خاصا رعب پڑ گیا تھا تم پر ہے نا۔"

وہ سچ کہہ رہا تھا۔ عہنا کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اور ڈیئر، ہمارے برادر محترم کا کیا حال ہے۔ کہیں چلے تو نہیں گئے۔"

"نہیں ابھی تو ارحم بھائی ادھر ہی ہیں اور پہلے سے کافی بہتر ہیں۔"

"کاش وہ میرے آنے تک رکے رہیں۔ جانتی ہو مجھے بارہ سال ہوگئے ہیں ان سے ملے ہوئے۔"

"جانتی ہوں۔"

اور پھر چند ادھر ادھر کی باتیں کرکے اس نے فون بند کردیا تھا۔ لیکن اس کے فون نے اس کی اداسی کسی حد تک کم کردی تھی۔ کھانا کھاکر وہ اپنے کمرے میں آئی تھی۔ اس نے سوچا وہ سحر کو خط لکھے۔ جب وہ گھوٹکی میں تھی تو مہینے دو مہینے بعد سحر کو خط ضرور لکھتی تھی۔ جس میں گزرے مہینے کی پوری تفصیل ہوتی تھی۔ سحر نے اگرچہ خط کا جواب کبھی نہیں دیا تھا لیکن وہ خط ضرور لکھتی تھی۔ یہاں سحر اس کا خط ملنے پر ایک مختصر سا فون ضرور کردیتی تھی۔ جس سے اسے سحر کی خیریت معلوم ہوجاتی اس سے تو کبھی کبھار ہی بات ہوپاتی تھی ورنہ اماں سے ہی بات کرکے وہ فون بند کردیتی تھی۔ اب تو چھ سات ماہ ہوگئے تھے اسے خط لکھے ہوئے۔ اس نے قلم اٹھالیا۔ لیکن پھر چند لفظ لکھ کر چھوڑ دیا۔ اتنے دن ہوگئے تھے اسے یہاں آئے آخر سحر تائی پھپھو کو تو فون کرتی ہوں گی اس سے بھی تو بات کرسکتی تھیں۔ صائم نے بھی تو بات کی تھی۔ شاید وہ مصروف ہوں یا پھر پھپھو نے انہیں میرا بتایا ہی نہ ہو۔ اور شاید ان کی اماں سے بھی بات نہ ہوئی ہو۔ چلو کل خط لکھوں گی۔ اس نے کتاب اٹھائی اور پڑھنے لگی۔

☆ ☆ ☆

وہ کرسی کی پشت پر سر رکھے آنکھیں موندے غلام علی کی غزل سن رہا تھا۔

ہم تیرے شہر میں آئے ہیں مسافر کی طرح
صرف اک بار ملاقات کا موقع دے دے
میری منزل ہے کہاں میرا ٹھکانہ ہے کہاں
صبح تک تجھ سے بچھڑ کر مجھے جانا ہے کہاں
سوچنے کے لیے اک رات کا موقع دے دو
ہم تیرے شہر میں آئے ہیں مسافر کی طرح
اپنی آنکھوں میں چھپا رکھے ہیں جگنو ہم نے
اپنی پلکوں پہ سجا رکھے ہیں آنسو ہم نے
آج کی رات میرا درد محبت سن لے
کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کی شکایت سن لے
بھولنا ہی تھا تو اقرار کیا ہی کیوں تھا

دروازے پر دستک ہوئی تھی اور پھر عہنا نے ذرا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا تھا۔ اس نے کانوں سے ہیڈ فون نکال کر عہنا کی طرف دیکھا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ لیکن وہ اب بھی گنگنا رہا تھا۔

بھولنا ہی تھا تو اقرار کیا ہی کیوں تھا
صرف دو چار سوالات کا موقع دے دے
ہم تیرے شہر میں

"آپ کی آواز میں بہت سوز ہے ارحم بھائی۔"
عہنا دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی۔

"وہ بھی یہی کہتی تھی۔" اس نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"کون چاندنی۔" عہنا کے لبوں سے بے اختیار نکلا تو ارحم چونکا۔

"آپ کھڑی کیوں ہیں بیٹھ جائیں عہنا؟"

"آپ کو چاندنی سے بہت محبت تھی ارحم بھائی۔"

"ہم۔ آپ کیسے جانتی ہیں عہنا چاندنی کو۔"

"سوری ارحم بھائی جب آپ بیمار تھے تو آپ نے کئی بار چاندنی کا نام لے کر بات کی تھی۔ میں نے آپ کو بتایا بھی تھا شاید۔"

"ہاں۔"

اس نے ایک گہری سانس لے کر عہنا کو بغور دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں تاسف تھا۔ دکھ تھا اس کے لیے۔

"وہ میرے لیے کیا تھی شاید میں کبھی کسی کو بتا نہیں پاؤں گا۔ وہ میرے رواں رواں میں بس چکی

تھی۔" اس نے جیسے خود کلامی کی۔ اور عہنا کی طرف دیکھا جو ابھی تک کھڑی تھی۔

"وہ میں پوچھنے آئی تھی ارحم بھائی آپ نے دن میں کھانا نہیں کھایا حمیدہ نے مجھے ابھی بتایا ہے آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"

"ٹھیک ہے عہنا۔ بس بھوک نہیں تھی مجھے اور آپ میرے لیے پریشان مت ہوا کریں پلیز۔ میں عادی نہیں ہوں اس طرح کے التفات کا۔"

"پلیز ارحم بھائی اس طرح اجنبیوں کی طرح بات مت کیا کریں۔"

"تو کیا میں آپ کے لیے اجنبی نہیں ہوں کیا رشتہ ہے میرا آپ سے۔"

"ٹھیک ہے میرا آپ سے کوئی رشتہ نہیں ارحم بھائی لیکن آپ میرے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ جب میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا تھا تب بھی آپ میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ سحر آپی آپ کا اتنا ذکر کرتی تھیں کہ جب آپ گاؤں آئے تو مجھے بہت اچھے لگے تھے۔ ابا کے بعد پہلی بار کسی نے مجھ سے اس طرح بات کی تھی اتنی شفقت اور اتنی محبت ہے۔" اس کی آنکھوں میں نمی سی پھیل گئی۔

"میں آپ کو کبھی نہیں بھولی۔ میں نے آپ کو ہمیشہ یاد کیا۔

مجھے یاد ہے جب میں یہاں آئی تھی تو آپ گھر کے اندر رہتے تھے اور ان دنوں آپ کتنے خوش رہتے تھے اور آپ نے مجھے کتنا گھمایا تھا۔ آپ کو یاد ہے نا۔"

"نہیں مجھے کچھ یاد نہیں ہے عہنا۔ میں سب بھول چکا ہوں پلیز۔ مت دہراؤ وہ سب گزر چکا ماضی بن چکا۔" وہ جو ہونٹ بھینچے بیٹھا تھا یکدم اس نے عہنا کی طرف دیکھا۔ عہنا کی نم آنکھوں کی طرف اور پھر یکدم ہی نظریں جھکالیں۔

"آپ جائیں عہنا پلیز اور مجھے تنہا چھوڑ دیں۔"

"تاکہ آپ میرے جانے کے بعد ڈرنک کریں لو۔" ارحم نے چونک کر اسے دیکھا وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"غم اس طرح ہلکا نہیں ہوتا ارحم بھائی دکھ تو کہہ دینے سے ہلکے ہوتے ہیں۔ آپ نے کبھی کسی کو اپنے دل کا حال نہیں بتایا۔ میں جانتی ہوں۔"

"مجھے بتائیں آپ دیکھیں گے کہہ دینے سے۔"

"آپ کیا جاننا چاہتی ہیں عینا۔" ارحم کی آواز مدھم تھی۔

"وہ سب جو آپ کے دل میں ہے، جو آپ نے کسی سے نہیں کہا۔" عینا مسکرائی۔

"وہ سب۔" اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبایا۔

"وہ سب جو میرے دل میں ہے اگر میں نے آپ سے کہہ دیا تو آپ سہار نہیں سکیں گی۔"

عینا لمحہ بھر خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

"اچھا چلیں آپ مجھے چاندنی کے متعلق بتائیں۔" اس کا انداز بڑا دوستانہ تھا۔ ارحم کو حیرت ہوئی۔ ابھی تین دن پہلے تو وہ اس سے ڈرتے ڈرتے پوچھ رہی تھی میں آپ کے لیے سوپ اور کھانا بھجوادوں اور آج اتنے استحقاق سے بات کر رہی ہے۔ یہ لڑکیاں بھی بس ایسے ہی ہوتی ہیں ذرا سی لفٹ کراؤ تو کمبل ہی ہو جاتی ہیں۔ اس کے اندر کڑواہٹ گھلنے لگی۔

"تو ارحم بھائی۔" وہ دروازے کے پاس سے ہٹ کر صوفہ چیئر پر بیٹھ گئی۔

"بتائیں نا یہ چاندنی کون تھی اور کہاں ملی آپ کو۔"

"میری زندگی میں آنے والی سب عورتیں میرے لیے کاغذ کی بنی ہوئی تحریریں ہیں۔ بے فیض اور بے رنگ۔ چاندنی بھی ایسی ہی ایک تحریر تھی اور پلیز اب آپ جائیں میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔" نہ جانے کیا کچھ یاد آگیا تھا اور کیا کچھ تکلیف دے رہا تھا۔ عینا نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے جیسے آگ نکل رہی تھی اور وہ ہونٹ بھینچے جیسے کسی اذیت کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ٹھیک ہے ارحم بھائی میں جا رہی ہوں لیکن پلیز اپنے آپ کو تکلیف مت دیجیے گا۔"

وہ دوبارہ صاف صاف نہ کہہ سکی تھی کہ وہ ڈرنک نہ کرے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا تھا۔ آس پاس کہیں کوئی بوتل وغیرہ نہیں پڑی تھی۔ اسے ڈرنک کرنے والوں سے نفرت تھی لیکن ارحم کو اس نے خود ہی مارجن دے کر اسے اس لسٹ سے نکال دیا تھا۔

ارحم بھائی چاندنی کو بھلانے اور اپنا غم غلط کرنے کے لیے ڈرنک کرتے ہیں۔ اور پھر اتنے دن ہو گئے تھے اس نے انہیں نشے میں زور زور سے بولتے یا گالیاں دیتے نہیں سنا تھا۔ اور پھر اس نے ہمیشہ ہی انہیں آئیڈیالائز کیا تھا۔ اس کے نزدیک وہ بہت اچھے تھے اور ان جیسا کوئی نہیں تھا۔ نہ ماموں نہ ظفر بھائی نہ مظفر۔ ظفر بھائی کا خیال آتے ہی اس نے جھرجھری لی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

ارحم نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ زخموں کے ٹانکے کھل گئے تھے اور کھلے زخم تکلیف دے رہے تھے۔ اور پتا نہیں۔ کب یہ زخم بھریں گے کب میں اسے اور اس اذیت کو بھول پاؤں گا۔ اتنے سال گزر گئے اجنبی سرزمینوں کی خاک چھانتے صحرانوردی کرتے لیکن وہ اذیت اسی طرح تازہ ہے اور وہ اسی طرح دل میں براجمان ہے۔ کاش وہ مجھ سے کہہ دیتی۔ میں مجبور ہوں ارحم۔ تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ تو میں خاموشی سے اس کے راستے سے ہٹ جاتا۔ وہ مجھے کہتی میں اپنا سر کاٹ کر اس کے قدموں میں رکھ دیتا لیکن وہ میرے ساتھ ایسا نہ کرتی مجھے یہ سزا نہ دیتی۔

اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور ایک گہرا درد اس کے دل کو جیسے چھیل رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ یونہی بیٹھا جیسے اس درد کو جھیلنے کی کوشش کرتا رہا۔ بہت دیر بعد وہ اٹھا اور کھڑکی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

باہر ملگجا اندھیرا تھا شام گہری ہو رہی تھی۔ اور اس گہری ہوتی شام میں درختوں کے پتے تیز ہوا سے سرسرا رہے تھے۔ بیتی شاموں میں سے ایک شام جیسے وہاں آکر ٹھہر گئی تھی۔ اس شام وہ وہاں کھڑی تھی لیموں کے پودے کے پاس اور اس نے لیمن کلر کا سوٹ پہنا

ہوا تھا۔ جس پر میرون کڑھائی اور میرون ہی ستاروں کا کام تھا اس شام وہ مبہوت سا اسے دیکھتا رہ گیا تھا اور وہ شام اس کی زندگی کی سب سے خوبصورت شام تھی کیونکہ اسی شام وہیں کھڑے کھڑے اس نے اعتراف کیا تھا۔

"ارحم میں تم سے بہت محبت کرنے لگی ہوں۔ بہت شدید۔ محبت۔" اس سے پہلے اس نے I love You کا کارڈ بھیجا تھا لیکن زبان سے پہلی بار اقرار کیا تھا۔ اور یہ وہ بات تھی جو وہ چاہت کے باوجود اس سے نہ کہہ سکا تھا اور اس نے بہت آسانی سے پلکیں جھپکتے ہوئے کہہ دی تھی۔ اسے یقین نہیں آیا تھا کہ جو کچھ اس نے سنا ہے وہ سچ ہے۔ وہ بس اسے دیکھے جا رہا تھا اور وہ یکدم اداس ہوئی تھی۔ کچھ دیر پہلے کے چمکتے چہرے پر جیسے یکدم بادل چھا گئے تھے۔

"تم کیا سوچنے لگے ہو ارحم میں شاید تمہارے قابل نہیں ہوں۔ تم ایک امیر باپ کے بیٹے اور میں ایک یتیم غریب لڑکی ہوں دل تو یہ سب نہیں دیکھتا ناں۔"

"پلیز اور کچھ مت کہنا۔" اس نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"میں تو سوچ رہا تھا کیا میں واقعی اتنا خوش قسمت ہوں کہ تم مجھے چاہو۔"

"ہاں میں تمہیں بہت چاہتی ہوں ارحم۔ مجھے خود نہیں پتا کب کیسے تم میرے دل میں اتر آئے۔" اس نے درخت کے تنے پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا اور ارحم کو لگا تھا جیسے وہ اس وقت دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی ہو۔ جسے پہلی نظر نے پسند کیا تھا اور جو چپکے سے اس کے دل میں اتر آئی تھی وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ اور خوشی سے سرشار ہو کر اس نے اس کے ہاتھ پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"میں بھی تم سے بہت محبت کرتا ہوں لیکن مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ محبت کے بچھڑ جانے سے۔ تم مجھے کبھی چھوڑ کر نہ جانا زندگی ورنہ میں جی نہیں پاؤں گا۔"

اس شام ہاتھوں میں ہاتھ دیے وہ بہت دیر تک پچھلے لان میں ٹہلتے رہے تھے۔ حتی کہ شام گہری ہو گئی تھی۔ اور اس شام دونوں نے ایک دوسرے سے ساتھ نبھانے کے عہد کیے تھے۔ عمر بھر اکٹھا رہنے کے لیکن پھر کیا ہوا تھا۔ بیچ راستے میں اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا تھا۔ بڑی بے دردی سے۔

اس نے ایک گہری سانس لی۔ اندر برسات ہو رہی تھی لیکن باہر آنکھیں خشک صحرا سی تھیں۔

اس نے آنکھوں کو رگڑا اور کھڑکی کے پاس سے ہٹ آیا۔ اور آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے سر پیچھے رکھتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔ اور ماضی اپنی تمام تر اذیت کے ساتھ جیسے اس کے اندر زندہ ہو گیا تھا۔

ماضی، جس میں خوشی اور مسرت کے لمحے تو بہت کم تھے لیکن بارہ سال سے وہ ایک اذیت ایک دکھ کے ساتھ جینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کتنا چاہا تھا کہ وہ سب کچھ بھول جائے اپنا اچھا برا بھلا ماضی سب بھلا دے اور صرف حال میں زندہ رہے لیکن نہ اذیت کم ہوتی تھی نہ ماضی بھولتا تھا اور یہ لڑکی عمنا اس سے کہہ رہی تھی کہ وہ اس سے اپنا غم شیئر کرے۔ اس لڑکی سے جو۔ اور اگر وہ دنیا کی آخری انسان بھی ہوتی تو بھی وہ اس سے اپنا دکھ شیئر نہ کرتا۔ اس عمنا جلال سے جو بیگم راحت کی بھتیجی تھی۔

جب وہ یہ سوچ رہا تھا تو ہرگز نہیں جانتا تھا کہ ایک روز وہ اسی عمنا کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دے گا اور وہ سارے آنسو اس کے سامنے بہا دے گا جو اس نے برفاب کر کے اپنے اندر اتار لیے تھے۔ وہ واقعی نہیں جانتا تھا کہ اندر سے وہ کس لمحے کمزور پڑا تھا۔

جب وہ اس کے سر پر پٹیاں رکھ رہی تھی۔ یا جب وہ اس کے ساتھ اسپتال گئی تھی۔ اور اس کے لیے پریشان ہو رہی تھی۔

یا جب وہ اس کے لیے سوپ بنوا کر بھجواتی تھی یا جب وہ اسے ڈرنک کرنے سے منع کر رہی تھی۔ نہیں بلکہ اس وقت جب اس نے اس کے ہاتھ سے مشروب کا گلاس لے کر کھڑکی سے باہر گرا دیا تھا۔

"نہیں ارحم بھائی میں آپ کو یہ زہر نہیں پینے دوں گی۔ دکھ اور غم اس طرح نہیں بھلائے جاتے۔"

"کس طرح؟" اس نے حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔

"یوں شراب پی کر۔"

"ہوں" اس نے بے اختیار امڈ آنے والی مسکراہٹ کو سر جھکا کر چھپانے کی کوشش کی تھی اور پھر لمحہ بھر بعد سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھری تھیں اور وہ پلکیں جھپک جھپک کر شاید انہیں روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"سوری ارحم بھائی آپ کو یقیناً اچھا نہیں لگا ہوگا غصہ آ رہا ہوگا مجھ پر لیکن ارحم بھائی۔۔۔ آپ کو نہیں پتا کہ یہ صحت کے لیے کتنی نقصان دہ ہے۔ آپ ایک لڑکی کی خاطر خود کو کیوں تباہ کر رہے ہیں۔ مت کریں اپنے ساتھ ایسا۔ مت سزا دیں خود کو۔" اور رکے ہوئے آنسو رخساروں پر ڈھلک آئے تھے۔ وہ رو رہی تھی۔ وہ ارحم فراز خان کے لیے رو رہی تھی پتا نہیں اس کے آنسو سچے تھے یا جھوٹے لیکن وہ لمحہ تھا جب ارحم کے دل میں اس کے لیے موجود غصہ آپوں آپ ختم ہو گیا تھا۔ اس سے وہ اسے وہی ھمنا لگی تھی کھیت کی منڈیر پر بیٹھی اپنے دکھ سکھ اس سے شیئر کرتی معصوم سی ھمنا۔ جو سمجھتی تھی جن کے ابا نہیں ہوتے انہیں کوئی شرارت نہیں کرنا چاہیے۔

"او کے ھمنا آپ روئیں تو مت ٹھیک ہے آئندہ کوشش کروں گا کہ ڈرنک نہ کروں۔"

"پرامس" وہ روتے روتے مسکرا دی تھی۔

"ہاں پرامس۔"

اس نے دلچسپی سے اسے دیکھا تھا۔ اور شاید یہی وہ لمحہ تھا جب وہ اسے بہت معصوم بہت سادہ لگی تھی۔ اور اس روز اس نے ھمنا سے دوستی کر لی تھی۔ لیکن ساتھ ہی اس نے اسے تنبیہہ بھی کر دی تھی کہ وہ اس سے اس کی ذاتی زندگی یا تنہائی کے متعلق کوئی بات نہیں کرے گی۔

"ہاں نہیں کروں گی لیکن آپ بھی ڈرنک نہیں کریں گے۔" اور وہ کھلکھلا کر ہنس دیا تھا۔

"اگر میں آپ سے وعدہ کر لوں کہ میں ڈرنک نہیں کروں گا اور میں پھر بھی ڈرنک کرتا رہوں تو رات میں دن میں کسی وقت جب آپ نہ ہوں یا جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا تب۔"

"مجھے یقین ہے ارحم بھائی اگر آپ نے وعدہ کر لیا ہے تو پھر ضرور پورا کریں گے۔" اس کی آنکھوں میں اتنا یقین تھا اتنا اعتماد کہ وہ حیرت زدہ رہ گیا ہے۔

"آپ کو مجھ پر اتنا یقین ہے ھمنا حالانکہ میں آپ سے اپنی زندگی میں اس سے پہلے صرف دو بار ملا ہوں تب آپ بچی تھیں۔۔۔ آپ مجھے کتنا جانتی ہیں۔"

"میں آپ کو جتنا بھی جانتی ہوں ارحم بھائی مجھے یقین ہے کہ اگر آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تو اسے کبھی نہیں توڑیں گے۔"

"فرض کریں ھمنا اگر کوئی آکر آپ سے کہے کہ ارحم کسی بے خانے میں بیٹھا پی رہا ہے اور۔۔۔"

اس کی آواز ٹوٹی ہوئی سی تھی۔ ھمنا نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی تھی اور فوراً کہا تھا۔

"میں بالکل یقین نہیں کروں گی ارحم بھائی بالکل بھی نہیں میں اس سے کہوں گی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ارحم بھائی کبھی ایسا نہیں کر سکتے کبھی نہیں کیونکہ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔"

اس کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ وہ یکدم کھڑا ہوا اور رخ موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

اور انہوں نے اس کا یقین نہیں کیا تھا۔ وہ جو اس کے اپنے تھے اس کے ڈیڈی اور وہ۔

نہیں وہ تو خود اس ڈرامے کا ایک کردار تھی اور اس نے خود ہی تو بیگم راحت کے ساتھ مل کر یہ سارا ڈرامہ ترتیب دیا تھا۔ کیوں۔۔۔ وہ آج بھی اس کا جواب نہیں جانتا تھا اور اس روز کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"لیکن انہوں نے میرا اعتبار نہیں کیا تھا ھمنا۔"

"انہوں نے۔" اس نے مڑ کر دیکھا اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"پلیز ھمنا مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ پرامس میں

ڈرنک نہیں کروں گا اور میں ضرور کسی روز آپ سے وہ سب شیئر کروں گا جو آپ جاننا چاہتی ہیں لیکن اس وقت نہیں۔"

"ٹھیک ہے ارحم بھائی۔"

عینا خاموشی سے اٹیکسی سے چلی گئی تھی اور اسے اپنے ہی کے لفظوں پر حیرت ہوئی تھی ابھی دو دن پہلے تو وہ سوچ رہا تھا کہ عینا اگر اس دنیا کی آخری لڑکی بھی ہوئی تو۔

ایک گہری سانس لے کر وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ آیا تھا اور ماضی ایک بار پھر اپنی پوری جزئیات کے ساتھ اس کے سامنے تھا۔

اسے بیگم راحت کے ساتھ کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا وہ اپنی دنیا میں مگن رہتا تھا۔ اپنی پڑھائی اور اپنا کمرہ لیکن صائم سے اسے بہت محبت تھی۔

وہ کتنا بھی مصروف ہوتا صائم کے لیے وقت ضرور نکال لیتا۔ اس کے ساتھ گیمز کھیلتا اسے گھمانے لے جاتا اور اس سے باتیں کرتا۔ زندگی بس ایسے ہی گزر رہی تھی۔ چھٹی والے دن تو صائم سارا وقت اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ ڈیڈی بیگم راحت سے ہنس کر کہتے۔

"لگتا ہے تم نہیں ارحم صائم کی ماں کا کردار ادا کر رہا ہے۔" اور بیگم راحت بھی مسکرا دیتی تھیں۔

"دونوں بھائیوں کی محبت دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے خدا اللہ کرے یہ محبت ہمیشہ قائم رہے۔"

سحر کے آنے کی اطلاع اسے صائم نے ہی دی تھی۔

اس روز صائم اس کے کمرے میں پلے اسٹیشن پر کوئی گیم کھیل رہا تھا کہ اچانک اس نے ارحم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"بھائی آپ سحر آپی سے ملے۔"

اس نے کتاب سے نظریں اٹھا کر صائم کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"کون سحر۔"

"ہمارے ماموں کی بیٹی اور کون۔" صائم ہنسا تھا۔

تب صائم اتنا چھوٹا تھا کہ وہ نہیں جانتا تھا کہ ارحم اس کا سوتیلا بھائی ہے۔ شاید بیگم راحت نے اسے تب تک نہیں بتایا تھا۔

"وہ اب یہاں ہی رہیں گی ہمارے گھر۔ یہاں پڑھنے آئی ہیں۔ گاؤں میں اچھے اسکول اور کالج نہیں ہیں نا۔"

یہ اطلاع بھی اسے صائم نے ہی دی تھی اور اس نے سرسری انداز میں سنا تھا۔ اس نے ایک دو بار بیگم راحت سے سنا تو تھا اپنی بھابھی اور بھتیجیوں کا ذکر کرتے اور وہ کبھی کبھار ان سے ملنے گاؤں بھی جایا کرتی تھیں، لیکن وہ لوگ کبھی ادھر نہیں آئے تھے اور وہ سحر کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ کتنی بڑی ہے اور کس کلاس میں پڑھتی ہے۔ خود وہ یو ای ٹی میں پڑھ رہا تھا۔ وہ انجینئر بننا چاہتا تھا اور ڈیڈی نے اس کی خواہش کو اہمیت دی تھی حالانکہ وہ چاہتے تھے کہ وہ ایم بی اے کرے، لیکن اس کے ذہن میں تھا کہ اسے انجینئر بننا ہے شاید جب وہ چھوٹا تھا تو اس کی ماما کہا کرتی تھیں میرا بیٹا بڑا ہو کر اپنے ماموں کی طرح انجینئر بنے گا اس کے اکلوتے ماموں جو انجینئر تھے۔ ینگ ایج میں ہی ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں وفات پا گئے تھے۔ ماما کو ان سے بہت محبت تھی۔

اس نے اگلے دن ناشتے کی ٹیبل پر سرسری انداز میں اسے دیکھا تھا۔ وہ بیگم راحت کے دائیں طرف دوپٹا اچھی طرح لپیٹے بیٹھی تھی اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"یہ سحر ہے ارحم۔" بیگم راحت نے تعارف کروایا تھا۔

"السلام علیکم۔" وہ سلام کر کے جلدی جلدی ناشتا کر کے چلا گیا تھا۔ اور پھر اگلے چھ ماہ تک اس کی یہی روٹین رہی تھی۔ کھانے کی ٹیبل پر وہ یونہی سر جھکائے بیٹھی ہوتی تھی۔ وہ صائم یا ڈیڈی سے باتیں کرتا ہوا کھانا ختم کر کے چلا جاتا تھا اس نے کبھی دھیان سے اس کی طرف نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی براہ راست اس سے بات ہوئی تھی۔ پھر وہ کبھی کبھی لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھتی یا بیگم راحت اور صائم سے باتیں کرتی نظر آنے لگی تھی، لیکن تب بھی اس نے

نظر اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ اگر سامنے بھی ہوتی تو وہ نظریں جھکائے رکھتا تھا۔ کبھی دانستہ اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اسے وہاں آئے تقریباً" سال ہو گیا تھا جب ایک روز صائم نے اس کے بیڈ پر اس کے قریب لیٹتے ہوئے سرگوشی کی تھی۔

"بھائی یہ جو سحر آپی ہیں نا وہ کہہ رہی تھیں، تمہارے ارحم بھائی بہت اچھے ہیں۔"

"وہ تو خیر میں ہوں۔" اس نے صائم کو گدگدی کی تھی۔

"ہاں تو میں نے بھی یہی کہا تھا' لیکن وہ کہہ رہی تھیں کہ آپ انہیں بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔"

"اچھا۔" وہ ہنس دیا تھا۔

وہ سانولے رنگ کا ایک پرکشش لڑکا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں بلا کا سحر تھا اور اس کی شخصیت میں ایک خاص مقناطیسیت تھی اس نے یونیورسٹی میں اکثر لڑکیوں کو خود کی طرف متوجہ ہوتے دیکھا تھا' لیکن اسے ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ اپنے آپ میں مگن رہتا تھا اور یہ بے نیازی اسے اور بھی اٹریکٹو بناتی تھی اور یہ بات وہ جانتا تھا۔

"کیا تم اچھے نہیں لگتے اپنی سحر آپی کو۔" اس کے گال پر چٹکی لیتے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔

"میں تو خیر بہت اچھا لگتا ہوں انہیں' آپ سے بھی زیادہ اور یہ بات مجھے پتا ہے۔ لیکن آپ کو نہیں پتا کہ آپ انہیں اچھے لگتے ہیں اس لیے انہوں نے مجھے کہا تھا کہ میں آپ کو بتادوں" اور اس نے اپنے دل میں سحر کے لیے انتہائی ناگواری محسوس کی تھی اور وہ اسے پہلے سے بھی زیادہ اگنور کرنے لگا تھا اگر وہ کبھی اکیلی لاؤنج میں بیٹھی ہوتی تو وہ اس کی طرف دیکھے بغیر اور وہاں رکے بغیر گزر جاتا تھا۔ وہ یہ تو جانتا تھا کہ وہ ایک خوش شکل لڑکی ہے لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اتنی خوب صورت ہے کہ وہ مبہوت ہو جائے گا ہمیشہ اپنے آپ کو دوپٹے میں اچھی طرح لپیٹے سر جھکائے بیٹھی رہتی تھی' لیکن اس روز لان میں سفید نقرئی ستاروں سے بجے لباس میں ملبوس وہ اسے کوئی آسمان سے اتری حور لگ رہی تھی۔ وہ کوئی اپسرا تھی یا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ سحر ہی ہے۔

اس روز اس کا جی چاہا تھا کہ وہ اسے دوبارہ دیکھے اور وہ اس کی واپسی تک لاؤنج میں ہی بیٹھا ٹی وی دیکھتا رہا تھا۔ وہ دل پھینک نہیں تھا اس کی یونیورسٹی میں ایک سے ایک خوب صورت لڑکی تھی' لیکن ان میں کوئی بھی سحر جلال جیسی نہیں تھی یا اسے نہیں لگی تھی۔

اس رات پہلی بار سونے سے پہلے بہت دیر تک وہ غیرارادی طور پر اسے سوچتا رہا تھا اور پھر ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ ایک دوسرے کے قریب آتے گئے تھے۔

وہ جو اپنے آپ کو دوپٹے کی بکل میں چھپائے رکھتی تھی اب گھنٹوں اس سے بے تکلفی سے باتیں کرتی وہ صائم کے ساتھ کھیل رہا ہوتا تو وہ بھی اس کے یا صائم کے کمرے میں چلی آتی اسے تو پتا بھی نہ چلا تھا کہ کب وہ اس کی محبت میں مبتلا ہوا اور کب اس کی رفاقت کی چاہ اس کے دل میں پیدا ہوئی ہاں جس روز اس نے اعتراف محبت کیا اس روز اسے لگا تھا جیسے ارحم فراز دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہو کہ دل نے جس کی چاہ کی تھی وہ بھی اسے چاہتا تھا۔ اس اعتراف کے بعد تو زندگی اور بھی خوب صورت ہو گئی تھی۔ پھر کتنے عہد و پیمان ہوئے تھے۔

عمر بھر ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائی تھیں۔ وہ اپنے جذبوں کے اظہار میں بہت بے باک تھی۔ اس کے پاس بے شمار لفظ تھے اپنے جذبوں کے اظہار کے لیے' لیکن وہ ہمیشہ جھجک جاتا تھا۔ وہ اس کی طرح اپنی محبتوں اور جذبوں کا اظہار نہیں کرپاتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا شاید لفظ ان جذبوں کے اظہار کے لیے بہت تھوڑے اور حقیر ہیں جو جذبے وہ اس کے لیے اپنے دل میں رکھتا ہے۔ پھر بھی اس کے ہر عمل سے اس کی محبت اور جذبہ جھلکتا تھا اور وہ ان شدتوں کو جانتی تھی اور کئی بار اس نے اس پر فخر کا اظہار کیا تھا کہ وہ کتنی خوش قسمت ہے کہ ارحم فراز کے دل میں بستی ہے اور وہ اسے اتنی شدتوں سے چاہتا تھا' لیکن اس سب جاننے کے باوجود اس نے اپنا راستہ بدل لیا تھا اور اسے

احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ بدل رہی ہے۔

وہ خود ان دنوں بے حد مصروف تھا۔ تعلیم ختم کرکے وہ ایک کنسٹرکشن کمپنی میں تجربے کے لیے جاب کررہا تھا اور گھر میں دیر تک ڈیڈی سے اس کی گفتگو ہوتی تھی۔ وہ اپنی ایک کنسٹرکشن کمپنی بنانا چاہ رہے تھے۔ ڈیڈی کے ساتھ ڈسکس کرتے ادھر سے ادھر جاتے وہ اسے دیکھتا تو تسکین سی ہوجاتی۔ دن بھر کا تھکا ہوا وجود پرسکون ہوجاتا۔ وہ اگر اتنا مصروف نہ ہوتا تو شاید جان جاتا کہ وہ بدل رہی ہے۔ وہ تو اس کی نگاہ کی جنبش سے اس کے دل کا حال جان لیتا تھا پھر کیسے نہ جان پاتا، لیکن وہ صبح کا نکلا شام کو گھر آتا تھا۔ اس کی جاب بہت ٹف تھی سائٹ پر جاکر کام کروانا خاصا تھکا دینے والا تھا۔ فراز خان نہیں چاہتے تھے کہ وہ جاب کرے، لیکن وہ جانتا تھا کہ آج یہاں جو تجربہ اسے حاصل ہوگا وہ کل اپنی کمپنی میں اس کے بہت کام آئے گا۔

ان دنوں سحر اپنے امتحان سے فارغ ہوکر گاؤں گئی ہوئی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس پروجیکٹ سے فارغ ہوکر وہ ڈیڈی سے سحر کے متعلق بات کرے گا، لیکن اس سے پہلے سحر اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ اپنے آفس کے لیے دو تین جگہیں دیکھ کر گھر آیا تھا اور سحر کو دیکھ کر جیسے اس کی ساری تھکن ختم ہوگئی تھی۔

"تم آگئی ہو سحر۔"

"ہاں۔" وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔

"پھپھو میری شادی کررہی ہیں۔"

"نہیں۔" اسے یقین نہیں آیا تھا۔

"ایسا نہیں ہوسکتا، میں خود مما سے بات کرتا ہوں۔"

"میں پھپھو کے کسی بھی فیصلے کو رد نہیں کرسکتی۔ ہمارا سر ان کے احسانوں سے جھکا ہوا ہے۔"

"تم کچھ نہ کرنا سحر صرف میرا ساتھ دینا۔ تمہاری رائے پوچھی جائے تو میرے حق میں فیصلہ دینا۔ بس اور اداس مت ہونا پریشان مت ہونا ڈیڈی وہ تین روز تک کراچی سے آجائیں تو میں ان سے بات کروں گا۔ ڈیڈی مما کو منالیں گے مجھے یقین ہے میری جاندلی تمہیں کچھ بھی نہیں کہنا پڑے گا اور یہاں سنو ان خوب صورت آنکھوں میں آنسو نہ آئیں بالکل بھی نہیں۔" اور آج اتنے سالوں بعد وہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ اداس یا پریشان بالکل نہ تھی صرف اداس ہونے کی ایکٹنگ کررہی تھی۔

سحر کو تو اس نے تسلی دے دی تھی، لیکن خود بہت بے چین بہت مضطرب تھا۔ اسے یقین تھا پھر بھی پوری دو راتیں اسے نیند نہیں آئی تھی اور وہ صبح اٹھ کر سائٹ پر چلا جاتا تھا۔ پراجیکٹ تکمیل کے مراحل میں تھا اس لیے کام بہت تھا۔ اس روز بھی وہ بہت دیر سے آیا تھا اور سحر کو دیکھنے کی خواہش دل میں چھپائے وہ ذرا دیر کے لیے ہی بیڈ پر لیٹا تھا اور اس کی آنکھ لگ گئی تھی وہ دو راتوں کا جاگا ہوا اور تھکا ہوا تھا اس لیے سویا تو پھر آنکھ شور پر ہی کھلی تھی اور پھر کمرے کا منظر چند لمحے تو اسے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا تھا کہ کیا ہورہا ہے۔

"ڈیڈی آپ کب آئے۔" اس نے ڈیڈی، سحر اور بیگم راحت کو حیرت سے دیکھا تھا۔ پاس ہی صائم بھی کھڑا تھا۔

"تم۔ تم ارحم۔" ڈیڈی اس کے قریب آئے تھے۔

"یہ سب کیا ہے۔" انہوں نے ٹیبل پر پڑی بوتل کی طرف اشارہ کیا تھا جو آدھی خالی تھی پاس ہی گلاس تھا جس میں چند گھونٹ تھے۔ ایک خالی بوتل کارپٹ پر گری ہوئی تھی۔

"کیا ہے ڈیڈی۔" وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔

"نشے میں ہے ابھی تک۔"

بیگم راحت کی نظروں میں کیا تھا ایسا کہ وہ چونکا۔ اس نے سب کے چہروں کی طرف باری باری دیکھا تھا۔

"ہم کب سے یہ سب۔"

"ڈیڈی مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ آپ سب لوگ یہاں کیوں اکٹھے ہیں اور یہ کیا ہے۔ یہ بوتلیں کس نے رکھی ہیں یہاں۔"

"ارحم تم جھوٹ بھی بولو گے اب سب کچھ تو سامنے ہے۔ تمہاری الماری میں اس خبیث چیز کا اسٹاک کیا کسی اور نے کر رکھا ہے۔"

اس نے وارڈ روب کے ساتھ ہی موجود الماری کے طاق کو وا دیکھا تھا اور تیزی سے الماری کی طرف بڑھا تھا۔ وہاں شراب کی کئی بوتلیں پڑی تھیں۔

"نہیں مجھے ان کے متعلق کچھ نہیں معلوم۔ میں نہیں جانتا انہیں کس نے یہاں رکھا ہے۔ ڈیڈی پلیز اس طرح مت دیکھیں مجھے کیا آپ کو اپنے بیٹے پر یقین نہیں ہے۔"

"نہیں ہو تم میرے بیٹے ایک ہی بیٹا ہے میرا۔"

وہ غصے سے باہر نکل گئے تھے اور ان کے پیچھے ہی بیگم راحت بھی چلی گئی تھیں۔

"صائم۔" اس نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ صائم تھا اس کا بھائی۔ وہ چھوٹا تھا صرف بارہ سال کا، لیکن جینئس تھا۔ وہ اکثر اسے کسی نہ کسی بات پر حیران کرتا تھا۔

"صائم تمہیں تو یقین ہے ناں۔" اور صائم بھی بنا کچھ کہے ڈیڈی کے پیچھے چلا گیا تھا۔

"نہیں۔" وہ بے یقینی سے صائم کو جاتے دیکھ رہا تھا ہاں وہ کھڑی تھی سحر۔

"چاندنی۔" وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔ اور۔۔۔ وہ اس کے یقین کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے چلی گئی تھی۔ وہ ساری رات روتا رہا تھا اور کوئی ہاتھ اس کے آنسو پونچھنے کے لیے نہیں بڑھا تھا۔

"کب، کب بھول پاؤں گا یہ سب۔ جو دل میں کسی انی کی طرح گڑھا ہے اور مسلسل اذیت دیے جاتا ہے۔ کاش۔۔۔ کاش کوئی مجھے بتا سکتا کہ اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا اور یہ لڑکی عہنا جو اسی سحر جلال کی بہن ہے کیوں چاہتی ہے کہ میں اپنے غم اس سے شیئر کروں اور کیا ایسا کرنے سے واقعی یہ جلن کم ہو جائے گی جو بارہ سالوں سے تڑپاتی اور جلاتی ہے۔"

اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔

اس نے جلتی آنکھوں کو کئی بار کھولا اور بند کیا اور پھر یک دم اٹھ کر انیکسی کے دروازے کھلے چھوڑتا باہر نکل گیا۔ عہنا نے اپنے ٹیرس سے اسے تیز تیز چلتے ہوئے گیٹ کی طرف جاتے دیکھا اور آواز دی، لیکن وہ اس کی آواز سنے بغیر گیٹ سے باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ یونیورسٹی سے آئی تو لاؤنج میں مظفر کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"ارے مظفر تم کیسے آئے۔"

مظفر ناصر ماموں کا بیٹا تھا۔ عمر میں اس سے چھوٹا تھا یہی کوئی انیس بیس سال کا ہوگا، لیکن قد کاٹھ بڑا تھا اپنی عمر سے بڑا لگتا تھا۔

"تمہیں لینے آیا ہوں پھپھو نے بھیجا ہے۔" اماں کے بار بار ٹوکنے کے باوجود وہ اسے آپا یا باجی نہیں کہتا تھا بلکہ نام سے مخاطب کرتا تھا۔ اسے ہی نہیں اپنی تینوں بڑی بہنوں کو بھی وہ اسی طرح مخاطب کرتا تھا۔

"جلدی سے سامان پیک کرلو اور چلو میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔"

"اماں ٹھیک ہیں۔"

"ہاں ٹھیک ہیں بھلا کیا ہوتا ہے انہیں۔" اپنی بات کر کے شاید اسے کوئی خیال آیا تھا کہ اس نے خود ہی اپنی بات کی تردید کر دی تھی۔

"وہ کچھ بیمار رہتی ہیں اس لیے بلایا ہے تجھے۔ اچھی بیٹی ہے تو بیمار ماں کو چھوڑ کر ادھر آ بیٹھی ہے۔"

"مظفر۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی اسے ایک دم یاد آیا تھا کہ اماں نے اسے کیا تاکید کی تھی۔

"جلدی کر اب کب سے آیا بیٹھا ہوں تیرے انتظار میں۔ تو پتا نہیں کہاں سیریں کرتی پھر رہی تھی۔"

"لیکن مظفر میں ابھی نہیں جا سکتی پھپھو گھر پر نہیں ہیں وہ آئیں گی تو میں خود آجاؤں گی ان کے ساتھ۔ اور میں یونیورسٹی گئی ہوئی تھی۔"

"لیکن میں تمہیں لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔ تمہاری اماں نے کہا تھا ہر صورت لے کر آنا۔"

"لیکن میں نہیں جاسکتی مظفر۔ تمہیں اگر جلدی ہے تو چلے جاؤ ورنہ کھانا کھا کر چلے جانا۔"

"کھانا میں کھا چکا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ایک غصیلی نظر اس پر ڈالتا دروازے کی طرف بڑھا۔ عینا کے دل کو کچھ ہوا تھا اور دل اماں سے ملنے کے لیے مچل اٹھا تھا۔ غیر ارادی طور پر وہ اس کے پیچھے باہر تک آئی۔

"اماں کو میرا سلام کہنا مظفر اور انہیں بتانا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں اور خوش ہوں۔" اس نے یک دم مڑ کر اس کا بازو پکڑ لیا تھا۔ وہ برآمدے کی آخری سیڑھی پر کھڑی تھی۔

"اگر میں تمہیں یہاں سے زبردستی لے جاؤں تو کون روکے گا تمہیں۔"

"میں روکوں گا تمہیں چھوڑو اس کا ہاتھ۔" ارحم دائیں طرف سے اچانک نمودار ہوا تھا۔ شاید وہ گیٹ کی طرف جا رہا تھا۔

"ارحم بھائی۔" عینا کی آنکھیں یک دم ہی پانیوں سے بھر گئی تھیں۔

"تم کون ہو۔" مظفر کے ہاتھ میں ابھی تک عینا کا بازو تھا۔

"میں جو کوئی بھی ہوں تم۔۔۔" ارحم نے قریب آکر ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ عینا کے بازو سے ہٹایا تھا۔

"نکل جاؤ یہاں سے۔" مظفر نے ایک غصیلی نظر ارحم اور پھر عینا پر ڈالی تھی اور تیز تیز چلتا ہوا گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔

عینا وہیں برآمدے کی سیڑھی پر بیٹھ کر رونے لگی تھی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیا تھا اور رو رہی تھی۔

"عینا۔ عینا پلیز مت روئیں اور بتائیں کون تھا یہ شخص اور اس کی جرأت کیسے ہوئی کہ وہ آپ کو یہاں سے زبردستی لے جانے کی کوشش کرے۔"

عینا نے روتے روتے سر اٹھا کر ارحم کی طرف دیکھا اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

"وہ۔ وہ مظفر تھا۔"

"آپ جانتی ہیں اسے۔" ارحم اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"ماموں کا بیٹا تھا مجھے لینے آیا تھا۔"

"اور آپ نہیں جانا چاہتیں کیونکہ یہاں والی لائف اور لگژری گاؤں میں تو نہیں ہے۔ یہاں یہ اتنی آسائش والی لائف۔" ایک زہر خند مسکراہٹ ارحم کے لبوں پر آئی تھی۔

"حالانکہ آپ تو اپنی اماں کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں اکیلا لیکن ظاہر ہے جب اتنی پر آسائش زندگی سامنے ہو تو اماں۔۔۔"

"نہیں چاہیے تھی مجھے یہ پر آسائش زندگی یہ لگژری لائف۔" وہ ایک دم چیخی تھی۔

"میں اماں کے ساتھ کانٹوں کے بستر پر سو سکتی تھی بھوکی رہ سکتی تھی لیکن۔۔۔"

وہ یک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اونچی آواز میں۔ ارحم ایک دم گھبرایا تھا۔

"پلیز عینا مت روئیں۔ سوری میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

"آپ نہیں جانتے ارحم بھائی بالکل بھی نہیں جانتے مجھے کسی چیز کی خواہش نہیں نہ اچھے کھانے کی نہ اچھے کپڑوں کی نہ اس بڑے گھر کی۔ آپ کو کیا پتا میں یہاں اماں کے بغیر کتنی ناخوش ہوں۔" وہ روتے روتے کہہ رہی تھی۔

"میں یہاں نہ پڑھنے آئی ہوں نہ پھپھو کے پاس پر آسائش زندگی کے لالچ میں۔ مجھے تو اماں نے بھیجا ہے یہاں زبردستی مجبور کر کے قسمیں دے کر اور انہوں نے مجھے فون کر کے کہا تھا کہ اگر کوئی مجھے لینے آئے تو میں نہ آؤں چاہے کوئی مجھے ان کی موت کی خبر ہی نہ دے پھر بھی نہیں اور آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں یہاں کسی لالچ میں آئی ہوں۔" اس نے ایک شاکی نظر ارحم پر ڈالی۔

"آپ کو کیا پتا آپ کے اس محل میں میرا کتنا دم گھٹتا ہے دل گھبراتا ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کاش میرے پر ہوتے تو میں اڑ کر اماں کے پاس پہنچ جاتی۔" اس کی آواز بھرا گئی اور آنسو پھر اس کے رخساروں پر

اسی روانی سے بہنے لگے تھے اور وہ اس طرح شاکی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

ارحم کو اس سے وہ وہی نو سال کی بچی لگی تھی۔ کھیت کی منڈیر پر بیٹھی بڑے یقین سے کہتی ہوئی کہ وہ کبھی اپنی اماں کو چھوڑ کر نہیں جائے گی۔

"اوکے۔ لوکے عہنا پہلے آپ رونا بند کریں پھر مجھے بتائیں کہ کیوں آپ کی اماں نے آپ کو یہاں بھیجا ہے میں واقعی نہیں جانتا عہنا۔" وہ اس کے قریب ہی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔

"اماں کا خیال ہے کہ ماہی میری شادی زبردستی مظفر بھائی سے کردیں گی جیسے بھی ممکن ہوا۔ مظفر بھائی کو تو آپ نے دیکھا تھا نا تب۔"

"ہاں وہ جو کچھ تھوڑے ابنارمل سے ہیں۔"

"ہاں، لیکن شادی کے لیے ہر وقت ماہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں کہ ان کی شادی کرلویں۔ ماہی جانتی ہیں کہ گاؤں میں کوئی انہیں رشتہ نہیں دے گا اور مجھے تو ان سے بہت ڈر لگتا ہے اتنی غلیظ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ پھر بھی میں وہاں ہی رہنا چاہتی تھی اماں کے پاس، لیکن وہ کہتی نہیں وہ بہت کمزور ہوگئی ہیں مجھے بچا نہیں سکیں گی۔ پھر وہاں وہ انس چوہدری ہے کسی زمیندار کا بیٹا ہے ساتھ والے گاؤں سے ہمارے گاؤں آتا ہے کسی دوست کے پاس، اس نے بھی ایک بار راستہ روک لیا تھا۔ وہ تو اماں پیچھے آرہی تھیں تو ہٹ گیا، لیکن اماں کو اس کا بھی ڈر ہے اس لیے انہوں نے پھپھو کو کہا کہ وہ مجھے ساتھ لے جائیں۔" اس کی پلکیں پھر بھیگنے لگی تھیں۔

"ہم ماموں کے گھر رہتے ہیں۔ ابا کے بعد تایا نے ہمیں گھر سے نکال دیا اور زمین گھر سب پر قبضہ کرلیا اس لیے اماں ماہی اور ماموں کی کسی بات سے انکار نہیں کرسکتیں، لیکن میں پھپھو کے پاس ہوں تو وہ لوگ زبردستی نہیں کرسکتے۔" وہ ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھنے لگی۔

"یہاں اس دنیا میں خون کے رشتوں میں زہر بھرا ہے۔ لوگ اپنوں کے لیے اذیت تکلیف اور پریشانیاں اکٹھی کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ لوگ سانپوں کی طرح ہیں انسانی شکل والے سانپ، یہ سب بہت قابل نفرت ہیں۔ یہ تمہاری ماہی اور تمہارے تایا جیسے لوگوں سے دنیا بھری ہوئی ہے۔" وہ ایک دم تلخ ہوا تھا۔

"یہی وجہ ہے کہ میں ان سے بھاگتا ہوں مجھے لگتا ہے جیسے گھر کی دیواروں اور فرش میں کانٹے بچھے ہیں پاؤں اور بدن سب چھل جاتے ہیں۔"

وہ سر اٹھائے ارحم کو دیکھ رہی تھی۔

"نہیں ارحم بھائی سب لوگ ایسے نہیں ہوتے۔ پھپھو جیسے لوگ بھی ہوتے ہیں نا محبت کرنے والے چاہنے والے۔ کتنا خیال رکھتی ہیں وہ ہمارا۔"

"پھپھو جیسے۔" اس کے لبوں پر زہریلا سا تبسم بکھرا۔

"آپ کیا سمجھتی ہیں اپنی پھپھو کو۔ آپ کو کیا پتا کتنا زہر بھرا ہے ان کے اندر خیر۔" اس نے سر جھٹکا اور کھڑا ہوگیا۔

"آپ منہ دھولیں اور آئیں میں آپ کو اچھی سی کافی پلواتا ہوں۔ روزانہ آپ مجھے کھانا بھجواتی ہیں آج میں آپ کی تواضع کرتا ہوں۔"

وہ ایک دم کھڑی ہوگئی تھی اسے بہت اچھا لگا تھا۔ ارحم کا اس طرح اس کی بات سننا اور اس سے بات کرنا پھر مظفر کو ڈانٹنا۔

"میں نے آپ کا شکریہ تو ادا کیا ہی نہیں ارحم بھائی۔" دوپٹے سے چہرا اچھی طرح پونچھ کر وہ اس کے پیچھے ہی چل پڑی تھی۔

"کس بات کا۔" ارحم نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"وہ مظفر کو بھگانے کا۔ اگر آپ نہ آتے تو کیا پتا وہ سچ مچ مجھے زبردستی لے جاتا خدا بخش چاچا بھی گیٹ پر نہیں تھے۔ ویسے تو وہ عمر میں مجھ سے چھوٹا ہے، لیکن وہ بہت بدلحاظ ہے۔"

"وہ ایسا نہیں کرسکتا تھا اور آپ کو بھی اتنا کمزور نہیں ہونا چاہیے کہ ڈر جائیں۔"

"جی ویسے آپ کہیں جارہے تھے۔"

"ہاں خالد کی طرف جارہا تھا۔"

"تو کافی پھر سہی آپ اپنا پروگرام خراب نہ کریں۔"

"نہیں میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ آیئے۔"

اور اس کے ساتھ ساتھ چلتی وہ انیکسی میں آگئی اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے ارحم نے فریج کھولا اور ایک ٹن نکال کر اسے کھول کر اس کی طرف بڑھایا۔

"میں جب تک کافی اور اسپگیٹی بناتا ہوں آپ اس سے لطف اندوز ہوں۔"

وہ ایک دم پیچھے ہٹی۔

"نہیں وہ۔۔۔" اور اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے ایک دم ارحم کے لبوں سے قہقہہ نکلا۔

"بے وقوف لڑکی یہ شراب نہیں ہے۔ یہ پڑھو ٹن پر کیا لکھا ہے۔"

عہنا شرمندہ ہوئی۔

"وہ میں۔۔۔"

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔" وہ سنجیدہ ہوا۔

"جانتا ہوں میں یہ ڈس انفارمیشن کہاں سے آئی ہوگی، میں نے کبھی کسی کے سامنے وضاحت نہیں کی۔ اس رات کے بعد سے میں نے کبھی تردید نہیں کی جو کوئی جو سمجھتا رہے، لیکن آپ کو عہنا صرف آپ کو بتا رہا ہوں کہ میں نے زندگی میں شراب پینا تو درکنار کبھی ایک گھونٹ تک نہیں چکھا۔ حالانکہ اس رات میرا جی چاہا تھا کہ میں پیوں۔ اتنا پیوں کہ مدہوش ہو جاؤں اور خود کو ایسا ہی بنا کر پیش کروں جیسا ڈیڈی نے سمجھا ہے۔ یہ بڑی منفی سوچ تھی۔ عہنا بہت جلد میں اس کے حصار سے نکل آیا، لیکن میرا اندر جلتا ہے۔ آگ بھڑکتی ہے۔ کبھی کبھی اور جی چاہتا ہے سب کچھ تہس نہس کر دوں۔" وہ چونکا اور ٹن اس کی طرف بڑھایا۔

عہنا نے ٹن لے لیا۔ ٹن پر فریش جوس لکھا ہوا تھا۔

"اچھا بیٹا ئیں آپ کو پسند ہیں اسپگیٹی۔"

"پلیز ارحم بھائی آپ رہنے دیں۔ میں بس کافی پی لوں گی۔"

"آپ کچھ دیر پہلے ہی یونیورسٹی سے آئی ہیں عہنا اور آپ کو بھوک بھی لگی ہوگی۔"

"حمیدہ نے لنچ نہیں بھیجا آپ کو۔"

"میں نے خود منع کر دیا تھا۔" وہ مسکرایا۔

"ویسے بھی میں سوچ رہا تھا آج اپنے ہاتھ کی پکی ہوئی کوئی چیز کھاؤں۔" اس نے فریزر سے ساسجز کا پیکٹ نکالا اور عہنا کی طرف دیکھا جو ٹن ہاتھ میں لیے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"میں یہ سب چیزیں پاکستان آتے ہوئے لے آتا ہوں۔" اس نے فریج سے دو تین ٹن اور نکالے اور کچن کی طرف بڑھ گیا۔ جو لاؤنج سے ملحق تھا۔

"آپ یہاں بیٹھیں اور میرا کمال دیکھیں۔"

"ارحم بھائی۔" وہ اس کے پیچھے ہی کچن تک آگئی۔

"مجھے بتا دیں میں کرتی ہوں۔" اس نے ارحم کے ہاتھ سے اسپگیٹی کا پیکٹ لینا چاہا۔

"ہوں۔۔۔ ہوں۔" اس نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

"آپ آج میری مہمان ہیں۔"

"ارحم بھائی میں آپ سے چھوٹی ہوں جب آپ مجھے آپ کہہ کر بلاتے ہیں تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"چھوٹے ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا عہنا مجھے یاد ہے میری ماما مجھے ہمیشہ آپ کہہ کر بلاتی تھیں۔"

"لیکن آپ میری ماما تو نہیں ہیں نا۔" عہنا کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا اور پھر وہ خود ہی جھینپ گئی تھی۔

"سوری وہ ایسے ہی منہ سے نکل گیا۔"

"تو پھر کیا ہوں آپ بتا دیں۔"

پانی ابلنے کے لیے رکھتے ہوئے اس نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"آپ ارحم بھائی ہیں۔"

"میں آپ کا بھائی نہیں ہوں۔ بلکہ میرا آپ کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے آپ جانتی ہیں نا۔" وہ پریشان سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

"جب دو افراد کے درمیان کوئی رشتہ نہ ہو تو ان کے درمیان دوستی، ہمدردی، خلوص یا محبت کا تعلق یا رشتہ ہو سکتا ہے۔ ان میں سے کون سا تعلق یا رشتہ ہے

آپ کا میرے ساتھ۔" اس نے ابلتے پانی میں تھوڑا سا آئل ڈال کر اسپگھٹی ڈالیں۔

"ارحم بھائی یہ آپ کیسی باتیں کرنے لگے ہیں۔" وہ اس طرح پریشان سی ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔

"او کے۔ آپ پریشان نہ ہوں عہنا۔" وہ ہولے سے ہنسا۔

"بغیر کسی تعلق یا رشتے کے بھی ہم ایک دوسرے سے بات کر سکتے ہیں بے تکلفی سے دو اجنبی مسافروں کی طرح۔۔۔ آپ کو اچھا نہیں لگتا تو میں آپ کو تم کہہ کر بلا لوں گا۔ اب آپ ریلیکس ہو کر بیٹھیں میں اپنا کام کر لوں۔"

عہنا واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی اور جوس پیتے ہوئے ارحم اور چاندنی کے متعلق سوچنے لگی۔ ارحم نے کبھی شراب نہیں پی۔ یہ سچ ہے لیکن پھپھو کا الزام۔ اور وہ چاندنی والی کہانی۔ پتا نہیں اس میں کتنا سچ ہے اور ارحم بھائی نے کہا تھا کہ وہ پھر کسی روز مجھے بتائیں گے چاندنی کے متعلق اور۔۔۔

جوس پی کر اس نے خالی ٹن ٹیبل پر رکھا کچن کے کھلے دروازے سے اسے ارحم کچن میں ادھر ادھر جاتا اور کام کرتا نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر اٹھ کر کچن کے دروازے تک آ گئی۔

وہ کاؤنٹر پر پڑے کٹنگ بورڈ پر کچھ کر رہا تھا۔ وہ سلسجز کے پیسز کر رہا تھا اور ساتھ میں گنگنا بھی رہا تھا۔ لیکن اس کی آواز آہستہ تھی وہ سمجھ نہ پائی تھی۔

"ارحم بھائی۔" ارحم نے مڑ کر دیکھا اور چولہے پر فرائی پن رکھ کر اس میں آئل ڈالا اور کٹنگ بورڈ سے سلسجز اٹھا کر فرائی کرنے کے لیے فرائی پن میں ڈالے اور جواب دیا۔

"تمہیں سکون نہیں مل رہا وہاں۔ آرام سے بیٹھو۔ تھوڑی سی اور دیر ہے۔ یہاں اس چھوٹے سے کچن میں میرے جیسے لمبے چوڑے بندے کے ساتھ کوئی دوسرا فرد کھڑا نہیں ہو سکتا ورنہ تم سے کہتا کہ تم یہاں کھڑی ہو کر میری حوصلہ افزائی کرتی رہو۔"

"آپ تو پوری شیف حسینہ لگ رہے ہیں ارحم بھائی آپ کو کسی کی حوصلہ افزائی کی کیا ضرورت ہے۔"

عہنا مسکرائی۔

"وہ لڑکی تو بہت لکی ہوگی ارحم بھائی جس سے آپ شادی کریں گے۔"

"میرے ہاتھ میں شادی کی لکیر نہیں ہے۔ عہنا بی بی۔"

"یہ مت کہیے ارحم بھائی زندگی صرف اس ایک لڑکی پر ختم نہیں ہو جاتی ارحم بھائی جس نے آپ کو دھوکا دیا آپ سے بے وفائی کی اصل میں اس نے آپ سے محبت کی ہی نہیں تھی۔"

"سچ کہتی ہو تم۔۔۔ کیا تمہیں الہام ہوتا ہے۔ اس نے واقعی مجھ سے محبت نہیں کی تھی۔"

"تو پھر آپ اپنی زندگی کیوں ضائع کر رہے ہیں۔ بھول جائیں اسے۔"

اس نے بے حد گہری نظروں سے اسے دیکھا اور پھر مڑ کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ عہنا دیوار پر ہاتھ رکھے کچن کے باہر کھڑی تھی۔

"آپ نے کہا تھا آپ مجھے بتائیں گے مجھ سے شیئر کریں گے وہ سب۔ جس نے آپ کو سب سے دور کر دیا ہے۔ وہ دکھ جو اندر ہی اندر آپ کو مار رہا ہے۔"

عہنا ارحم کو دیکھ رہی تھی جو اب ٹرے میں پلیٹیں کانٹے وغیرہ رکھ رہا تھا اور ساتھ ہی گنگنا رہا تھا۔

روداد محبت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے
دو دن کی مسرت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے
جب جام دیا تھا ساقی نے جب دور چلا تھا محفل میں
اک ہوش کی ساعت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے
اب وقت کے نازک ہونٹوں پر مجروح ترنم رقصاں ہے
بیداد مشیت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

اس نے یونہی گنگناتے ہوئے ٹرے اس کی طرف بڑھایا۔ عہنا نے ٹرے پکڑ لیا۔

احساس کے میخانے میں کہاں اب فکر و نظر کی قندیلیں
آلام کی شدت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

"آپ بہت محبت کرتے تھے نا چاندنی سے کاش وہ آپ کی محبت کی قدر کرتی۔"

ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے عمنا نے آہستگی سے کہا۔

ارحم نے لسبہکنٹھی کی ڈش ٹیبل پر رکھی اور عمنا کی طرف دیکھا۔

کچھ دل کے اندھے ساتھی تھے کچھ ماضی کے عیار بھی
احباب کی چاہت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

"آپ کو شاعری سے بہت لگاؤ ہے ارحم بھائی سحر آپی کو بھی بہت سے اشعار زبانی یاد تھے اور انہوں نے اپنی ڈائریاں بھر رکھی تھیں۔"

فریج کھولتے ہوئے ایک لمحے کو ارحم رکا تھا۔ پھر اس نے سیون اپ کے ٹن نکال کر ٹیبل پر رکھے۔

"میں ہاتھ دھو کر آتا ہوں تم شروع کرو عمنا۔" وہ واش روم کی طرف جاتے ہوئے بھی گنگنا رہا تھا اور عمنا سوچ رہی تھی یہ ارحم بھائی کی آواز میں کتنا سوز ہے۔

کانٹوں سے بھرا ہے دامن دل شبنم سے سلگتی ہیں پلکیں
پھولوں کی سخاوت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے
اب اپنی حقیقت بھی ساغر بے ربط کہانی لگتی ہے
دنیا کی حقیقت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

وہ واپس آیا تو عمنا یونہی ہاتھ گود میں دھرے بیٹھی تھی۔

"ارے تم نے شروع نہیں کیا۔ شروع کرو اور بتاؤ کیسی بنی ہیں۔"

اس نے خود ہی پلیٹ میں ڈال کر کانٹا اس کی طرف بڑھایا۔

"ہو بھئی شروع کرو۔ مجھے تو سخت بھوک لگی ہے۔ کتنے دنوں بعد میں ذرا کچھ مزے کی چیز کھاؤں گا۔ ورنہ وہ تمہارے بھیجے ہوئے سوپ اور یخنیاں پی پی کر تو منہ کا مزاہی خراب ہو گیا تھا۔"

"ویسے آپ کو کھانے میں کیا پسند ہے۔" عمنا دل میں آتے خیالات کو جھٹک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"پتا نہیں، جو ملے کھا لیتا ہوں۔"

"پھر بھی کچھ تو پسند ہو گا آپ کو مجھے بتائیں نا رات کو وہی بنوالوں گی۔"

"تم جو کچھ بناؤ گی مجھے اچھا لگے گا ننھی لڑکی گھر کے بنے کھانوں کا ذائقہ مدت ہوئے بھول چکا ہوں۔"

ارحم نے کوئی ایسی بات نہیں کی' پھر بھی عمنا کا دل اندر ہی اندر گداز ہو رہا تھا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے کھا رہی تھی۔ ارحم کی پرسوز آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

"تم اتنی اداس کیوں ہو عمنا۔" ارحم نے برتن سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

"ارحم بھائی پلیز رہنے دیں میں اٹھا لیتی ہوں اور دھو کر رکھ دیتی ہوں۔"

"نہیں آج تم میری مہمان ہو اور میں تمہارا میزبان۔

تم بیٹھو' میں فارغ ہو کر آتا ہوں' تو پھر باتیں کرتے ہیں۔ بلکہ گاؤں جانے کا پلان بناتے ہیں۔ میں تمہیں اماں سے ملواؤں گا' بہت دل چاہ رہا ہے نا تمہارا اماں سے ملنے کو۔"

وہ مسکرایا اور برتن اٹھا کر کچن میں چلا گیا۔ یہ ارحم جو آج اس کے سامنے تھا۔ اس ارحم سے کتنا مختلف لگ رہا تھا۔ جس سے وہ پہلے روز متعارف ہوئی تھی' سخت اکھڑ اور تلخ اور یہ وہ ارحم بھی نہیں تھا جس کا خاکہ پھپھو نے کھینچا تھا۔ بد اخلاق' بد کردار۔

یہ تو ایک نرم دل' مخلص انسان تھا۔

وہ یوں ہی سوچوں میں کھوئی رہی' چونکی تو تب جب گرم کافی کے کپ اٹھائے ارحم کچن سے نکلا۔

"کیا تم فلاسفی پڑھ رہی ہو لڑکی۔"

"ہاں۔۔۔ نہیں۔"

عمنا نے چونک کر اسے دیکھا۔

"اردو۔۔۔ اردو میں ماسٹر کر رہی ہوں۔۔۔ دراصل میں نے پرائیویٹ بی اے کیا تھا۔۔۔ بی اے میں میرے پاس یہی مضامین تھے۔ اسلامیات اور اردو۔۔۔"

ایک مبہم سی مسکراہٹ ارحم کے لبوں پر نمودار

ہو کر معدوم ہو گئی۔

"ابا زندہ ہوتے تو شاید میں ڈاکٹر بنتی۔ ابا کو بہت شوق تھا کہ سحریا میں کوئی ایک ڈاکٹر بنے وہ تو پھپھو کو بھی ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ لیکن پھپھو کو ایڈمیشن نہیں مل سکا تھا میڈیکل کالج میں۔"

"یہ دنیا ایسی ہی ہے سوئٹ گرل یہاں کسی کو اس کے حسب منشا نہیں ملتا۔ تم خوش قسمت ہو کر تم نے اتنے نامساعد حالات میں بھی بی اے کر لیا اور اب ماسٹر کر رہی ہو۔ دنیا میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو چاہت کے باوجود ایک لفظ نہیں پڑھ پاتے۔ دو وقت کی روٹی ان کا نصیب نہیں ہوتی۔ میں بہت ملکوں میں گھوما ہوں اور میں نے دنیا کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اس کے بدنما چہرے سمیت۔" اس نے کافی کا کپ اس کی طرف بڑھایا اور بیٹھ گیا۔

"دنیا میں صرف بدنمائی ہی تو نہیں ہے ارحم بھائی خوب صورتی بھی ہے۔"

"ہاں کبھی میں بھی ایسا ہی سمجھتا تھا' لیکن اب نہیں۔ کبھی میرے نزدیک زندگی بھی خوب صورت تھی' لیکن نہیں یہ کبھی بھی خوب صورت نہیں تھی۔"

"آپ نے کبھی اسے خوب صورت بنانے کی کوشش ہی نہیں کی' بس ایک ہی نام کی مالا جپتے رہے اور۔"

"تم کیا جانو عمنا جلال اس نے مجھے اتنا بے بس کر دیا تھا کہ اندر باہر کسی دوسرے نام کی گنجائش نہیں بچی تھی۔" وہ کھو سا گیا تھا۔

"کاش کبھی وہ مجھے ملے تو میں اس سے پوچھوں۔ تم نے یہ ظلم کیوں کیا۔ اتنے اچھے انسان کی زندگی میں خزائیں بکھیر دیں۔ اس نے کیوں کیا ایسا ارحم بھائی وہ پچھتائی تو ہو گی۔"

"تم کیوں میرے زخم کرید نا چاہتی ہو عمنا بی بی۔"

"میں آپ کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں ارحم بھائی۔ اس لیے کہ آپ بہت اچھے ہیں۔ میں چاہتی ہوں آپ چاندنی کو بھول کر نئی زندگی جئیں۔ آپ یہاں تنہا انیکسی میں رہنے کے بجائے اندر اپنے کمرے میں رہیں صائم اور انکل فراز ان سب کی محبتوں کو انجوائے کریں' خود کو۔ ایک لڑکی کی محبت کی خاطر تنہا اور اکیلا مت کریں۔"

"صرف ایک لڑکی کی محبت کی خاطر۔" اس کے لبوں پر تلخ سی مسکراہٹ ابھری۔

"نہیں عمنا بی بی صرف محبت کی خاطر نہیں میری تمام اذیتوں میں سے سب سے بڑی اذیت رشتوں کا بھرم ٹوٹ جانا اور۔

وہ سب میرے اپنے تھے جنہوں نے مجھے مصلوب کیا۔ رشتوں کا اعتماد یہ وہ دھوکا ہے' جو اچانک کھل جاتا ہے اور جب رشتوں کا یہ اعتماد اور مان کسی پھٹی پرانی اوڑھنی کی طرح دل سے اتار کر پھینکنا پڑتا ہے تو انسان خلا میں چکرانے لگتا ہے اور ساری عمر چکراتا ہے۔ ان رشتوں اور محبتوں کے بھرم کھلیں تو اندر سے اتنی بلائیں اور خوفناکیاں برآمد ہوتی ہیں' جو جھیلے جانے کے قابل نہیں ہوتیں اور یہ کبھی ختم نہیں ہوتیں' ہر لمحہ بڑھتی ہیں۔ دنیا میں کوئی رشتہ نہیں چاہے' وہ محبت کا رشتہ ہو چاہے خون کا۔"

وہ ہولے ہولے کہہ رہا تھا اور وہ ساکت بیٹھی سن رہی تھی۔ اس کی پلکیں بار بار بھیگ جاتی تھیں۔ کیا کسی نے کسی کو اتنا چاہا ہو گا۔ جتنا ارحم بھائی نے اسے چاہا تھا۔

"وہ سحر تھی، سحر جلال اور میں اسے چاندنی کہتا تھا۔"

"نہیں۔۔۔" وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا کسی گمنام کال پر کسی کو موت کی سزا دی گئی آج تک۔ کیا کسی پر فرد جرم عائد کی گئی ہو تو بنا صفائی اسے قابل گردن زدنی ٹھہرایا گیا۔ نہیں نا۔۔۔ لیکن مجھے۔۔۔ مجھے انہوں نے صفائی کا موقع نہیں دیا۔ مجھ پر فرد جرم عائد کی اور موت کی سزا سنا دی۔ انہوں نے میرے باپ اور سحر نے جن پر میں دنیا میں سب سے زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ یہ سارا منظر نامہ اسی نے تحریر کیا تھا۔

کیوں۔۔۔ میں نہیں جانتا۔ آج تک نہیں جان سکا وہ اگر کہہ دیتی مجھ سے کہ وہ خرم شہزاد سے محبت کرنے لگی ہے اور مجھ سے شادی نہیں کر سکتی، وہ یہ سچ بول دیتی تو میں کیا کر لیتا۔ پتا نہیں اس نے یہ سب اکیلے کیا تھا یا بیگم راحت بھی اس میں شامل تھیں۔ میں نہیں جانتا۔۔۔ لیکن وہ اکیلے یہ سب نہیں کر سکتی تھی۔ اس ڈرامے کی خالق یقیناً وہ ہو گی اور معاونت بیگم راحت نے کی ہو گی۔ ڈیڈی کی نظروں میں مجھے گرا کر انہیں بھی تو فائدہ تھا۔" عہنا کے آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر اس کے رخساروں پر پھسل آئے تھے۔

"سوری ارحم بھائی۔"

"آپ کیوں سوری کر رہی ہیں۔" ارحم نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"اس لیے کہ آپ کو تکلیف دینے والی میری بہن تھی۔ کاش میں ان زخموں پر مرہم رکھ سکتی۔ کاش میں اس سب کا مداوا کر سکتی۔" آنسو زیادہ روانی سے اس کے رخساروں پر بہنے لگے تھے۔

"آپ مداوا کر تو رہی ہیں۔"

ارحم نے اس کے بہتے آنسوؤں کو دیکھا۔ "میری بات سن کر مجھ پر یقین کر کے، آپ کے آنسو بتا رہے ہیں کہ آپ نے میرا یقین کیا اور میرے لیے دکھی ہو رہی ہیں۔"

"ارحم بھائی کیوں۔۔۔ کیا سحر آپی نے ایسا کیا تھا خرم شہزاد میں، جو آپ میں نہیں تھا۔"

"شاید وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت تھا اور مجھ سے زیادہ دولت مند۔۔۔"

"ہو سکتا ہے وہ آپ سے زیادہ دولت مند ہوں۔۔۔ لیکن وہ آپ سے زیادہ خوب صورت تو بالکل بھی نہیں ہیں۔۔۔ جیسے سفید پھیکے شلجم۔۔۔"

اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے ارحم کی طرف دیکھا۔

"آپ ان سے زیادہ خوب صورت ہیں۔"

"ارے میں کہاں خوب صورت ہوں کالا کلوٹا۔"

وہ ہولے سے ہنسا۔

"یہ تمہارا حسن نظر ہے اچھی لڑکی ورنہ۔۔۔"

"جی نہیں آپ خرم شہزاد سے زیادہ حسین ہیں اور جب سحر آپی کی شادی ہوئی تھی، تب میں نے سیکڑوں بار سوچا تھا کاش سحر آپی کی شادی آپ سے ہوئی ہوتی۔ وہ تو مجھے پہلے دن ہی اچھے نہیں لگے تھے۔ اکڑو سے اور میں تو آپ کو ڈھونڈ رہی تھی اور آپ سے پوچھنا چاہتی تھی۔ آپ نے میری آپی سے شادی کیوں نہیں کی۔ تب صائم نے مجھے بتایا تھا کہ آپ گھر پر ہیں۔"

وہ تیز تیز بول رہی تھی اور پلکیں جھپک جھپک کر آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی جو پھر آنکھوں میں جمع ہو رہے تھے اور ارحم دلچسپی سے اسے دیکھ رہا۔ تب ہی خالد تیز تیز بولتے ہوئے اندر داخل ہوا۔

"میں وہاں تمہارے انتظار میں سوکھ سوکھ کر لکڑی ہو گیا اور تم یہاں بیٹھے ہو۔۔۔ تمہارے دس منٹ ابھی تک نہیں ہوئے کیا۔"

پھر اس کی نظر عہنا پر پڑی تھی۔

"اور آپ یہاں۔۔۔ کیسی ہیں۔"

"ٹھیک ہوں ڈاکٹر صاحب آپ کیسے ہیں۔"

وہ کھڑی ہو گئی۔ اس کی بھیگی پلکیں روپا روپا سا چہرہ ڈاکٹر خالد نے معنی خیز انداز میں ارحم کی طرف دیکھا۔

"میں اب چلتی ہوں ارحم بھائی سوری میری وجہ سے آپ۔۔۔"

"کوئی بات نہیں۔۔۔ میں تو بس یوں ہی ٹائم گزارنے خالد کی طرف جا رہا تھا۔"

اس نے خالد کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ عینا باہر چلی گئی تو خالد نے ارحم کی طرف دیکھا۔
"کیا تم نے اسے رلایا ہے۔"
"شاید۔" آہستگی سے کہہ کر ارحم بیٹھ گیا۔
"دیکھو میری جان ہر ایک کو ایک نظر سے مت دیکھا کرو۔ یہ لڑکی مجھے بہت مخلص لگتی ہے۔" ارحم نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا اور کافی کے کپ اٹھا کر کچن میں لے گیا۔
"دو کپ۔" خالد نے پرسوچ انداز میں کہا۔
"یعنی اکٹھے بیٹھ کر کافی پی گئی۔ پھر یہ آنسو۔"
"فضول اندازے مت لگاؤ۔ چلو کہاں چلنے کا کہہ رہے تھے۔"
"سوچا تھا آج کچھ پرانے دوستوں سے ملنے چلتے ہیں۔ پرانی یادیں تازہ کرتے ہیں۔" خالد بھی اٹھ کھڑا ہوا۔
"یار کیا دن تھے وہ بھی، کتنی بے فکر زندگی تھی۔"
"کیا سب دوست یہاں ہی ہیں۔" ارحم نے پوچھا۔
"نہیں صرف احمر اور سعید ہیں۔ ان سے ذکر کیا تھا تمہارا۔"
"کیسے ہیں دونوں۔"
"خوش اپنی اپنی زندگی میں مگن۔"
وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے انیکسی سے نکل گئے۔

☼ ☼ ☼

"میں بارہ سال سے جس of thought State میں Exist کر رہا ہوں۔ وہ ایک ہی رات میں کیونکر Crack ہو سکتی ہے عینا۔ آپ سمجھتی ہیں کل میں نے آپ سے اپنا دکھ شیئر کیا اور آج میں سب کچھ بھول جاؤں۔" ارحم فوارے کی دیوار پر بیٹھا تھا اور عینا پاس ہی سنگی بینچ کی پشت پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔
"نہیں۔ میں نے یہ نہیں کہا ارحم بھائی کہ آپ ایک ہی رات میں سب کچھ بھول جائیں۔ میں چاہتی

ہوں آپ وہ سب کچھ بھولنے کی کوشش کریں اور اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کریں۔ آپ نے اپنی زندگی کے بارہ سال ضائع کردیے محض ایک لڑکی کے لیے۔ مت کریں ایسا۔ وقت ابھی گزرا نہیں ہے۔ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی ہاتھوں میں پھول لیے آپ کا منتظر ہوگا ضرور۔" ارحم ہونٹ بھینچے عینا کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی اس کے رتجگے کی کہانی سنا رہی تھی۔

"آپ رات بھر سوئے نہیں نا۔ سوری میں نے آپ کا غم تازہ کردیا۔ میں نے آپ کو وہ سب یاد دلا دیا جو آپ کے لیے تکلیف دہ تھا۔"

"میں وہ سب بھولا ہی کب تھا۔ میرے کمرے سے شراب کی بوتلوں کا نکلنا شاید۔ اتنا اہم نہیں تھا میں بھول جاتا لیکن میں وہ نظریں کیسے بھول سکتا ہوں جن نظروں سے ڈیڈی نے مجھے دیکھا تھا۔

اور جو۔ جو سحر نے مجھ سے کہا تھا۔ وہ سب میری سماعتوں میں زندہ ہے۔ آپ کیوں دکھی ہوتی ہیں میرے لیے اور کیوں مجرم سمجھتی ہیں خود کو، ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمے دار ہوتا ہے۔

جو سحر نے کیا اس کے لیے آپ ہرگز قصوروار نہیں ہیں۔ پلیز بھول جائیں سب کچھ جو میں نے کہا، جو آپ نے سنا۔ اور آپ غالباً" یونیورسٹی جارہی تھیں۔ جائیں۔"

"نہیں مجھے یونیورسٹی نہیں جانا۔ اکرم بھائی آج چھٹی پر گئے ہیں اور مجھے راستوں کا نہیں پتا۔ کون سی بس کون سی ویگن کہاں سے جاتی ہے۔"

"میں چھوڑ آتا ہوں آپ کو۔"

"نہیں۔ آج نہیں جاؤں گی۔ یوں بھی آج کل ہفتہ اسٹوڈنٹ چل رہا ہے۔ آپ نے ابھی ناشتا نہیں کیا ہوگا۔ کب سے بیٹھے ہیں یہاں۔"

"بہت دیر سے۔"

"چلیں۔ پھر آپ کے کچن میں چائے بناتے ہیں لوں۔" ارحم چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر کھڑا ہوگیا۔

"رات اماں سے فون پر بات ہوئی تھی۔" اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس نے بتایا۔ ... بڑی ہوئی تھیں۔ میں نے مظفر کا بتایا تھا اور آپ کا بھی کہ آپ کے ساتھ ملنے آؤں گی، لیکن ان کی وہی ایک ضد کہ کسی صورت نہ آؤں۔"

"لوگ ایسے درندے ہیں عینا کہ جن کے دانت اور بڑے بڑے ناخن دکھائی نہیں دیتے اور تم بہت سادہ اور معصوم ہو۔ تمہاری اماں ٹھیک کہتی ہیں۔" اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا۔

"کل سے میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آخر میں یہاں کیوں رکا ہوا ہوں۔ کیا بیگم راحت کو چڑانے کے لیے۔ صرف اس لیے کہ وہ چاہتی تھیں کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔"

"نہیں ارحم بھائی آپ اپنے ڈیڈی سے ملنے کے لیے رکے ہیں۔ آپ بظاہر کچھ بھی کہیں۔ لیکن آپ کے دل میں ان سے ملنے کی جب ہے چاہ ہے۔ آپ ان سے ہی ملنے آئے تھے نا پھر بغیر ملے کیسے جاسکتے ہیں۔"

"میں سچ مچ جارہا تھا عینا۔ لیکن بعض اوقات انسان کے ذہن پر ایسے احساس سوار ہوتے ہیں جو بے حد ایگریسو اور گھٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کا out way نہیں ہوتا یہ Infra Sensations اپنوں کی زیادتی اور سازشوں کے نتیجے میں ایک دم Develope ہوجاتی ہیں اور انہیں rage ImpulSive بھی۔ اس لیے کہتے ہیں کہ انسان اس ذہنی حالت میں کچھ بھی کرسکتا ہے۔ میں نے تمہارے ساتھ بھی اسی حالت میں زیادتی کی۔ سخت رویہ رکھا۔ تمہیں برا لگا ہوگا۔" وہ جیسے اپنا تجزیہ کررہا تھا۔

"نہیں اتنا زیادہ برا بھی نہیں لگا تھا۔ افسوس ہوا تھا تھوڑا سا۔"

وہ مسکرائی۔

"چلیں۔ بتائیں ناشتے میں کیا لیں گے۔"

وہ ناشتا خود ہی بناتا تھا۔ صرف دن اور رات کا کھانا اندر سے آرہا تھا۔ "اس وقت صرف چائے پیوں گا۔

لیکن میں صرف اچھی چائے پیتا ہوں۔"
"اور اگر میں آپ کی پسند کی چائے نہ بنا سکی تو۔"
"تو میں خود بنا تا ہوں۔ تم بیٹھو۔" اس نے الیکٹرک کیٹل میں پانی ڈال کر سوئچ آن کیا "اور آپ نے گھر کیوں چھوڑ دیا تھا۔ ارحم بھائی آپ کو یہاں ہی رہنا چاہیے تھا اور یہاں رہ کر ثابت کرنا تھا کہ وہ سب غلط تھا۔"

"ہاں۔ شاید۔ لیکن میں جب اسپتال سے گھر آیا تو مجھے لگتا تھا جیسے میں کسی اجنبی جگہ اجنبی لوگوں کے درمیان رہ رہا ہوں۔ میری نظر بیگم راحت پر پڑتی تو مجھے وہ اپنا تمسخر اڑاتی نظر آتیں۔ ڈیڈی مجھ سے بات تو کرتے۔ لیکن مجھے ان کی آنکھوں میں اپنے لیے تاسف' دکھ اور جانے کیا کچھ نظر آتا۔ میرے نروس بریک ڈاؤن نے شاید ان کے دل کو نرم کیا ہو۔ لیکن ان کی آنکھیں مجھے بے یقینی سے دیکھتی تھیں۔ جیسے میں۔ میں ایک غیر ملکی کمپنی میں کام کرتا تھا۔ انہوں نے مجھے باہر بھیجنے کی آفر کی اور میں نے قبول کرلیا۔ وہ آتی خرم شہزاد کے ساتھ۔ غرور سے اٹھی گردن خوشی سے چمکتی آنکھیں۔ لاؤنج میں موجود وہ ہنستی تو۔ اس کی ہنسی کی آواز میں اپنے کمرے میں سنتا مجھے لگتا مجھے کند چھری سے ذبح کیا جارہا ہے۔"

اس نے ٹی بیگ کپوں میں رکھے۔

"اور یوں میں نے ایک دن بغیر کسی کو بتائے گھر چھوڑ دیا۔"

اس نے دودھ مکس کرکے کپ عینا کی طرف بڑھایا اور خود اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

"میں ملکوں ملکوں گھومتا پھرا اور میں نے امیدیں باندھنا' انہیں زندہ رکھنا چھوڑ دیا اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ مسلسل چار سال میں اس سب کو بھولنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن جو کانٹے میرے بدن اور پاؤں میں اترے تھے ان کی جلن اور چبھن کم نہیں ہوئی تھی۔ پھر مجھے پتا چلا کہ ڈیڈی کا ہارٹ بائی پاس ہونا ہے۔

لندن کی ایک کہر آلود شام میں وہ ڈیڈی کے دوست تھے جنہوں نے مجھے بتایا تھا۔

"ارحم تمہارا باپ تمہارے لیے بہت تڑپتا ہے۔ خود کو ان سے دور مت کرو۔ تمہاری جو بھی ناراضی اور غصہ ہے وہ ختم کردو۔"

اس شام میرا دل بھی جیسے سرد تھا۔ لندن کی اس شام کی طرح اور میں نے ڈیڈی کے بارے میں ان کی ہر بات کو اس طرح سنا تھا جیسے وہ کسی اور فرد کی بات ہو۔ لیکن رات کو جب میں بستر پر لیٹا تو مجھے بہت سارے لمحات یاد آنے لگے۔ جب ماما زندہ تھیں۔

جب ڈیڈی میرے ایک آنسو پر بے چین ہوجاتے تھے۔ میرا دل گداز ہونے لگا اور میں رات کے دو بجے اٹھ کر خالد کو فون کررہا تھا۔ پورے چار سال بعد اور خالد مجھے بتا رہا تھا کہ ٹھیک تین دن بعد ان کا بائی پاس ہورہا ہے۔

عینا خاموشی سے سن رہی تھی۔ ارحم کے چہرے پر سوز بکھرا تھا۔

"اور ڈیڈی کے آپریشن سے صرف چند گھنٹے پہلے میں ان کے پاس کھڑا تھا۔ وہ رو رہے تھے۔ انہوں نے مجھے گلے بھی لگایا تھا۔ گلہ بھی کیا تھا۔

"میں تمہارا باپ ہوں۔ ارحم کیا مجھے یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ میں تم میں کوئی غلط بات دیکھوں تو تمہیں ڈانٹ سکوں۔"

وہ آج بھی سمجھتے تھے کہ جو کچھ ان کی آنکھوں نے دیکھا' وہی سچ تھا' میں نے تردید نہیں کی عینا' بس خاموشی سے ان سے الگ ہوگیا۔ میری آنکھوں میں آنسو نہیں آئے۔ میں رویا نہیں' میرا دل گداز نہیں ہوا' وہ ایسا ہی سخت تھا۔ سرد پتھر۔

"میں نے آج تک یہ سب کچھ کسی سے نہیں کہا۔ پتا نہیں تم سے کیوں کہہ دیا۔ شاید یہ بوجھ تنہا اٹھاتے اٹھاتے تھک گیا تھا۔ لیکن عینا میں بہت Agrassive اور Reactionary کرچکا ہوں جو شاید اس کے حق دار نہیں ہوتے۔ میں نے تمہیں سب بتادیا۔ تم جو جاننا چاہتی تھیں جان لیا تم نے۔ مجھے ڈر ہے' میں کسی روز تمہیں پھر hurt

کروں گا اور میں تمہیں hurt نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے پلیز اب تم۔"

"میں hurt نہیں ہوں گی، کبھی بھی نہیں ارحم بھائی آپ جتنا مرضی غصہ کریں، مجھے برا نہیں لگے گا اور مجھے جانے کو مت کہیں۔" اس نے ارحم کی بات کاٹی۔

"لیکن عینا میں نہیں چاہتا اچھی لڑکی میری وجہ سے آپ کی ذات پر کوئی آنچ آئے بیگم راحت۔ کچھ کہیں، کچھ غلط۔"

"آپ کی وجہ سے مجھے کچھ نہیں ہو گا ارحم بھائی۔ وہ میری پھپھو ہیں۔ میں جانتی ہوں۔ وہ مجھے آپ سے بات کرنے سے منع کر سکتی ہیں۔ لیکن کوئی ایسی بات نہیں کر سکتیں جس سے میرے کردار پر کوئی حرف آئے۔"

"آپ ہر ایک کے متعلق اتنی ہی پر یقین ہوتی ہیں۔" ارحم کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ "ہر ایک کے متعلق نہیں، لیکن وہ، جو مجھ سے متعلق ہیں کسی نہ کسی رشتے کے حوالے سے۔" ارحم کی آنکھوں کی حیرت ستائش میں بدلی۔

"آپ بہت عجیب ہیں، حیرت انگیز۔"

"آپ کو لگتا ہے۔ ورنہ میں تو عام سی لڑکی ہوں۔" ارحم نے خالی کپ اٹھائے "اور چائے پیو گی۔"

"نہیں۔"

"تو میں اپنے لیے ایک کپ چائے بنا لوں۔"

"آپ چائے بہت پیتے ہیں۔ اتنی چائے نہ پیا کریں۔"

"پہلے تم نے شراب پر پابندی لگائی اب چائے پر لگا رہی ہو ہم کچھ زیادہ ہی دخیل نہیں ہوتی جا رہی ہو میری زندگی میں۔" وہ مسکرایا۔

وہ کبھی اسے آپ کہہ کر بلاتا اور کبھی تم۔ اور عینا کو اس کا اس طرح بے تکلفی سے بات کرنا اچھا لگا۔

"نہیں۔"

وہ ارحم کی طرف دیکھ رہی تھی۔ "میں تو چاہتی ہوں آپ کچھ ایسا نہ کریں جس سے آپ کو نقصان پہنچے۔"

"مجھے جتنا نقصان پہنچنا تھا وہ پہنچ چکا۔ اب اور کیا نقصان ہو گا میرا۔"

اس کے مسکراتے لب بھنچ گئے۔

"اور آپ جن زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کر رہی ہیں وہ کبھی بھرنے والے نہیں۔ آپ کیا اس سب کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، جو سحر جلال نے کیا میرے ساتھ۔" وہ ایک دم ایگریسو ہوا تھا۔

"نہیں عینا جلال مجھے ایسے کسی مرہم کی چاہ نہیں ہے۔"

"نہیں۔"

اس کی رنگت ماند پڑ گئی تھی۔

"میں تو جانتی بھی نہیں تھی کہ وہ سحر آپی تھیں۔ جب میں نے چاہا تھا کہ آپ اس دکھ کے حصار سے نکل آئیں۔ جس میں بارہ سال سے آپ گھرے ہوئے ہیں۔ صرف اس لیے کہ آپ میرے لیے وہ ارحم بھائی تھے جو مجھے بہت اپنے ہمدرد اور اچھے لگے تھے جنہیں پچھلے بارہ سالوں میں سیکڑوں بار میں نے یاد کیا تھا۔"

اس کی آنکھیں نم ہوئیں۔

"سحر آپی نے آپ کے ساتھ جو کچھ کیا اس کا بھلا کیا کفارہ ہو سکتا ہے۔ میں کچھ بھی کر لوں، کیا میں آپ کے بارہ سال واپس لا سکتی ہوں۔ وہ خواب جو آپ نے سحر آپی کے حوالے سے دیکھے۔ وہ محبت جو آپ نے ان سے کی۔ کیا۔"

"سوری عینا۔"

وہ شرمندہ ہوا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ میں آپ کو ہرٹ کر دوں گا۔ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ کانٹے چننے کی کوشش نہ کریں۔ اپنی انگلیاں زخمی کر لیں گی۔"

وہ دلگرفتہ سا واپس آ کر پھر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

"اگر میری انگلیاں زخمی ہونے سے آپ کے پاؤں کے کانٹے نکل آئیں گے تو مجھے پروا نہیں بھلے زخمی

ہوتی رہیں۔"

اس کے چہرے کی چمک لوٹ آئی تھی۔

"آپ سحر سے کتنی مختلف ہیں عمنا۔ آپ کو سن کر ایسا لگتا ہے جیسے کسی ٹھنڈک کسی مہربان موسم نے آنچل پھیلا دیا ہو۔ جیسے دل پر مرہم لگ جائے۔ لیکن میں بہت ڈرتا ہوں، بہت ڈر لگتا ہے مجھے ان لمحوں سے جب آپ کے چہرے کا نقاب اتر جائے گا اور جب سچ بتائیں عمنا آپ کیوں... کیوں مہربان ہیں مجھ پر اتنی۔" وہ پل کے پل بدلتا تھا۔

"کیا بیگم راحت نے کہا ہے آپ سے مجھ سے قریب ہو کر ایک بار پھر اسی اذیت سے دوچار کریں۔"

اس کی آنکھوں میں شک تھا اور چہرہ کسی چٹان کی طرح سخت اور سرد مہر ابھی چند لمحے پہلے آنکھوں میں پشیمانی لیے وہ کتنی نرمی سے بات کر رہا تھا۔

"ارحم بھائی۔" اس کی آنکھیں ایک دم آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

"ایسا سمجھتے ہیں آپ مجھے۔" آنکھیں زیادہ دیر آنسو سہار نہ سکیں اور وہ رخساروں پر بہہ آئے۔ وہ یکدم اٹھی اور تیزی سے باہر نکلتی چلی گئی۔

ارحم خاموش بیٹھا تھا۔ اس نے شاید اسے خفا کر دیا تھا۔ اس معصوم اور پیاری سی لڑکی کو جس کی سادہ اور بے ریا آنکھوں سے خلوص جھلکتا تھا۔ لیکن پتا نہیں کیوں وہ بار بار شکوک کا شکار ہو جاتا تھا۔

وہ ایک دم اٹھا اور انیکسی سے باہر نکل گیا اور تیز تیز چلتا ہوا پورچ تک آیا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ ایک لمحے کو رکا۔ کتنے سالوں بعد وہ آج گھر کے اندر جا رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے دروازے پر دستک دی۔

حمیدہ نے دروازہ کھول کر حیرت سے اسے دیکھا اور وہ اس کی حیرت کو نظرانداز کرتا سیدھا لاؤنج میں آیا تھا اور اس کی توقع کے عین مطابق وہ لاؤنج میں بظاہر ٹی وی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں پانیوں سے بھری ہوئی تھیں اور آنکھوں کی کور تک آنے والے آنسو کو وہ انگلی کی پوروں سے پونچھتی جاتی تھی۔

"سوری... عمنا... ام رئیلی ویری سوری۔"

"آپ نے بہت غلط بات کی بہت ہی غلط۔"

"سوری... کر تو رہا ہوں اور دیکھیں صرف آپ سے سوری کرنے کی خاطر میں نے بارہ سال بعد یہاں قدم رکھا ہے۔ میں جانتا ہوں میں نے غلط کیا۔ لیکن میں ایسا ہی ہوں عمنا، میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ کبھی کبھی میں بہت کھردرا اور تلخ ہو جاتا ہوں۔ مجھے خود پتا نہیں چلتا شاید یہ حالات کی وجہ سے ہے کہ میں ایسا ہو گیا ہوں۔ مجھے دوٹوک بات کرنا پسند ہے۔ میں اپنی شدید سوچیں اور احساسات کبھی بھی ملفوف کر کے پیش نہیں کر سکتا۔ یہ میری شاید اچھی عادت نہ ہو، لیکن میں...۔"

"کوئی بات نہیں ارحم بھائی۔"

"کوئی بات نہیں تو پھر یہ آنسو کس لیے۔ ان آنکھوں کو رونے کی عادت ہے کیا۔" وہ مسکرایا۔

عمنا نے جلدی سے دوپٹے کے پلو سے اپنا چہرہ اور آنکھیں پونچھیں۔

"مجھ سے دوستی کی ہے تو میرے رویوں کو بھی برداشت کرنا ہوگا۔" عمنا نے سر ہلایا۔

کچن روم میں ڈسٹنگ کرتی حمیدہ کے کان ادھر ہی لگے ہوئے تھے۔ لیکن اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

"عمنا میرے پاس دوسروں کے لیے بہت جگہ ہے۔ میں دوسروں کا حق [illegible] یا عزت نفس خود سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ مجھے دوسروں کا احترام کرنا بہت پسند ہے۔ کسی بھی اختلافی مسئلے میں سب سے پہلے میں اپنا قصور ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"ارحم بھائی... میں جانتی ہوں آپ بہت اچھے ہیں... اور..."

"نہیں عمنا آپ مجھے نہیں جانتی ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ میں اپنے رویے اور اپنی باتوں سے کہیں آپ کو زخمی نہ کر دوں۔ آپ تو میرے زخموں پر مرہم رکھنا چاہتی ہیں۔ کہیں اس کوشش میں آپ خود زخم زخم نہ ہو جائیں۔ آپ بہت اچھی ہیں۔ میں اپنے دل کی ہر بات ہر کسی سے نہیں کہتا۔ لیکن آپ سے میں نے

اپنے دل کی ہر بات، ہر سوچ کہہ دی۔ چاہے وہ اچھی تھی، معقول تھی یا غیر معقول۔ آپ میری زندگی میں پہلی ہستی ہیں جو اتنا کچھ جان گئی ہیں۔ یہ سب مجھے اچھا لگا۔ آپ سے اپنی بات کہنا، لیکن میں چاہوں گا کہ اب آپ میرے پاس مت آئیں۔ مجھ سے دور رہیں۔ میں آپ کے احساسات کی قدر کرتا ہوں۔ آپ نے میرے لیے اچھا سوچا۔ میری بات کا یقین کیا۔ اس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں۔ ہمیشہ رہوں گا۔ کم از کم ایک ہستی ایسی ہے دنیا میں جو میرا یقین کرتی ہے اور جو وہ سب کچھ جانتی ہو جو میرے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا۔ میں اپنے عجیب و غریب رویے سے آپ کو تکلیف پہنچا دیتا ہوں اور میں آپ کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا۔ کبھی بھی نہیں۔ اگین سوری۔"

وہ جتنی تیزی سے اندر آیا تھا اتنی ہی تیزی سے بات کر کے باہر چلا گیا اور دروازہ بند کرتے ہوئے حمیدہ نے کندھے اچکائے اور بلند آواز میں سوچا۔ "اللہ جانے اتنی دیر سے ارحم صاحب عینا بی بی سے کیا بات کر رہے تھے اور کمال ہے آج اندر گھر میں بھی آ گئے۔ ضرور انہوں نے ہی کہا ہو گا گھر آنے کو۔ کھانا بھی تو بھجواتی ہیں نا روزانہ۔" عینا نے اس کی بڑبڑاہٹ کو واضح سنا تھا۔ لیکن اس نے مڑ کر حمیدہ کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ ارحم کی باتوں پر غور کر رہی تھی۔

یہ ارحم بھائی نے اس طرح کی باتیں کیوں کیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کے سامنے نہ آؤں۔ ان سے بات نہ کروں کیا صرف اس لیے کہ میں سحر جلال کی بہن ہوں۔

اندر پھر کن من ہونے لگی تھی۔

اور یہاں لاؤنج میں بیٹھ کر حمیدہ کی کھوجتی نظروں کا سامنا کرنا اس کے بس میں نہ تھا۔ سو وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔

☆ ☆ ☆

جنوری کی اس صبح میں خاصی دھند تھی اور وہ اس دھند میں باہر لان میں ٹہل رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چہرہ نم ہو جاتا۔ عجیب سی خشک سردی تھی۔ اس نے ہاتھوں کو رگڑا اور درختوں کی اوٹ سے جھانکتی سورج کی کرنوں کو دیکھا۔ دھوپ میں حدت نہیں تھی اور ابھی سورج نکلے زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی تھی۔ وقت تھا کہ رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ تین دن سے وہ نظر نہیں آئی تھی۔ رفیق کھانا دے جاتا۔ وہ خاموشی سے کھا لیتا۔ لیکن کل دن کا کھانا اور پھر رات کا کھانا بھی اس نے واپس کر دیا تھا۔ پتا نہیں کیوں دل بوجھل سا تھا اور اداسی تھی کہ کہر کی طرح دل پر جمی تھی۔ شاید یہ اس موسم کا اثر ہے۔ ورنہ تو مدتوں سے اس نے دل کو بے حس کر رکھا تھا۔ نہ غم، نہ خوشی، ہر احساس اسے چھوئے بغیر ہی چلا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ کیسا احساس تھا جو دل کو مضطرب کیے ہوئے تھا۔ کوئی احساس۔۔۔ احساس زیاں جیسا۔

"کیا میں نے اسے بہت زیادہ خفا کر دیا ہے۔"

میں تو اس سے سوری کرنے اس کے پیچھے بھاگا تھا۔ لیکن پھر پتا نہیں کیا کیا کہہ دیا۔ یہی تو کہا تھا کہ وہ مجھ سے دور رہے۔ پھر۔۔۔"

تب ہی دروازہ کھلا اور سیاہ شال اپنے گرد اچھی طرح لپیٹتی وہ باہر نکلی اور لان میں آتے ہی اس کی نظر ارحم پر پڑی تھی۔ وہ یکدم اس کی طرف بڑھی، لیکن پھر فوراً ہی پیچھے ہٹ کر رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔ ارحم بے اختیار اس کے قریب آیا تھا۔

"بہت ناراض ہیں کیا۔" وہ سر جھکائے خاموش کھڑی رہی تھی۔

"عینا میں نے جو کچھ آپ سے کہا آپ کی خاطر کہا۔ میں آپ کو دکھی نہیں کرنا چاہتا۔"

"آپ جانتے ہیں کہ کیا چیز مجھے دکھی کرتی ہے۔" اس نے یکدم سر اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔

"مجھے آپ کا تمہارا دکھی کرتا ہے۔

مجھے یہ چیز دکھی کرتی ہے کہ آپ خود کو سزا دے رہے، مجھے آپ کی اداسی دکھی کرتی ہے۔ میں دکھی ہوتی ہوں اس بات پر کہ آپ نارمل زندگی نہیں گزار

رہے۔ آپ کا atitude آپ کی تلخی، آپ کا غصہ کچھ بھی مجھے دکھی نہیں کرتا۔ سنا آپ نے۔ میں اس بات پر دکھی ہوتی ہوں آپ نے خود کو بالکل بدل ڈالا ہے۔ آپ وہ ارحم بھائی نہیں — اصل میں خود پر خول چڑھا رکھا ہے آپ نے اور آپ اس خول کے ٹوٹنے سے ڈرتے ہیں کہ کہیں میں یا کوئی اور اس خول کے پیچھے چھپے ارحم کو نہ دیکھ لے جو اندر سے بہت حساس، بہت نرم دل ہے۔ جو اپنے ڈیڈی سے پیار کرتا ہے۔ جسے صائم سے محبت ہے۔

اور جسے بیگم راحت سے بھی نفرت نہیں ہے اور جو آج بھی سحر جلال سے محبت کرتا ہے باوجود اس کی چیٹنگ کے۔"

اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ لیکن اس نے فوراً ہی اپنی آواز پر قابو پالیا۔

"آپ بھلے مجھ سے بات نہ کریں۔ میری طرف مت دیکھیں، لیکن اپنی زندگی کو ضائع مت کریں۔ دنیا بہت خوب صورت ہے، کسی بہت اچھی لڑکی سے شادی کرلیں۔ جو کرچیاں چننے کا ہنر جانتی ہو۔" ارحم ایک پر مسرت سی حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھ کر اس کے قریب آیا۔

"اور کس کس بات سے تمہیں دکھ ہوتا ہے عھنا۔" وہ اس کے بالکل مقابل کھڑا تھا۔

"مجھے اس بات سے دکھ ہوتا ہے کہ آپ اتنی دھند اور سردی میں یہاں کھڑے ہیں۔ حالانکہ آپ اس سے پہلے بیمار رہ چکے ہیں اور آپ کو دوبارہ بھی نمونیے کا اٹیک ہو سکتا ہے۔"

"تم بہت اچھی ہو بہت کیوٹ۔" اس نے انگوٹھے اور انگلی سے اس کی ناک کو ہلکا سا دبا کر چھوڑ دیا۔

"آؤ دوستی کرلیں۔"

اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ عھنا نے جھجکتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پھر فوراً ہی اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

"اف کتنے ٹھنڈے ہو رہے ہیں آپ کے ہاتھ۔"

"اور تمہارے کتنے گرم اور نرم۔"

"مخلص لوگوں کے گرم ہی ہوتے ہیں۔ فوراً جائیں، جا کر گرم گرم چائے یا کافی پئیں۔"

"آج تمہارے ہاتھ کی چائے پیوں گا۔ اس دوستی کی خوشی میں اور پرومس اب تم پر غصہ نہیں کروں گا اور تم بھی ناراض نہیں ہوگی۔ اگر غلطی سے کچھ غلط بول گیا تو۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ مسکرائی۔ "آئیے اندر چلیں۔"

"نہیں میری انیکسی میں۔"

"اچھا میں ذرا خدا بخش چاچا سے کہہ دوں کہ وہ اکرم سے مجھے ایک کتاب منگوا دیں۔ میں کتاب کے لیے ہی باہر نکلی تھی۔ کچھ بال پین بھی چاہیے تھے۔"

"تو چلو باہر چلتے ہیں، کہیں باہر چل کر چائے پیتے ہیں۔ تمہارے ہاتھ کی چائے پھر سہی۔ یہاں قریب ہی ایک کیفے ہے۔ اس کی پیسٹری اور چائے بہت مشہور ہے۔ پھر تمہاری کتاب خرید لیں گے۔"

اس نے ایک لمحہ کے لیے سوچا۔ ارحم نے بغور اسے دیکھا۔

"ٹھیک ہے چلتے ہیں۔ میں حمیدہ کو بتا دوں۔"

وہ ارحم کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے حمیدہ کو بتا کر اس کے ساتھ گیٹ سے باہر نکل آئی۔ ارحم کا دل چاہا وہ اس کا ہاتھ تھام لے اور اس دھند بھرے موسم میں اس کا ہاتھ تھامے چلتا رہے، ہولے ہولے باتیں کرتا اور پھر اسے خود ہی اپنی سوچ پر ہنسی آگئی۔

"کیا ہوا۔" عھنا نے اس کی طرف دیکھا۔

یوں ہی ایک بات یاد آگئی تھی۔ پہلے لاہور میں اتنی دھند نہیں ہوتی تھی۔

"اچھا۔ اس میں ہنسنے والی تو کوئی بات نہیں۔"

"ہاں ہنسی تو مجھے کسی اور بات پر آئی تھی۔

جب میں پڑھتا تھا تو ہم دوست کبھی کبھی تیز بارش میں بھیگتے اس کیفے میں کافی یا چائے پینے آتے تھے۔" وہ بتا رہا تھا اور وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سن رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اے ابر کرم آج اتنا برس' اتنا برس کہ وہ جانہ سکیں۔" ارحم نے مسکرا کر عینا کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت انیکسی کے برآمدے میں کھڑے تھے اور بارش برس رہی تھی۔

"میں بارش کے بغیر بھی تو رکی ہوئی تھی۔" عینا نے ہاتھ آگے بڑھا کر بارش کے قطروں کو اپنے ہاتھوں پر لیا۔

"تمہیں بارش کیسی لگتی ہے عینا۔"

"بہت اچھی۔"

"وہاں یو اے ای میں بارشیں بہت کم ہوتی ہیں' مجھے وہاں لاہور کی بارشیں بہت یاد آتی تھیں۔" وہ اندر سے فولڈنگ چیئرز اٹھا لایا تھا۔

"تم بیٹھو یہاں۔ میں ابھی آیا۔ پھر بارش انجوائے کرتے ہیں۔" کچھ ہی دیر بعد وہ جھاگ اڑاتی گرم گرم کافی کے کپ اٹھائے آیا۔

جنوری کی بارش انجوائے کرتے کرتے کہیں ہماری بھی قلفی نہ جم جائے۔

"تمہیں سردی لگ رہی ہے۔"

وہ فولڈنگ ٹیبل پر کپ رکھ کر پھر اندر گیا۔ واپس آیا تو اس کے بازو پر اس کا گرم کوٹ تھا۔ "تو یہ پہن لو۔"

"نہیں۔" وہ جھجکی۔

"ارے یار پہن لو۔" اس نے بے تکلفی سے کہا۔ "پھر گرم گرم کافی پیتے ہوئے باتیں کرتے ہیں۔ میں تمہیں دوسرے ملکوں کی مزے مزے کی باتیں بتاتا ہوں۔"

"مجھے کافی کچھ زیادہ پسند نہیں آتی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کافی اس روز پی تھی جب آپ نے بنائی تھی۔"

"تمہارے لیے چائے بنا لوں۔"

"اب آپ نے بنالی ہے تو مجبوراً" پی لوں گی۔" وہ ہنسی۔

"تم ہنستے ہوئے اچھی لگتی ہو' لیکن میں نے تمہیں ہنستے ہوئے بہت کم دیکھا ہے۔ ہنستی رہا کرو۔"

پچھلے تین' چار دنوں میں انہوں نے بے شمار باتیں کی تھیں۔ ارحم نے اسے مختلف ملکوں میں رہنے کے دوران ہونے والے واقعات بتائے تھے۔ عینا ہر روز ہی کچھ دیر کے لیے ارحم کے پاس آتی تھی۔ دونوں مل کے چائے پیتے تھے اور باتیں کرتے تھے۔ آج تو سنڈے تھا۔ ارحم کی ضد پر اس نے کھانا اسی کے ساتھ کھایا تھا اور کھانے کے دوران ہی بارش شروع ہو گئی تھی۔ کافی پیتے ہوئے وہ اسے ہندو لڑکی کانیا کا احوال بتانے لگا جو بری طرح اس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ بڑی عجیب لڑکی تھی وہ۔

"آپ اتنی لڑکیوں سے' ملے ارحم بھائی کبھی کسی نے اٹریکٹ نہیں کیا۔"

"نہیں سحر کے بعد کسی نے نہیں۔ سچ پوچھو تو مجھے عورتیں۔"

"سب عورتیں بری نہیں ہوتیں ارحم بھائی۔" عینا نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ہاں۔ لیکن میرا مزاج ہی کچھ ایسا ہو گیا تھا کہ میں عورتوں سے بھاگتا تھا۔ بہت بے اعتبار ہو گیا تھا۔"

لیکن کبھی نہ کبھی' کسی نہ کسی پر تو اعتبار کرنا پڑے گا نا۔ زندگی یوں ہی تو نہیں گزرتی۔ انسان کے دل میں بڑی گنجائش ہوتی ہے۔ ایک کے بعد دوسری محبت کی۔"

"شاید ایسا ہوتا ہو" اس نے بغور اسے دیکھا۔

"تم موسم بدلنے پر قدرت رکھتی ہو عینا۔ میرے اندر کے موسم بدل رہے ہیں۔ خزائیں رخصت ہونا چاہتی ہیں۔ لیکن پھر میں ابھی بہار کی آمد کو پوری طرح محسوس بھی نہیں کر پاتا کہ خزاں پھر سے پنکھ پھیلائے میرے اندر اتر آتی ہے۔"

"وقت تو لگتا ہے ارحم بھائی کسی بھی تبدیلی میں۔ ایک دم سے سب کچھ تبدیل نہیں ہو جاتا۔" عینا کا لہجہ نرم تھا۔ ہولے ہولے بات کرتی وہ ارحم کو اچھی لگنے لگی تھی۔

"بے اعتباری' بے وفائی' منزل کھو جانے کا دکھ' کرب اور عذاب انسان کو ریزہ ریزہ کرکے بکھیر دیتے

کے لیے کافی ہوتا ہے اور آپ کہتی ہیں میں نئے سرے سے زندگی شروع کروں' نئے گل بوٹے لگاؤں۔ تمام گرد اور جالے صاف کردوں۔"

"ہاں۔۔۔" وہ مسکرائی اور آخری گھونٹ لے کر خالی کپ ٹیبل پر رکھا۔

"میرے دل میں بے شمار چھید ہیں عینا۔ پتا نہیں کبھی وہ بھر بھی پائیں گے یا نہیں۔ آپ نے ان سارے بیتے دنوں میں جو کچھ کہا۔ مجھے اچھا لگا۔ بہت محبوب ہوگیا مجھے' لیکن مجھے تو جیسے سراب کے پیچھے بھاگنے اور ریت اور دھول پھانکنے کی عادت ہوگئی ہے۔ دن میں وعدہ کرتا ہوں آپ سے خود سے کہ آنے والا دن دوسرے دنوں سے مختلف ہوگا۔ لیکن جب بے دار ہوتا ہوں تو دل میں وہی وحشت ہوتی ہے۔ وہی دکھ' وہی عذاب' پھر سے زندہ ہوجاتے ہیں۔" وہ یوں ہی باتیں کرتے کرتے اداس ہوجاتا تھا۔

"میں عجیب و غریب موسموں سے گزر رہا ہوں اور سمجھ نہیں پارہا کہ کیا ہورہا ہے۔"

"میں بتاؤں۔" عینا نے شوخی سے کہا۔

"آپ کے اندر تبدیلی ہورہی ہے۔ آپ کو احساس زیاں ہورہا ہے۔ بیتے بارہ برس ضائع کرنے کا۔ اگر بارہ برس پہلے آپ شادی کرلیتے تو اس وقت آپ کے تین' چار بچے ہوتے۔"

"خدا کا خوف کرو لڑکی۔ ایک' دو نہیں تین' چار۔"

"اور آپ کی مسز اس وقت ڈاکٹر خالد کی بیوی کی طرح آپ کو بار بار مس کال دے رہی ہوتیں۔" وہ ہنس رہی تھی اور ارحم اسے مبہوت سا دیکھ رہا تھا۔ بارش رک گئی تھی اور موسم کھل گیا تھا۔

"میں اب چلتی ہوں ارحم بھائی۔ مجھے کل یونیورسٹی بھی جانا ہے' کچھ نوٹس تیار کرنے تھے۔"

"میں بھی چلتا ہوں' خالد کی طرف جاؤں گا۔ تمہارے ساتھ باتوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ تم چلی جاتی ہو تو وقت کاٹے نہیں کٹتا۔"

اس نے کوٹ اتار کر ارحم کی طرف بڑھایا۔

"پہنے رکھتیں' اچھا لگ رہا تھا۔"

ارحم نے کوٹ لے لیا اور یوں ہی بازو پر ڈالے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ میں عمر بھر یوں ہی تمہارے ساتھ چلتا رہوں اور تم اپنے مخصوص لہجے میں دھیمے دھیمے سے میرے اندر خوشیوں کا رس قطرہ قطرہ ٹپکاتی جاؤ۔"

یہ کیسی سوچ تھی۔ اس نے گھبرا کر عینا کی طرف دیکھا کہ کہیں اس نے اس کی سوچ تو نہیں پڑھ لی۔ وہ معصوم سی لڑکی جو صرف اپنے خلوص و محبت سے مجبور ہو کر اسے نارمل زندگی کی طرف لانا چاہتی ہے۔ جو چاہتی ہے کہ وہ سب بھلا دے جو اس کے ساتھ ہوا اور کسی اچھی لڑکی کی ہمراہی میں زندگی کا سفر شروع کرے۔

لیکن وہ اپنے دھیان میں مگن انگلیوں سے شلوار کے پائنچے اونچے کیے نیچے دیکھتے ہوئے چل رہی تھی۔

"یہ کیسی سوچ میرے دل میں پیدا ہورہی ہے۔" وہ خوف زدہ ہو کر تیز تیز چلنے لگا۔

"ارحم بھائی پلیز رکیں' میری بات سنیں۔۔۔ وف۔۔۔"

ارحم گیٹ کے پاس پہنچ گیا تھا اور وہ پورچ کی سیڑھیوں کے پاس کھڑی تھی۔ تب ہی گیٹ کھلا تھا اور کوئی اندر داخل ہوا تھا۔ نیلی جینز پر قیمتی لیدر جیکٹ اور وہ ٹرالی بیگ گھسیٹتا ہوا اندر آیا تھا اور پھر اسے وہاں ہی چھوڑ کر ارحم سے لپٹ گیا تھا۔

"ارحم بھائی۔۔۔ ارحم بھائی یہ میں ہوں صائم۔۔۔ پہچانا نہیں مجھے۔"

ارحم ساکت کھڑا تھا۔ جب آخری بار ارحم نے اسے دیکھا تھا تو وہ بارہ سال کا تھا اور اب چوبیس سال کا اونچا لمبا جوان اس کے چہرے پر عینک بہت جچ رہی تھی۔

"ارحم بھائی۔۔۔ آپ ناراض ہیں مجھ سے ابھی تک۔ آپ نے دوسروں کی سزا مجھے کیوں دی۔ آپ مجھے بھی چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ آپ کو معلوم ہے میں کتنا رویا تھا۔ کتنے دن روتا رہا۔ آپ کو یاد کرکے راتوں کو اٹھ اٹھ کر آپ کے کمرے میں جاتا تھا کہ شاید آپ

آگئے ہوں۔ آپ نے بہت ظلم کیا مجھ پر' خود پر۔" وہ رو رہا تھا۔ ارحم کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی۔
اس کے نیچے گرے ہوئے ہاتھ اٹھے اور اس نے صائم کو مضبوطی سے اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے لیا۔
"صائم۔" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور خشک آنکھوں میں نمی پھیلتی جارہی تھی اور عمنا نم آنکھوں سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد صائم الگ ہوا۔
"مجھے آپ سے باتیں کرنی ہیں اور بہت سارا لڑنا ہے۔"
اس نے آنکھیں پونچھیں اور عمنا کی طرف دیکھا جو قریب آکر کھڑی ہوئی تھی۔
"یہ تم ہو عمنا بونگی لڑکی۔ آج بھی ویسی ہی لگ رہی ہو بونگی۔"
"اور یہ تم ہو پڑھاکو صائم۔ آج بھی ویسے ہی لگ رہے ہو پڑھاکو سے۔" عمنا اب وہ بارہ سال پہلے والی عمنا نہیں تھی جو صائم سے بات کرتے ہوئے جھجکتی تھی۔ صائم بے اختیار مسکرا دیا۔
"چلیں نا اندر۔ یہاں ہی کھڑے رہیں گے؟" عمنا کو ہی خیال آیا تھا۔
"اور یہ آپ نے اپنے آنے کی اطلاع ہی نہیں دی۔"
"ہاں۔ میں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ پرسوں صبح میرا آخری پیپر تھا اور آج میں یہاں ہوں۔ مجھے ڈر تھا کہ میں پھر ارحم بھائی کو کھو نہ دوں۔" اس نے مسکرا کر ارحم کی طرف دیکھا۔ دل کا گداز پھر پتھر میں ڈھل گیا تھا۔
"چلیے نا اندر۔ چل کر بیٹھتے ہیں۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔"
"ہاں ٹھیک ہے۔ تم چلو میں پھر آتا ہوں۔" ارحم کا چہرہ سپاٹ تھا۔ وہ ایک دم ہی گیٹ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔
"دراصل ارحم بھائی کسی ضروری کام سے جارہے تھے۔" صائم نے اس طرح اسے دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو کسی وضاحت کی ضرورت نہیں' سب جانتا ہوں میں۔ اکرم کو سامان اندر لانے کا کہہ کر اس نے اندرونی گیٹ کی طرف قدم بڑھایا اور عمنا بھی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

☼ ☼ ☼

عمنا کچن میں حمیدہ کے ساتھ مصروف تھی۔ جب صائم نے اندر جھانکا۔
"بڑے مزے مزے کی خوشبوئیں آرہی ہیں۔"
"تم جاگ گئے ہو۔" عمنا نے مڑ کر دیکھا۔ وہ فریش لگ رہا تھا۔
"بہت تھکاوٹ تھی۔ بستر پر گرتے ہی غڑوں۔"
"یہ غڑوں کیا۔"
"جب میں چھوٹا تھا نا تو کبھی ارحم بھائی کو تنگ کرتا تھا' تو وہ کہتے تھے چلو اب غڑوں ہو جاؤ۔ آواز نہ آئے تمہاری اور میں سو جاتا تھا۔ یہ ارحم بھائی نہیں آئے ابھی تک میں ان کے کمرے میں دیکھ آیا ہوں۔"
"تم چلو لاؤنج میں چل کر بیٹھو' میں آتی ہوں۔"
عمنا نے صافی سے ہاتھ پونچھے اور حمیدہ کو کچھ ہدایات دے کر باہر آگئی۔ وہ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھا ریموٹ کے ساتھ کھیل رہا تھا۔
"پھپھو کا دو بار فون آچکا ہے۔ پہلے ان سے بات کرلو' پھر میں کھانا لگواتی ہوں۔"
"ارے انہیں کیسے پتا چلا۔ میں نے تو سوچا تھا کہ انہیں بھی سرپرائز دوں گا۔ یہاں آکر دیکھیں گی۔"
"میں نے فون کرکے بتایا تھا' نہیں تو ناراض ہوتیں۔"
"میرا سارا سرپرائز خراب کردیا تم نے۔" صائم نمبر ملانے لگا۔
عمنا اس کے دائیں طرف والی صوفہ چیئر پر بیٹھ گئی۔
"ملا پرسوں آئیں گی' کل ان کی کوئی ضروری میٹنگ ہے۔ کسی پارٹی کے ساتھ اور ڈیڈی بھی پرسوں

صبح کی فلائٹ سے آئیں گے۔" عمنا نے سرہلایا۔
"میرے پاس ایک اور خبر بھی ہے۔"
"کیا۔ کوئی اور بھی آرہا ہے تمہاری انگریز بیوی تو نہیں۔"
"بلف۔" اس نے قہقہہ لگایا۔
"پتا نہیں کیوں جب بھی کوئی گوری دل کو بھائی اور سوچا کہ دل ہاتھ پر رکھ کر اسے پیش کردوں تو ایک چھوٹی سی پیاری سی شرمیلی سی لڑکی بڑے سے دوپٹے میں خود کو چھپائے سامنے آگئی اور گوری کا سارا حسن ماند پڑ گیا۔"
"کون ہے وہ لڑکی۔" عمنا کی آنکھوں میں اشتیاق تھا۔
"بتادیں گے کسی مناسب موقع پر۔" اس نے بہت گہری نظروں سے عمنا کی طرف دیکھا۔
"تم بہت بدل گئے ہو صائم۔ پہلے تو تم بڑے سنجیدہ سے ہوتے تھے۔ بلکہ کافی تنہائی پسند اور کچھ اکھڑ سے۔" صائم نے ہنستے ہوئے اس کی بات کاٹی۔
"بات یہ ہے کہ جب ارحم بھائی گھر سے چلے گئے تو گھر میں سناٹے گونجنے لگے۔ اتنی خاموشی اور سناٹا ہوتا تھا کہ گھبرا کر میں کمرے سے نکل آتا اور خود باتیں کرنے لگتا اونچا اونچا ہنستا۔ ڈیڈی اور ماما کو لطیفے سناتا۔ دوستوں کو گھر بلانے لگا حالانکہ اس سے پہلے میرے دوست تھے ہی نہیں صرف ارحم بھائی تھے میرے دوست اور پھر عادت سی ہو گئی اور پردیس میں تو تنہائی یوں بھی کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ ہم چند دوست کسی نہ کسی ویک اینڈ پر مل بیٹھتے تھے اور خوب ہلا گلا کرکے دل بہلاتے تھے۔"
"ابھی اور کتنا رہنا ہے وہاں۔"
"ایک سمسٹر رہ گیا ہے بس۔" صائم نے ریموٹ سے ٹی وی آن کیا۔
"کھانا لگوادوں صائم یا کچھ دیر سے کھاؤ گے۔"
"ارحم بھائی کب تک آجائیں گے۔ دس تو بج رہے ہیں۔ آجائیں تو اکٹھے کھانا کھاتے ہیں۔"
"وہ دراصل صائم ارحم بھائی ادھر نہیں رہتے۔ وہ انیکسی میں رہتے ہیں۔ ان گزشتہ سالوں میں وہ جتنی بار بھی آئے وہاں ہی ٹھہرے۔ اپنا کھانا بھی خود بناتے تھے۔" عمنا نے جھجکتے ہوئے بتایا۔
"کیوں مجھے تو کبھی کسی نے نہیں بتایا۔ نہ ماما نے نہ ڈیڈی نے۔ میری موجودگی میں تو وہ کبھی نہیں آئے یہاں۔ میں باہر چلا گیا تھا۔ تب وہ آئے تھے اور اس سے پہلے وہ ڈیڈی کے بائے پاس پر آئے تھے اور تب میں اپنے اسکول کے طلبا اور ٹیچرز کے ساتھ کاغان گیا ہوا تھا اور وہ میرے آنے سے پہلے ہی چلے گئے تھے۔ تب وہ صرف ایک ہفتہ رہے تھے یہاں۔ میں ان کو بلا کر لاتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
"بیٹھو صائم میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ لیکن پلیز ارحم بھائی سے کچھ مت کہنا۔" صائم بیٹھ گیا تو عمنا نے ہولے ہولے اسے وہ سب بتادیا جو ارحم نے اسے بتایا تھا۔
"لیکن تب اس صبح۔" اس نے کچھ یاد کرتے ہوئے عمنا کی طرف دیکھا۔
"میں ڈیڈی کی بلند آواز سن کر کمرے سے باہر آیا تھا۔ ارحم بھائی کا کمرہ میرے کمرے کے ساتھ ہی ہے نا۔ دروازہ کھلا تھا۔ میں ابھی پوری طرح جاگا نہیں تھا۔ مجھے تو پوری طرح کوئی بات ہی سمجھ نہیں آئی تھی۔ ہاں ارحم بھائی مجھے دیکھ رہے تھے۔ لیکن ماما مجھے بازو سے پکڑ کر باہر لے آئی تھیں۔ بخدا عمنا میں نے کبھی نہیں سوچا کہ میرا بھائی شرابی ہے۔ میری تو کئی راتیں اور دن ان کے کمرے میں گزرتے تھے۔ میں تو اکثر ان کے کمرے میں ہی سو جاتا تھا۔ مجھے تو کبھی سمجھ نہیں آیا کہ وہ اچانک ہم سب کو چھوڑ کر کیوں چلے گئے۔ میں کم عمر تھا۔ صرف بارہ سال کا۔ لیکن مجھے اتنا پتا تھا کہ وہ سحر آپی سے محبت کرتے ہیں اور انہوں نے سحر آپی کی شادی کا اثر لیا ہے۔ ان کے جانے کے بعد جب بھی ڈیڈی نے اس بات پر دکھ کا اظہار کیا کہ ارحم نے شراب پی اور ہر بار میں نے تردید کی پورے یقین سے کہا کہ ارحم بھائی ایسے ہرگز نہیں ہیں۔" وہ ایکدم

اٹھ کھڑا ہوا۔
"تم کھانا لگواؤ میں آتا ہوں۔"
عینا کچن میں آئی تو رفیق نے بتایا۔" ارحم صاحب نے کھانا بھجوانے سے منع کر دیا تھا۔ کہہ رہے تھے باہر سے کھا آیا ہوں۔"
عینا سرہلا کر ڈائننگ روم میں آ گئی۔ شازیہ ٹیبل لگا رہی تھی۔ وہ اسے ہدایات دینے لگی۔ حالانکہ وہ ٹرینڈ تھی۔ اسے کسی ہدایت کی ضرورت نہ تھی۔
"سلاد نہیں رکھا تم نے۔"
"بس باجی ابھی لائی۔" شازیہ چلی گئی تو وہ یوں ہی کھڑی ہو کر ٹیبل کا جائزہ لینے لگی۔
"کیا کیا پکا ہے بھئی۔" صائم جیسے ہی ڈائننگ روم میں آیا تھا۔ عینا نے مڑ کر دیکھا تو اس کی آنکھیں ایک دم جگمگا اٹھیں۔ صائم' ارحم کے بازو میں بازو ڈالے کھڑا تھا۔
"ارحم بھائی آپ آ گئے نا۔"
"یار میں نے کہا بھی ہے کھانا کھا کر آیا ہوں۔"
ارحم نے عینا کی آنکھوں میں اترتے خوشی کے جگنو دیکھ لیے تھے اور اسے لگا تھا جیسے اس نے صائم کے ساتھ آ کر اچھا کیا ہے۔ اس نے صائم کی ساری بات تحمل سے سنی تھی۔
"جو گزر گیا سو گزر گیا۔ صائم میں بھول گیا سب مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔ میری اپنی ایک دنیا ہے اور میں اس میں خوش ہوں۔ تنہا' اکیلے رہنے کا عادی ہو چکا ہوں' ہر رشتے کے بغیر۔ مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں۔ نہ ہی کوئی شکوہ ہے۔ ہر ایک نے اپنے ظرف کے مطابق جانا اور سمجھا اور میں نے اسے قبول کر لیا۔ میں یہاں صرف ڈیڈی سے ملنے آیا تھا۔ صرف اس لیے کہ روز محشر میری پرسش نہ ہو۔" لیکن اس کے سامنے بھی صائم تھا۔ جس نے بارہ برس کے ہر دن اسے یاد کیا تھا۔
"اور میں اپنے بارہ برسوں کا حساب کس سے لوں۔ صائم ہر رات میں نے تڑپتے گزاری۔" اس نے سوچا تھا۔

"ارحم بھائی۔۔۔ اگر آپ میرے ساتھ نہیں چلیں گے تو میں بھی یہاں ہی رہوں گا آپ کے ساتھ۔ آپ کو یاد ہے نا میں بچپن میں بھی ایسا ہی کرتا تھا۔ میں زبردستی آپ کے کمرے میں ہی سو جاتا تھا اور اگر آپ میرے ساتھ آ کر کھانا نہیں کھائیں گے تو میں بھی نہیں کھاؤں گا۔ حالانکہ مجھے بہت بھوک لگی ہے اور آپ کو پتا ہے کہ میں بھوک بالکل بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن میں کروں گا۔" وہ بیڈ پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا تھا۔ ارحم متذبذب سا کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ صائم نے جوتے اتارے تھے اور بیڈ پر لیٹ کر کمبل سر تک تان لیا تھا۔ ارحم جھنجلایا تھا۔
"کیا کر رہے ہو صائم' جاؤ کھانا کھا کر اپنے کمرے میں آرام سے سو جاؤ۔" لیکن صائم نے کروٹ بدل لی تھی۔
"سونے سے پہلے لائٹ آف کر دیجیے گا۔ آپ کو پتا ہے نا مجھے روشنی میں نیند نہیں آتی۔" اس نے کمبل میں منہ دیے دیے ہی کہا تھا۔
"اور جب پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہوں تو پھر بالکل بھی نہیں آتی۔"
"اور میں کہاں سوؤں گا۔ اٹھو میرے بیڈ سے۔"
"بیڈ پر کافی جگہ ہے' صوفہ بھی ہے' جہاں جی چاہے سو جائیں۔" وہ لمحہ بھر وہاں ہی بیڈ کے پاس کھڑا سوچتا رہا تھا۔ پھر اس کا کمبل کھینچا تھا۔
"اٹھو۔۔۔ چیٹر ہو' تم بلیک میلر۔۔۔ ہمیشہ مجھے بلیک میل کرتے ہو بچپن سے۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور بیڈ پر آلتی پالتی مارے چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"کاش مجھے اس وقت پتا چل جاتا کہ آپ گھر چھوڑ کر جا رہے ہیں اور پھر بارہ سال تک میں آپ کی صورت نہ دیکھ سکوں گا تو میں کسی نہ کسی طرح آپ کو روک ہی لیتا' چاہے بلیک میل کرتا' چاہے چیٹ۔"
"صائم پلیز۔۔۔ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ اب سب کچھ ویسا نہیں ہو سکتا' جیسا پہلے تھا۔ دل پتھر ہو چکا اور روح نے بے حسی کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔"
"ہاں سب کچھ بدل گیا ہو گا۔ لیکن صائم کا دل تو

نہیں بدلا ارحم بھائی۔۔۔ اور یہ کبھی بھی نہیں بدلا تھا۔ اس دل میں ارحم بھائی صائم کے واحد دوست ہیں آج بھی۔ صائم نے ان بارہ سالوں میں ہر رات سونے سے پہلے ارحم بھائی کے لیے دعا کی۔ ان سے ملنے کی دعا۔ جب جب فون کیا پہلے یہی پوچھا کہ ڈیڈی ' ارحم کا فون آیا ارحم بھائی کا کچھ پتا چلا۔ آپ کو ماما سے گلہ تھا۔ سحر آپی سے شکوہ تھا۔ مجھ سے کیوں منہ موڑ لیا۔ میں تو آپ کا اپنا تھا آپ کا پیارا صائم۔"

"اور ان دونوں سے ہی تو مجھے شکوہ نہیں تھا صائم۔" بے اختیار لبوں سے پھسلا تھا۔

"اور پھر کیا مجھ سے اور ڈیڈی سے۔۔۔"

"اب وہ اسے کیا بتاتا کہ ہاں ان ہی دونوں سے۔"

"یار زچ مت کرو۔ صائم مجھے سونے دو' نیند آرہی ہے۔"

"تو سو جائیں۔" وہ پھر کمبل تان کر سونے کی تیاری کرنے لگا تھا۔

"صائم۔" اس نے دانت پیسے تھے اور اس کا بازو پکڑ کر کھینچتا ہوا باہر لے آیا تھا۔

"چیٹر۔۔۔ بلیک میلر۔" وہ بڑبڑایا تو ٹیبل پر سلاد رکھتی عہنا نے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھ سے کچھ کہا آپ نے ارحم بھائی۔"

"نہیں۔۔۔" اس نے صائم کی طرف دیکھا۔ جس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

"اب بیٹھو بھی' شکل کیا دیکھ رہے ہو' تمہارے تو پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔" ارحم چڑا ہوا تھا۔

"ہاں تو دوڑ رہے ہیں نا۔" صائم نے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ لیے کرسی کھینچی۔ تو ارحم بھی اس کے برابر بیٹھ گیا۔

عہنا نے اس کی طرف ڈش بڑھائی۔

"ارحم بھائی یہ روسٹ لیں اور صائم تم بھی لونا۔"

"تم نے بنایا ہے۔" صائم نے پوچھا۔

"نہیں۔ حمیدہ نے۔" صائم اور عہنا باتیں کر رہے تھے اور ایک خوب صورت منظر اس کی آنکھوں کے سامنے آرہا تھا۔ وہ صائم' ڈیڈی' ماما اور سحر وہ کھو سا گیا تھا اور چھوٹے چھوٹے لقمے لیتے ہوئے اس کا دھیان صائم اور عہنا کی طرف نہیں تھا۔

"ارے صائم تم کوئی اور خبر بھی دینے والے تھے۔ کیا خبر تھی وہ۔" عہنا کو اچانک یاد آیا تھا۔

"وہ سحر آپی آئی ہوئی ہیں۔"

"کب آئی ہیں۔"

"ہفتہ بھر پہلے میری بات ہوئی تھی تو انھوں نے بتایا تھا کہ وہ پاکستان جا رہی ہیں۔ ان کے سسرال میں کسی کی شادی ہے۔ اسی میں شرکت کے لیے آئی ہیں۔"

"شادی میں مصروف ہوں گی۔ تب ہی تو فون نہیں کیا' ملنے نہیں آئیں۔"

اس نے جیسے خود کو تسلی دی۔ ورنہ ایک لمحہ کے لیے جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں لے لیا تھا ارحم کا دھیان ان کی باتوں کی طرف نہیں تھا۔ وہ ماضی میں کھویا ہوا تھا۔

"ارحم بھائی آپ کچھ لے نہیں رہے۔" عہنا نے چور نظروں سے ارحم کی طرف دیکھا۔ کیا اس نے سحر کے آنے کا سن لیا ہے۔

"میں نے بتایا تھا صائم کو کہ میں کھا آیا ہوں۔ لیکن یہ زبردستی لے آیا ہے۔" ارحم نے چونکتے ہوئے عہنا کی طرف دیکھا۔

"اچھا کیا نا۔۔۔ بہت اچھا لگ رہا ہے مجھے کہ آپ آگئے۔ یہ خوشی جو اس وقت آپ کے یہاں آنے سے صائم کو اور مجھے ملی ہے آپ نہ آتے تو یہ خوشی کے لمحات ہمارے ہاتھوں سے پھسل جاتے۔ یہ لمحے کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔ جب کبھی آپ ان لمحوں کو سوچیں گے تو آپ کو اچھا لگے گا کہ آپ نے صائم کا مان رکھا۔"

"اور میرا مان کس نے رکھا تھا عہنا۔ کسی نے نہیں۔" ارحم نے دل گرفتگی سے سوچا اور کھڑا ہو گیا۔

"اب میں چلوں صائم۔"

"کہاں۔۔۔" صائم نے منہ میں بریانی کا چمچہ ڈالتے ہوئے ارحم کی طرف دیکھا۔

"ٹیکسی میں۔"

"کیوں بھئی آپ نے ادھر ہی سونا ہے۔ جب تک میں یہاں ہوں آپ ادھر ہی رہیں گے۔ اپنے کمرے میں اور میں آپ کے کمرے میں۔ پھر دیر تک باتیں کریں گے۔ پچھلے بارہ برسوں کی باتیں کچھ آپ سنائیے گا۔ کچھ میں سناؤں گا۔ حکایت دل کہیں گے۔ کچھ حسینوں۔ جبینوں کا ذکر ہوگا اور رات کٹ جائے گی۔"

"صائم تمہاری باتیں مجھے ہضم نہیں ہو رہی ہیں۔" ارحم سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میرے تصور میں تم ابھی تک وہی بارہ سال کے صائم ہو۔"

"لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اب بارہ سال کا نہیں ہوں۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ عینا ٹشو سے ہاتھ صاف کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ بیٹھیں نا ارحم بھائی۔ میں نے باداموں کا حلوہ بنایا ہے۔ اس سرد موسم میں بہت اچھا لگے گا' چکھیں تو۔" اس نے دروازے کے قریب جا کر شازیہ کو آواز دی۔

"حلوہ لے آؤ شازیہ۔" اور پھر خود بھی باہر چلی گئی۔

"صائم۔" ارحم نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"بس ارحم بھائی۔ اب اور کچھ مت کہیے گا۔ نہیں تو میں نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دینا ہے۔" صائم نے بے حد سنجیدگی سے کہا تو ارحم نے بے بسی سے اسے دیکھا اور بیٹھ گیا۔

"عینا صحیح کہتی ہے ارحم بھائی باہر سے اخروٹ کی طرح سخت ہیں اور اندر سے نرم۔"

صائم نے چہرہ جھکا کر اپنی مسکراہٹ چھپائی تھی۔ وہ ارحم کو واپس لانا چاہتا تھا اس گھر میں۔ اس کے اختیار میں ہوتا تو پچھلے بارہ سال زندگی کی کتاب سے پھاڑ کر پھینک دیتا۔ پچھلے سال اس نے ڈیڈی کو ارحم کے لیے روتے دیکھا تھا۔ وہ اس سے ملنے بوسٹن آئے تھے۔ یونیورسٹی ہوسٹل میں اس کے کمرے میں بیٹھے بیٹھے انہوں نے ارحم کی بہت سی باتیں کی تھیں۔

"وہ ہمیشہ سے ہی بہت Sensitive (حساس) تھا۔ مجھے اس کے لیے وہ الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہیے تھے۔ میں نے اسے hurt کیا صائم۔ غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں۔ اس سے بھی غلطی ہوئی۔ وہ عمر ایسی ہی ہوتی ہے اور پھر جس طبقے سے ہم ہیں وہاں تو یہ بات عام سی ہے۔ لیکن مجھے فخر تھا کہ نہ میں' نہ میرا بیٹا۔ مجھے شاک لگا تھا' اور اس روز اس نے پورے یقین سے کہا تھا۔ "ڈیڈ بعض اوقات آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں۔ وہ صحیح نہیں ہوتا۔ میں نہیں جانتا وہ منظر کس نے Create (تخلیق) کیا تھا لیکن اس سے اگر آپ ارحم بھائی کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھ لیتے تو آپ کو یقین ہو جاتا کہ وہ ایک جھوٹ تھا' اور ان کی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔

"ہاں اس کے جانے کے بعد میرے دل نے بارہا کہا کہ ارحم ایسا نہیں تھا۔ جب وہ اسپتال میں بستر پر پڑا تھا تو میں نے سوچا تھا۔ وہ ہوش میں آ جائے گا تو میں۔ اس سے پوچھوں گا۔ وہ کون سا غم تھا جسے بھلانے کے لیے اس نے۔"

"ڈیڈی آپ یقین کر لیں۔ وہ سب جھوٹ تھا۔" صائم نے ان کی بات کاٹی تھی۔

"مجھے یقین ہے۔"

وہ بہت نارمل تھا۔ بہت نرم دل وہ تو ایک چڑیا کے بچے کو گھونسلے سے گرا دیکھ کر رو پڑتا تھا۔ لیکن اب۔ اب اگر تم اسے دیکھو تو۔ میں نے جب چار سالوں بعد اسے دیکھا۔ اور پھر اس کے بعد تو ہر بار مجھے لگا۔ میرا دل پھٹنے لگا ہے۔ اتنا سپاٹ اتنا سخت چہرہ۔ اتنی ویران آنکھیں' اور وہ رو پڑے تھے۔ تب صائم نے عہد کیا تھا کہ اگر کبھی ارحم بھائی اسے ملے تو وہ انہیں واپس لائے گا ہر قیمت پر۔

عینا حلوہ لے کر آئی تو وہ دونوں کہنیاں میز پر لگائے ہولے ہولے کچھ کہہ رہا تھا اور ارحم کی آنکھوں میں ایک نرم سا تاثر تھا۔ عینا حلوہ ٹیبل پر رکھ کر ان کی طرف متوجہ ہوگئی۔

☆ ☆ ☆

سحر نے جوس کا گھونٹ بھرتے ہوئے عہنا کی طرف دیکھا۔

وہ کچھ دیر پہلے ہی آئی تھی۔ عہنا نے چھ سالوں بعد اسے دیکھا تھا۔ چھ سال پہلے وہ آئی تھی تو گاؤں بھی آئی تھی اور صرف دو دن رہ کر چلی آئی تھی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ خوب صورت ہو گئی تھی۔ نازک جسم تھوڑا سا گداز ہو گیا تھا۔ ڈائمنڈ کا نیکلس اور ٹاپس پہنے وہ اس کی سحر آپی نہیں لگ رہی تھی، بلکہ کوئی اجنبی بیگم صاحبہ۔

"صائم نے بتایا تھا آپ کے آنے کا۔"

عہنا پتا نہیں کیوں اتنی گرم جوشی سے نہیں مل سکی تھی، جتنی کہ ملنا چاہیے تھا۔

"ہاں تو اس لیے تمہارا منہ پھولا ہوا ہے کہ میں اتنے دنوں سے تمہیں ملنے نہیں آئی۔" سحر نے پتا نہیں کیسے محسوس کر لیا تھا۔

"آتے ہی تو شادی کے ہنگامے شروع ہو گئے۔ پھر پتا چلا تھا پھپھو بھی کراچی نہیں ہیں تو میں نے سوچا ایک بار ہی جاؤں گی۔"

"یعنی میری کوئی اہمیت نہیں۔" عہنا نے سوچا۔

"پھپھو نے کب آنا ہے۔"

"شام کو۔" عہنا نے مختصراً جواب دیا۔

"آپ بچوں کو نہیں لائیں۔"

"ہاں ان لوگوں نے شادی بھی تو جنوری میں رکھ دی۔ ابھی چھٹیاں ختم ہوئی تھیں اور اسکول کھلے تھے تو خرم نے کہا۔ بچوں کو ان کی کزن کے پاس چھوڑ جاتے ہیں۔ خرم کی کزن ساتھ ہی رہتی ہیں۔ وہاں ایک روڈ کراس کر کے۔ یہ بتاؤ اماں کیسی ہیں۔"

"بیمار رہتی ہیں اکثر۔" عہنا اماں کے ذکر پر اداس ہو گئی۔

"آپ کب جائیں گی اماں سے ملنے۔"

"دیکھو کب جانا ہوتا ہے، لیکن ظاہر ہے مل کر ہی واپس جاؤں گی۔"

"آپ خوش ہیں سحر آپی۔"

"ہاں تمہیں کیا لگتا ہے۔" سحر کو اس کے سوال پر حیرت ہوئی۔

"آپ کو ارحم بھائی یاد نہیں آتے۔"

"میرا خیال ہے چھ سال پہلے جب میں آئی تھی تب بھی تم نے یہ پوچھا تھا اور میں نے جواب دیا تھا تمہیں یاد ہے۔" عہنا نے سر ہلایا۔

"میرا مطلب ہے وہ۔۔۔ آپ کو ان سے محبت تھی نا پھر آپ نے خرم بھائی سے کیوں شادی کی۔" سحر نے ایک گہری سانس لی۔

"تم ابھی بھی اتنی ہی بے وقوف ہو عہنا جتنی تب ہوا کرتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں تم سے ارحم کی باتیں کیا کرتی تھی۔ حالانکہ تم چھوٹی تھیں۔ لیکن ظاہر ہے۔ میں اماں یا شنا وغیرہ سے یہ دل کی باتیں نہیں کر سکتی تھی اور مجھے پتا ہے کہ جب میری شادی خرم سے ہو گئی تو تم حیران ہوئیں اور ابھی تک الجھی ہوئی ہو۔ تب ہی یہ سوال کرتی ہو تو آج تمہاری الجھن دور کر دوں۔" عہنا خاموشی سے اسے سن رہی تھی۔

"ہاں مجھے ارحم پسند تھا جب میں یہاں آئی تو میں نے ارحم کو دیکھا۔ اپنے آپ میں مگن، بے نیاز سا لڑکا تو مجھے اچھا لگا وہ۔۔۔ اور میں نے سوچا تھا کہ اگر اس سے میری شادی ہو گئی تو زندگی بہت اچھی گزرے گی۔ اتنا بڑا گھر، دولت، آرام اور کیا چاہیے ہوتا ہے زندگی میں۔۔۔ لیکن جب آپ کے سامنے ایک بہتر چوائس ہو تو بہتر کا انتخاب کرنا چاہیے۔ پہلے میرے پاس کوئی چوائس نہیں تھی، پھر میں نے خرم کو دیکھا۔ وہ بے اختیار میری طرف بڑھا تھا۔"

"تو خرم بھائی آپ کے نزدیک بہتر چوائس ہے۔" عہنا نے پوچھا۔

"ہاں ہر لحاظ سے۔" سحر کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

"اور پھر میں نے دیکھا پھپھو بھی ارحم کو دل سے پسند نہیں کرتی تھیں۔ اگرچہ بظاہر اس کا اظہار نہیں کرتی تھیں تو۔"

"اور آپ نے ارحم بھائی کا دل توڑ دیا۔" عہنا کے لہجے میں دکھ تھا۔

"بے وقوف لڑکی۔" سحر ہنسی۔
"ارحم جیسے لڑکوں کے دل ٹوٹ ٹوٹ کر جڑتے رہتے ہیں۔"
"ارحم جیسے لڑکوں سے کیا مراد ہے آپ کی۔" عینا کو ناگوار لگا تھا۔
"بھئی یہ فلرٹ قسم کے لڑکے کیا پتا یونیورسٹی میں کتنی لڑکیوں سے دوستی کر رکھی ہو اس نے۔" سحر کھڑی ہو گئی۔
"اوکے عینا گڑیا اب چلتی ہوں۔ دراصل میں شاپنگ کے لیے نکلی تھی۔ سوچا تم سے بھی ملتی چلوں تمہارے گفٹ وغیرہ پھر لاؤں گی۔ شام کو خرم کے ساتھ چکر لگاؤں گی۔ تب تک پھپھو بھی آ جائیں گی۔" عینا نے سر ہلا دیا۔
وہ سحر سے مل کر اس طرح خوش نہیں ہوئی تھی۔ جس طرح چھ سال پہلے ہوئی تھی۔ کتنی بے چینی سے انتظار کیا تھا اس نے تب اور کتنا روئی تھی۔ جب وہ جا رہی تھی۔ اتنی جلدی سحر آپی۔۔۔ جی نہیں بھرا' کچھ دن تو رک جائیں۔ وہ آخر دم تک منتیں کرتی رہی تھی۔ لیکن آج۔۔۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ کیا اس لیے کہ سحر نے ارحم بھائی سے بے وفائی کی تھی۔ چوٹ کیا تھا انہیں۔۔۔ بھلے شادی نہ کرتیں۔۔۔ لیکن۔۔۔ انہوں نے پھپھو کے ساتھ مل کر انہیں انکل فراز کی نظروں میں گرانے کی کوشش کی تھی اور یہ طے تھا کہ یہ انہوں نے ہی کیا تھا اور صائم جانتا تھا یہ شادی کرنا نہ کرنا ان کا حق تھا۔۔۔ لیکن ڈیڈی کی نظروں میں انہیں گرانا یہ تو صریح جرم تھا۔
"ہے۔۔۔ کیا سوچ رہی ہو۔" اسے صائم کے آنے کی خبر نہیں ہوئی تھی۔
"تم کب آئے ہو صائم اور ارحم بھائی کہاں ہیں۔"
"ابھی کچھ دیر پہلے آیا ہوں اور ارحم بھائی ڈاکٹر خالد سے ملنے چلے گئے۔"
"شاپنگ ہو گئی۔"
"تقریباً۔۔۔" وہ اس کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔ وہ ارحم کے ساتھ شاپنگ کے لیے گیا تھا۔
"تمہیں کیا ہوا ہے۔"
"مجھے کچھ نہیں۔"
"کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔" وہ گنگنایا۔
"کچھ بھی تو نہیں بھئی یوں ہی سحر آپی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ وہ ملنے آئی تھیں۔ شام کو خرم بھائی کے ساتھ آئیں گی۔"
"تمہیں سحر آپی کے آنے سے خوشی نہیں ہوئی۔" وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔
"کیوں بھلا خوشی کیوں نہیں ہو گی۔ بس اماں کے متعلق سوچ رہی تھی کہ آپی اماں سے ملنے جائیں گی تو میں بھی چلی جاؤں۔ بہت یاد آتی ہیں مجھے۔" "ماما آجائیں تو سب چلتے ہیں ملنے۔ مجھے بھی مامی سے ملے عرصہ ہو گیا ہے۔ وہی بارہ سال پہلے ملا تھا۔ سحر آپی کی شادی پر۔"
"ہوں ٹھیک ہے۔" عینا اداس سی تھی اور اسے خود پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیوں اداس ہے۔
"یاد ہے عینا جب تم سحر آپی کی شادی پر آئی تھیں تو میں نے تمہاری تصویر اتاری تھی۔"
"ہاں یاد ہے۔ یہاں سے جانے کے بعد میں نے کئی بار سوچا تھا۔ پھپھو سے کہوں تم سے میری تصویر لے کر بھیجیں۔ مجھے بہت شوق تھا۔ اپنی تصویر دیکھنے کا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی تصویر نہیں بنوائی تھی اور میں دیکھنا چاہتی تھی کہ میری تصویر کیسے آئی ہے۔"
"بہت پیاری آئی تھی تمہاری تصویر۔" صائم کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔
"اچھا جھوٹ مت بولو۔ سحر آپی کی شادی کے سال بھر بعد میٹرک کے داخلہ فارم پر لگانے کے لیے میں نے ماموں کے ساتھ جا کر فوٹو گرافر کی دکان پر اپنی زندگی کی دوسری تصویر بنوائی تھی' لیکن وہ بہت خراب تھی۔"
"لیکن جو میں نے اتاری تھی وہ تو بہت اچھی تھی' دیکھو گی۔"
"تم نے اب تک رکھی ہوئی ہے صائم۔ میں تو زاق

سمجھ رہی تھی۔"

"ہاں تو وہ میری شاہکار تصویر ہے۔ سنبھال کر کیوں نہ رکھتا۔" وہ دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"دکھاؤ نا کہاں ہے۔"

"دل میں۔" اس نے زیر لب کہا اور والٹ کھول کر اس کی طرف بڑھایا۔

والٹ میں اس کی تصویر لگی تھی۔ وہی سحر آپی کی شادی والی۔

"بے نا شرمیلی سے نخریلی سی۔"

"صائم۔" وہ حیران ہو رہی تھی۔ وہ تب صرف بارہ سال کا تھا اور وہ چودہ سال کی اور ان کے درمیان اس طرح کی اپنائیت اور بے تکلفی بالکل نہ تھی جیسے کزنز میں ہوتی ہے۔ شاید اس کی وجہ اسٹیٹس کا فرق تھا یا پھر دوری میل ملاپ نہ ہونا۔

"اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو۔" صائم نے والٹ اس کے ہاتھوں سے لے لیا۔

"فوٹوگرافی میری ہابی بھی ہے۔ اس لیے میں اپنی اتاری ہوئی ہر تصویر سنبھال کر رکھتا ہوں۔ چاہے وہ کسی بلو گھڑے کی کیوں نہ ہو۔ ابھی لاسٹ ایر لندن میں میری تصویروں کی نمائش ہوئی تھی۔ آؤ نا میں تمہیں اپنی شاپنگ دکھاؤں۔ ارحم بھائی کی چوائس بہت اچھی ہے۔ ان کے بغیر میں اتنی اچھی شاپنگ نہیں کر سکتا تھا۔ پچھلے سال بھی جب میں آیا تھا تو کئی فالتو چیزیں لے لی تھیں۔ یورپ بہت مہنگا ہے۔ میں ہمیشہ سال بھر کے لیے یہاں سے ہی شاپنگ کرتا ہوں۔ اٹھو چلو کیا سوچ رہی ہو۔"

"ہاں چلو۔" عہنا جو ابھی بھی سحر کے متعلق سوچ رہی تھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں باہر نکل آئے۔

☼ ☼ ☼

آج بظاہر منظر پورا مکمل تھا۔ بالکل ایسا ہی جیسا اس نے کبھی خوابوں میں دیکھا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر وہ سب تھے۔ وہ ڈیڈی اور صائم ساتھ ساتھ تھے۔ ملا اس کے بالکل سامنے تھیں دائیں طرف سحر تھی۔ وہ جب صائم کے ساتھ آکر بیٹھا تھا تو سحر اس کے مقابل تھی۔ پھر وہ اٹھ کر دائیں طرف بیٹھ گئی۔ پتا نہیں اس نے دانستہ ایسا کیا تھا یا پھر یوں ہی بے خیالی میں اٹھی تھی۔ منظر بظاہر مکمل تھا' لیکن کیا واقعی مکمل تھا۔ اس نے ایک اچٹتی ہوئی سی نظر سحر پر ڈالی تھی اور حیران سا ہوتا ہوا بیٹھ گیا تھا۔ یہ سحر تھی اس کے مقابل بیٹھی' وہ سوچتا تھا ہمیشہ کہ جب بھی اس نے سحر کو دیکھا تو وہ ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو جائے گا یا پھر شاید اس کے اندر بھڑکتی آگ یکدم شعلہ بن کر اسے جلا ڈالے گی۔ وہ کیسے کس طرح دیکھ پائے گا اسے' وہ نظریں جو اس کی طرف اٹھتی تھیں تو پھر جھکنا بھول جاتی تھیں۔ ان نظروں میں وہ التفات' وہ محبت نہیں ہوگی تو وہ کیونکر گردش دوراں کا بدلا ہوا چہرہ دیکھ پائے گا' لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک سرسری سی نظر اس پر ڈال کر ڈیڈی سے بات کرنے لگا تھا اور وہ اٹھ کر دائیں طرف والی چیئر پر بیٹھ گئی تھی اور اس کی چھوڑی ہوئی چیئر پر آکر عہنا بیٹھ گئی تھی۔ کھانا کھاتے ہوئے اس نے عہنا کی طرف مسکرا کر دیکھا تھا اور اپنی پلیٹ میں چاول ڈالنے لگا تھا۔

اس نے دو' تین بار سحر کی کھوجتی نظروں کی تپش اپنے چہرے پر محسوس کی تھی۔ جب عہنا نے اسے بتایا تھا کہ سحر آئی ہوئی ہے تو ایک لمحہ کو اسے اپنا دل پاتال میں گرتا محسوس ہوا تھا۔ پھر پوری رات وہ سو نہیں پایا تھا۔

"ایک اور رتجگا۔" اس نے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔ کیا اسے بھی اب ہی آنا تھا۔ پچھلے دو دن کتنے اچھے گزرے تھے۔ صائم وہ اور عہنا۔ وہ سالوں بعد صائم کی باتوں پر دل کھول کر ہنسا تھا۔ اس نے صائم کے ساتھ شاپنگ کی تھی اور رات کے وقت ٹھنڈے یخ ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈالے وہ سڑکوں پر ٹہلتے تھے اور اتنی دور تک چلے تھے کہ ان کی ناکیں جیسے سرد ہو کر چہرے پر رہی ہی نہیں تھیں اور پھر کافی ہاؤس میں بیٹھ کر گرم گرم کافی پیتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

"عہنا سچ ہی تو کہتی ہے' زندگی صرف سحر پر ختم

نہیں ہو جاتی اور یہ کہ اسے اپنے اندر نئے پھول اگانے چاہئیں اور اس رات اس نے اپنے اندر نئے پھول اور گل بوٹے اگتے محسوس کیے تھے۔ لیکن پھر۔۔۔“

”سحر آئی تھی مجھ سے ملنے۔“ عینا بتا رہی تھی اور وہ سارے گل بوٹے اپنے ہاتھوں سے اکھاڑ اکھاڑ کر پھینک رہا تھا۔ نہیں اس نام کے بعد کسی اور نام کی گنجائش نہیں رہی۔ سو طے ہوا کہ خزائیں مقدر ٹھہریں اور بہار میرے لیے نہیں‘ پھر میں کیوں نئے پودے اور پھول لگا رہا ہوں اور ان کی آبیاری کر رہا ہوں۔ وہ پورا دن بے چین رہا تھا۔ صائم اور عینا کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ان کے ساتھ نہیں تھا۔

”صائم اب میں نے تمہاری خواہش پوری کر دی‘ لیکن آج سے میں پھر انیکسی جا رہا ہوں۔ دیکھو اب مجھے یہاں رہنے پر مجبور نہ کرنا۔“ اس کمرے میں رہنا کسی امتحان سے کم نہیں تھا۔ یہی وہ کمرہ تھا جہاں اس کا مان ٹوٹا تھا۔ جہاں اس نے ڈیڈی کی آنکھوں میں اپنے لیے بے یقینی دیکھی تھی۔ اور صائم کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔

”ٹھیک ہے‘ لیکن کھانا‘ ناشتا سب ہمارے ساتھ ہی کھائیں گے۔ کم از کم تب تک جب تک میں ہوں۔“

”میں شاید تم سے پہلے ہی چلا جاؤں صائم۔ کل ڈیڈی سے مل کر ایک دو روز میں۔۔۔“

”لیکن ابھی تو آپ کی چھٹیاں ہیں نا۔“ صائم زیادہ ٹھہرنے پر اصرار کرتا رہا‘ لیکن وہ سحر کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا‘ نہ ہی اسے دیکھنا چاہتا۔ شاید وہ خود سے ڈرتا تھا۔ اسے دیکھے گا تو اس پر کیا گزرے گی۔ پتا نہیں وہ اکیلی آئے گی یا اپنے شوہر کے ساتھ۔ دوپہر میں بیگم راحت آئی تھیں۔ صائم اسے خود بلانے آیا تھا۔ لنچ کے لیے اس نے بھوک نہ ہونے کا بہانہ کر دیا تھا اور صائم نے بھی زیادہ زور نہیں ڈالا تھا اور اب ڈیڈی آ گئے تھے اور وہ یہاں تھا۔ ہمیشہ کی طرح اسے گلے لگاتے ہوئے ڈیڈی کی آنکھیں برس پڑی تھیں۔ لیکن اس نے اپنے گداز ہوتے دل کو پتھر کر لیا تھا۔ خشک آنکھوں کے ساتھ وہ ان سے الگ ہوا تھا۔

”تم بہت کمزور ہو گئے ہو ارحم۔“ ڈیڈی نے بہت غور سے اسے دیکھا تھا۔

”ہاں میری جاب بہت محنت والی ہے۔“ اس نے مختصراً کہا تھا۔ تپتے ہوئے سورج کے نیچے گرم ریت پر کام کرنا پڑتا ہے۔ رنگ جھلس جاتا ہے اور۔۔۔ خیر۔۔۔“

”کیا ضرورت ہے اتنی محنت کی ارحم یہ سب کچھ کس کا ہے آخر۔“

”یہ سب میں برسوں پہلے چھوڑ چکا اور میں اس سب پر کوئی حق نہیں رکھتا۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے ارحم‘ تم اور صائم ہی ہو میرے وارث۔“

”ڈیڈی پلیز۔۔۔ ہم اس موضوع پر بات کر چکے ہیں۔“

”میں یہاں اپنے لیے نہیں آتا۔ آپ کے لیے آتا ہوں۔ تاکہ آپ مجھے دیکھ سکیں۔“

اور وہ خاموش ہو گئے تھے۔ جانتے تھے اس کی ضد اور اس کا غصہ۔

”خرم نہیں آیا تمہارے ساتھ۔“ بیگم راحت نے سحر سے پوچھا تو وہ چونک کر اپنی پلیٹ میں چاول ڈالنے لگی۔

”وہ گھر پر نہیں تھے آج اسلام آباد گئے ہیں۔“

”تم ٹھیک ہو بیٹا۔ بڑے عرصہ بعد آئیں۔“ فراز خان بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

”جی بالکل ٹھیک ہوں۔ بہت بزی لائف ہے۔ بچوں کی ایجوکیشن‘ خرم کا بڑھتا بزنس چاہت کے باوجود نہیں آ سکے اب بھی بچے وہاں ہی چھوڑ کر آئے ہیں‘ خرم کی کزن کے گھر۔“ اس نے مسکراتے ہوئے ایک جتاتی نظر ارحم پر ڈالی تھی اور ارحم کو حیرت ہوئی کہ سحر کی اس بات کا اس کے دل پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا کہ وہ کہیں اور کسی اور کے شبستان میں مہکتی ہے اور خوش ہے۔ اس نے سر اٹھا کر مقابل بیٹھی عینا کی طرف دیکھا تھا جو چھوٹے چھوٹے نوالے لے رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے اداسی جھلکتی تھی۔ یقیناً وہ اس کے لیے اداس تھی۔ دل کو یقین ہوا۔

"عمنا پلیز ذرا یہ کوفتے والا ڈونگا پکڑانا۔" اس نے عمنا کو مخاطب کیا۔ سحر نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ عمنا کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ عمنا نے ڈونگا اس کی طرف بڑھایا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ ارحم کی مسکراہٹ گہری ہوگئی اور دل عجیب انداز میں دھڑکا۔

"سحر آپی آپ کب ماں سے ملنے جارہی ہیں۔" صائم نے اسے مخاطب کیا تو اس نے نظریں ارحم کے چہرے سے ہٹا کر صائم کی طرف دیکھا۔

"خرم آجائے اسلام آباد سے تو پروگرام بناتی ہوں۔

"اماں سے کل بھی بات ہوئی تھی مختصر سی۔ اگر خرم کے پاس وقت نہ ہوا جانے کا تو ان سے کہوں گی وہ مل جائیں آکر۔"

"خرم بھائی نہ بھی گئے تو آپ ہمارے ساتھ چلیے گا۔" صائم نے انوائیٹ کیا۔

"تم کب جارہے ہو۔" سحر نے پوچھا۔

"ماما ذرا اپنی تھکن اتار لیں تو دو روز تک میں، ماما اور عمنا چلیں گے۔ صبح جائیں گے، شام کو آجائیں گے۔"

"پھر تو اچھی بات ہے۔ خرم گاؤں جانے سے گھبراتا ہے۔" سحر خوش ہوگئی تھی۔ اس سارے عرصہ کے دوران بیگم راحت سر جھکائے خاموشی سے کھانا کھاتی رہی تھیں۔

"تم بہت خاموش ہو راحت کیا بات ہے۔" فراز خان نے انہیں مخاطب کیا۔

"میں منیر لاکھانی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ بہت تیز شخص ہے۔ اس نے جو ایگریمنٹ سائن کیا ہے اس میں سب شرائط اپنی مرضی کی لکھوائیں۔"

"تم بھی راحت اس وقت بزنس کی باتیں بھول جاؤ۔ تمہارے بچے گھر آئے ہوئے ہیں، انہیں ٹائم دو۔" بیگم راحت مسکرا کر صائم کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ کھانا خوش گوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ ارحم، صائم کے روکنے کے باوجود کھانے کے فوراً بعد ٹیکسی میں آگیا تھا۔ بہت دیر تک وہ کھڑکی کے پاس کھڑا باہر دیکھتا رہا۔ یہ کیسا احساس تھا جو اچانک اس کے اندر جاگا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار عمنا کا چہرہ آرہا تھا۔ اس کی باتیں سنتی اس کے لیے دکھی ہوتی۔ اس کے لیے روتی۔ اسے مشورے دیتی۔ یہ عمنا جلال اسی سحر جلال کی بہن تھی۔ جس نے اس کا دل کچل ڈالا تھا۔ جیتے جی مار دیا تھا اور یہ عمنا جلال تھی جو اپنی نرم باتوں سے اس کے زخموں پر پھاہے رکھتی تھی اور پاؤں میں چبھے کانٹے چنتی تھی اور اس کے لیے جگنو تلاش کرنا چاہتی تھی اور اسے خزائیں رخصت کرنے کو کہتی تھی اور وہ تھا کہ اپنے رویے سے اسے تکلیف پہنچاتا تھا۔ پھر بھی وہ تھوڑی دیر بعد بھول جاتی تھی اور اس کے لیے پریشان ہونے لگتی تھی۔

اس جیسا کوئی نہیں۔۔۔ یہ کیسی خواہش ہے جو دل میں پنپ رہی ہے۔ ہمیشہ اس کے قریب رہنے کی خواہش، نہیں۔۔۔ یہ میں کیا سوچ رہا ہوں بھلا۔ اس نے سر جھٹکا۔ کھلی کھڑکی سے آنے والی ہوا نے کمرہ بالکل سرد کردیا تھا۔

"عمنا جلال تم چپکے سے میرے اندر سرائیت کرگئی ہو۔" کھڑکی بند کرکے اپنے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس نے پھر سوچا۔

"اور یہ صحیح نہیں ہے۔ میں ایک بار پھر اس عذاب سے نہیں گزرنا چاہتا جس سے پہلے گزرا تھا اور پھر عمنا وہ معصوم سی سادہ دل لڑکی وہ بھلا کیا سوچے گی۔ اگر اسے میری سوچوں سے آگاہی ہوجائے تو۔" اس نے شعوری کوشش سے عمنا کا خیال جھٹکا اور بیڈ پر لیٹتے ہوئے آنکھیں بند کرکے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"یار خالد لگتا ہے مجھے عمنا سے محبت ہوگئی ہے۔" وہ خالد کے ڈرائنگ روم میں اس کے مقابل بیٹھا ہوا تھا۔ خالد کا قہقہہ بہت بلند تھا۔

"تمہیں آج لگا ہے مجھے تو اسی دن پتا چل گیا تھا۔ جب محترمہ بیڈ روم سلیپر پہنے رات کے لباس میں

ملبوس رو رو کر تمہاری صحت کے لیے دعائیں مانگ رہی تھیں کہ یہ خدمتیں رنگ لائیں گی ایک دن۔"

"حکومت خالد میں بہت پریشان ہوں۔"

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ میری جان بس سہرا باندھنے کی تیاری کرو۔"

"میرا یار بنے گا دولہا اور پھول کھلیں گے دل کے۔" اس نے بیٹھے بیٹھے ہی ٹھمکا لگایا۔

"خالد۔" اس نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ "مذاق مت کرو یار۔"

"ارحم۔" خالد سنجیدہ ہو گیا۔

"کون سی چیز تمہیں پریشان کر رہی ہے۔ وہ اچھی لڑکی ہے۔ تمہاری عزیز بھی ہے۔ پھر سیدھے سبھاؤ رشتہ بھجوا دو۔"

"وہ مجھ سے عمر میں بہت چھوٹی ہے۔"

"تو میری بیوی تیرہ سال چھوٹی ہے مجھ سے۔ کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔"

"وہ بیگم راحت کی بھتیجی ہے۔ وہ شاید ایسا نہ چاہیں۔"

"کیوں نہیں چاہیں گی وہ تم سے بہتر دولہا کہاں ملے گا انہیں۔" خالد کے پاس ہر سوال کا جواب تھا۔

"کیا تم سحر کی وجہ سے۔"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

اب وہ اسے کیا بتاتا کہ بات صرف سحر کی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ کیسے اسے بتاتا وہ بھرم کھونا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ آج تک سوائے عہنا کے اس نے کسی سے حتیٰ کہ خالد کو بھی سب نہیں بتایا تھا۔ خالد صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ سحر سے محبت کرتا تھا اور سحر نے اس کے بجائے کسی اور سے شادی کر لی۔

"کیا وہ جانتی ہے۔" خالد نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں۔"

"تو اسے بتا دو۔"

"کیسے۔" وہ ایک بار پھر بے بس نظر آ رہا تھا۔ "وہ کیا سوچے گی کہ میں نے اس کی ہمدردی اور دوستی کا غلط مطلب لیا۔"

"وہ ایسا کچھ نہیں سوچے گی میرے یار۔ ایک بار کہہ کر تو دیکھو۔" خالد نے اسے تھپکی دی۔

"میں نہیں جانتا یہ کیسے ہوا، کیوں ہوا، لیکن ہو گیا۔" اس نے خالد کی طرف دیکھا۔

"میں سمجھتا تھا اب میرے دل میں کسی محبت کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ یہ دل اتنا سخت ہو چکا تھا۔ حالانکہ لیزا، نازی، کانتا کون کون راستے میں نہیں آیا۔ لیکن میں کہیں نہیں رکا۔ کسی کے لیے میرا دل گداز نہیں ہوا، لیکن یہ عہنا۔ وہ کل یہاں نہیں تھی تو مجھے لگتا تھا جیسے کچھ کھو گیا ہو کوئی قیمتی چیز۔ یہ احساس بڑا انوکھا سا تھا۔ میں کل سارا دن اور ساری رات کھونے کے کرب اور پانے کی امید سے گزرتا رہا۔ وہ کل صبح گاؤں گئے تھے۔ آج واپس آ گئے ہیں اور میں یہاں بھاگ آیا۔ مجھے پتا تھا صائم ابھی آ جائے گا اور زبردستی ساتھ لے جائے گا۔ پتا نہیں کیوں میں اس کا سامنا نہیں کر سکتا۔ مجھے اپنی چور سوچوں سے ڈر لگتا ہے۔ اگر اس نے ان کو پڑھ لیا تو وہ کیا سوچے گی۔"

"تم احمق اعظم ہو، ارحم اور کیا کہوں۔" خالد ہولے سے ہنسا۔

"میں سوچ رہا ہوں ڈیڈی سے تو مل لیا، اب چلا جاؤں اگر یہاں رہا تو۔"

"یار ابھی تو تمہاری چھٹی ہے نا۔ چلے جانا۔ تم کتنے سالوں بعد صائم سے ملے ہو۔ کم از کم جب تک وہ یہاں ہے تب تک تو رکو۔"

ارحم نے کچھ نہیں کہا تھا۔ لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ اسے چلے جانا چاہیے واپس اپنے صحراؤں کی طرف۔ وہ یہاں رہا تو خود کو روک نہیں پائے گا۔ اس سے پہلے کہ چنگاری شعلہ بن جائے اسے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا چنگاری تو شعلہ بن چکی تھی۔

خالد کے گھر سے اٹھا تو یونہی بہت دیر تک آوارہ گردی کرتا رہا۔ جب تھک گیا تو گھر لوٹ آیا اور خدا بخش کو سلام کرتا تیزی سے اپنی انیکسی کی طرف بڑھ

گیا تھا اور آرام کرسی پر گرتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔ اس نے لائٹ بھی نہیں جلائی تھی اور یوں ہی آرام کرسی کی پشت پر سر رکھے وہ کھو سا گیا تھا۔

"تم کیا چیز ہو عہنا جلال۔ تم نے برسوں کی دھول چند دنوں میں جھاڑ دی اور جالے اتار پھینکے۔ اب اندر بہار رقصاں ہے، لیکن یہ بہار کیسی ہے عہنا جلال جس میں خزاں کا خوف زیادہ ہے۔ پھر بھی دل شدت سے چاہنے لگا ہے کہ کوئی ہو جو میرے ہر پل کا نگراں ہو جائے۔ مجھے اس مد جزر سے باہر نکال دے۔ میرے شب و روز مجھ سے چھین کر ان پر قابض ہو جائے میری سوچوں اور میرے دل کی اداسی اور بے چینی کو نوچ کر کہیں دور پھینک دے وہ مجھ پر ہی قابض ہو جائے۔ یہ کیسی خواہش پیدا کر دی ہیں تم نے عہنا جلال میرے اندر۔ یہ کیسی آرزو ہے، تمہیں ہر پل، ہر لمحہ اپنے ساتھ دیکھنے کی۔"

"ارحم بھائی آپ یہاں اندھیرے میں کیوں بیٹھے ہیں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا اور آپ صبح سے کہاں غائب تھے۔" اس نے لائٹ جلائی اور وہ یوں ہی آنکھیں کھولے اسے دیکھتا رہا۔

"ارحم بھائی۔" وہ قریب آگئی۔

"آپ ٹھیک ہیں نا۔"

"ہاں۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"تم لوگ آگئے اماں ٹھیک تھیں۔"

"اماں کمزور ہو گئی ہیں۔" وہ اداس ہوئی تھی۔ "لیکن وہ ٹھیک تھیں۔ پہلے سے زیادہ مطمئن۔ میں نے انہیں پہلے کی طرح بے چین نہیں دیکھا۔ ماہی کا موڈ خراب تھا۔ لیکن پھر صائم کی باتوں نے سب کا موڈ اچھا کر دیا۔ ماہی اس کے صدقے واری جاتی رہیں اور انہوں نے زبردستی روک لیا ہمیں، ورنہ ہمیں تو رات کو ہی واپس آجانا تھا۔ ماں بہت پریشان ہو گئی تھیں ہمارے رکنے سے۔ لیکن کچھ نہیں ہوا۔ مظفر بھائی کے ساتھ اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ ان کو جانا ہوتا ہے ڈاکٹر کے پاس۔ ہم آج ان کے آنے سے پہلے ہی آگئے تھے۔" وہ اس کے سامنے ہی بیٹھ گئی تھی۔

"یوں بھی صائم اور پھپھو ساتھ تھیں۔ ڈرنے کی تو کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن اماں وہ تو رات کو اٹھ اٹھ کر مجھے دیکھتی رہیں کہ کہیں غائب تو نہیں ہو گئی۔"

"ممکن ہے عہنا وہ جو جانتی ہوں، وہ کچھ خوف زدہ کر دینے والا ہو۔"

"ہاں شاید۔ اور آپ نے بتایا نہیں آپ کہاں تھے۔ سارا دن صائم نے اتنے چکر لگائے انیکسی کے۔"

"میں خالد کی طرف تھا۔" اس نے نظریں عہنا کے چہرے سے ہٹالیں۔

"صائم آپ سے بہت محبت کرتا ہے ارحم بھائی آپ اپنا دل صاف کر لیں اس کی طرف سے۔"

"میرا دل تو تمہاری باتوں سے پہلے ہی صاف ہو گیا تھا۔ عہنا میں نے سب کو معاف کیا۔ ان کو بھی جنہوں نے میرے ساتھ زیادتی کی آپ کی خاطر" وہ کھل اٹھی۔

"صائم کہاں ہے۔"

"صائم انکل کے ساتھ باہر گیا ہے۔" ایک لمحہ کے لیے اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

"یہ صائم بھی بس۔" لبوں پر دلکش مسکراہٹ آکر ٹھہر گئی تھی۔

کل شام وہ اس کے ساتھ گاؤں دیکھنے گیا تھا۔

"ایک بار ارحم بھائی بھی گاؤں آئے تھے۔ تب میں صرف نو سال کی تھی اور ہم نے یہاں بیٹھ کر دیر تک باتیں کی تھیں اور تب ہی میں نے جانا تھا کہ ارحم بھائی کا دل بہت خوب صورت ہے۔"

"تو آج ہم بھی یہاں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں کیا پتا تم جان جاؤ میرا دل بھی کتنا خوب صورت ہے۔"

"یہ تو میں نے اسی دن جان لیا تھا جب تم ارحم بھائی کا ہاتھ پکڑے گھر کے اندر لائے تھے۔" وہ ہنستے ہوئے بیٹھ گئی تھی۔

"جاننے کے بعد بتانا بھی ضروری ہوتا ہے لڑکی۔" صائم کے لبوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔

"تم جانتی ہو عہنا ان بیتے تین، چار سالوں میں

تمہیں میں نے سب سے زیادہ سوچا۔"

"مجھے۔"

"ہاں اور تم بالکل ویسی ہی ہو جیسا میرا تصور تمہیں دیکھتا تھا۔" وہ اشتیاق سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"لیکن میں تو تم سے صرف دو بار ملی تھی صائم۔"

"تمہیں پتا ہے نا میں نے تمہاری جو تصویر کھینچی تھی وہ میرے پاس ہے۔"

"ہاں تم نے دکھائی تھی۔"

"مجھے نہیں پتا کہ میں نے وہ تصویر کیوں سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ لیکن جب میں بوسٹن ہو گیا تو ایک روز وہ تصویر میرے سامان سے نکل آئی۔ جب پہلی نظر جب تصویر پر پڑی تو مجھے ہنسی آئی اور مجھے تم یاد آگئیں۔ دلو سی شرمیلی، ڈری ڈری سی میری طرف تم کتنا ڈر ڈر کر دیکھتی تھیں اور پھر میں اکثر یہ تصویر دیکھنے لگا اور پھر یوں ہوا کہ میں جس روز تمہاری تصویر نہ دیکھتا، مجھے لگتا کہ کہیں کچھ کمی سی رہ گئی ہے اور پھر ایک روز مجھے لگا جیسے مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے اور یہ وہ دن تھا جس دن ماما نے مجھے جتایا تھا کہ وہ تمہیں گاؤں سے اپنے ساتھ لے آئی ہیں اور یہ کہ تم بہت اٹریکٹو ہو گئی ہو۔ میرا دل چاہا تھا کہ میں ماما سے کہوں کہ آج صبح ہی تو مجھ پر انکشاف ہوا ہے کہ میں آپ کی اس پینڈو بھتیجی سے محبت کرنے لگا ہوں اور کیا آپ کو الہام ہوتا ہے کہ آپ آج ہی اسے گاؤں سے لے آئیں۔" وہ بولتا رہا تھا اور وہ حیرت سے سنتی رہی تھی۔

"عینا۔ میں نے سوچا ہے کہ جانے سے پہلے ماما سے کہوں گا کہ مجھے تم سے ہی شادی کرنی ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے نا۔"

"صائم کیسی باتیں کر رہے ہو، میں تم سے عمر میں بڑی ہوں۔"

"کتنی بڑی ہو، دو سال۔" وہ ہنسا۔

"عمر کی دو سالہ بڑائی سے کچھ نہیں ہوتا عینا۔ ورنہ قد میں، عقل میں، ہر لحاظ سے میں تم سے بڑا ہوں اور اگر میں ابھی وہی پہلے والا صائم بن جاؤں بقول تمہارے اکڑو سا تو تم۔"

"خیر اب میں تمہارے رعب میں نہیں آنے والی۔"

"تو میں کب کہتا ہوں کہ میں تم پر رعب جمایا کروں گا۔ بھئی ہم تو دوستوں کی طرح رہیں گے۔ میں صرف تم سے محبت کروں گا اور تم بس میرا خیال رکھنا۔ تم بہت لونگ اور کیئرنگ ہو۔ میں جب بھی اپنی شریک زندگی کے متعلق سوچتا ہوں تو تم میرے سامنے آ کھڑی ہوتی ہو۔ تم میرے تصور میں بالکل ایسی ہی تھیں جیسے میں نے تمہیں یہاں آ کر دیکھا۔ تم یہ مت کہنا کہ تم مجھ سے دو سال بڑی ہو اور یہ بھی مت کہنا کہ تم میرے قابل نہیں ہو، وغیرہ وغیرہ۔ یہ فیصلہ کرنا تمہارا نہیں میرا کام ہے کہ تم کس قابل ہو۔ میں جانے سے پہلے ماما سے تمہارے بارے میں ضرور بات کروں گا۔"

اور اس نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ عینک کے شیشوں کے پیچھے سے اس کی ذہین آنکھیں چمک رہی تھیں اور ان سے جذبے چھلکتے تھے۔

"صائم تم۔"

"نو آرگو۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر روکا تھا۔

"بارہ سال سے میں نے وہ تصویر یوں ہی سنبھال کر نہیں رکھی ہوئی۔"

"عینا۔" ارحم نے آہستگی سے کہا تو اس نے چونک کر ارحم کی طرف دیکھا۔

"کیا سوچ رہی ہو اتنی دیر سے۔"

"کچھ نہیں۔ ارحم بھائی میں سوچ رہی تھی کہ آپ کو یہ سب ضرور اچھا لگ رہا ہو گا۔ آدمی رشتوں کے بغیر بھی تو بالکل ہلکا ہوتا ہے، تنکے کی طرح جسے ہوا جدھر چاہے جہاں چاہے اڑا کر لے جائے۔ رشتے جیسے بھی ہوں ہم ان کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ جیسے اماں کو ہی دیکھ لیں۔ اماں جانتی ہیں کہ ناصر ماموں اور ممانی ان کے لیے مخلص نہیں ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ ان کا بھرم ان ہی سے ہے۔ وہ یہاں آ جائیں گی تو اپنی ہی نظروں میں ہلکی ہو جائیں گی۔"

"عینا تمہاری اماں کی اپنی سوچ ہے اور میری اپنی،"

لیکن تمہارے کہنے پر میں نے ایک بار پھر ان رشتوں کو آزمانے کا سوچا ہے۔ باپ اور بھائی کا رشتہ اور سب سے بڑھ کر محبت کا رشتہ۔"

"ضروری نہیں ارحم بھائی محبت ہمیشہ ہی بے اعتبار ٹھہرے۔" اس کے لبوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔ پُرخلوص اور سادہ۔

"تمہارا دل بہت خوب صورت ہے عھنا اور تم ہمیشہ بہت اچھا سوچتی ہو۔ اللہ کرے تمہاری خوب صورت دنیا ہمیشہ خوب صورت رہے۔" وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا اور باہر دیکھنے لگا۔

"ارحم بھائی کیا بات ہے۔ آپ بہت اداس لگ رہے ہیں۔" عھنا نے اس کے لہجے میں چھپی اداسی کو محسوس کر لیا تھا۔

"ہاں میں اداس ہوں عھنا۔" اس نے یوں ہی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایسے ہی جیسے کوئی بھی پردیس جاتے ہوئے ہوتا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اتنے سالوں میں کبھی یہاں سے جاتے ہوئے اداس نہیں ہوا اور نہ ہی آتے ہوئے خوش ہوا۔ بس ایک میکانکی عمل۔ پچھلے بارہ برسوں سے میں ایسی زندگی گزار رہا تھا۔ لیکن تم نے عھنا سب کچھ بدل دیا۔ میں یہاں سے واپس جارہا ہوں اور اداس ہوں بہت اداس ہوں۔"

"آپ۔ آپ کیوں واپس جارہے ہیں ارحم بھائی ابھی تو آپ کی چھٹیاں ہیں نا۔ تو پھر کیا کریں گے وہاں جاکر۔"

"کیا کروں گا وہاں جاکر۔" اس نے مڑ کر عھنا کی طرف دیکھا اور پھر مڑ کر باہر اندھیرے میں دیکھنے لگا۔

"اپنے فلیٹ میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے یا پھر سمندر کے کنارے ٹہلتے چھٹیاں گزار دوں گا اور پھر وہی روٹین لائف شروع ہو جائے گی۔"

"آپ نہ جائیں ارحم بھائی۔ آپ کس سے بھاگ رہے ہیں۔ ارحم بھائی سحر آپی تو آج ملتان چلی گئی ہیں اور آئیں گی تو پھر دو دن بعد واپس کینیڈا۔ ملتان میں خرم بھائی کے والدین ہیں ان ہی سے ملنے گئے ہیں وہ۔"

"کیا تمہارے خیال میں سحر سے بھاگ رہا ہوں میں۔" انہوں نے پھر اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں میں اپنے آپ سے بھاگ رہا ہوں عھنا۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔

"اپنے آپ سے بھاگ کر کوئی کہاں جا سکتا ہے ارحم بھائی۔" عھنا اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی اور التجا کی۔

"نہ جائیں ارحم بھائی پلیز۔ کیا آپ کو اچھا نہیں لگ رہا۔ یوں سب کے ساتھ مل کر بیٹھنا' باتیں کرنا۔"

"اور میں اس اچھا لگنے سے ہی ڈر رہا ہوں عھنا' خوف زدہ ہو گیا ہوں خود سے۔"

"آپ خود سے کیوں خوف زدہ ہیں' کیا آپ کو ڈر لگتا ہے کہ سحر۔"

"نہیں۔" وہ پورا کا پورا اس کی طرف مڑ گیا تھا۔

"سحر کہیں نہیں ہے اب۔ میں سوچتا تھا' میں سحر کو کیسے دیکھ پاؤں گا۔ شاید وہاں ہی راکھ ہو جاؤں' لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ بس میں نے اسے دیکھا ایسے ہی جیسے راہ چلتے کسی بھی اجنبی کو دیکھتے ہیں۔ اس نے شاید میرا احوال بھی پوچھا تھا اور میں نے اس طرح جواب دیا تھا جس طرح کسی اجنبی کو دیتے ہیں۔"

"پھر کیا پچھو۔"

"نہیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"میں انہونی خواہشوں سے ڈر رہا ہوں۔ زندگی میں دوسری بار ایسی desire بیدار ہوئی ہے اور میں اس کے سامنے بے بس ہو گیا ہوں۔" عھنا نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میرا جی چاہنے لگا ہے عھنا کسی کے نرم ہاتھ میرے آنسو پونچھیں۔ کوئی انگلیاں میرے بالوں میں رینگیں اور میں اس مہربان ہستی کی گود میں سر رکھ کر وہ سارے آنسو بہا دوں جو میں نے برفاب کر کے اپنے اندر اتار لیے تھے۔"

"کیا ایسی مہربان ہستی کہیں ہے' کون ہے وہ ارحم بھائی۔" بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا اور وہ

اشتیاق سے اسے دیکھنے لگی تھی۔
"آپ اتنی بے خبر کیوں ہیں عہنا۔"
اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا اور اس نے فوراً" ہی منہ موڑ لیا تھا۔ ایک بار پھر باہر اندھیرے میں دیکھنے لگا تھا اور عہنا ساکت کھڑی اس کی بات سمجھنے کی کوشش کررہی تھی۔
"نہیں۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "بھلا ارحم بھائی مجھے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سحر آپی کہاں اور میں کہاں۔ وہ حسن کی مورت اور میں ایک عام سی سادہ سی لڑکی۔"
"ارحم بھائی۔" اس کی آواز لرزتی ہوئی سی تھی یا ارحم کو محسوس ہوئی تھی۔
"پلیز عہنا' کچھ مت پوچھنا اور کچھ مت کہنا' میں اپنی بے اختیاری پر نادم ہوں۔ آپ نے میرے اس جملے سے کچھ اخذ کیا ہے تو بھول جائیں اسے۔ میں پتا نہیں کس دھیان میں کیا کہہ گیا ہوں۔ میں نے تمہارے آنے سے پہلے سیٹ بک کروالی تھی۔ پرسوں میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تم مجھے ہمیشہ یاد رہو گی۔ تم نے میرے تلووں میں چبھے کانٹے نکالنے کی کوشش کی۔ یہ سوچے بغیر کہ تمہارے اپنے ہاتھ بھی زخمی ہوسکتے ہیں۔ وہ بہت خوش نصیب ہوگا عہنا جس کے چمن میں تم مہکوگی۔"
عہنا کے تصور میں صائم کا چہرہ آیا۔
"زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہیں ڈیر۔ دراصل یہ اسی دن طے ہوگیا تھا کہ تمہیں میری دلہن بننا ہے۔ جس روز شادی ہال میں میں نے تمہاری تصویر اتاری تھی۔"
"حالانکہ تب تم صرف بارہ سال کی تھیں۔"
"پوت کے پاؤں پنگوڑے میں۔" کا محاورہ تو تم نے سنا ہوگا نا تو۔"
"عہنا تم ابھی صائم کو اور ڈیڈی کو میرے جانے کا نہ بتانا۔ وہ اداس ہوجائیں گے تو ان کو اداس ہوتے کیسے دیکھ پاؤں گا میں۔"
"اور میں۔۔۔ کیا میں اداس نہیں ہوجاؤں گی آپ کے جانے سے۔ زندگی اس طرح سب سے کٹ کر نہیں گزرتی ارحم بھائی' آپ نے بہت سارے سال سب سے کٹ کر ناراض رہ کر گزار دیے۔"
"ہاں شاید تم بھی اداس ہوجاؤ گی' لیکن ایک دن تم بھول جاؤ گی۔ اپنی زندگی میں گم ہوکر۔"
"آپ جانتے ہیں۔ ارحم بھائی میں پہلے بھی آپ کو نہیں بھولی تھی' اب بھی نہیں بھولوں گی۔ لیکن میں آپ سے ناراض ضرور رہوں گی۔ اگر آپ نے اپنی زندگی کو یوں ہی ویران رکھا تو۔"
"کیسے آباد کرلوں اسے۔" اس کے لہجے میں درد تھا۔
"میرے مقدر میں شاید نارسائی روز اول ہی لکھ دی گئی تھی اور پلیز مجھ سے ناراض مت رہنا۔ میں تمہاری ناراضی برداشت نہیں کرپاؤں گا۔ یہ احساس مجھے جینے نہیں دے گا کہ ایک پیاری سی مخلص سی لڑکی مجھ سے ناراض ہے۔"
"وہ کون ہے' آپ کس نارسائی کی بات کررہے ہیں۔ کیا وہاں۔۔۔" اس نے جیسے کھوجنا چاہا تھا۔ اس شک کو دور کرنا چاہتی تھی جو تھوڑی دیر پہلے دل میں پیدا ہوا تھا۔
"کیا جاننا ضروری ہے عہنا۔" وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ آیا تھا۔
"ہاں ارحم بھائی آپ کو میری قسم۔ مجھے بتائیں' شاید میں آپ کی ہیلپ کرسکوں۔"
"اپنی قسم کیوں دی آپ نے عہنا۔" وہ بیڈ پر بیٹھ گیا تھا اور جب اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا تھا تو اس کی آنکھیں بے حد سرخ ہورہی تھیں اور چہرہ جیسے کرب کی تصویر بنا ہوا تھا۔
"عہنا کچھ باتیں انسان کے اختیار میں نہیں ہوتی ہیں۔ میرے اختیار میں بھی نہیں ہیں۔ یہ سب کچھ جو میں آپ سے کہنے والا ہوں شاید کبھی نہیں کہتا' اگر آپ مجھے اپنی قسم نہ دیتیں۔ آپ نہیں جانتیں آپ مجھے کتنی عزیز ہوگئی ہیں۔" ہمیشہ کی طرح وہ کبھی تم اور کبھی آپ کہہ کر بلا رہا تھا۔ عہنا کھڑکی کے پاس خاموش دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی اسے دیکھ رہی

تھی۔
"میں جو کچھ کہوں گا اسے ایک دوست سمجھ کر سن لینا اور دل میں دفن کر دینا ایسے ہی سننا جیسے پہلے تم نے میرے دکھ سنے اور شیئر کیے۔ میرے جانے کے بعد بھول جانا میں نے جو کچھ کہا اور اس کے لیے کبھی خود کو یا مجھے مورد الزام مت ٹھہرانا۔ یہ ایسا ہی ہونا لکھا تھا عمنا میں تم۔ میرے لیے تم سے پرے اور کوئی نہیں ہے۔ میں بری طرح تمہاری محبت میں مبتلا ہو چکا ہوں۔ میں خود سے یہ سوالات کرتے کرتے تھک گیا کہ کیوں آپ کے دلاسے اور سپورٹ کی آرزو کرنے لگا۔ میرا دل شدت سے کیوں چاہنے لگا ہے کہ آپ کی خوب صورت آواز ہر وقت میرے ارد گرد رہے میں کیوں اپنے سارے آنسو آپ کے لیے بہا دینا چاہتا ہوں۔ میں کیوں چاہتا ہوں کہ میری ہر صبح آپ کی آواز سے ہو اور ہر رات آپ کو دیکھتا ہوا نیند کی وادیوں میں اتروں۔ تو جانتی ہو عمنا ان سب سوالوں کا ایک ہی جواب تھا۔ محبت۔۔۔ ہر جمع تفریق کے بعد ہی ایک ہی جواب۔"

عمنا پریشان سی کھڑی تھی چپ ساکت، ابھی کچھ دیر پہلے جو خوف اس کے دل میں در آیا تھا وہ سچ تھا۔

"آپ کو الجھا دیکھ کر مجھے اپنا گریبان چاک کرنا پڑا۔ بتائیے میرے پلے میں کیا رہا۔ میں یہ سب آپ سے نہیں کہنا چاہتا تھا۔ دل میں ہی چھپا کر چلا جاتا۔ لیکن۔۔۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور عمنا کے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھے۔

"میں تمہاری اور اپنی عمر کا فرق اچھی طرح جانتا ہوں۔ لیکن دلی جذبے کب عمروں کے تفاوت کو مانتے ہیں۔ کیا میری سوچ اتنی اتھلی ہے کہ۔۔۔"

"نہیں۔۔۔" عمنا نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں شاید۔" اس نے اپنے ہاتھ اس کے کندھوں سے ہٹا لیے۔

"میرے لیے تو آپ جیسی روشنی سے چند کرنیں ہی کافی تھیں عمر گزارنے کے لیے۔ کہاں میں آپ کی آرزو کروں، جو کچھ کہا بھول جانا، برا لگا تو معاف کر دینا۔" وہ ایک دم تیزی سے پلٹا اور دروازہ دھکیلتا باہر نکل گیا۔

بہت دیر بعد عمنا کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی اور اس نے انیکسی سے باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ لیکن اسے لگتا تھا جیسے ایک ایک قدم من من بھر کا ہو گیا ہو۔ باہر اندھیرا تھا۔ پورچ کی لائٹ جل رہی تھی اور اس کی ہلکی روشنی یہاں تک آرہی تھی۔ اس نے اس مدھم روشنی میں ارحم کو نہیں دیکھا، جو دائیں طرف اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھا تھا۔ وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی پورچ کی سیڑھیوں پر آکر بیٹھ گئی تھی۔ اس کا ذہن خالی تھا۔ فضا میں خنکی تھی۔ اس نے گھٹنوں پر سر رکھا۔ اسے رونا آرہا تھا۔ وہ رونا چاہتی تھی اور وہ اس رونے کا سبب نہیں جانتی تھی اور جاننا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ گھٹنوں پر سر رکھے رو رہی تھی جب اندرونی گیٹ کھلا اور چند قدم چل کر صائم بڑی خاموشی سے اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

وہ رو رہی تھی۔ وہ جانتا تھا۔ لیکن اس نے اسے رونے دیا۔ بہت دیر بعد جب اس نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر اپنا چہرہ صاف کیا تو صائم نے پوچھا۔

"اب بتاؤ کیوں رو رہی تھیں۔" اس نے صائم کی طرف دیکھا۔

"یہ اتنے پیارے دل کا مالک شخص۔۔۔ کیا وہ اس کا دل توڑ سکتی ہے۔"

لیکن وہ جس کے ٹوٹے دل کی کرچیاں چن کر اس نے پھر سے اسے ایک شکل دینے کی کوشش کی تھی۔

وہ جو سحر نے اس کے ساتھ کیا تھا وہ اسے ڈیزرو نہیں کرتا تھا۔

کیا وہ اسے پھر سے نارسائی کے سمندر میں دھکیل سکتی ہے۔ یہ کس دوراہے پر آکھڑی ہوئی تھی۔ آنسوؤں نے پھر یلغار کی۔

"بس۔۔۔ اب اور نہیں۔" صائم نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کی۔

"بہت رو لیا اب شروع ہو جاؤ کیا سحر آپی نے کچھ

کہا ہے۔"

"سحر آپی۔" اس نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔ "کیا سحر آپی ملتان نہیں گئیں۔"

"ہاں نہیں گئیں۔"

"کیوں؟" "ان کی مرضی یار خرم بھائی اکیلے ہی چلے گئے ہیں اور وہ دو دن یہاں رہیں گی۔ مما بہت خوش ہیں' ان کے آکر رہنے سے۔ اور ہاں مجھے باتوں میں مت لگاؤ۔ بتاؤ کیوں نیر بہائے جا رہے تھے۔"

"کچھ نہیں ایسے ہی اماں یاد آ رہی تھیں۔"

"میں سمجھا اندر آتے ہوئے سحر آپی نے کچھ کہا ہے تمہیں' کیونکہ اندر مما کے پاس آکر کچھ بول رہی تھیں۔"

"کیا۔" عہنا نے پوچھا۔

"تمہارا نام سنا تھا' بس کیا کہہ رہی تھیں سنا نہیں' چلو اٹھو۔ اف تمہارے ہاتھ کتنے ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔" صائم نے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا ہاتھ صائم کے گرم ہاتھوں میں تھا۔

اور سگریٹ کی طلب میں باہر گیٹ کی طرف جاتے ارحم نے غیر ارادی طور پر ادھر دیکھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ کھڑے تھے اور عہنا کا ہاتھ صائم کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے نظریں ان سے ہٹائیں۔ ایک شام عہنا نے اس کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر پھینک دیا تھا۔

"کیوں اپنا اندر جلاتے ہیں۔ مت پیا کریں' بہت بری لگتی ہے مجھے اس کی بو۔"

اور اس روز کے بعد سے اس نے سگریٹ پینے کم کر دیے تھے اور عہنا کے سامنے تو بالکل بھی نہیں' لیکن آج پھر دل میں شدت سے سگریٹ کی طلب جاگی تھی ایک اور رتجگا اس کا منتظر تھا۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے چھوٹا گیٹ کھولتے ہوئے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا۔ وہ دونوں اندر جا چکے تھے۔ لکڑی کے منقش دروازے پر لگے پیتل کے بڑے بڑے الٹے توے جیسے ڈیکوریشن کے لیے لگائے گئے ٹکڑے روشنی میں چمک رہے تھے۔

"کہاں تھیں تم۔" سحر لاؤنج میں بیگم راحت کے ساتھ بیٹھی ڈرائی فروٹ کی ٹرے گود میں رکھے چلغوزے کھا رہی تھی۔

"محترمہ باہر برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی رونے میں مصروف تھیں۔" صائم نے اندر داخل ہوتے ہی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اور اب بیگم راحت کے پاس کھڑا تھا۔

"لیکن میں جب آئی تھی تب تو تم وہاں نہیں تھیں۔" سحر نے کھوجتی نظروں سے اس کی بھیگی پلکوں اور روئے روئے چہرے کو دیکھا۔

"میں پچھلے لان میں تھی۔"

"وہاں تو اندھیرا ہوتا ہے۔ اور ٹھنڈ میں کیا کام تھا تمہیں وہاں۔" عہنا بنا جواب دیے اس کے پاس بیٹھ گئی۔ کاش اس وقت سحر آپی نہ آئی ہوتیں تو میں اپنے کمرے میں جا کر آنکھیں موند کر لیٹ جاتی بس۔

"کیوں رو رہی تھیں۔" بیگم راحت نے ٹرے سے ایک کاجو اٹھا کر منہ میں ڈالا۔

"اماں یاد آ رہی تھیں۔" وہی ان کی سوال کر کے خود ہی جواب دینے کی عادت۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

"دیکھا ہے تم نے اسے سحر۔ جب سے آئی ہے ہر دوسرے تیسرے روز رونے کا سیشن چلتا ہے۔" بیگم راحت مسکرائیں۔

"کب بڑی ہو گی جانو۔" انہوں نے دو انگلیوں سے اس کے رخسار کو چھوا۔

"اب اماں کو یاد کرنا چھوڑ دو۔ دیکھ لیا ہے نا وہ مطمئن ہیں۔ خوش ہیں۔" اس نے پھر سر ہلا دیا۔

"اچھا تم لوگ باتیں کرو مجھے ایک دو ضروری فون کرنے ہیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"او کے میں بھی چلتا ہوں۔" صائم کی نظریں اس پر تھیں۔

"تم کہاں جا رہے ہو۔"

"میں ذرا ارحم بھائی کی طرف جا رہا تھا۔ صبح سے غائب ہیں۔ ان محترمہ کو دیکھ کر رک گیا تھا۔"

"لیکن ارحم بھائی تو نہیں ہیں گھر پر۔" بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

"تمہیں کیسے پتا۔" سحر نے چونک کر اسے دیکھا۔
"وہ۔ میں لان میں ٹہل رہی تھی تو انہیں جاتے دیکھا تھا۔" وہ ایک لمحہ کو سٹپٹائی تھی۔
"کیا خبر آگئے ہوں اب تک۔ نہ ہوئے تو پھر ڈاکٹر خالد کی طرف جاؤں گا۔ کیا خبر وہاں ہوں۔ فون بھی نہیں اٹھا رہے۔" صائم چلا گیا تو سحر نے اس کی طرف دیکھا۔
"تم جانتی ہو عہنا کہ میں صرف تمہاری وجہ سے ملتان نہیں گئی۔ کیا پتا زندگی میں پھر کب ملاقات ہو۔ سوچا دونوں بہنیں دو روز اکھٹی رہ لیں گی اور تم گھر سے ہی غائب تھیں۔ ایک گھنٹہ ہو گیا ہے مجھے آئے ہوئے۔"
"مجھے کیا پتا تھا سحر آپی کہ آپ آئی ہیں۔ میرا تو اندر دل گھبراتا ہے تو باہر لان میں نکل جاتی ہوں۔ آپ حمیدہ سے پوچھ لیتیں۔ اس نے نہیں بتایا۔"
وہ نیچے کارپیٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"اس نے اور بھی کچھ بتایا ہے۔" سحر کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔
"کیا۔" اس نے ان کی طرف دیکھا۔
"یہی کہ تم ارحم پر بہت مہربان ہو۔ پھپھو کراچی تھیں تو ان کا کھانا اندر سے جاتا تھا۔ اور تم ان کی دیکھ بھال کے لیے انیکسی میں گھنٹوں گزارتی تھیں۔" اس نے چند چھلے ہوئے چلغوزے اس کے ہاتھ میں رکھے لیکن عہنا نے پھر واپس ٹرے میں رکھ دیے اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
"تو۔ وہ انکل فراز کے بیٹے ہیں اور انہوں نے مجھے ان کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔"
"بس اتنا ہی۔"
"نہیں صائم اور اماں نے بھی کہا تھا کہ وہ بیمار ہیں۔ پھپھو یہاں نہیں ہیں تو مجھے ان کا خیال رکھنا چاہیے۔"
"خوب۔" سحر کے لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ تھی۔
"وہ چھوٹا بچہ ہے نا۔"

اب کے عہنا نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ ایک بار پھر قالین کی طرف دیکھ رہی تھی اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔
"تم جانتی ہو عہنا پھپھو کو وہ کتنا ناپسند ہے اور وہ اس سے کتنی نفرت کرتی ہیں۔"
"پھپھو کا ان سے جو رشتہ ہے وہ جس ظرف کا متقاضی ہے وہ شاید ان میں نہیں ہے لیکن میرا ان سے ایسا کوئی سوتیلا رشتہ نہیں ہے جو میں انہیں ناپسند کروں یا نفرت کروں ان سے۔" سحر کی آنکھوں میں ایک لمحہ کے لیے حیرت نظر آئی لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔
"پھپھو کی ناپسندیدگی کی وجہ اس کا سوتیلا ہونا نہیں ہے عہنا۔ وہ اچھا لڑکا نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے اس میں کئی اخلاقی برائیاں ہیں۔ شراب پینا۔۔۔ میں جب یہاں رہتی تھی تو تب میں نے خود اسے پیتے دیکھا تھا۔ نشے میں بدمست انسان سے باقی ہر برائی کی بھی توقع کی جاسکتی ہے۔"
"کیا واقعی۔" اب عہنا سحر کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"تم نہیں جانتیں عہنا۔"
"آپ تو جانتی ہیں نا۔" اس کا انداز معنی خیز سا تھا۔
"اور آپ سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ وہ کیسے ہیں۔" سحر کو پھر حیرت ہوئی یہ اتنا زیادہ اعتماد اس میں کہاں سے آگیا تھا۔ وہ تو بڑی جھینپو سی تھی۔
"اگر حمیدہ پھپھو سے کہہ دیتی یہ سب تو انہیں کتنا برا لگتا پھپھو نے ہمیشہ ہمارا خیال رکھا۔ پہلے میں تھی یہاں اب تم ہو۔ وہ ہم سے محبت کرتی ہیں۔"
"مجھے آپ کی اس بات میں قطعاً" کوئی شک نہیں ہے انہوں نے ہمیشہ ہمارا ساتھ دیا۔" سحر نے گود میں رکھی ٹرے جھک کر سامنے پڑے ٹیبل پر رکھی۔
"جانتی ہو جب اماں نے انہیں فون کیا تو انہوں نے ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کی اور گاؤں پہنچ گئیں۔ اگر وہ دیر کر دیتیں تو تمہارا نکاح ظفر سے ہو جاتا۔ ساری

تیاریاں مکمل تھیں۔ ان کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھنا۔ بھولنا مت۔" عینا ایک بار پھر خاموش ہو گئی تھی۔

سحر یہ کیوں کہہ رہی تھی۔ کیا پھپھو نے اس سے کچھ کہا تھا۔ یا پھر یونہی۔ اس نے ہولے سے سر جھٹکا اور آنکھوں کو کھولا اور بند کیا۔ سر بے حد بوجھل ہو رہا تھا۔ سحر نے بغور اسے دیکھا۔

"تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔ کھانا لگنے تک کچھ دیر آرام کرلو۔ رات میں دونوں بہنیں باتیں کریں گی۔ تمہارے لیے تصویریں بھی لائی ہوں۔ ریان اور حسان کی۔ پورے انگریز ہیں دونوں پچھلے سال بہت منتیں کیں دونوں کی کہ چلو تمہاری خالہ اور نانو سے ملنے جاتے ہیں۔ صاف انکار کردیا۔ بہت جی چاہتا ہے کہ اماں میں اور تم کبھی اکٹھے رہیں۔۔ خیر جاؤ تم۔" عینا اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی اور سحر نے ریموٹ سے ٹی۔وی آن کیا اور دلچسپی سے دیکھنے لگی۔

☆ ☆ ☆

"یا اللہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ اگر صائم کو مجھ سے محبت تھی تو ارحم کے دل میں میری محبت پیدا نہ ہوتی۔ اور اگر ارحم کے دل میں میری محبت پیدا ہو گئی تھی تو صائم کے دل میں نہ ہوتی لیکن اب تو ایسا ہو گیا تھا اور وہ۔۔ وہ خود اسے کس سے محبت ہے۔" اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔

اس کے کورے کاغذ جیسے دل پر پہلا لفظ محبت صائم نے لکھا تھا لیکن کل سے پہلے تک اس نے صائم کے لیے ایسا نہیں سوچا تھا ایک لمحے کے لیے بھی نہیں۔۔ وہ اس سے دو سال چھوٹا تھا۔ وہ اس کی پھپھو کا اکلوتا بیٹا تھا۔ خوبصورت ذہین لائق۔۔ وہ بچپن سے ہی اسے اچھا لگتا تھا۔ وہ اس سے متاثر تھی اور کل شام کھیت کی منڈیر پر بیٹھے بیٹھے جب اس نے کہا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے تو اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ بارہ سالوں بعد جب اس نے صائم کو دیکھا تو وہ اسے اور اچھا لگا۔ وہ اس کی طرف فخر سے دیکھتی تھی۔ اس کی سوچ اچھی تھی۔ اسے ارحم بھائی کا خیال تھا۔ وہ ہمدرد تھا۔

لیکن کل رات جب وہ سونے کے لیے لیٹی تھی تو اس کی سوچ مختلف تھی۔ وہ یقیناً "ایک اچھا ہمسفر بھی ثابت ہوتا۔ لونگ کیرنگ۔

اس کا ساتھ اس کے لیے خوشی اور فخر کا باعث تھا۔ اس رات خوابوں میں بھی وہ اس کے سنگ رہی۔ دل کی زمین پر محبت کی کونپلیں۔ سر اٹھا رہی تھیں۔ اور ابھی ان کونپلوں نے پوری طرح سر بھی نہیں اٹھایا تھا کہ ارحم۔ وہ ارحم سے محبت کرتی تھی۔ بہت پہلے سے لیکن وہ بالکل خالص محبت تھی۔ اس محبت کی نوعیت الگ تھی۔ وہ ارحم بھائی تھے۔ اور بہت اچھے تھے۔ سحر آپی ان سے محبت کرتی تھیں اور ان کی نسبت سے وہ بھی ان سے محبت کرتی تھی۔ پھر اس محبت میں ہمدردی بھی شامل ہو گئی۔

وہ غیر ارادی طور پر ان کا دکھ بانٹنے لگی شاید لاشعوری طور پر وہ سحر کے دیئے زخموں پر پھاہے رکھ رہی تھی یا بقول ارحم کے۔ کفارہ ادا کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ ان کی تلخی۔ ان کا غصہ ان کی ناراضی کچھ بھی اسے برا نہیں لگتا تھا۔ وہ جھکتے وہ بار بار ان کی طرف جاتی۔ انہوں نے کتنی بار اس سے منہ موڑا تھا کتنی بار کہا تھا کہ انہیں اس کی مہربانیوں کی ضرورت نہیں۔ اور یہ وہ تھی نا جو ان کی طرف لپکتی رہی۔ چاہے کفارہ ادا کرنے کی نیت سے چاہے کسی اور نیت سے تو قصوروار وہ تھی اگر ارحم بھائی کے دل میں اس کی محبت پیدا ہوئی ہے تو اس نے خود یہ محبت پیدا کی ہے لاشعوری طور پر ہی سہی۔ آدمی سالوں تپتے صحراؤں میں بھٹکتا رہے اور ریت کی تپش سے پاؤں جلتے ہوں اور سورج آگ برساتا ہو۔ ایسے میں نخلستان نظر آئے تو آدمی اس کی طرف ہی لپکے گا۔ یہی انسانی فطرت ہے تو۔۔

"کیا پھر نارسائی ان کا مقدر بنے گی۔" اس نے اپنی جلتی آنکھوں کو بری طرح مسل ڈالا۔

"میں اپنی محبتوں میں بہت شدید ہوں اور اپنی شدتوں سے خوف آتا ہے مجھے۔" ایک بار ارحم نے کہا تھا۔

"اس لیے میں کسی کی طرف بڑھا نہیں کہ کہیں پھر نارسائی مقدر نہ ٹھہرے۔"

"مجھے محبت پر یقین نہیں ہے۔ یہ بہت بے اعتبار اور ویران کر دینے والا لفظ ہے۔ اس کے پہلو میں صرف آنسو اور رسوائیاں ہیں۔ یہ شخصیتیں کچل دیتا ہے۔

تمہیں دیکھ کر یقین ہونے لگا ہے کہ ابھی دنیا میں بے غرض جذبے رکھنے والے ہیں۔ شاید دنیا اسی لیے باقی ہے اب تک تم جیسے لوگوں کی وجہ سے۔ میں آپ کی محبت کے سحر میں گرفتار ہو چکا ہوں عمنا۔ نہیں جانتا کیسے اس سحر سے نکلوں گا لیکن یقین جانیے آپ کے دامن پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ مزید رکا تو ناہی بے اختیاریوں سے عیاں ہو جاؤں گا دوسروں پر بھی ایسے ہی جیسے آپ پر۔" وہ کروٹوں پر کروٹیں بدلتی رہی لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ بے چین ہو کر اٹھ بیٹھی ترازو اس کے ہاتھ میں تھا کبھی ایک پلڑا جھک جاتا کبھی دوسرا اور کبھی ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہو جاتے۔

"کھانا لگ گیا ہے۔ عمنا بی بی۔" شازیہ نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

"اچھا" اسے بھوک بالکل نہیں تھی لیکن وہ جانتی تھی صائم، پھپھو اور سحر سب ہی اصرار کریں گے۔ پوچھیں گے کیوں بھوک نہیں ہے۔

اس نے اٹھ کر دونوں ہاتھوں سے بال پیچھے کیے آئینے میں ایک نظر خود کو دیکھا۔ اور پھر منہ ہاتھ دھو کر منہ پر ہلکی سی کریم لگا کر اس نے فریش نظر آنے کی کوشش کی۔

ٹیبل پر سب ہی تھے صائم کے ساتھ ہی ارحم بھی بیٹھا تھا۔ آج سحر ٹیبل کے دوسری طرف اس کے مقابل بیٹھی تھی۔ بے حد فریش سی ہلکے نیچرل لک دیتے میک اپ کے ساتھ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ شاید اس نے ابھی ابھی تازہ میک اپ کیا تھا۔ ایک نظر سحر پر ڈال کر وہ اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ارحم نظریں جھکائے گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔

"ڈیڈی کہاں ہیں۔" صائم نے بیگم راحت سے پوچھا۔

"وہ کسی بزنس ڈنر کے لیے گئے ہیں۔"

"آپ نہیں گئیں۔" صائم ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میرے بچے گھر پر ہوں تو میں دوسروں کے ساتھ کیوں ڈنر کروں۔" وہ مسکرائیں۔

"یہ تو ہے ماما ایک عرصہ بعد ہم یہاں اکٹھے ڈنر کر رہے ہیں۔

"ارحم تم نے شادی نہیں کی۔" سحر نے اپنی پلیٹ میں چکن پیس رکھتے ہوئے ارحم سے پوچھا۔

"کوئی پسند نہیں آئی یا پھر کوئی پرانی محبت اب تک روکے ہوئے ہے۔" پتا نہیں وہ کیا سننا چاہتی تھی یا کیا جتانا چاہتی تھی ۔ عمنا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ارحم مسکرایا۔

"کسی پر اعتبار کرنے کو دل نہیں چاہا کیونکہ لوگ ہرگز قابل اعتبار نہیں ہوتے وہ آپ کو محبت کا دھوکا دے کر آپ کی پیٹھ میں خنجر مار دیتے ہیں۔" سحر کا رنگ لمحہ بھر کو پھیکا پڑا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ مسکرا دی۔

"لیکن ارحم کیا تم ساری زندگی یوں ہی گزار دو گے تمہیں اب شادی کر لینی چاہیے۔"

"ہاں ارحم سحر صحیح کہتی ہے شادی کر کے گھر بسا لو۔" بیگم راحت نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"تم کہو تو تمہارے لیے کوئی رشتہ دیکھوں۔" سحر پُرجوش ہوئی۔

"میرے سسرال میں ایک دو لڑکیاں ہیں۔"

"اس مہربانی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں مسز خرم۔" ارحم سچ مچ حیران تھا۔

"وجہ کیا ہو گی بھلا ارحم تم بھی بہت عجیب ہو گئے ہو ہم نے اچھے دوستوں کی طرح بہت سارا وقت اس گھر میں اکٹھا گزارا ہے تو تمہیں یوں تنہا دیکھ کر اچھا نہیں لگا۔ افسوس ہوا۔"

"دوست۔" ارحم استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

"ہاں دوستی کا رشتہ تو بہت پر خلوص اور بے غرض ہوتا ہے۔" سحر اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"میں کسی بھی رشتے کو نہیں مانتا۔" ارحم یکدم تلخ ہوا تھا۔

"محبت کا رشتہ ہو دوستی کا یا خون کا سب میں زہر بھرا ہے۔ روپیہ پیسہ ایسا گاربیج ہے۔ جو انسان کو اپنی سطح سے بہت نیچے گرا دیتا ہے۔ کیوں بیگم راحت ایسا ہی ہے نا۔" بیگم راحت ایک لمحہ کو سٹپٹائی تھیں۔

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔"

"یقیناً" ایسا ہی ہے؟" اس کے لبوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ تھی۔

"یعنی تم نے شادی نہیں کرنی صاف بات کرو ادھر ادھر گھماؤ مت۔" سحر نے بیگم راحت کی طرف سے اس کی توجہ ہٹائی۔

"میں تو ہمیشہ صاف بات ہی کرتا تھا جھوٹ تو دوسروں نے کیا مجھے۔" تب ہی فون کی بیل ہوئی۔

"سحر باجی آپ کا فون ہے۔ خرم بھائی کا۔ کہہ رہے ہیں آپ موبائل کیوں نہیں اٹھا رہی ہیں۔" شازیہ نے آکر بتایا۔

"اوہ میرا فون اندر کمرے میں ہے۔" سحر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں فون سن کر آتی ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد وہ تینوں خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔ ارحم نے سر جھکائے کھانا کھاتی عینا کی طرف دیکھا۔ وہ بے حد خاموش اور اداس لگ رہی تھی۔ کیا ضروری تھا کہ میں اس سے دل کی بات کہہ دیتا اور اس پیاری لڑکی کو اداس کر دیتا۔

وہ ایک دم ہی کھانا چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"اب میں چلتا ہوں۔"

"ارے ارحم بھائی آپ نے تو کچھ بھی نہیں کھایا۔"

"بھوک نہیں ہے صائم چلتا ہوں اب۔" عینا نے ایک دم سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بے حد تھکا تھکا اور نڈھال لگ رہا تھا۔ اس کے دل کو کچھ ہوا۔

"سوری۔" ارحم نے اس کی طرف دیکھا دونوں کی نظریں ملیں اور پھر ارحم بیگم راحت کی طرف دیکھنے لگا۔

"میری وجہ سے اگر کوئی ڈسٹرب ہوا ہو تو۔"

"کمال ہے ارحم بھائی۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ کوئی بھلا کیوں ڈسٹرب ہو گا۔" جواب صائم نے دیا تھا۔

"آپ لوگ کھانا کھائیں پلیز۔" اس نے صائم کے کندھے کو ہولے سے تھپکا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ڈائننگ روم سے نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

"عینا۔" صائم بہت آہستگی سے آکر اس کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے چونک کر صائم کی طرف دیکھا۔ وہ فجر کی نماز پڑھ کر باہر آکر لان میں مصنوعی پہاڑی کے پیچھے اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"تم کچھ پریشان ہو عینا۔ میں کل سے نوٹ کر رہا ہوں۔ حالانکہ جب ہم گاؤں سے آرہے تھے تو تم خوش تھیں ماں سے ملنے کی خوشی تمہارے چہرے سے جھلکتی تھی لیکن یہاں آکر تم پریشان ہو گئیں۔ مجھے نہیں بتاؤ گی عینا۔"

عینا نے ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ اسے کیا بتائے کہ وہ کس الجھن میں ہے۔ پوری رات وہ ٹھیک طرح سے سو نہیں سکی تھی۔ سوچ سوچ کر اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ سحر کا موڈ باتیں کرنے کا تھا۔

"میں تمہارے لیے رکی ہوں عینا اور تم آنکھیں موندے پڑی ہو۔ یار اٹھو باتیں کرو مجھ سے چھ سالوں کی باتیں تم کیا ماں کا رویہ بہت خراب ہو گیا تھا جو اماں نے پھپھو کو تمہیں لے جانے کے لیے کہا۔"

"ہمیشہ جیسا ہی تھا۔" وہ یونہی آنکھیں موندے موندے بولی تھی۔

"طبیعت خراب ہے کیا۔" سحر نے محبت سے اسے دیکھا۔

"سر میں درد ہے آپی بہت درد۔"

"لاؤ میں دبا دوں۔"

سحر نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تھا اور ہولے ہولے دبانے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔ یہ اس کی بہن تھی اور بچپن سے ہی وہ دونوں اپنی ہر بات ایک دوسرے سے کرتی تھیں۔ جب سحر کو ارحم سے محبت ہوئی تھی تو سحر نے اسے ہی بتایا تھا حالانکہ وہ بہت چھوٹی تھی پھر بھی۔ لیکن پھر سحر بدلنے لگی۔ خرم کے متعلق اس نے عمنا سے کوئی بات نہیں کی تھی اور اس سے شادی کرلی۔ لیکن ارحم بھائی کو دھوکا دیا۔ پھپھو کے ساتھ مل کر ایک تیر سے دو شکار۔ ارحم نے کہا تھا۔ میں نے لوگوں کو پڑھنا سیکھا ہے ساری عمر گنوا کر اور اب میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے جب چھوڑ کیا گیا تو کیوں اور کیسے۔

اس نے آہستگی سے سحر کا ہاتھ اپنے ماتھے سے ہٹایا تھا۔ وہ اپنی الجھن سحر سے شیئر نہیں کرسکتی تھی۔ کبھی نہیں اسے جو بھی فیصلہ کرنا تھا خود ہی کرنا تھا۔

"تم لو اس اور پریشان مت رہا کرو عمنا۔" سحر کہہ رہی تھی۔

"مجھے یقین ہے تم بھی میری طرح ایک اچھی زندگی گزارو گی۔ پھپھو تمہارا رشتہ کسی اچھی جگہ طے کردیں گی۔"

"مجھے اس طرح کی کوئی پریشانی نہیں ہے۔ میں تو وہاں گاؤں میں بھی بہت خوش تھی آپی۔"

"عمنا تم بہت معصوم ہو۔ بہت سادہ' اپنا بہت خیال رکھنا۔ یہ ارحم پتا نہیں کب تک یہاں ہے۔ مجھے بہت فکر رہے گی۔ اس سے دور ہی رہنا۔"

"عمنا کہاں کھو گئی ہو یار' بتاؤ نا کیا مسئلہ ہے۔" صائم نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"مسئلہ تو ہے صائم۔" اس نے افسردگی سے اس کی طرف دیکھا۔

"تو یار بتاؤ نا مسئلہ۔" صائم مسکرایا۔

"صائم تم ارحم بھائی سے کتنی محبت کرتے ہو۔" اس نے پوچھا۔

"کیا محبت ناپنے کا بھی کوئی پیمانہ ہوتا ہے۔" وہ مسکرایا۔

"پھر بھی کیا تم ان سے اتنی محبت کرتے ہو کہ ان کے لیے اپنی کسی پسندیدہ چیز سے دستبردار ہو جاؤ۔"

"ہاں کیوں نہیں' محبت کے معاملے میں چیزیں کیا اہمیت رکھتی ہیں ڈیر۔ ارحم بھائی جس چیز پر بھی ہاتھ رکھیں گے ان کے لیے حاضر ہے۔"

"اگر وہ تم سے کہیں کہ تم اپنی محبت سے دستبردار ہو جاؤ۔ یعنی تم مجھ سے شادی۔"

"یہ کیا سوال ہوا یار۔" وہ جھنجلایا۔

"اور تم چیز نہیں ہو۔ صاف بات کرو کیا الجھن ہے تمہارے ذہن میں اور کیا کہنا چاہتی ہو۔"

"صائم۔"

اس کی پلکیں نم ہوئیں اور پھر آنسو رخساروں پر لڑھک آئے۔

"سحر آپی نے ارحم بھائی کے ساتھ جو کچھ کیا آپ جانتے ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا تھا سب۔"

"ہاں۔" صائم نے سر ہلایا۔

"رشتوں' محبتوں' ہر چیز سے ان کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔ میں نے ان سے کہا۔ ہمیشہ ہر رشتہ برا نہیں ہوتا اور ہر محبت بے اعتبار نہیں ہوتی۔ مجھے نہیں پتا کب کیسے۔ لیکن ارحم بھائی مجھے چاہنے لگے۔" وہ ہولے ہولے سر جھکائے بول رہی تھی اور صائم خاموشی سے سن رہا تھا۔

"یہ میں تھی نا صائم جس نے انہیں یقین دلایا تھا کہ بے غرض محبت کا بھی وجود ہے۔ وہ تو اپنی دنیا میں خوش تھے۔ تم نے انہیں دیکھا نہیں جب وہ آئے تھے ان کا سپاٹ چہرہ ان کی ویران آنکھیں تم نے نہیں دیکھیں جن میں دھول اڑتی تھی۔ میں نے دیکھا سب اس احساس جرم کے ساتھ کہ اس شخص کی زندگی میں زہر گھولنے والے اور کوئی نہیں' میرے اپنے تھے۔ سحر آپی نے ان کے ساتھ محبت کا ڈراما کیا اور پھر بہتر آپشن ملنے پر پھپھو کے ساتھ مل کر اس کا انجام کردیا۔" اس کے آنسو مزید تیزی سے بہنے لگے۔

"ان کی اپنی ایک تنہا دنیا تھی۔ میں اس میں زبردستی گھسی صائم۔"

"تو تم کیا چاہتی ہو اب۔" صائم کی آواز ٹوٹتی ہوئی سی تھی۔

"میں۔ میں چاہتی ہوں انہیں ایک بار پھر اس اذیت سے نہ گزرنا رہے۔ جس سے پہلے گزرے ہیں۔ بچھڑ جانے کی اذیت کھو دینے کا دکھ وہ اپنی اسی تنہائی کی دنیا میں واپس نہ جائیں۔ محبتوں پر ان کا جو یقین بحال ہوا ہے وہ قائم رہے۔"

"یعنی تم۔"

"ہاں میں نے فیصلہ کیا ہے کہ۔"

"نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" صائم نے اس کی کاٹ دی۔

"میں نے تو کل رات مما سے بھی بات کرلی اور ماما کو کوئی اعتراض بھی نہیں ہوا۔ بس انہوں نے کہا کہ میری تعلیم مکمل ہو جائے تو۔ نہیں عہنا تم صرف اتنی سی بات پر اتنا بڑا فیصلہ نہیں کر سکتیں۔"

"یہ اتنی سی بات نہیں ہے صائم۔ تمہیں اگر ارحم بھائی کو جاننے کا دعوا ہے تو سمجھ سکتے ہو۔"

"تم بارہ سال پرانی تصویر سے ابھری تھیں عہنا اور تمہاری شبیہ کو مجسم کرنے کی کوشش میں کتنی راتیں میں نے جاگ کر گزاریں اور پھر فیصلہ کیا۔ تم اب جیسی بھی ہو مجھے تم سے ہی شادی کرنا ہے۔"

عہنا روتے روتے جیسے تھک سی گئی تھی۔

"لیکن میں نے پرسوں شام سے پہلے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔ تمہارے لیے۔ تم میرے لیے صرف صائم تھے پھپھو کے بیٹے۔"

"لیکن پرسوں شام تمہیں یہ نیا تعلق اچھا لگا تھا اور تم نے سوچا تھا مجھے اور تمہاری آنکھوں میں جگنو دمکے تھے اور خوشی تمہارے وجود سے پھوٹتی تھی۔"

"ہاں۔" عہنا نے آہستگی سے پھر کہا۔

"اور کل صبح سے پہلے تم نے ارحم بھائی کے لیے بھی ایسا نہیں سوچا تھا۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو صائم۔" اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔

"لیکن۔"

"کوئی لیکن ویکن نہیں عہنا۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

"فضول میں اپنا دماغ مت کھپاؤ۔ جب ارحم بھائی نے خود ہی تم سے کہہ دیا ہے کہ وہ کل یہاں سے چلے جائیں گے تمہیں اور انہیں یاد بھی نہیں رہے گا۔"

"تم ارحم بھائی کو بالکل بھی نہیں جانتے صائم۔"

"ٹھیک ہے نہیں جانتا۔ لیکن میں اپنی محبت چھوڑنے کی قربانی نہیں دے سکتا ان کے لیے۔ یوں ان کے لیے جان بھی حاضر ہے اور تمہیں بھی قربانی دینے اور سحر کے کیے کا کفارہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ تیز تیز چلتا ہوا لان سے گزر کر برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر اندرونی گیٹ دھکیلتا اندر چلا گیا اور وہ وہاں ہی لکڑی کے تنے پر جسے بیٹھنے کے لیے تراشا گیا تھا، بیٹھی رہی۔

"پوری دنیا میں تمہارے علاوہ میرا کوئی دوست نہیں۔" ارحم کی آواز اس کے کان میں گونجی۔

"جی چاہتا ہے تمہیں اتنی بڑی دنیا میں لے کر گم ہو جاؤں۔" اس روز وہ لان میں بیٹھے تھے جب نہ جانے کس بات پر ارحم نے کہا تھا۔ شاید وہ کوئی بے اختیاری کا لمحہ تھا۔ وہ ہی جان نہ پائی۔

"تم کامیاب ٹھہریں عہنا جلال تم نے میرا حصار توڑ دیا۔ میں تمہاری باتوں پر ایمان لایا۔ اب بھاگ بھاگ کر یہاں مت آیا کرو۔"

"کیوں، کیا آپ مجھ سے ڈرتے ہیں۔" وہ ہنسی تھی۔

"نہیں خود سے ڈرتا ہوں۔"

جب خول ٹوٹ ہی گیا تو خود سے کیا ڈرنا۔

کاش وہ تب ہی رک پاتی دور ہو جاتی اور ارحم۔

پتا نہیں کتنی دیر ہو گئی تھی اسے بیٹھے ہوئے سورج نکل آیا تھا۔ لان میں چڑیوں کی چہکار تھی۔ جب شازیہ اسے بلانے آئی۔

"باجی ناشتا لگ گیا ہے آجائیں۔" وہ دھیمے دھیمے چلتی ہوئی اندر آئی تھی۔ صائم روٹھا روٹھا سا بیٹھا تھا۔ ٹیبل پر صرف وہ صائم اور سحر تھے۔ صائم صرف چائے

بی کر اٹھ گیا تھا۔ بیگم راحت اور فراز انکل ناشتا کر رہے تھے جو کہ وہ ہمیشہ ہی کرتے تھے۔ سو ٹیبل پر لیب والو اور سحر تھیں۔

"یہ صبح صبح اٹھ کر تم کہاں چلی گئی تھیں عینا۔" انہوں نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

"لان میں واک کے لیے جاتی ہوں۔"

"اس موسم میں بھی اتنے سویرے تو ٹھنڈ ہوتی ہے۔"

"میں کچھ دیر تک گھر چلی جاؤں گی۔ خرم کا فون آیا تھا۔ وہ بارہ بجے تک آجائے گا ملتان سے اور پرسوں میری فلائٹ ہے۔ تم تو گی نا ایئر پورٹ پر پھپھو کے ساتھ۔" اس نے سر ہلا دیا۔

"ارے ہاں۔ یہ صائم کیا کہہ رہا ہے۔"

"کیا۔"

"وہ شادی کرنا چاہتا ہے تم سے۔ میں تو حیران ہی رہ گئی۔ میرے تو تصور میں بھی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ تم سے چھوٹا ہے نا اس لیے، چلو یہ مسئلہ تو حل ہوا نہ ہوا رہا تھا پھپھو کو بھی اعتراض نہیں۔" خوشی اس کے لہجے سے چھلکتی تھی۔

"لیکن مجھے تو اعتراض ہے۔" عینا کہنا چاہتی تھی، لیکن خاموش رہی اور خاموشی سے چائے گھونٹ گھونٹ کر کے پیتی رہی۔

"تم تو مجھ سے بھی زیادہ لکی ہو یار۔" سحر بے حد خوش نظر آرہی تھی اور اپنی خوشی میں اس نے عینا کے چہرے پر بکھری اداسی پر غور نہیں کیا تھا۔

"صائم، خرم کے مقابلے میں بہت اچھا ہے۔ ہر لحاظ سے، میرا خیال ہے وہ منگنی ابھی کروائے گا اور شادی اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد۔ اف لوہی کتنا جلیں گی۔" وہ ہنسی۔

"وہ اور ان کے منصوبے سب خاک میں مل جائیں گے۔ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہ رہی تھیں۔ اپنے ابنارمل بیٹے کے لیے دلہن اور ساتھ میں مفت کی نوکرانی۔ میں تو کہوں گی صائم سے نکاح بھی کر لے، منگنی پہ۔ پھر کوئی خطرہ نہیں رہے گا ——— تمہارا کیا خیال ہے۔" عینا نے ایک گہرا سانس لے کر خالی کپ ٹیبل پر رکھا۔

"آپی میرے سر میں درد ہے اور نیند بھی آرہی۔ میں کچھ دیر سونا چاہ رہی ہوں۔"

"ہاں۔ ہاں ضرور کچھ دیر سو جاؤ۔ میں دیکھ رہی تھی رات تم بالکل نہیں سوئیں۔ جب بھی آنکھ کھلتی تھی تمہیں کروٹیں بدلتے دیکھتی تھی۔"

عینا کھڑی ہو گئی۔ سحر بھی اٹھی تھی اور اسے گلے لگاتے ہوئے اس کی پیشانی چوم لی۔

"میں بہت خوش ہوں عینا، بہت خوش۔ مجھے ڈر لگا تھا جب مجھے صائم نے بتایا کہ ارحم بھی یہاں ہے۔ وہ جادوگر ہے۔ مجھے ڈر تھا تمہیں اسیر کر لے گا۔"

"آپ کو تو اسیر نہیں کیا۔" عینا نے الگ ہوتے ہوئے اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ لمحہ بھر کو وہ چپ ہو گئی۔

"کر لیتا اگر خرم میرے سامنے نہ ہوتا۔" سحر کبھی لاجواب نہیں ہوتی تھی۔ آج بھی ایسی ہی تھی۔

"خرم اکلوتا نہیں ہے۔ اس کی بہنیں ہیں، بھائی ہے، اس کی جائیداد کے حصہ دار، لیکن تم اکلوتی مالک ہو گی اس اتنی بڑی جائیداد کی۔ صائم تنہا وارث ہے سب کا۔"

"آپ بھول رہی ہیں آپی۔ صائم کا بھی ایک بھائی ہے۔"

"کون ارحم۔" سحر کی سوالیہ نظریں عینا کی طرف اٹھیں۔ ان نظروں میں تمسخر سا تھا۔

"تمہیں شاید علم نہیں ہے۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر چلا گیا تھا اور اس نے انکل سے کہہ دیا تھا کہ وہ ہر شے سے دستبردار ہو رہا ہے۔"

"جب انہوں نے کہا، میں ان کا بیٹا نہیں ہوں تو میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں ان کی محبت کے ساتھ ساتھ ان کی ہر شے سے دستبردار ہوں۔" اس کے کانوں میں ارحم کی آواز گونجی۔

"ان کے کہہ دینے سے ان کا حق ختم تو نہیں ہو جاتا۔ وہ انکل فراز کے بیٹے ہی رہیں گے ہمیشہ۔"

"یار فکر نہ کرو، یہ سب تمہارا ہے۔ میں ارحم کو بہت

اچھی طرح جانتی ہوں۔ ایک دفعہ اس نے کہہ دیا ہے نا تو وہ کبھی آنکھ اٹھا کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھے گا۔ یہ جو تمہیں یہاں نظر آیا ہے نا تو صرف انکل فراز کی وجہ سے۔ پورے چار سال اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ پھر انکل کا ہارٹ اٹیک ہوا۔ اور۔۔۔"

"آپ ان کو اتنا جانتی تھیں۔ پھر بھی آپ نے انہیں چھوڑ دیا آپی۔" اس کی آنکھیں جھلملائیں اور وہ تیزی سے مڑ گئی۔ سحر وہاں ہی کھڑی اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔ جس کا ہر اٹھتا قدم اس کے فیصلے کو مضبوطی عطا کر رہا تھا۔ فیصلہ تو اس نے رات کو ہی کر لیا تھا۔ لیکن سحر کی باتوں نے اس پر مہر لگا دی تھی۔ سحر نے اسے کمرے میں جاتے دیکھا اور پھر کندھے اچکا کر بیگم راحت کی طرف متوجہ ہو گئی جو اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج کی طرف جا رہی ہیں۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے بیڈ پر گھٹنوں کے گرد بازو حمائل کیے اور گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے سوچوں میں گم بیٹھی تھی۔ جب دستک دے کر صائم اندر آیا۔

"ہیلو میم کیا چھٹی منائی جا رہی ہے۔" لہجے میں شوخی تھی ـــــ عہنا نے اس کی طرف دیکھا۔ عینک کے شیشوں کے پیچھے سے جھانکتی آنکھوں میں وہ چمک اور شوخی نہ تھی جو ان آنکھوں کا خاصہ تھی۔

"ہاں جی تمہیں چاہ رہا تھا۔" وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"تو تم نے فیصلہ کر لیا۔" صائم نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔

"ہاں میرے دل میں تمہارے اور ارحم بھائی کے لیے ایک سے جذبات ہیں۔ میں تم سے دوستوں کی طرح بے تکلف ہوں اور ارحم بھائی کا بہت احترام کرتی ہوں۔ تم سے میرا خون کا رشتہ ہے۔ ارحم بھائی سے ایسا کوئی رشتہ نہیں۔ میں تم دونوں سے محبت کرتی ہوں۔ میں تم دونوں کو دکھ نہیں دینا چاہتی۔ کاش تم میرے لیے ایسا نہ سوچتے یا پھر ارحم بھائی ہی ایسا نہ سوچتے۔ لیکن بہت سی باتیں ہمارے اختیار میں نہیں ہوتیں صائم۔ لیکن مجھے فیصلہ کرنے کا اختیار ہے اور میں نے۔۔۔"

اس نے ارحم کی طرف دیکھا جو بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"صائم تم بہت اچھے ہو۔ تمہیں بہت اچھی لڑکی مل جائے گی جو مجھ سے بھی اچھی ہوگی اور تمہیں شاید دو تین سالوں بعد یاد بھی نہ رہے کہ تم نے ایسی کوئی خواہش کی تھی۔ لیکن ارحم بھائی کا دل دوسری بار یہ دکھ برداشت نہیں کر پائے گا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرا دل پہلی بار تمہارے نام پر دھڑکا تھا۔ میں نے وہ خاص جذبہ تمہارے لیے محسوس کیا تھا۔ لیکن مجھے یقین ہے۔ ایک دن آئے گا جب میرا دل ارحم بھائی کے لیے بھی ایسے ہی دھڑکے گا۔ یہ تھوڑا مشکل ضرور ہوگا، لیکن ناممکن نہیں۔ ایک دن میری محبت ان کے دل سے پچھلے سارے دکھوں اور غموں کو دھو دے گی۔ پلیز صائم مجھے تمہاری سپورٹ کی ضرورت ہے۔ مجھ ایسا مت کرنا جو۔۔۔"

"تم کیا سمجھتی تھیں کہ تم ارحم بھائی سے بہت محبت کرتی ہو اور میں ایک خود غرض شخص ہوں سحر آپی اور ماما کی طرح۔ مجھے اپنی خواہش ان کی آرزو سے زیادہ عزیز ہے۔ صرف تمہارے اندر دینے کا حوصلہ ہے۔ باقی سب مہا کنجوس ہیں۔ میں نے بارہ سال ان کی واپسی کی دعائیں اس لیے نہیں مانگی تھیں کہ وہ میری ایک اسٹوپڈ خواہش کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے پھر سے کھو جائیں۔ ٹھیک ہے۔ میں کچھ دیر کے لیے خود غرض ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا تھا۔ نہیں میں اس لڑکی کو نہیں کھو سکتا جو بوسٹن کی ایک کہر آلود شام میں چپکے سے میرے دل میں اتر آئی تھی اور جس کی بارہ سال پرانی تصویر میرے سامان سے میرے والٹ میں منتقل ہو گئی تھی اور جسے سونے سے پہلے میں ہر رات دیکھتا تھا۔ میں ارحم بھائی کو تم سے زیادہ جانتا تھا۔ مجھے صرف ارحم بھائی سے اتنا کہنا تھا۔ ارحم بھائی مجھے عہنا اچھی لگتی ہے۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور

مجھے پتا تھا۔ ارحم بھائی نے مڑ کر تمہاری طرف دیکھا تک نہ تھا۔ چاہے خود ان کا وجود راکھ بن کر اڑ جاتا۔ ایکسی کی طرف جاتے میرے قدم تھم گئے۔ میرے اندر بیٹھے صائم نے مجھ سے کہا اور کیا تم ارحم کو کھو سکتے ہو۔ جس کی انگلی پکڑ کر تم نے چلنا سیکھا۔ اپنے بچپن کی بہت سی راتیں جس کے بیڈ پر تم سو جاتے تھے اور وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی سو جاتا تھا۔ میرے دل نے کہا نہیں اور میں واپس پلٹ گیا۔ مجھے یقین تھا تمہارا فیصلہ بھی یہی ہوگا۔ وہ لڑکی جسے میرے دل نے چنا وہ بڑے دل اور بڑے ظرف کی مالک ہے۔ لیکن اگر تمہارا فیصلہ اس کے برعکس ہوتا تو شاید تم میرے دل سے اتر جاتیں ہمیشہ کے لیے۔ مجھے لگتا میرا انتخاب غلط تھا۔ لیکن میرا انتخاب غلط کیسے ہو سکتا تھا۔ آخر کو میں ایک جینئس لڑکا ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"صائم۔" عہنا نے بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر آنکھوں سے لگایا۔ اس کے ہاتھ تھامے وہ اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی اور اس کے آنسو صائم کے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔

"صائم۔"

"کچھ مت کہو عہنا۔ تھوڑا وقت لگے گا۔ لیکن پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ مسکرایا۔ لیکن اس کی عینک کے شیشے دھندلے ہو رہے تھے یا آنکھیں اس نے پلکیں جھپکائیں۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ لیکن اس کے آنسوؤں سے عہنا کا من بھیگتا جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تو ایک اور نارسائی تمہارا مقدر ٹھہری ارحم فراز خان۔" ارحم کھڑکی کے پاس باہر دیکھ رہا تھا۔ وہاں لیموں کے پودوں کے پاس کھڑی وہ چپکے چپکے سے اسے دیکھتی اور وہ انجان بن جاتا تھا۔ وہ نازک دل لڑکی جو اس کے لیے پھول اور مسکراہٹیں ڈھونڈنے نکلی تھی وہ نہیں جانتی کہ ابھی مجھے کتنا سفر یادوں طے کرنا ہے اور کتنے کانٹے چننے ہیں۔ پتا نہیں کیسے سمیٹ پاؤں گا میں یہ سب۔ کیسے نکال پاؤں گا میں اسے زندگی سے۔

وہ مڑا اور اس کی حیران آنکھوں نے عہنا کو دیکھا جو کمرے کے بیچوں بیچ اس کے بیگ کے پاس کھڑی تھی۔ پتا نہیں وہ کب چپکے سے اندر آئی تھی۔ اس کے لبوں پر بڑی جاندار سی مسکراہٹ تھی۔

"یہ۔" اس نے بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

"کوچ کا ارادہ ہے۔"

"بتایا تو تھا تمہیں عہنا۔" اس نے نظریں عہنا کے چہرے سے ہٹالیں۔

"آپ ایسے کیسے جا سکتے ہیں میرے دل میں اپنی محبت جگا کر۔ مجھے ہمیشہ کے لیے نارسا چھوڑ کر۔ آپ اتنے ظالم کیسے ہو سکتے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آرہا۔ لیکن۔ شاید۔" وہ تیزی سے پلٹی تھی۔

"رکو۔ رکو عہنا۔" ارحم چونکا اور اس نے یکدم اسے بازوؤں سے پکڑ کر اپنی طرف موڑا۔

"زندگی کے کربلا میں فرات کی جھلک دکھا کر کیوں گم ہونا چاہتی ہو عہنا۔ کہو پھر سے کہو کیا کہا تھا۔" خوشی سے لرزتی آواز میں کہتا وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ عہنا کی آنکھیں جھلملا گئیں اور ان جھلملاتی آنکھوں میں صائم کا عکس لمحے بھر کو لہرایا اور وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرائی اور ارحم کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نظروں کی تاب نہ لا کر نظریں جھکالیں۔

☆ ☆ ☆

ٹائی باندھتے ہوئے فراز خان نے مڑ کر بیگم راحت کی طرف دیکھا۔

"میں نے آپ سے کل بات کی تھی کہ میں عہنا کو بہو بنانا چاہتی ہوں۔"

"ہاں اور مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔"

"وہ دراصل ابھی سحر نے گھر جانے سے پہلے ایک خواہش ظاہر کی ہے فراز کہ اگر ہم آج یا کل شام صائم اور عہنا کی منگنی کا چھوٹا سا فنکشن کرلیں تو وہ بھی اس تقریب میں شرکت کرلے۔ پردیس میں رہنے والوں

کے لیے۔ یہ حسرت ہی رہ جاتی ہے کہ وہ اپنے پیاروں کی خوشیوں اور غموں میں شریک نہیں ہو پائے۔ کیا ممکن ہے ایسا۔"

"ہوں۔۔ ممکن۔۔ تو ہے راحت لیکن تصحیح کرلو صائم اور عینا نہیں۔" "ارحم اور عینا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ فراز میں نے آپ کو بتایا تھا صائم پسند کرتا ہے عینا کو اس نے خود مجھ سے کہا تھا۔"

"ہاں۔۔ لیکن ارحم کے لیے بھی صائم نے ہی مجھ سے کہا تھا۔"

"کب۔۔" بیگم راحت حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

"ابھی کچھ دیر پہلے جب آپ لاؤنج میں بیٹھی سحر سے باتیں کررہی تھیں۔"

"لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ صائم یہ کیسے کہہ سکتا ہے۔"

"صائم نے ایسا ہی کہا ہے راحت۔" ان کی آواز دھیمی تھی۔ وہ ڈریسنگ کے سامنے سے ہٹ کر ان کے سامنے آکھڑے ہوئے تھے۔

"نہیں میرا بیٹا عینا سے محبت کرتا ہے۔ اس نے خود مجھے بتایا تھا۔" وہ بڑبڑائی تھیں۔

"اگر تم ارحم سے اس کی شادی کے لیے راضی نہیں ہوگی تو صائم کبھی عینا سے شادی نہیں کرے گا۔ یہ جان لو۔" وہ ان کے قریب آئے۔

"میں نے آج تک کبھی تمہیں کچھ جتایا نہیں۔۔ لیکن میں جانتا تھا میں بہت پہلے جان گیا تھا سب وہ سب جو تم نے سحر کے ساتھ مل کر میرے بیٹے کے ساتھ کیا تھا۔ آج تمہیں اپنی غلطی کے ازالے کا ایک موقع مل رہا ہے تو اسے مت گنواؤ۔"

بیگم راحت کا چہرہ یکدم سفید پڑ گیا تھا اور وہ بیڈ کی پٹی پر بیٹھ گئیں جیسے گرنے سے بچنا چاہتی ہوں۔

"عینا کا اختیار تمہارے پاس ہے۔ ہونا بھی وہی کریں گی جو تم کہو گی۔ تمہیں انکار ہے تو یاد رکھنا تم ہم سب کو کھو دو گی۔ صرف مجھے ہی نہیں صائم کو بھی ہم ارحم کی خوشی کے لیے کچھ بھی کرسکتے ہیں۔"

وہ بیڈ پر سے اپنا والٹ اٹھاتے تیزی سے باہر نکل گئے اور بیگم راحت کسی کو کھونا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ اٹھیں اور بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی لاؤنج تک آئیں جہاں فراز خان کھڑے صائم سے کچھ کہہ رہے تھے۔

"صائم یہاں کھڑے کیا گپیں لگا رہے ہو' بھائی کو بھی تو خبر کرو کہ آج ہی شام اس کی منگنی ہورہی ہے۔"

وہ زبردستی مسکرائی تھیں' لیکن فراز خان نے جن نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔ انہیں لگا جیسے خوشی کی ایک لہر سی اندر تک پھیل گئی ہو' سچی خوشی کی' صائم نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"آج۔۔ یعنی آج۔۔" اور پھر اندرونی دروازہ کھولتا انیکسی کی طرف بھاگا۔ جہاں ابھی تک ارحم' عینا کا ہاتھ تھامے خواب کی سی کیفیت میں کھڑا تھا۔ عینا کی لانبی پلکیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔

"میرے زخم پھر سے گلاب ہوں۔"

وہ ہولے سے گنگنایا تھا

کبھی گنگناؤ تو اس طرح
کبھی مسکراؤ تو اس طرح
میری دھڑکنیں بھی لرز اٹھیں
کبھی یاد آؤ تو اس طرح
کہ لہو کی ساری تمازتیں
تمہیں دھوپ دھوپ سمیٹ لیں
تمہیں رنگ رنگ نکھار دیں
میرے زخم پھر سے گلاب ہوں

وہ اس کے ہاتھ ہاتھوں میں لیے گنگنا رہا تھا اور عینا کا دل ایک نئی تال پر دھڑک رہا تھا۔

✡ ✡

لبنیٰ طاہر

صفی کے آنے میں صرف پندرہ دن رہ گئے تھے اور ابھی تک اس کے جوڑ کی لڑکی نہیں مل سکی تھی اس مرتبہ اس کے آنے پر ارادہ یہی تھا کہ اس کا نکاح کردیا جائے، مگر صفی کے جوڑ کی لڑکی تو جیسے عنقا ہو کر رہ گئی تھی۔

بہت سی لڑکیاں دیکھی گئیں، مگر عالیہ کو ان میں سے کوئی بھی پسند نہ آئی تھی اس کا خیال تھا کہ صفی جیسے شاندار بندے کی دلہن بھی اس جیسی ہونی چاہیے پتا نہیں اس کے دماغ میں کیا سوچ تھی ابھی بھی وہ لوگ ایک لڑکی دیکھ کر آئے تھے۔ شاریہ اور امی کا خیال تھا کہ یہ لڑکی صفی کے لیے مناسب ہے، مگر عالیہ۔۔۔

"کیا ہو گیا ہے آپی؟ اتنی تو اچھی لڑکی تھی پتا نہیں آپ کو اچھی کیوں نہیں لگی، آخر آپ چاہ کیا رہی ہیں؟" شاریہ بہت بے زار نظر آرہی تھی۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔۔۔ ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے تھے اس لڑکی میں مجھے تو بہت عام سی لگی اور میرے صفی کی دلہن کوئی عام سی لڑکی ہو۔۔۔ نہیں ہو سکتا سمجھیں تم۔۔۔" عالیہ کے لہجے میں صفی کے لیے محبت تو تھی، مگر ایک عجیب سا احساس تفاخر بھی تھا جو امی کو اچھا نہیں لگا۔

"بری بات ہے عالیہ۔۔۔ اس طرح نہیں کہتے کسی کی بہن بیٹی کے بارے میں ایسا سوچنا بہت غلط ہے۔"

"اس میں غلط کیا ہے امی۔۔۔؟ صفی کی پرسنالٹی اس کی تعلیم اور پھر وہ جس ملک میں رہتا ہے یہ سب کوئی معمولی چیزیں تو نہیں ہیں نا امی تو اپنے بہت عام سے بیٹوں کے لیے بھی چاند سی دلہن ڈھونڈنے میں اپنی جوتیاں گھس ڈالتی ہیں اور ایک آپ ہیں۔"

"ہاں ہوتی ہیں ایسی مائیں بھی، مگر میں ان ماؤں میں سے نہیں ہوں۔ مجھے بہت شرمندگی ہوتی ہے بیٹے کہ ہم کسی کی بیٹی دیکھنے جائیں اور پھر اسے ریجیکٹ کردیں تم تو خیر سے اپنے گھر کی ہو، مگر میرے سامنے میری اپنی بچی بھی ہے میری شاریہ۔۔۔ اللہ اس کے نصیب اچھے کرے مجھے بہت ڈر لگتا ہے عالیہ بیٹے۔ اب بس کرو اور اس ہفتے میں ہم نے جو چند لڑکیاں دیکھی ہیں ان میں سے کوئی ایک فائنل کردو ویسے بھی ہمارے پاس کوئی زیادہ وقت نہیں ہے ایک مہینے کے لیے صفی آرہا ہے اور پندرہ دن یہ کل ملا کر ڈیڑھ ماہ۔۔۔ اور ہم ابھی تک لڑکی ڈھونڈ رہے ہیں۔"

"بس کردیں امی یہ ریجیکشن ویجکشن کچھ نہیں ہوتی مجھے بھی تو ریجیکٹ کیا گیا تھا میں مر گئی اور نہ ان لوگوں کو کوئی فرق پڑا وہ تو ہمارے سگے تھے جب انہوں نے ہمارا خیال نہیں کیا تو آپ کو بھی غیروں کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور معاف کیجیے گا جن لڑکیوں کی آپ بات کررہی ہیں مجھے ان میں سے ایک بھی پسند نہیں ہے مجھے ایک ہفتہ اور دے دیجیے ان شاء اللہ میں صفی کے لیے اس کی شایان شان دلہن ڈھونڈ ہی لوں گی۔" عالیہ نے کہا بات ختم کی۔

صفی امریکا میں تھا وہ یہاں سے اسکالر شپ پر گیا تھا اب وہ وہاں پر ایک کامیاب ڈاکٹر تھا پانچ سال سے وہ وہیں پر تھا بیچ میں ایک مرتبہ آیا تھا، مگر اس وقت تک اس کی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی اب نہ صرف اس کی تعلیم مکمل ہو گئی تھی بلکہ اسے ایک اسپتال میں بہترین جاب بھی مل گئی تھی۔ اسی لیے گھر والوں کا خیال تھا کہ

اس بار وہ آئے تو اسے شادی کے بندھن میں باندھ دیا جائے، مگر یوں لگتا تھا جیسے صفی کے لیے لڑکی ڈھونڈنا جوئے شیر لانا تھا۔ سارا مسئلہ عالیہ کا تھا اس کے معیارات اتنے بلند تھے کہ کوئی لڑکی اس معیار پر پوری اترتی دکھائی نہ دیتی تھی سو یہ بیل بھی منڈھے نہ چڑھ رہی تھی یہ تو صفی کی سعادت مندی تھی کہ امریکا جیسے ملک میں رہتے ہوئے بھی اس نے سارا اختیار ماں

بہنوں کو سونپ رکھا تھا ورنہ وہ اگر چاہتا تو اپنے لیے وہیں کسی کو پسند کرکے اب تک شادی بھی کرچکا ہوتا کہ عموماً "یہی ہوتا ہے" مگر وہ ایک حساس دل رکھنے والا شخص تھا۔ عالیہ کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اسے اس کا بھی احساس تھا اس لیے وہ عالیہ کی بات کو بہت اہمیت دیتا تھا یوں بھی عالیہ گھر کی بڑی اور بیاہی بیٹی تھی اس کا حق بھی تھا کہ وہ اپنے ارمان نکالے، مگر عالیہ کا رویہ اب امی اور

شاریہ کو کھلنے لگا تھا۔
ایک تو وقت زیادہ نہیں تھا دوسرے ایک کے بعد ایک لڑکیوں کو ریجیکٹ کرتے جانا یہ اور بھی نامناسب بات تھی۔ امی کی تو یہی دعا اور کوشش تھی کہ جلد سے جلد کوئی فیصلہ ہو تاکہ وہ اپنے فرض سے عہدہ براہو سکیں۔
عالیہ اپنے چچازاد انصار سے منسوب تھی، مگر چھ سال پہلے انصار نے اپنی پسند سے اپنی کلاس فیلو سے شادی کرلی تھی انصار کی اس حرکت سے دونوں خاندان ایک دوسرے سے کٹ کر رہ گئے تھے اور عالیہ اس پر تو پہاڑ سا ٹوٹ پڑا تھا اس کے پندار کو شدید ٹھیس پہنچی تھی اسے یوں لگتا تھا جیسے بھرے بازار میں کسی نے اس کے سر سے چادر کھینچ لی ہو، اس کی انا اس کی خودداری کو جس طرح انصار نے اپنے پیروں تلے کچلا تھا وہ پور پور زخمی ہوگئی تھی، مسترد کیے جانے کا دکھ اس کا دم گھونٹتا رہتا تھا پھر اس نے سارے خواب انصار کے حوالے سے ہی دیکھے تھے ان ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں اس کے جسم و جان میں پیوست ہو کر رہ گئی تھیں۔ اسے لگتا تھا کہ وہ اب شاید ہی دنیا کا سامنا کرسکے گی۔ اس احساس نے اسے گھر کا قیدی بنا ڈالا تھا مہینوں وہ گھر سے باہر نہ نکلی تھی کوئی گھر میں آجاتا تو وہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتی تھی ان دنوں وہ اس قدر اذیت میں تھی کہ گھر والوں کی محبت اور تسلی کے پھاہے بھی کچھ کام نہ دے رہے تھے۔
صفی اس وقت میڈیکل فائنل ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا، بہن کی یہ حالت اس سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ اپنی ڈاکٹری کا ہنر اس پر آزماتا رہتا تھا، مگر لگتا تھا کہ ہر دوا اس پر بے اثر تھی پھر ماں باپ کی دعائیں کبھی بھی بے اثر نہیں رہتیں ان دعاؤں کی بدولت عالیہ آہستہ آہستہ نارمل ہو ہی گئی تھی پھر اللہ کے کرم سے ایک بہت اچھے گھر سے اس کا رشتہ آگیا فرہاد ہر لحاظ سے انصار سے بہتر تھا شکل و صورت اور تعلیم تو اچھی تھی ہی مالی پوزیشن بھی مستحکم تھی اس لیے اس رشتے کو قبول کرکے جلد از جلد اس کی شادی کردی گئی۔
اب وہ ایک بہت مطمئن اور خوش باش زندگی گزار رہی تھی ایک صحت مند اور خوب صورت بچے کی ماں بن کر اس کی کائنات مکمل ہوگئی تھی، مگر وہ کہتے ہیں نا کہ انسان سب کچھ بھلا دیتا ہے، مگر اپنی ذلت نہیں بھول پاتا سو عالیہ بھی ہر نعمت کے ہوتے ہوئے بھی بے عزتی کے اس احساس سے چھٹکارا حاصل نہیں کرپائی تھی جس سے انصار نے اسے دوچار کیا تھا ٹھکرائے جانے کا احساس اسے اب بھی کچوکے لگاتا تھا اور یہ بڑی عجیب بات تھی کہ اس کے ساتھ جو ہوا تھا وہی سب کچھ وہ اب دوسروں کے ساتھ کر رہی تھی بڑے آرام سے وہ اچھی خاصی لڑکیوں میں کوئی نہ کوئی نقص نکال کر انہیں ریجیکٹ کردیتی تھی امی اس صورت حال سے پریشان تھیں۔ شاریہ الگ بے زار نظر آتی تھی اس روز بھی موضوع بحث یہی مسئلہ تھا امی آج کچھ غصے میں تھیں۔
"عالیہ۔ بہت ہوگیا بیٹے۔ تم نے ایک ہفتہ مانگا تھا مجھ سے اور ایک ہفتہ گزر چکا ہے تمہیں کچھ احساس ہے ہمارے پاس کتنا تھوڑا وقت رہ گیا ہے؟"
"جی امی مجھے بالکل احساس ہے۔"
"تو پھر بیٹے جلد سے جلد کوئی فیصلہ کرو صفی کے آنے کے بعد تو ویسے بھی مصروفیت بہت بڑھ جائے گی میرا خیال ہے کل جو بچی ہم دیکھ کر آئے ہیں بڑی پیاری بچی ہے صفی کے لیے تمہیں ایسی ہی کسی لڑکی کی تلاش تھی نا؟ مجھے ہر لحاظ سے وہ بچی پسند آئی ہے کیوں شاریہ۔ تمہیں بھی اچھی لگی ہے نا؟"
"مجھ سے کیا پوچھ رہی ہیں امی۔ آپی سے پوچھیں سچ بتاؤں۔ مجھے تو کوئی بھی لڑکی بری نہیں لگی جو ہم نے اب تک صفی بھائی کے لیے دیکھیں، لیکن مجھے لگتا ہے صفی بھائی کی دلہن صلہ ہی بنے گی۔" شاریہ کے منہ سے بلا ارادہ یہ جملہ نکلا تھا جسے ادا کرنے کے بعد وہ چور سی بن گئی تھی۔ کمرے میں یکدم سناٹا چھا گیا تھا۔
"تحت۔ تم کیا فضول بکواس کر رہی ہو شاریہ؟" کچھ دیر بعد عالیہ نے ہی اس سکوت کو توڑا تھا۔
"وہ۔ وہ آپی۔ میں تو بس یونہی۔" شاریہ ہکلا

سی گئی۔

"یونہی؟"

"یوں ہی سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ صلہ کا نام تمہارے منہ سے نکلا کیسے، تم بھول گئیں انہوں نے ہمارے ساتھ کیا کیا تھا۔" عالیہ کے لہجے میں آنچ دیتی آگ تھی۔

"مگر آپی۔۔ صلہ اور چچی کا تو کوئی قصور نہیں تھا انصار بھائی نے جو کچھ بھی کیا وہ ان کا اپنا ذاتی فیصلہ تھا۔"

"اور اس کے اس فیصلے کی بھینٹ تمہاری اپنی سگی بہن چڑھ گئی تھی۔ تم شاید یہ بھول گئی ہو بلکہ مجھے تو لگتا ہے سب بھول گئے ہیں۔۔ کیوں امی۔" وہ ماں سے سوال کررہی تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے بیٹے۔۔ کوئی کچھ نہیں بھولا ہے اگر ایسی بات ہوتی تو صفی نے سارا اختیار تمہیں نہ سونپا ہوتا ورنہ تمہیں بھی پتا ہے صفی بہت پسند کرتا ہے صلہ کو۔"

"یہ پرانی بات ہے امی وہ پسند کرتا تھا صلہ کو۔" عالیہ نے تھا پر زور دیا۔ "مگر اس واقعے کے بعد اس کی پسند نفرت میں بدل گئی وہ اب ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتا اگر ایسا ہوتا تو وہ کبھی بھی کسی اور سے شادی کے لیے تیار نہیں ہوتا۔" عالیہ کے لہجے میں بھائی کے لیے بڑا یقین اور مان تھا۔

"یہ تو اس کی سعادت مندی اور تم سے محبت کا ثبوت ہے عالیہ بیٹے۔۔ ورنہ صلہ جیسی پیاری لڑکی کو بھول جانا اتنا آسان نہیں ہے اور سچ بات یہی ہے کہ اس سارے معاملے میں صلہ اور تمہاری چچی بالکل بے قصور تھیں ان دونوں کو بھی انصار کے اس فیصلے سے اتنی ہی تکلیف پہنچی تھی جتنی ہم لوگوں کو۔"

"چھوڑیں امی۔۔ تب ہی انہوں نے اتنے آرام سے اس لڑکی کو قبول کرلیا تھا جسے انصار نے مجھ پر ترجیح دی تھی۔۔ یہ سب چچی اور صلہ کا ڈھکوسلہ ہے تاکہ آپ ان کی طرف سے بدگمان نہ ہوں اور دیکھیں وہ کتنی کامیاب ہیں اپنی اس پلاننگ میں آپ اور شاریہ اب بھی ان دونوں کے لیے سافٹ کارنر رکھتی ہیں اپنے دل میں۔۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟"

"بالکل غلط آپ کی سوچ بہت نگیٹو ہے آپی۔ فرہاد بھائی جیسے اچھے انسان کا ساتھ بھی آپ کی سوچ کو بدل نہیں سکا۔"

"تم اپنی بکواس بند کرو شاریہ۔ یہ شوشا تم نے ہی چھوڑا ہے، مگر میں ایک بات بتادوں میرے جیتے جی تو صلہ کبھی بھی صفی کی دلہن نہیں بن سکے گی یہ یاد رکھیے گا آپ لوگ۔۔" عالیہ نے بیگ اٹھایا اور بگولے کی طرح باہر نکل گئی۔

"کیا ضرورت تھی شاریہ۔۔ یہ بات کرنے کی خوامخواہ تم نے اس کا دل برا کیا۔ دیکھنا اب یہ معاملہ اور لٹک جائے گا۔" امی کے لہجے میں تاسف بھی تھا اور فکر بھی۔

"بس امی میرے منہ سے بے ارادہ نکل گیا۔ کیا کروں زبان تھی پھسل گئی۔ آئم سوری امی۔" شاریہ واقعی نادم تھی۔

"اب جاکر اسے منالینا ورنہ روٹھی بیٹھی رہے گی تم تو جانتی ہو چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی کتنا محسوس کرتی ہے۔"

"جی امی صبح ہوتے ہی جاؤں گی یا آپ کہیں تو انہیں فون کرلوں؟"

"نہیں بیٹے جانا بہتر ہے کا فون تو شاید اس وقت تمہارا ریسیو بھی نہیں کرے گی۔"

لڑکی تو خیر کیا ملنی تھی صفی شیڈول سے ایک ہفتہ پہلے ہی پاکستان آگیا تھا۔

"تم نے کتنا ٹائم ضائع کیا عالیہ۔۔ اب دیکھو صفی بھی آگیا ہے اور ہم لوگ ابھی تک ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔" امی تو عالیہ پر برس ہی پڑی تھیں۔

"تو ہو امی۔۔ کیوں فکر کرتی ہیں، میں دو ماہ کی چھٹی لے کر آیا ہوں ابھی بہت وقت پڑا ہے آپ پریشان مت ہوں۔" صفی ان کے گلے میں بانہیں ڈالے کہہ رہا تھا۔

"ارے۔۔ اچھا واقعی۔ چلو یہ تو بہت اچھا ہو گیا۔"

وہ ذرا سی ریلیکس ہو کر بولیں۔

"اب یوں کریں گے کہ تم خود ہی ہمارے ساتھ چل کر کسی لڑکی کو اوکے کر لینا تاکہ بات آگے بڑھ سکے ورنہ عالیہ نے یہ دو ماہ بھی یوں ہی گزار دینے ہیں۔ کیوں عالیہ! تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

"مجھے کوئی شوق تو نہیں ہے خوا مخواہ کے اعتراض کرنے کا میں تو بس اتنا چاہتی ہوں کہ کوئی بہت پیاری سی لڑکی ہو جس سے صفی کی شادی ہو اس کے علاوہ میں اور کیا چاہتی ہوں بھلا۔" عالیہ نے اپنے ہینڈسم اور شاندار پرسنالٹی کے حامل بھائی کو محبت پاش نظروں سے دیکھا۔

صفی کے آنے سے گھر میں ایک دم گہما گہمی سی ہو گئی تھی ایک لمبے عرصے کے بعد وہ پاکستان آیا تھا دوست احباب، ملنے جلنے والے ہر روز ہی کوئی نہ کوئی آیا رہتا اتنی بے تحاشا مصروفیت میں لڑکی والا معاملہ پیچھے ہی رہ گیا تھا۔ خدا خدا کر کے آج کئی دنوں کے بعد تھوڑی سی فرصت ملی تھی امی نے فون کر کے عالیہ کو بلوا لیا تھا۔

امی کی ایک پرانی دوست تھیں جن کے توسط سے کہیں رشتے کے سلسلے میں جانے کی تیاری تھی شاریہ کا بالکل موڈ نہیں تھا ویسے بھی اس کا خیال تھا کہ اس کے جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیوں کہ فیصلہ تو عالیہ کو ہی کرنا تھا۔ رہ گیا صفی تو اس کا خیال تھا کہ ایک بار امی اور عالیہ ہو کر آ جائیں پھر ضرورت پڑی تو وہ بھی چلا جائے گا۔ امی اور عالیہ چلی گئیں تو وہ دونوں لان میں آ کر بیٹھ گئے۔

"شاری۔۔۔ اچھی سی چائے تو بنا لاؤ پھر دونوں بھائی، بہن بیٹھ کر چائے بھی پئیں گے اور ڈھیر ساری باتیں بھی کریں گے۔ کیا خیال ہے؟"

"بہت نیک خیال ہے۔ میں بس اچھی سی چائے بنا کر لاتی ہوں۔ یوں گئی اور یوں آئی۔" شاریہ نے چٹکی بجائی اور ہنستی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔

"شکر ہے۔ آج کتنے دنوں کے بعد تھوڑی سی فراغت ملی ہے۔ ہے نا بھائی؟" شاریہ نے چائے کا سپ لیتے ہوئے ریلیکس سے انداز میں صفی کی جانب دیکھا۔

"ہاں بہنا۔ یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ واقعی بڑا سکون سا مل رہا ہے اور ہاں۔۔۔ چائے تم نے بڑی مزے دار بنائی ہے۔ جب میں یہاں سے گیا تھا اس وقت تو تمہیں شاید انڈا ابالنا بھی نہیں آتا تھا ہے نا؟"

"جی جناب۔۔۔ مگر اتنے دنوں میں آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ آپ کی بہن بڑی سگھڑ ہو گئی ہے سارے کام آتے ہیں اب مجھے۔"

"اچھا۔۔۔ واقعی۔۔۔؟ پھر تو مجھے لگتا ہے میرے ساتھ ساتھ تمہاری بھی شادی ہو جانی چاہیے۔۔۔ کیوں؟"

"اوفوہ۔ بھائی پلیز۔۔۔ میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔" صفی کی شرارت پر شاریہ بری طرح جھینپ گئی تھی۔

"ابھی تو میری بس یہی دعا ہے کہ آپ کی نیا کسی کنارے لگ جائے، عالیہ آپی آپ کے لیے پتا نہیں کس گوہر کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اللہ کرے کہ ان کی یہ تلاش آج تو ختم ہو جائے۔" شاریہ نے بڑے خلوص سے دعا کی یونہی اس کی نظر صفی پر پڑی تھی وہ کسی گہری سوچ میں تھا پتا نہیں اس نے شاریہ کی بات سنی بھی تھی کہ نہیں۔

"کہاں کھو گئے بھائی۔" شاریہ نے چٹکی بجائی۔

"آں۔۔۔ ہاں۔۔۔ کہیں نہیں یار۔۔۔ ادھر ہی ہوں۔"

"اچھا۔۔۔ مجھے تو لگا یہاں ہوتے ہوئے بھی آپ کہیں اور تھے۔ کیا سوچ رہے تھے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس ایسے ہی۔۔۔ تم بتاؤ۔ کیا کہہ رہی تھیں۔" صفی پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا۔

"ایک بات پوچھوں بھائی۔" شاریہ بغور اسے دیکھ رہی تھی۔

"کبھی صلہ سے بات ہوئی؟" صلہ کے نام پر صفی کے چہرے پہ ایک سایہ سا لہرایا تھا۔

"صلہ سے۔۔۔ نن۔۔۔ نہیں تو۔ کیوں پوچھ رہی ہو۔" صفی کی آواز لڑکھڑا رہی تھی شاریہ کو رنج سا ہوا، صفی کی کیفیت بہت کچھ سمجھا رہی تھی صلہ کے لیے

اب بھی اس کا دل دھڑکتا تھا۔ شاریہ جان گئی تھی۔

"کیوں بھائی۔۔۔ کیوں ایسا کر رہے ہیں کہتے کیوں نہیں کہ آپ اب بھی صلہ کو چاہتے ہیں۔ عالیہ آپی کو من مانی کی اجازت کیوں دی ان کے ساتھ جو کیا انصار بھائی نے کیا۔ صلہ نے اور چچی نے تو نہیں کیا پھر خود کو اور صلہ کو سزا کیوں دے رہے ہیں۔ پلیز بھائی۔۔۔ ایسا مت کریں اگر آپ اسٹینڈ لیں گے تو عالیہ آپی کچھ نہیں کر سکیں گی۔ آپ ایک بار کوشش تو کریں۔" شاریہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔

"نہیں گڑیا۔۔۔ جو ہو رہا ہے ہونے دو۔ میں عالیہ آپی کو تکلیف نہیں دے سکتا انہوں نے پہلے ہی انصار بھائی کی وجہ سے بہت اذیت جھیلی ہے۔"

"مگر بھائی۔۔۔ وہ پرانی بات ہے عالیہ آپی بہت خوش گوار زندگی گزار رہی ہیں میرا نہیں خیال کہ انہیں اب اپنی وہ اذیت یاد بھی ہوگی اور یاد ہونی بھی نہیں چاہیے، فرہاد بھائی نے انہیں ایک بہترین زندگی دی ہے انہیں کوئی حق نہیں ہے کہ پرانی رنجشوں کی وجہ سے وہ آپ کی خوشیوں کو داؤ پر لگائیں آپ پلیز ایک بار ان سے بات تو کریں۔"

"رہنے دو نا شاریہ۔ میں نے کہا نا میں انہیں دکھ نہیں دے سکتا پھر چاہے ان کی خاطر میں زندگی بھر کے دکھوں کا سودا کرلوں۔ اب یہ بات دوبارہ مت کرنا یہ میری تم سے ریکویسٹ ہے۔"

"ٹھیک ہے آپ کی مرضی۔۔۔ مگر آپ زیادتی کریں گے اپنے ساتھ، صلہ کے ساتھ اور اس کے ساتھ بھی جو آپ کی زندگی میں شامل ہوگی۔" شاریہ ہار کر بولی تھی۔

"کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو رہی۔ یہ تم کیا پٹیاں پڑھا رہی ہو صفی کو۔" عالیہ پتا نہیں کب سے کھڑی تھی اور کیا کچھ سن چکی تھی اس وقت بڑے کڑے تیوروں سے وہ شاریہ سے مخاطب تھی۔

"کوئی پٹی نہیں پڑھا رہی ہوں آپ کا جو جی چاہے سمجھیں۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور عالیہ کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی تھی۔

"میں سب سمجھتی ہوں۔ تم صفی کو ورغلا رہی تھیں صلہ کے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کر رہی تھیں، مگر میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکی ہوں اور اب پھر کہہ رہی ہوں کہ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی سمجھیں تم۔"

"اور میں بھی آپ کو ایک بات بتادوں آپی۔۔۔ اگر بھائی کے نصیب میں صلہ کا ساتھ لکھا ہے تو آپ اسے روک نہیں سکیں گی۔" شاریہ اپنی بات ختم کر کے رکی نہیں تھی۔ عالیہ پاؤں پٹخ کر رہ گئی۔

"پلیز آپی۔۔۔ ریلیکس ہو جائیں۔ وہی ہوگا جو آپ چاہیں گی۔ مجھے بتائیں جس سلسلے میں گئی تھیں اس کا کیا بنا؟" صفی نے عالیہ کے ہاتھ تھامے اور اسے چیئر پر بٹھا دیا۔

"کیا بتاؤں صفی۔۔۔ پھر وہی مسئلہ لڑکی بس سو سو تھی اور سب سے بڑھ کر مجھے وہ لوگ کچھ لالچی سے لگے یہ سن کر کہ تم امریکا میں رہتے ہو ڈاکٹر ہو اور شادی کے بعد بھی وہیں رہو گے ان لوگوں کی تو جیسے رال ہی ٹپک پڑی تھی ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ہم سارے معاملات بس ابھی کے ابھی طے کر کے اٹھیں پتا نہیں لوگ امریکا کے نام پر پاگل سے کیوں ہو جاتے ہیں امی کو بھی ان کے یہ انداز کچھ اچھے نہیں لگے اور شکر ہے کہ وہ مجھ سے متفق ہیں ورنہ پھر سارا الزام مجھ پر ڈال دیتیں۔" عالیہ بہت بیزار سی تھی۔

"چلیں۔۔۔ کوئی بات نہیں۔ اللہ بہتری کرے گا آپ ٹینشن نہ لیں۔"

✿ ✿ ✿

وہ لڑکی اس قدر خوب صورت تھی کہ عالیہ مسلسل اسے دیکھے جا رہی تھی وہ بالکل ویسی ہی تھی جیسی عالیہ صفی کے لیے ڈھونڈ رہی تھی وہ سیاہ جدید طرز کا لباس پہنے ہوئے تھی جس میں اس کا گلابی رنگ دمک رہا تھا خوب صورت لبوں پر ایسی پیاری مسکان تھی کہ عالیہ کھو سی گئی عالیہ اس ریسٹورنٹ میں فرہاد کے ساتھ ڈنر پر آئی تھی اس سے تھوڑے فاصلے پر وہ لڑکی اپنی فیملی

کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی ان لوگوں کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بہت کھاتے پیتے اور امیر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں عالیہ دور بیٹھی اندازے لگا رہی تھی کہ ٹیبل پر بیٹھے باقی لوگوں کے ساتھ لڑکی کا کیا رشتہ ہو سکتا تھا وہ یقیناً" اپنے والدین اور بھائی کے ساتھ ڈنر کرنے آئی تھی۔ وہ سب کے سب لوگ بہت ڈیشنگ پرسنالٹی کے مالک تھے ساتھ بیٹھا لڑکا تو اتنا ہینڈسم تھا کہ عالیہ اسے بھی بنا پلکیں جھپکائے دیکھے گئی۔

"کیا ہوا میڈم۔ کن سوچوں میں گم ہیں آپ؟" فرہاد نے اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

"فرہاد' ایک دم سے مڑ کر مت دیکھیے گا۔ آپ کے پیچھے جو فیملی بیٹھی ہے نا میں انہیں دیکھ رہی ہوں۔"

"اف۔ اتنی حسین لڑکی میں نے تو آج تک نہیں دیکھی۔"

"اچھا۔ مگر میں نے تو ہمیں دیکھی ہے۔ میرے سامنے بیٹھی ہے۔" فرہاد شرارت کے موڈ میں تھے۔

"ہو نوہ فرہاد۔ میں سیریس ہوں مجھے یہ لڑکی صفی کے لیے ایک دم پرفیکٹ لگ رہی ہے اتنے دنوں سے میں ایسی ہی کسی لڑکی کی تلاش میں ہوں۔ مجھے لگتا ہے آج میری تلاش ختم ہوگئی ہے۔" عالیہ بے تابی سے کہہ رہی تھی۔

"کیا مطلب۔ ذرا آرام سے۔ کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

"میں ان کی ٹیبل پر جا رہی ہوں۔ بات کر کے دیکھتی ہوں۔ ہو سکتا ہے کام بن جائے لڑکی اتنی زبردست ہے کہ میں ایک کوشش کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔" عالیہ اٹھنے کو تھی۔

"ارے۔ ارے ذرا تھمو۔ پاگل تو نہیں ہوگئی ہو۔ پتا نہیں کس قسم کے لوگ ہیں کس طرح ری ایکٹ کریں گے۔ اگر برا مان گئے تو۔" فرہاد نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

"اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے میں بہت سلیقے سے بات کروں گی آپ فکر نہ کریں۔ کچھ نہیں ہوگا۔" عالیہ اٹھ کر اس طرف چلی گئی۔

"السلام علیکم!" عالیہ نے سلام کیا تو سب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"وعلیکم السلام۔ جی فرمایئے؟" گریس فل سی وہ خاتون جو شاید اس پیاری لڑکی کی ماں تھیں عالیہ سے پوچھ رہی تھیں۔

"جی کیا میں دو منٹ آپ سے بات کر سکتی ہوں؟ اگر آپ کی اجازت ہو تو۔"

"اوکے۔ مگر آپ ہیں کون؟ کیا اس سے پہلے ہماری ملاقات ہوئی ہے۔"

"جی نہیں۔ ہم پہلی بار مل رہے ہیں' مگر مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے پلیز۔ مائنڈ مت کیجیے گا۔"

"جی کہیے۔" خاتون سمیت سب کی آنکھوں میں الجھن سی تھی۔

"یہ۔ آپ کی بیٹی ہے نا ماشاءاللہ بہت پیاری ہے اتنی پیاری کہ میں اپنی ٹیبل سے اٹھ کر یہاں تک آنے پر مجبور ہوگئی۔ دراصل میں آج کل اپنے بھائی کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی ہوں۔ میرا بھائی امریکا میں رہتا ہے وہ وہاں ڈاکٹر ہے۔" عالیہ کے انداز میں تفاخر سا تھا اسے امید تھی کہ امریکا کا نام سن کر اور یہ جان کر کہ لڑکا ڈاکٹر ہے وہ لوگ اس کے پرپوزل پر ضرور غور کریں گے اس نے دوبارہ بات شروع کی۔

"وہ وہیں رہتا ہے اور شادی کے بعد اپنی بیوی کو بھی اپنے ساتھ رکھے گا کیا آپ ایک بار میرے بھائی سے ملنا پسند کریں گی وہ بہت گڈ لکنگ ہے آپ کی بیٹی اور میرے بھائی کی جوڑی بہت شاندار لگے گی اگر آپ مجھے اپنے گھر کا ایڈریس دے دیں تو میں اور میری فیملی آپ لوگوں سے ملنے آپ کے گھر آجائیں۔" عالیہ بہت اعتماد سے بات کر رہی تھی۔

"بس یا آپ کچھ اور کہنا چاہیں گی؟" خاتون کے لبوں پر ایک غیر مفہوم سی مسکراہٹ تھی۔

"بیٹھ کر بات کریں یا آپ کھڑے کھڑے ہی میرا جواب سننا پسند کریں گی؟"

"نہیں بس ٹھیک ہے۔"

"اوکے اب ایسا ہے کہ آپ کی پوری بات میں نے سن لی ہے۔ بیچ میں آپ کو بالکل نہیں ٹوکا تو اصولاً آپ کو بھی میری پوری بات سننی چاہیے بغیر کسی انٹرپشن کے۔ پہلی بات تو یہ کہ محترمہ آپ کو کسی نے تمیز نہیں سکھائی کہ اس طرح راہ چلتے لوگوں کو پرپوزل نہیں دیا کرتے اور دوسری بات یہ کہ آپ کا بھائی امریکا میں رہتا ہے وہاٹ ایور کہ وہ کیا کرتا ہے وہاں ڈاکٹر ہے یا ڈرائیور یہ بات آپ کے لیے بہت اہم ہوگی کہ وہ امریکا میں رہتا ہے ہمارے لیے یہ کوئی بہت خاص بات نہیں ہے کیوں کہ ہمارے لیے امریکا اور یورپ ایسے ہی ہیں جیسے ایک شہر سے دوسرے شہر جانا ہم چھ ماہ یہاں ہوتے ہیں تو چھ ماہ یورپ اور امریکا میں۔ اور یہ لڑکا۔ یہ بائے برتھ امریکن ہے اور میرا ہونے والا داماد بھی۔ کچھ سمجھ میں آیا آپ کے۔" اس عورت کا انداز لب و لہجہ سب اتنا تحقیر آمیز تھا کہ عالیہ کے لیے کچھ بولنا تو دور کی بات نظر اٹھانا بھی مشکل ہو گیا۔

"اب آپ یہاں سے تشریف لے جائیے اور آئندہ کے لیے محتاط رہیے اس طرح سرِراہ اجنبی لوگوں سے اس قسم کی باتیں نہیں کی جاتیں اگر آپ کو مینرز ہوتے تو بولنے سے پہلے ضرور سوچتیں۔" اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے بڑی دقت سے وہ اپنے ٹیبل تک پہنچی تھی فرہاد اس کے چہرے کو دیکھ کر سمجھ گئے تھے کہ معاملہ گڑبڑ تھا انہوں نے کچھ پوچھنے سے بہتر یہاں سے جانا سمجھا تھا گاڑی میں بیٹھتے ہی عالیہ کے اندر ابلتا ذلت کے احساس کا لاوا آنسوؤں کی صورت میں بہہ نکلا تھا۔ فرہاد چپ چاپ گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے اور وہ بس روئے جا رہی تھی اس قدر توہین آمیز رویہ تھا اس عورت کا کہ عالیہ کو برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا اتنی انسلٹ ہو گی یہ تو اس نے سوچا بھی نہ تھا وہ تو بڑے زعم سے بات کرنے گئی تھی مگر اس کا سارا زعم مٹی میں مل گیا تھا بھلا یہ کوئی ایسی بات تو نہ تھی کہ اسے اتنا ذلیل کیا جاتا سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔

"جاہل، بدتمیز، ال مینرڈ۔ بڑی آئی مجھے مینرز سکھانے والی۔" وہ بڑبڑائی تو فرہاد کو بھی پوچھنے کا حوصلہ ہوا سارا ماجرا سن کر فرہاد کو غصہ بھی آیا اور ہنسی بھی آئی، مگر اس وقت ہنسنا اپنی شامت بلوانا ہوتا سو انہوں نے عالیہ کو ہی تسلی دلاسے دینا مناسب سمجھا تھا۔

"چھوڑو یار۔ دنیا میں ہر رنگ کے لوگ پائے جاتے ہیں ضروری تھوڑی ہے لوگ جیسے بظاہر نظر آتے ہیں حقیقت میں بھی ویسے ہی ہوں بظاہر کتنے سلجھے ہوئے پڑھے لکھے لگ رہے تھے، مگر دیکھو۔۔۔ کتنے بدتمیز اور بداخلاق نکلے یہ بات اخلاق سے بھی کی جا سکتی تھی۔ اس کے لیے اتنی بکواس کرنے کی کیا ضرورت تھی مگر کیا کیا جا سکتا ہے تم اپنا دل چھوٹا مت کرو مٹی ڈالو ان لوگوں پر۔ صفی کے لیے لڑکیوں کی کوئی کمی تھوڑی ہے۔"

"پتا نہیں۔ صفی کے نصیب کی لڑکی کہاں ملے گی۔ مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ کیا کروں آخر۔" عالیہ اس وقت بہت مایوس نظر آرہی تھی۔

"لڑکی تو آس پاس ہی ہے تم ہی کو نظر نہیں آرہی۔"

"کیا مطلب۔۔۔ کس کی بات کر رہے ہیں کہیں آپ بھی تو شاریہ کے ہمنوا نہیں بن گئے۔" عالیہ کے تیور بگڑے۔

"شاریہ کا نہیں۔۔۔ صفی کا ہمنوا۔" فرہاد گہرے لہجے میں بولے۔

"صفی۔۔۔؟ کیا صفی نے آپ سے کوئی بات کی ہے؟"

"وہ بے چارہ کب کوئی بات کرتا ہے، مگر اس کی چپ سارے راز افشا کر دیتی ہے تم تو اس کی سگی بہن ہو عالیہ، تم تک اس کے دل کی آواز کیوں نہیں پہنچی وہ چاہتا ہے اس لڑکی کو۔ کیا بھلا سا نام ہے اس کا صلہ۔ ہاں صلہ کو۔ مگر صرف تمہاری خاطر وہ اپنی چاہت کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ تم پر جو کچھ بھی گزری مجھے سب علم ہے لیکن، میری محبت میرے خلوص نے اب تک تمہیں وہ سب کچھ بھلا نہیں دیا ہے یا تم اب بھی۔۔۔"

فرہاد کے لہجے میں کچھ ایسا تھا۔ عالیہ تڑپ گئی۔
"نہیں فرہاد۔ بخدا نہیں۔ نہ مجھے آپ کے خلوص پر شبہ ہے اور نہ آپ کی محبت میں کوئی کمی ہے بس ایک احساس ٹھکرائے جانے کا وہ احساس میرا پیچھا نہیں چھوڑتا ورنہ آپ کا اور اس مخلص کا کوئی مقابلہ نہیں ہے اگر مجھے جو اس دی جاتی کہ آپ دونوں میں سے کس کا انتخاب کروں تو میں یقیناً" آپ کو منتخب کرتی۔ پلیز میرا یقین کریں۔"
"مجھے یقین ہے میری جان۔ میں تم پر شک نہیں کررہا۔ میں تو صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ بھول جاؤ پرانی باتوں کو اتنی چھوٹی سی زندگی ہے یار۔ کتنا اچھا ہو کہ ہم اس زندگی کو بغض اور کینے کے بغیر گزاریں۔ خوش رہیں اور لوگوں میں خوشیاں بانٹیں۔ یقین کرو بڑا سکھ ملتا ہے جب ہماری ذات کسی کے لیے خوشی کا سبب بنتی ہے تم ایک بار یہ تجربہ کرکے تو دیکھو۔ گارنٹی دے رہا ہوں اتنا مزا آئے گا کہ تم موقعے تلاش کروگی لوگوں کو خوش کرنے کے لیے۔" ایسا دلاویز انداز تھا فرہاد کا کہ عالیہ کو لگا کہ دھول سے اٹے اس کے وجود میں کہیں کوئی روزن نمودار ہوگیا ہے اور اس روزن سے جھانکتی روشنی کی ایک ننھی سی لکیر نے اندھیرے کا سینہ چاک کردیا ہے۔ اس کے لبوں پر آج جو مسکراہٹ تھی فرہاد نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

☼ ☼ ☼

"مسلہ آخر کب تک ماں کے لیے امتحان بنی رہوگی۔ چاہتی کیا ہو؟" آمنہ اس وقت واقعی غصے میں تھیں۔
"امی پلیز۔ مجھے تھوڑا وقت اور دے دیں پھر آپ جیسا کہیں گی میں کرلوں گی۔"
"مجھے پتا ہے تمہیں کتنا وقت درکار ہے۔ تم صرف صفی کی شادی کا انتظار کررہی ہو نا' ہوجائے گی اس کی شادی۔ اب تو وہ آگیا ہے اور ظاہر ہے شادی کرکے ہی جائے گا۔" راحیلہ آئی تھیں بتارہی تھیں کہ صفی کے لیے لڑکیاں دیکھی جارہی ہیں آج کل میں کہیں نہ کہیں نسبت ٹھہر جائے گی۔ تم کیوں خود کو سزا دے رہی ہو۔ دیکھو چندا۔ تمہارے بھائی نے جو کچھ ان کے ساتھ کیا اس کے بعد ان سے خیر کی توقع رکھنا بے کار ہے بھابھی جان تو بے چاری ٹوٹے رشتے جوڑ بھی لیں' مگر عالیہ۔ وہ کبھی ایسا نہیں ہونے دے گی جبکہ صفی نے سارا اختیار بھی اسے دے رکھا ہے سوچو میری بچی۔ تم کس چیز کا انتظار کررہی ہو۔" انہوں نے بہت کرب سے بیٹی کے جھکے سر کو دیکھا۔
"کسی انہونی کا۔ شاید۔ شاید کہ کوئی انہونی ہوجائے۔" اس نے صرف سوچا تھا۔
"اب کچھ بولتی کیوں نہیں ہو۔"
"کیا بولوں امی۔ آپ سب کچھ تو جانتی ہیں۔ پھر مجھ سے کیا سننا چاہتی ہیں" وہ بے بسی سے بولی۔
"صرف اقرار اس رشتے کے لیے جو راحیلہ تمہارے لیے لائی تھیں۔" امی قطعیت سے بولیں۔
"مگر امی۔"
"بس بہت ہوگئی اگر مگر۔ میں تو صفی سے پہلے تمہاری شادی کردینا چاہتی تھی' لیکن تمہارے لاحاصل انتظار کی وجہ سے اتنا وقت گزر گیا۔ تمہاری آس آس ہی رہی نا۔ نہ پہلے کچھ حاصل ہوا نہ اب ہوگا اس لیے میں نے سوچ لیا ہے کہ صبح ہوتے ہی راحیلہ کو فون کردوں گی۔ دو چار دنوں میں ہی یہ معاملہ نبٹ جائے تو اچھا ہے۔ چلو اب اٹھ جاؤ عشاء کی نماز پڑھ کر انصار کے کپڑے استری کردینا۔ بہو بیگم تو میکے جاکر بیٹھ ہی گئی ہیں نہ گھر کی فکر ہے نہ شوہر کا خیال اور بیٹے صاحب ہیں کہ پھر بھی فریفتہ ہیں۔" امی بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئیں وہ وہیں بیٹھی پلکیں جھپک جھپک کر آنسوؤں کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش میں ہلکان ہوتی رہی۔
"کاش ابا آپ اتنی جلدی دنیا سے نہ گئے ہوتے یا پھر۔ تایا جی ہی زندہ ہوتے آپ میں سے کوئی ایک بھی ہوتا تو اس خاندان کو اس طرح ٹوٹنے نہ دیتا مگر۔ ایک کے پیچھے دوسرے کو جانے کی کتنی جلدی تھی۔ دیکھیے نا رشتے کس طرح ٹوٹ کر بکھر گئے ایسا طوفان

آیا کہ سب کو تنکے کی طرح بہا کر لے گیا۔" وہ گھٹنوں میں سر دیے کر سسک پڑی تھی۔

طوفان تو واقعی آیا تھا اور اس طوفان کے بعد باقی سب تو کنارے لگ گئے تھے انصار۔۔۔ اس کا اپنا ماں جایا جس نے صرف اپنی خوشی کی خاطر خود غرضی کا مظاہرہ کیا ایک لمحے کے لیے بھی بہن کے بارے میں نہ سوچا کہ اس کا مستقبل کیا ہو گا اس کے اس اقدام کے بعد صفی کبھی بھی اسے نہیں اپنائے گا اور وہی ہوا تھا اور عالیہ۔۔۔ شادی کر کے گھر بسا کے بھی اس کے دل کی کدورت نہ گئی تھی۔ سب پرسکون تھے ایک وہی تھی جس کی زندگی میں یہ طوفان ایسا آکر ٹھہرا تھا کہ وہ منہ زور لہروں سے لڑتے لڑتے تھک گئی تھی پتا نہیں اس کے نصیب میں ساحل کا سکھ تھا بھی کہ نہیں۔

☼ ☼ ☼

"کہاں غائب ہو عالیہ۔۔۔ تین دن سے نہ خود آئی ہو نہ فون کیا ہے طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟؟"

"جی امی۔ ٹھیک ہوں۔ آج مجھے آنا تھا اچھا ہوا آپ نے فون کر لیا میں بس تھوڑی دیر میں آ رہی ہوں مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

"اچھا۔ چلو پھر آجاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔" ان گزرے ہوئے تین دنوں میں عالیہ صرف اپنا احتساب کرتی رہی تھی اس کے ساتھ جو بھی ہوا سو ہوا انصار نے اسے جو بھی زخم لگایا تھا اس کا مداوا تو بہت پہلے ہو گیا تھا فرہاد کی شکل میں اللہ نے اسے بہترین انعام سے نوازا تھا' مگر بدلے میں اس نے کیا کیا تھا بجائے اس انعام پر خدا کا شکر گزار ہونے کے وہ آج تک شکوہ شکایت کرتی آئی تھی' معاف کر دینے کا ہنر شاید اس نے سیکھا ہی نہیں تھا' لیکن اب جبکہ دل و دماغ پر چھائی گرد چھٹی تھی تو سب کچھ آئینے کی طرح صاف ہو گیا تھا اور اس آئینے میں وہ اپنے بھائی کو دیکھ رہی تھی جس کی آنکھوں کی لو ماند پڑی ہوئی تھی اس سے پہلے اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا ان آنکھوں کی چمک دمک لوٹ سکتی تھی اگر صلہ کی محبت کا چراغ روشن ہو جاتا اس دیے کو جلانے کا ارادہ کیا تو عالیہ کو اپنے اندر بھی روشنی سی پھوٹتی محسوس ہوئی تھی۔

"چلیں امی۔ ایک لڑکی میں نے پسند کر لی ہے اور آج ہم سب ساتھ چل رہے ہیں۔ صفی تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔ جلدی سے ریڈی ہو جاؤ۔" عالیہ نے آتے ہی ہڑبونگ مچا دی تھی۔

"میں جا کر کیا کروں گا عالیہ آپی' بس آپ لوگ ہو آئیے۔"

"جی نہیں۔ آپ ہمارے ساتھ چل رہے ہیں۔ کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ آئی سمجھ۔"

"ہاں یار۔ اٹھ جاؤ۔ اللہ اللہ کر کے تو تمہاری بہن کو لڑکی پسند آئی ہے چلے چلو فائدے میں رہو گے ورنہ یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔" فرہاد کے ذو معنی جملے پر عالیہ نے انہیں گھور کر دیکھا سب جانتے تھے کہ وہ لوگ کہاں جا رہے ہیں سوائے صفی کے' شاریہ کی تو خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا جب عالیہ نے چپکے سے امی اور اسے صلہ کے گھر جانے کا بتایا تھا یہ کایا پلٹ کیسے ہوئی تھی شاریہ حیران تھی اور جاننا بھی چاہتی تھی' مگر عالیہ نے فی الحال یہ کہہ کر اسے ٹال دیا تھا کہ وہ سب کچھ بعد میں بتائے گی۔ عالیہ نے یہاں آنے سے پہلے راحیلہ پھپھو کو فون پر بتا دیا تھا کہ وہ لوگ صلہ کے گھر جا رہے ہیں ان کے دل کو بھی سکون آگیا تھا وہ صلہ کے دل کا حال اچھی طرح جانتی تھیں کئی بار انہوں نے کوشش بھی کی تھی کہ ٹوٹے رشتے پھر سے جڑ جائیں' مگر عالیہ نے ہر بار ان کی کوششوں پر پانی پھیر دیا تھا اور اب عالیہ نے ہی انہیں یہ خوشخبری سنائی تھی وہ بھی اس معجزے پر حیران تھیں' مگر بے انتہا خوش بھی تھیں آمنہ بھابھی نے جب یہ سنا تھا تو کئی لمحوں تک کچھ بول ہی نہیں سکی تھیں۔ صلہ کا انتظار جسے وہ لاحاصل سمجھتی رہی تھیں اس انتظار کا صلہ کو ایسا صلہ ملے گا انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

"بس بھابھی۔۔۔ صلہ کو ابھی کچھ نہ بتائیے گا صفی کو بھی کچھ نہیں معلوم ہے عالیہ ان دونوں کو سرپرائز دینا چاہتی ہے۔ بس صلہ سے کہیے گا خوب اچھی طرح تیار

ہو جائے صفی بہت عرصے بعد اس سے ملے گا نا۔"

"ٹھیک ہے میں اسے کچھ نہیں بتاؤں گی کوشش کروں گی کہ وہ تیار ہونے پر راضی ہو جائے تم تو جانتی ہو اسے اب ان چیزوں کا کہاں شوق رہا ہے میری بچی بے چاری تو مرجھا کر رہ گئی۔ مگر شکر ہے مولا کا یہ سخت دن بھی آخر گزر ہی گئے۔ اچھا خیر۔ مجھے مشورہ دو کہ بہو بیگم کو میکے سے بلوالوں یا ابھی رہنے دوں؟"

"ارے نہیں بھابھی۔ ابھی فی الحال وہیں رہنے دیں کہہ دیجیے گا کہ وہ لوگ اچانک آئے تھے بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔"

"میں کب سے کہہ رہی ہوں صلہ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ راحیلہ ان لوگوں کو لے کر آتی ہی ہوں گی۔ آخر تم سنتی کیوں نہیں ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں امی۔ اور کیا تیاری کروں؟" وہ بے دلی سے بولی۔

"فضول باتیں مت کرو صلہ۔ اس مریل سے رنگ کے کپڑوں میں ان لوگوں کے سامنے جاؤ گی جو سوٹ میں نے نکال کر دیا ہے جا کر وہ پہنو اور خدا کے لیے اپنے چہرے سے یہ بے زاری ہٹاؤ کیا سوچیں گے وہ لوگ۔"

"میری بلا سے جو سوچنا ہے سوچیں۔" اس نے بددلی سے سوچا اور امی کی خاطر کپڑے چینج کرنے چلی گئی۔

جن رستوں پر گاڑی چل رہی تھی وہ اسے کچھ جانے پہچانے سے تو لگ رہے تھے مگر چار سالوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا پھر بھی پتا نہیں کیوں اسے لگ رہا تھا کہ وہ ان رستوں پر پہلے بھی سفر کر چکا ہے جو بھی تھا اس سارے معاملے سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی وہ تو بس دوسروں کی خوشی کے لیے یہ سب کر رہا تھا جس کے لیے اس نے اپنے دل کو بڑے جتن سے راضی کیا تھا سفر تمام ہوا تو وہ اپنی سوچوں سے باہر آیا تھا۔

گاڑی جس گھر کے آگے رکی تھی اس گھر کو تو وہ ہزاروں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ یہ تو صلہ کا گھر تھا وہ گھر جہاں اس کی زندگی بستی تھی اس نے کچھ حیرانی کچھ بے یقینی سے سب کی جانب دیکھا تھا۔

"آجاؤ صفی۔ یہیں رہتی ہے وہ لڑکی جس سے تمہاری شادی ہوگی۔" عالیہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"مم۔ مگر۔ آپی۔" وہ مزید کچھ نہ بول سکا دروازہ چچی نے کھولا تھا راحیلہ پھپھو بھی وہیں موجود تھیں برسوں کے بچھڑے ملے تھے آنکھوں میں نمی مگر چہروں پر مسکراہٹ تھی وہ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے صفی کی نظریں بے چینی سے اس چہرے کو کھوج رہی تھیں جسے دیکھے لگتا تھا صدیاں بیت گئی ہیں۔

"چچی۔ صلہ کدھر ہے ہم جا کے صلہ سے مل لیں؟" شاریہ سے بھائی کی بے چینی کیسے چھپ سکتی تھی۔

"ہاں۔ ہاں جاؤ مل لو اس بے چاری کو تو پتا بھی نہیں ہے کہ آج اس گھر میں کون آیا ہے۔ عالیہ کے سرپرائز کی وجہ سے اسے لاعلم رکھا گیا ہے اور اس سے اچھا سرپرائز کیا ہوگا کہ صفی خود اس کے سامنے چلا جائے کیوں بھابھی۔ آپ کی اجازت ہے؟" راحیلہ نے پوچھا تو آمنہ نے محبت سے صفی کو دیکھا اور اثبات میں گردن ہلا دی۔

وہ کچن میں کھڑی ہلتوں میں کھانے پینے کی چیزیں نکال رہی تھی۔ صفی نے اس کی پشت پر لہراتی خوب صورت چوٹی کو دیکھا اور ہلکا سا کھنکھارا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور ہاتھ میں پکڑی چیزیں فرش پر بکھر گئیں۔

"آ۔ آپ"

"شش۔ کچھ مت کہو۔ پہلے مجھے یقین کر لینے دو کہ یہ حقیقت ہے ہزاروں بار کا دیکھا ہوا کوئی خواب نہیں ہے۔" صفی کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی تھی وہ دھیرے دھیرے چلتا اس کے قریب آ گیا تھا وہ اسے چھوتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ اگر یہ خواب ہے تو ٹوٹ جائے گا مگر یقین بھی کرنا چاہتا تھا کہ یہ واقعتاً کوئی خواب نہیں ہے وہ سچ مچ اس کے روبرو تھی اپنی تمام تر دلربائی کے ساتھ گو کہ وہ پہلے سے کافی بدل گئی تھی۔ وہ آنکھیں جو ہیرے کی طرح دمکتی تھیں ان میں

سوگواری کا بڑا گہرا تاثر تھا مگر اس تاثر نے ان آنکھوں کی دلکشی میں اضافہ کیا تھا۔

"صلہ۔" صفی نے اس کے ٹھنڈے یخ ہاتھ تھام لیے۔

"میں آگیا ہوں۔ شاید تم نے بڑی شدت سے مجھے پکارا ہوگا تب ہی تو دیکھو یہ انہونی ہو گئی ہے ورنہ مجھے تو یہی لگتا تھا کہ یہ زندگی تمہارے بغیر گزرے گی اور کیسی گزرے گی میں یہ تصور بھی نہیں کرپاتا تھا۔ تم۔۔ تم کچھ نہیں کہو گی۔" وہ جھک کر اس سے پوچھ رہا تھا وہ کیا کہتی۔ الفاظ تو جیسے کہیں گم ہو گئے تھے بس اس کی آنکھیں برس پڑی تھیں۔

"صفی۔۔ کتنی بری بات ہے اتنے عرصے بعد ملے ہو اور بے چاری کو رلا رہے ہو۔" عالیہ کچن میں داخل ہوتے ہوئے بولی اس نے جلدی سے صفی کے ہاتھوں میں جکڑے اپنے ہاتھ کھینچے عالیہ اس کے قریب چلی آئی۔

"اوہوں۔ آج تو خوشی کا دن ہے اور تم رو رہی ہو۔ بس میری جان رونے دھونے کے دن تمام ہوئے میرے صفی کی دلہن بننے کے بعد ہمیشہ ہنستی رہنا۔" عالیہ نے اس کے آنسو صاف کیے اور اسے اپنے سینے سے لگالیا۔

"اور مسٹر چلو تم یہاں سے نکلو۔ زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے آج سے یہ تم سے پردہ کرے گی جب تک تم دونوں کی شادی نہیں ہو جاتی۔"

"مگر آپی۔۔ آج ہی تو دیکھا ہے اور آج سے ہی پردہ؟" صفی کے احتجاج پر عالیہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

"زیادہ بے صبرا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس کچھ دن کی بات ہے جہاں اتنا صبر کیا ہے وہاں کچھ دن اور نہیں کرسکتے۔"

"صبر کا صلہ اتنا شاندار ہو تو کیوں نہیں کرسکتا۔ بالکل کرے گا۔ کیوں صفی؟" فرہاد بھی وہیں آگئے تھے پیچھے پیچھے شاریہ بھی چلی آئی وہ سب لوگ اسے صفی کے نام سے چھیڑ رہے تھے اس کے چہرے کی زردی میں گلابیاں کھلیں تو صفی کے لیے اس پر سے نظر ہٹانا مشکل ہو گیا تھا وہ چہرہ جو کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس کے تصور سے جدا نہیں ہوا تھا وہ اب حقیقت میں مقابل تھا اور یہ حقیقت دنیا کی ہر سچائی سے زیادہ خوب صورت تھی۔

☆ ☆

حیا مجتبیٰ

اس نے ایک گہری نگاہ شیشے کے اس پار نظر آنے والے منظر پر ڈالی۔ زمین ابھی بھی بہت دور تھی اور زمین پر بلند و بالا عمارات اس وقت ننھے منے بلاکس کی مانند نظر آ رہی تھیں۔ اس نے نگاہیں شیشے سے ہٹا کر دوبارہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی۔

لحہ بہ لحہ وہ اپنی منزل کے قریب ہوتی جا رہی تھی اور اتنی ہی تیزی سے اس کی بے زاری میں اضافہ جبکہ وہ کسی غیر جگہ تو نہیں جا رہی تھی۔ اس کی منزل اس کا ددھیال تھی۔ اس کے خونی رشتے اس کے جان سے پیارے بابا سے وابستہ لوگ اور یادوں سے سجا گھر،

ناولٹ

مگر نہ جانے کیوں اس بار وہاں جاتے ہوئے اسے خوشی کی جگہ دل میں کانٹے سے چبھتے محسوس ہو رہے تھے۔

اسے رہ رہ کر اپنی پاپا پہ بھی غصہ آ رہا تھا جنہیں بیٹھے بٹھائے نہ جانے کیا سوجھی۔ ایک پل کے لیے بھی انہوں نے اس کے متعلق نہ سوچا تھا جس گھر میں اس کی ماں کو عزت نہ مل سکی اس کی ماں اپنی جگہ نہ بنا سکی اس کا باپ اپنا حق نہ لے سکا وہ بھلا اس کی کیا عزت کریں گے یا اس کا حق کیسے تسلیم کریں گے۔ پریشانی سے اس کے سر میں درد ہونے لگا۔ وہ آنکھیں موند کے اپنا بچپن سوچنے لگی۔

بچپن میں وہ ہمیشہ اپنے بابا کے ساتھ بہت خوش ددھیال جایا کرتی۔ بابا اور اپنے علاوہ اس نے اپنی ماں کو کبھی وہاں جاتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بے حد اصرار کرتی مگر اس کی ماں ہمیشہ اسے ٹال دیتی پھر بابا کے ساتھ ویسے بھی وہ اپنی ماں کی کمی کم ہی محسوس کرتی۔ لیکن ہمیشہ جب وہ اپنی ماں کے اپنے ددھیال نہ جانے کا سوچتی تو اسے اپنے ددھیال والے ہی قصوروار نظر آتے۔ اسے لگتا اس کی ماں وہاں نہ جا کر بالکل ٹھیک کرتی ہے۔

پشاور تک کا سفر اسے گاڑی میں طے کرنے میں بڑا مزا آتا۔ دادی اس سے بے حد پیار کرتیں جب بھی وہ ابو کے ساتھ وہاں جاتی بھاگ کے برآمدے میں پڑے تخت پہ بیٹھی تسبیح پڑھتی دادو کی گود میں جا بیٹھتی تو ابو اسے اکثر جوتوں سمیت تخت پر چڑھ جانے پہ ڈانٹ دیتے۔ وہ منہ بسورنے لگتی اور تب ابو کو دادو جھڑک کے خاموش کرا دیتیں۔ حالانکہ یہی حرکت اگر زینیا کرتی تو انہیں سخت کوفت ہوتی۔ تو ویسے ہی تایا جان بھی اس پہ جان لٹاتے تھے۔ اسے سیر کرانے لے جاتے۔ زینی اور ارتضیٰ پیدل چلتے مگر وہ ان کی گود میں ہی سوار رہتی۔ مقتدیٰ سے وہ زیادہ فری نہ تھی کیونکہ وہ بہت سنجیدہ قسم کا لڑکا تھا۔ ہر وقت کتابوں میں مگن رہنے والا اور تائی جان۔۔۔ پتا نہیں کیوں اسے ہمیشہ ان سے عجیب سا کھنچاؤ ہوتا وہ چاہ کر بھی ان سے بہت زیادہ بے تکلف نہ ہو پاتی کیونکہ ان کا رویہ ہمیشہ اس کے ساتھ سرد رہتا۔ آہستہ آہستہ اسے ان کے اس سرد رویے کی وجہ بھی سمجھ آ گئی۔ انہیں دراصل اس کی ذات سے نہیں بلکہ اس کی ماں سے چڑ تھی۔ تائی جان بابا اور تایا جان کی غیر موجودگی میں دادو کو بار بار اس کی ماں کا حوالہ دیتیں، طنز کرتیں ان کی برائی کرتیں اور اس کے

لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ بات تو یہ تھی کہ اتنی محبت کرنے والی دادو بھی ان کے سامنے ایک لفظ نہ بول پاتیں۔ ان کی انہی بے زار باتوں اور سخت رویے سے دلبرداشتہ ہو کے ابو ہمیشہ وہاں سے جلدی واپس ہو لیتے۔

دس سال کی چھوٹی سی عمر میں اس کے معصوم ذہن میں سوال پیدا شروع ہوئے تو وہ بلا جھجک ماں سے پوچھ لیتی۔ تب نانو نے اسے بتایا کہ چونکہ اس کے باپ نے اس کی ماں سے پسند کی شادی کی ہے اور چونکہ اس کا ددھیال اس کے ننھیال کی نسبت زیادہ امیر ہے تو اس لیے اس کے بابا اور امی کو ان کے گھر والے زیادہ پسند نہیں کرتے۔ تب آہستہ آہستہ اسے اچھی طرح سمجھ میں آگیا کہ اس کی ماں اس گھر جانے سے کیوں کتراتی ہیں۔ رفتہ رفتہ اس نے بھی بابا کے ساتھ وہاں جانا چھوڑ دیا تھا۔

اور جب اس کے باپ کی اچانک وفات ہو گئی تو وہ منتظر ہی رہی کہ اس کے پیاروں میں سے کوئی آئے اور اسے اپنی مضبوط پناہوں میں سمیٹ لے۔ وہ تایا جان

کی ہر لمحہ منتظر رہی کہ وہ اپنے بھائی کے جنازے میں ضرور شریک ہوں گے مگر وہ نہ آئے۔ اس کے باپ کا جنازہ اٹھ گیا۔

اور پھر ٹھیک چار روز بعد اس نے اپنی دادو اور تایا جان کو بیٹھک میں بیٹھے دیکھا۔ وہ اسی وقت کالج سے آئی تھی۔ وہ ان کی ایک جھلک دیکھ کے ہی نفرت سے رخ پھیر کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

"جیا! تمہاری دادی اور تایا کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ فریش ہو کر بیٹھک میں آجاؤ۔" ماں نے اسے کتنے نرم لہجے میں تاکید کی تھی۔ مگر اس نے ان سے ملنا گوارا نہ کیا۔ وہ یونیفارم بدل کر اپنی سہیلی کے گھر چلی گئی اور تب تک وہیں رہی جب تک وہ لوگ واپس نہیں چلے گئے۔

"کیا ہوتا اگر تم ان سے مل لیتیں۔" امی نے واپسی پہ اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"کیوں مل لیتی۔" بنو نے اسے خود سے لپٹا لیا۔ "جن لوگوں کو اتنی شرم نہ آئی کہ اپنی بیوہ بہو کے سر پر نہ سہی، اپنی یتیم پوتی کے سر پر ہی دوپٹا ڈال دیتے۔ اسے ساتھ لے جانے کا کہہ دیتے، بھلے جھوٹے منہ ہی سہی، مگر نہ، انہوں نے تم سے سیدھے منہ افسوس بھی نہ کیا۔"

"وہ لوگ اب یہاں کیوں آئے، آپ نے انہیں اجازت کیوں دی۔" سترہ سالہ نبا ہو بھڑکی۔

"تو کیا کرتی بیٹا، دوسرے شہر سے آئے تھے۔ بٹھانا تو مجبوری تھی۔ اب ہم ان کے جیسے تو نہیں ہیں۔" اب کی بار اس کی ماں نے نرم لہجے میں کہا تو وہ مزید کھول اٹھی۔

"تو بن جائیں نا ان جیسی، تب ہی انہیں بھی آپ کی قدر ہوگی۔ نہ کیا کریں ان کی خوشامدیں، اگر انہوں نے آپ کو بہو تسلیم کیا ہوتا تو آج آپ اپنے گھر میں ہوتیں اور پاپا اپنے شہر سے اتنی دور اپنی زندگی کی بازی نہ ہارتے۔"

"بیٹا ان ہی لوگوں کا بر تو کہا گیا تمہارے باپ کو۔ ورنہ ایسی بھری جوانی میں۔ گھر چھوڑ دیا خود دار نے مگر ان لوگوں کو اپنے دل سے نہ نکال سکا۔" تائو بیگم کہتے ہوئے بولیں اور اس نے دل ہی دل میں کبھی ان لوگوں کو معاف نہ کرنے کی قسم اٹھائی۔

وہ کتنا تڑپی تھی اس دن۔ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ اس کی خوب صورت براؤن آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ تھک کے اس نے سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔

"اور آج اتنے سالوں بعد دادو کو پھر اپنی پوتی یاد آگئی اور مما۔ میری سادہ لوح مما کہتی ہیں کہ میں ان کے پیار اور ان کے بیٹے "اپنے پاپا کی وراثت کی حق دار ہوں اور مجھے یہ حق خود لینا ہوگا۔ جو لوگ مما آپ کو قبول نہ کر سکے۔ وہ بھلا مجھے کیا قبول کریں گے۔ لیکن میں بھی ان ہی کا خون ہوں مما۔ آپ کو اپنا صحیح مقام اور پاپا کا حق ان سب سے چھین نہ لیا تو میں بھی نبا ہو نہیں۔" اس نے تلخی سے اپنی نم آنکھیں رگڑتے ہوئے دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔ جہاز لینڈ کر رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کے دل کی دھڑکنیں منتشر ہونے لگیں۔

اسے لینے ارتضیٰ آیا تھا۔ وہ دور سے ہی اسے پہچان گئی تھی۔ پورے بارہ برس بعد وہ اس شہر میں آئی تھی اور اس عرصے میں ارتضیٰ کافی بدل گیا تھا۔ وہ اسے ہرگز نہ پہچان پاتی۔ اگر اس نے وہ تختی نہ اٹھا رکھی ہوتی، جس پر سیاہ سیاہی سے موٹے حروف میں "ویلکم مائی میاؤں" لکھا تھا، بہت ساری دوسری یادوں کے ساتھ اسے یہ بات بھی اچھی طرح یاد تھی کہ ارتضیٰ اور زینی اسے ہمیشہ میاؤں میاؤں کہہ کر چڑایا کرتے۔ ان تینوں کی دوستی بھی بھلا بھلائی جا سکتی تھی۔ نبا ہو کے دل نے گواہی دی۔

"نہیں۔ وہ میرے دوست نہیں ہیں۔" اس نے سختی سے دل کی تردید کی۔

"میرے پاپا کا سکون تباہ کرنے والے، میری ماں کو قبول نہ کرنے والے میرے خونی رشتے، مجھے ان کی محبت نہیں چاہیے۔ مجھے بس اپنا اور اپنی ماں کا حق چاہیے۔" دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی وہ ارتضیٰ کے قریب گئی۔

"میں نبا ہو احمد۔" نرم سے لہجے پر ارتضیٰ اس کی

طرف متوجہ ہوا۔

"واؤ۔" سیٹی کے سے انداز میں لب سکوڑتے ہوئے وہ پرجوش ہوا۔

"تم کتنی بڑی ہوگئی ہو میاؤں اور پہلے سے زیادہ پیاری بھی۔" ارتضیٰ نے شرارت سے کہتے ہوئے آنکھ دبائی۔

"سچ میں گھر والے تو تمہیں دیکھ کر بے حد خوش ہوں گے۔ اسپیشلی مقتدی بھائی۔" اس کے دل کی دھڑکنیں منتشر ہوگئیں۔ لڑکپن کا پہلا پیار 'بھلے ہی وہ اس کا گلا دبا چکی تھی۔ مگر آج نہ جانے کیوں اسے محسوس ہوا کہ اس پیار کی سانسیں ابھی بھی چل رہی تھیں۔ وہ اسے مکمل طور پر نہ مار سکی تھی۔ اس نے تیزی سے سر جھٹکا۔

"اوہ سوری۔" اسے سر جھٹکتے دیکھ کر ارتضیٰ شرمندہ ہوا۔

"تم ابھی ابھی آئی ہو اور میں بجائے تمہیں گھر لے جانے کے ادھر ہی ہانکنے لگا۔ لاؤ لاؤ یہ سامان مجھے دو۔" وہ اس کو اپنی ہمراہی میں لیے گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"نو تھینکس۔ میں اپنا بوجھ خود اٹھا سکتی ہوں ارتضیٰ مہدی۔" لہجے میں تلخی سموئے وہ ارتضیٰ کو حیران کر گئی۔

"اب کیا چلنے کی زحمت کریں گے یا یہیں رہنا پڑے گا مجھ کو۔" اس نے کہتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولنا چاہا۔ ارتضیٰ بجھ سا گیا۔

"بیٹھ جاؤ ارتضیٰ، مجھے ویسے بھی دیر ہو رہی ہے۔" بھاری آواز اور بارعب لہجہ نباء کو چونکا گیا۔ اس نے سامنے دیکھا۔ گاڑی کی رائٹ سائیڈ پہ فرنٹ ڈور سے ٹیک لگائے مغرور سے انداز میں کھڑا وہ شخص بلاشبہ مقتدی مہدی ہی تھا۔ اس کی وجیہہ شخصیت وقت کے ساتھ مزید نکھری تھی۔ مقتدی نے اس پہ غلط نگاہ ڈالنے کی بھی زحمت نہ کی۔ ایک پل کے لیے تو اسے خود اپنے سخت الفاظ پہ خفت محسوس ہوئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے اسے دل میں نوازتی وہ پچھلی سیٹ سنبھال چکی تھی۔ بریف کیس سے کب گرفت چھوٹی اسے احساس تک نہ ہوا۔ اس کے بیٹھتے ہی مقتدی نے بھی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

ارتضیٰ بیٹھنے ہی لگا کہ مقتدی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے بھائی کو دیکھنے لگا۔

"محترمہ اپنا بوجھ باہر ہی بھول آئی ہیں شاید۔" ایک ایک لفظ چبا کر کہتے ہوئے وہ نباء کو جتا گیا۔ نباء ہونٹ چبا گئی۔ ارتضیٰ نے سامان اندر رکھا اور دوبارہ سے بھائی کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"داد بھی نا۔ پتا نہیں کس کس کا ڈرائیور بنا دیتی ہیں مجھے۔" بے زاری سے کہتے ہوئے مقتدی نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔ نباء کی آنکھوں میں چبھن سی اتری۔

✡ ✡ ✡

گھر کے اندر داخل ہوتے ہی اسے خوش گوار حیرت نے آگھیرا تھا۔ بلیک اینڈ وائٹ ماربل بلاکس سے بنی چوڑی روش کے دونوں طرف خوب صورت لان اس کا موڈ خوش گوار کر گیا۔ گیٹ کے ساتھ ہی کھلے گیراج سے لے کر گھر کی اندرونی عمارت تک خوب صورت پھولوں کی لمبی قطاریں اور نرم و ملائم آسٹریلوی گھاس' لان کی خوب صورتی کے ساتھ ساتھ گھر کی شان و شوکت کو بھی مزید چار چاند لگا رہی تھی۔ پرانے کمروں اور برآمدے کی جگہ ایک جدید اور خوب صورت عمارت نے لے لی تھی۔

"سما تو وہی ہے مگر گھر۔" اس کے لہجے میں خود بخود نرمی گھلی تو ارتضیٰ مسکرا دیا۔

"یہ سب مقتدی بھائی کا کمال ہے۔ پچھلے سال کی بارشوں میں گھر کو کافی نقصان ہوا تو بھائی نے مکمل طور پر اس کی شکل ہی بدل ڈالی۔" ارتضیٰ نے تفصیل بتائی۔

"تو تب ہی یہ پودے اتنے چھوٹے سے ہیں۔" اس نے انار اور دیگر چند پودوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں بس دو، تین پرانے درختوں کے علاوہ باقی سب کچھ عرصے پہلے ہی لگوائے ہیں بھائی نے۔ لیکن کافی جلدی گروتھ ہو رہی ہے۔" ارتضیٰ پرانی جون میں واپس آچکا تھا۔ نباء کو اچانک ہی مقتدی کا خیال آیا۔

"مقتدی۔" اس نے ارتضیٰ کے پیچھے جیسے اسے ڈھونڈا۔

"وہ تو باہر سے ہی واپس چلے گئے۔ آفس میں بہت کام ہوتا ہے۔" ارتضیٰ نے بتایا تو نہ جانے کیوں اس کا دل بجھ سا گیا۔

"ارے نابو۔" تب ہی اندر سے زینی دوڑتی آئی اور اس سے لپٹ گئی۔ نباء کا دل چاہا کہ دھکا دے کر اسے خود سے الگ کر دے۔ لیکن چاہ کر بھی وہ ایسا نہ کر پائی۔

"تم تو ہمیں بھول ہی گئیں۔ قسم سے یار کتنا مس کرتے تھے ہم تینوں بہن بھائی تمہیں۔" نباء کو تینوں کے لفظ پہ حیرت سی ہوئی۔

بھلا مقتدی بھی اسے یاد رکھ سکتا تھا۔ زینی مسلسل بولے جا رہی تھی۔ ارتضیٰ نے اس کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے زینی کو اشارہ کیا تو وہ بھی خاموش ہو گئی۔

وہ لاؤنج میں آئے تو سامنے ہی کارپٹ پہ تایا جان نماز پڑھتے نظر آئے۔ وہ اتنے سالوں بعد بھی پہلی نظر میں انہیں پہچان گئی تھی۔ ان کے نماز ختم کرنے تک وہ وہیں ٹھہرے رہے۔ تایا جان نے سلام پھیر کر جوں ہی نباء کو دیکھا۔ ان کے چہرے پہ بہت ہی خوب صورت مسکان پھیل گئی۔ نباء نے دیکھا وہ کافی کمزور ہو گئے تھے۔

"میرا بچہ آگیا۔" وہ فوراً" اس کے پاس چلے آئے اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ نباء کو لگا جیسے عرصے بعد اس کے بابا نے اسے اپنے سینے سے لگایا ہو۔ اس نے سکون سے آنکھیں موند لیں۔

"کیسا ہے میرا بیٹا؟ زیادہ تھک تو نہیں گئیں۔" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں۔ آئی ایم اوکے۔" عجیب سا روکھا پن تھا اس کے لہجے میں جو ارتضیٰ اور زینیا دونوں نے ہی واضح طور پہ محسوس کیا۔

"زینی بیٹا۔ نباء کو دادی کے پاس لے جاؤ۔ پھر اس کے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو۔ تھک گئی ہو گی۔" تایا جان نے بھی شاید محسوس کر لیا تھا اس کی اجنبیت کو۔ تب ہی فوراً" اس کے لیے آسانی پیدا کرتے ہوئے اسے نرمی سے خود سے الگ کرتے ہوئے زینی سے کہا۔

"جی ابو۔" زینی اسے ساتھ لیے دادو کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ لاؤنج سے ملحقہ یہ دوسرا کمرہ تھا جس کے ساتھ ہی گھومتی ہوئی سیڑھیاں اوپر کی طرف جا رہی تھیں۔ وہ اندر داخل ہوئے تو تائی امی، دادو کے پیر دبا رہی تھیں۔ نحیف سی دادو آنکھیں بند کیے جیسے سونے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"دادو۔ دیکھیں تو کون آیا ہے؟" زینی نے اس کو دادو کے قریب کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ دادو نے دھیرے سے آنکھیں کھول دیں۔

"نباء میری نابو۔" پل میں ان کی اداس آنکھوں میں خوشی سی چھلک پڑی۔ انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہیں۔ نباء ان کے پاس ہی جا بیٹھی۔ دادو نے اسے اپنی کمزور بانہوں میں لے لیا۔

"کیسی ہو نباء۔" تائی امی نے اسے خود ہی مخاطب کیا۔ نباء نے انہیں سلام کرنے کی بھی زحمت نہ کی تھی۔

"ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں۔" اس کے لہجے میں وہی روکھا پن تھا۔

"تم بیٹھو۔ دادو کے ساتھ باتیں کرو۔ میں تمہارے لیے کچھ بھجواتی ہوں۔" انہوں نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ میں بس صرف ایک کپ چائے لوں گی۔ جہاز میں ہی کھا لیا تھا بہت کچھ۔ ویسے بھی مجھے نیند بھی آرہی ہے۔ اگر مجھے میرا کمرہ دکھا دیں تو باتیں کل بھی ہو سکتی ہیں نا، کیوں دادو۔" اس کی بات پہ تائی امی نے ایک جتاتی ہوئی نگاہ دادی پہ ڈالی۔ دادو نے انہیں آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ تو وہ منہ بنا کر

باہر چلی گئیں۔

"زینی بیٹا! جاؤ۔ نباہ کو اپنے کمرے میں لے جاؤ۔ چائے وہیں دے دینا۔ ویسے بچی تھک گئی ہوگی میری بچی۔" انہوں نے اس کے ریشمی سنہری بالوں پہ بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"جی دادو۔ چلو نباہ۔" زینی نے کہا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اوپر رائٹ سائیڈ والا کمرہ تمہارے لیے سیٹ کردیا ہے میں نے۔ تم چلو، میں چائے لے کر آتی ہوں۔" زینی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں زینی۔ بس چائے مت لانا۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ ویسے بھی رات کو جلدی سونے کی عادی ہوں۔ چائے پی کر نیند نہیں آئے گی۔ صبح ملتے ہیں۔" اس نے آرام سے زینی کو منع کرتے ہوئے کہا اور کمال کی خود اعتمادی سے اوپر چلی گئی۔ زینی حیران سی کچن میں چلی آئی، جہاں سکینہ بی چائے بنا رہی تھیں۔

"چائے تیار ہے زینی، لے جاؤ میڈم کے لیے۔" اسے آتا دیکھ کر انہوں نے تلخی سے کہا۔

"نہیں ممانی۔ لے نہیں چنی۔ آپ مجھے دیں۔ میں پی لیتی ہوں۔" زینی ان کے خیال سے بولی۔

"نہیں تم چائے کہاں پیتی ہو، رہنے دو، مجھے تو پہلے ہی پتا تھا، تب ہی ایک ہی کپ بنایا تھا۔" انہوں نے چائے کپ میں نکالتے ہوئے کہا۔

"بہت بدل گئی ہے وہ ممانی۔ میں نے تو جیسا سوچا تھا وہ اس کے بالکل الٹ نکلی۔" زینی مایوس لہجے میں بولی۔

"اس نے تو دادی تک کا خیال نہ کیا۔" اسے دکھ تھا۔

"اور میں نے بھی تم سب سے کہا تھا۔ جیسی ماں، ویسی بیٹی۔ اس کی ماں نے جب ان رشتوں اور خلوص کی قدر نہ کی۔ تو یہ لڑکی کیا کرے گی۔ پھر اس کے باپ کی خصلت میں بھی وفا نہ تھی۔ لیکن تم لوگ ہی مرے جاتے تھے کہ نباہ ایسی نہیں، ویسی نہیں میں تو حیران ہوں ساری عمر خدمت کرتے گزار دی۔ یہ تعریف اور یہ محبت میرے حصے میں تو نہ آئی۔" وہ برتن دھوتے ہوئے بولیں۔ زینی ان کے لہجے میں محرومیاں محسوس کرکے مزید دکھی ہوگئی۔

"دادو نے آپ کی قدر نہ کی۔ تب ہی شاید انہیں راشدہ چچی جیسی سوتیلیں بخشوں نے۔"

"خیر بڑے لوگوں کی بڑی باتیں، تم ان میں دخل نہ دیا کرو۔" حسب عادت انہوں نے اسے ٹوک دیا تھا۔ وہ پرستائش نظروں سے اپنی صابراں کو دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

اوپر کا پورشن دیکھ کر وہ منتہیٰ کی پسند کی مزید قائل ہوئی۔ "دائیں ہاتھ والا کمرہ بتایا تھا شاید۔" اس نے کچھ یاد کرتے ہوئے دائیں ہاتھ والا کمرے کا دروازہ کھولا اور لائٹس آن کرتے ہی اسے خوش گوار حیرت نے آلیا۔ کمرہ بے حد نفاست سے سیٹ کیا گیا تھا۔ کمرے کی شکل گول تھی اور بالکل اسی طرح فرنیچر میں بھی نسبتاً کم گولائی، مگر صاف طور پہ واضح دیکھی جاسکتی تھی۔ بیڈ، صوفہ، کمپیوٹر ٹیبل سب کے سب منتہیٰ کی اعلا پسند اور نفاست کے منہ بولتا ثبوت تھے۔ وہ دھیرے سے نرم کارپٹ پہ قدم جماتی کھڑکیوں کے پاس چلی آئی۔

دیوار کا یہ والا حصہ بلیک شیشے کی کھڑکیوں پہ ہی محیط تھا۔ اس نے سب سے پہلے والی کھڑکی کھول کر باہر کا منظر دیکھنا چاہا تو اسے ایک اور جھٹکا لگا۔ یہ کھڑکی نہیں، بلکہ سب دوسری کھڑکیوں کے ساتھ ملحق ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ جو باہر ٹیرس پہ جا کھلتا۔ ٹیرس بھی دائرے کی شکل میں تھا۔ جہاں ننھے ننھے گملوں میں کافی سارے پودے لگائے ہوئے تھے۔

"لگتا ہے پودوں میں جان ہے اس کمٹوں کی۔" اس نے نرمی سے چنبیلی کے پودے کو چھوتے ہوئے منتہیٰ کو نوازا۔ ٹیرس پہ کسی درخت کی شاخیں جھکی ہوئی تھیں۔ جس کی وجہ سے کچھ خاص روشنی نہیں ہو پا رہی تھی۔

"کل صبح کسی سے کہہ کر اس درخت کو ہلکا پھلکا

کروائیں گی۔ روشنی میں تو یہ اور بھی خوب صورت لگے گی۔" وہ خودکلامی کرتے ہوئے اندر چلی آئی۔ نرم ملائم بستر کی آغوش میں جاتے ہی اسے پرسکون نیند نے آلیا تھا۔

☼ ☼ ☼

بہت کوشش کے باوجود بھی اسے آفس سے نکلتے ہوئے رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اسے اچھی طرح پتا تھا کہ سب گھر والے سو چکے ہوں گے۔ کیونکہ اس نے خود امی کو اطلاع دے دی تھی کہ شاید وہ آج رات باہر ہی رکے۔ ایسا اس نے جان بوجھ کر کہا تھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ گھر میں باقی سب نیند کے دلدادہ تھے سوائے امی کے۔

امی اس وقت تک جاگتی ہی رہتیں، جب تک وہ گھر نہ آجاتا۔ اس نے گاڑی گھر کی بیرونی دیوار کے ساتھ ہی لاک کی اور بونٹ پہ پاؤں رکھ کر دیوار چڑھ گیا۔ یوں چوروں کی طرح اپنے ہی گھر آنے پہ خود اس کے ہونٹوں پہ بہت پیاری مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے لاؤنج کا دروازہ چیک کیا۔ دروازہ لاک تھا۔ آج کل ویسے بھی شہر کے حالات خراب تھے۔ تو وہ سمجھ سکتا تھا کہ امی نے سارے دروازے ایسے ہی احتیاط سے لاک کیے ہوں گے۔

کچھ دیر یوں ہی کھڑے سوچنے کے بعد اسے ترکیب سوجھ ہی گئی اور صرف دس منٹ کے اندر ہی جامن کے درخت کی مدد سے وہ اپنے ٹیرس پہ پہنچ چکا تھا۔ اس نے اپنے پاس موجود ٹیرس کے لاک کی چابی سے لاک کھولا اور بے فکر سا اندر چلا آیا۔ مگر اگلے ہی لمحے اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ اس کے بیڈ پہ سکون کی نیند سوئی یقیناً "وہ نباء ہی تھی۔ اس کے کھلے بال اس کے چہرے کو ڈھک رہے تھے اور وہ نیند میں بھی مسلسل انہیں ہٹا رہی تھی۔ شام کی نسبت سوتے میں اس کا چہرہ قدرے پرسکون تھا۔

"تم نے بھی قیامت ہی بھیجی ہے ہمارے گھر پہ۔" وہ مسکرایا۔

"اس کا مسئلہ تو پتا نہیں حل ہوگا کہ نہیں مگر جب تک یہ یہاں رہے گی امی ضرور پریشان ہوں گی۔ لیکن یہ میرے کمرے میں؟" ایک دم سے ہی اسے خیال آیا۔ اس کا موڈ ایک دم سے بدلا۔

"سب کو پتا بھی ہے کہ میں اپنے کمرے میں کسی کو برداشت نہیں کرتا۔ پھر کس نے اسے اجازت دی۔ جبکہ امی تو جانتی ہیں کہ میں کتنا غصہ کرتا ہوں اس بات پر۔" وہ بڑبڑایا۔

"اور دیکھو تو کیسے پورا بیڈ سنبھال کے سو رہی ہے جیسے اس کے مسٹر رائٹ کا بیڈ ہو۔" اس نے بیڈ پہ آڑی ترچھی لیٹی نباء پہ ایک غصیلی نگاہ ڈالی۔

"اب اتنی سخت تھکن میں... میں کہاں جگہ ڈھونڈوں۔ ارتضیٰ تو گھوڑے بیچ کے سویا ہوگا۔" وہ مضطرب ہوا۔ اور ٹیرس پر کمبل لے کر سو گیا۔

☼ ☼ ☼

"ارتضیٰ! ذرا بھائی کو فون کر کے پوچھو بیٹا" جلدی گھر آئے۔ اسے دیکھ نہ لوں تو میرا تو دن ہی نہیں نکلتا۔" ارتضیٰ ابھی ابھی جاگنگ کر کے گھر لوٹا کہ امی نے پکار لیا۔

"بھائی تو گھر آچکے ہیں امی۔ ابھی میں نے باہر گاڑی دیکھی ہے نا۔" اس نے جوس کا گلاس لیتے ہوئے کہا تو وہ مزید پریشان ہو گئیں۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس نے کل خود ہی مجھے کہا تھا کہ وہ رات باہر رکے گا۔ تب ہی تو میں نے سارے دروازے لاک کر دیے تھے۔ وہ کیسے آسکتا ہے اندر۔" امی کی آواز میں پریشانی تھی۔

"آپ چیک تو کرلیں کمرے میں۔ شاید لیٹ آئے ہوں۔ سو رہے ہوں گے۔" وہ تھا ہی ایسا بے پروا' انہوں نے ماتھا پیٹ لیا۔

"تمہیں تو نہ جانے کب عقل آئے گی لڑکے۔ ذرا جو بڑے بھائی کی فکر ہو۔" انہوں نے ارتضیٰ کو سنائیں۔

"دیکھیں... چھوٹے بھائی کی فکر کرتے ہیں امی اور

مقتدی بھائی تو مجھ پر جان دیتے ہیں۔" اس نے فرضی کالر جھاڑے۔ امی اسے کوستے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئیں۔

مقتدی کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہی ان کی پریشانی میں غصے کا بھی اضافہ ہوا تھا۔ بیڈ پہ گہری نیند سوئی نباء نے ان کے ہوش اڑا دیے تھے۔ تب ہی باتھ روم سے نکلتے مقتدی کی نظر ماں پہ پڑی۔ ان کے تیور دیکھ کر وہ لمحوں میں ساری صورت حال سمجھا تھا۔ وہ پلک جھپکنے میں ماں کے پاس پہنچا تھا۔

"یہ یہاں کیا کر رہی ہے۔ تمہارے کمرے میں۔" سکینہ بی بی مشتعل ہو کر بولیں۔

"آہستہ امی۔ سو رہی ہے۔ آپ نیچے چلیں میں بتاتا ہوں آپ کو۔" اس نے بمشکل انہیں سنبھالا۔

"کیوں آہستہ بولوں۔ ساری عمر سسرال میں ڈر ڈر کے زندگی گزار دی اور اس آفت کی بیٹی سے میں کیوں ڈروں۔" وہ مزید بھڑکیں۔

"اچھا آپ نیچے تو چلیں۔" وہ انہیں ساتھ لگائے نیچے لانے لگا۔

"اور تم۔ تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا۔ ارے ساری عمر اس کی ماں نے تمہارے چاچو کے لیے تمہاری دادو کو ترسایا ہے۔ میں خوب سمجھتی ہوں۔ وہ تمہیں بھی اپنے قابو میں کرنا چاہتی ہے اس آفت کے ذریعے۔"

ان کا بی پی ہائی ہو چکا تھا۔ ارتضٰی نے سوالیہ نظروں سے بھائی کو دیکھا۔ اس نے نظروں ہی نظروں میں ارتضٰی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ "میں خوب سمجھتی ہوں، اماں کی طرح بھولی نہیں ہوں میں۔ ارے ساری عمر تو ہماری یاد نہ آئی۔ اب اتنی مدت بعد بچی کو دادی کی یاد ستانے لگی۔ یہ سب تمہیں پھنسانے کے ڈرامے ہیں۔ وہ لڑکی صرف اور صرف تم پر ڈورے ڈالنے آئی ہے۔" ان کی سانس پھولنے لگی۔

"پلیز امی! ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ ہماری مہمان ہے۔ اگر اس نے یہ سب سن لیا تو کتنا برا سوچے گی ہمارے بارے میں۔" مقتدی فکر مند تھا۔ "کبھی اچھا نہیں سوچا ان ماں بیٹی نے ہمارے لیے۔ تو سوچنے دو مزید برا۔" سکینہ بی بی نے مکھی اڑائی۔ مقتدی نے بے بسی سے ایک نظر اوپر ڈالی اور اس کا دل ڈوب سا گیا۔ سیڑھیوں کے عین اوپر کھڑی نباء کی آنکھوں میں بدگمانیاں اور غصہ بے حد واضح تھا۔ نظریں ملتے ہی وہ جھٹکے سے مڑی تھی۔

"شٹ۔" مقتدی نے اپنے ہاتھ پہ ہی مکا جڑ دیا۔

"امی۔ اس نے آپ کی ساری باتیں سن لیں۔" زینی خفا لہجے میں بولی۔

"ہاں تو سن لے۔ میں کب ڈرتی ہوں اس سے۔"

"اچھا آپ ریلیکس کریں، چلیں میں آپ کو کمرے میں چھوڑ آؤں۔" مقتدی نے ان کی توجہ ہٹانے کی کوشش کی۔

"نہیں میں ٹھیک ہوں۔" سکینہ بی بی نے ہاتھ چھڑایا۔

"چلیں نا امی۔" وہ بضد ہوا تو لاچار انہیں اٹھنا ہی پڑا۔

"زینی تم ناشتا اوپر لے جاؤ۔ میں آتا ہوں ابھی۔" اس نے زینی کے کان میں سرگوشی کی اور امی کے پیچھے چل دیا۔ زینی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بھائی بے چارے۔ ساری عمر لگتا ہے رشتے جوڑتے ہی گزار دیں گے۔" ارتضٰی نے توسٹ پہ جیم لگاتے ہوئے کہا۔

"سچ میں۔ ہم تو کب کی ہمت ہار چکے ہوتے۔ پتا نہیں کس کس طرف جان کھپاتے ہیں بھیا۔" زینی ناشتا بنانے لگی۔ ارتضٰی گہری سوچ میں چپ رہا۔

☼ ☼ ☼

"آئی ایم رئیلی سوری نباء ساری غلطی میری ہے۔ میں نے ہی تمہیں تیزی میں رائٹ بول دیا۔ جبکہ لیفٹ والا روم تمہارے لیے سیٹ کیا تھا۔" زینی ناشتا لے کر اوپر گئی تو اس کی توقع کے عین مطابق نباء کرم بیٹھی تھی۔

"تم... تو یہ بات مجھے نہ بتاؤ۔ جاکر اپنی امی جان کو بتاؤ۔" وہ تڑخی۔

"مہاری امی جان تمہاری بھی تو کچھ لگتی ہیں۔" مقتدی اندر آتے ہوئے بولا۔

"جی... ان کی گل افشانی سے ہی پتا چل رہا تھا مجھے کہ میں ان کی اور وہ میری کیا لگتی ہیں۔" اس کے لہجے میں تلخی بھری تھی۔

"کچھ بدگمانیاں ہیں نباء ہم جتنا جلدی چاہو گی انہیں ختم کر سکو گی۔" لمبا چوڑا وجود بالکل اس کے سامنے آ ٹھہرا تھا۔ کچھ لمحے تو وہ بول ہی نہ پائی۔

"تمہیں اپنے رویے میں لچک پیدا کرنی ہوگی۔ کیونکہ جہاں رویوں میں لچک ختم ہوجائے' وہاں صرف نفرت اور بدگمانی رہ جاتی ہے۔ دل میں تب ہی کوئی جگہ پائے گا جب ہم دل میں کچھ گنجائش پیدا کریں گے۔ ہم خود ہی دل تنگ کرلیں تو بھلا کسی دوسرے سے کیا توقع رکھیں گے۔" نرم لہجے میں کہتا وہ اسے اپنا فاتح لگنے لگا۔ اس نے بہت مشکل سے خود کو دوبارہ مضبوط کیا۔

"مائی فٹ۔ یہاں بدگمانیاں ختم ہی کون کرنے آیا ہے۔ مجھے صرف حق چاہیے۔ جس پہ پچھلے کئی سالوں سے تم سب لوگ قابض ہو اور بس... سو تم لوگ جتنی جلدی دے دو گے میں اتنی ہی جلدی یہاں سے چلی جاؤں گی۔" اس کے لہجے کی کڑواہٹ نے نہ صرف زینی بلکہ مقتدی کو بھی حیرت زدہ کردیا تھا۔

"مجھے نہ تو تم لوگوں کی سوکالڈ محبت کی ضرورت ہے۔ نہ ہی خود کو اور اپنی ماں کو کلیئر کرنے کی۔ ازاٹ کلیئر۔" وہ تڑخی۔

"شٹ اپ... جسٹ شٹ اپ نباء۔ میرے سامنے تو تم نے یہ بات کرلی' مگر دادو کے سامنے تم نے اس طرح کے سخت الفاظ کہے تو پھر نتیجے کی ذمہ دار تم خود ہوگی۔ تمہیں چاچی نے صرف اور صرف دادو کی طبیعت کی ناسازی کے لیے بھیجا ہے' نہ کہ اس طرح کے شوشے چھوڑنے کے لیے۔" سخت لہجے میں وارن کرتے ہوئے مقتدی کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

"تو پھر تمہیں میری بات ماننا ہوگی مقتدی... میں دادو کے سامنے مس بی ہیو نہ کروں' اس کی ذمہ داری تم پر ہے۔ تم بھی مجھے سکھانے کی کوشش آئندہ مت کرنا اور اپنی امی جان کو بھی سمجھا دینا کہ مجھے ان کے اس چھ فٹ کے بیٹے میں کوئی دلچسپی نہیں اور نہ ہی کبھی ہوگی۔ سو وہ میرے بارے میں ایسے اندازے نہ ہی لگائیں تو بہتر ہے۔" اس کی آخری بات پہ مقتدی کے تنے چہرے پہ اچانک ہی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"ویسے اس بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔" اس کے شریر لہجے پہ جہاں سہمی سی زینی بھی مسکرا اٹھی' وہیں نباء مزید تڑپی۔

"مر کر بھی نہیں اور زینی اب براہ مہربانی تم مجھے میرا کمرہ دکھا دو یا میں واپسی کی ٹکٹ ہی کنفرم کروالوں۔"

"ہاں..." زینی چونکی۔

"ویسے جو بھی اس کمرے میں آتا ہے یہاں سے جانا مشکل سے ہی ہے۔ اگر تم رہنا چاہو تو اٹس اوکے' میں گیسٹ روم میں گزارہ کرلوں گا۔" اس نے اس بار دوستانہ لہجے میں کہا۔ مگر نباء پہ ذرا برابر بھی اثر نہ ہوا۔

"جی نہیں۔ مجھے احسان لینا بالکل بھی پسند نہیں۔" وہ پیر پٹختی باہر چلی گئی۔ زینی بھی اس کے پیچھے ہولی۔

"یہی تو اصل مسئلہ ہے نباء احمد۔ اگر تمہیں میرے احسانوں کا پتا چل جائے تو یوں کبھی سر اٹھا کر میرے سامنے نہ آسکو شاید اور میں یہ ہرگز نہیں چاہتا۔ مجھے تو بس ایسی ہی نباء چاہیے۔" اس نے مسکراتے ہوئے سوچا تھا۔

☆ ☆ ☆

اسے پشاور آئے ایک ہفتے سے اوپر ہوگیا تھا۔ دادو کی صحت میں واقعی اس کے آنے کے بعد بہت بہتری آگئی تھی۔ وہ خود چلنے پھرنے کے قابل ہوئیں تو نباء کو ان سے چھپنا مشکل ہوگیا۔ نہ جانے کیوں لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ اس گھر کے لوگوں کی محبت ٹھکرا نہ پائی

تھی۔ مقتدیٰ بہت مصروف رہتا تھا۔ سو اس سے ملاقات کم ہی ہوتی۔ گھر والے سارے نفوس اس پہ جان چھڑکتے تھے۔ وہ ان کو لاکھ بے زاری دکھاتی' ان کے ماتھے پہ شکن تک نہ آتی۔ سوائے تائی امی کے' جن کا رویہ برا نہ سہی ویسے ہی سرد تھا جیسے وہ بچپن میں محسوس کرتی تھی۔

کبھی کبھی اسے نہ صرف اپنے رویے پہ شرمندگی ہوتی بلکہ اکثر وہ اس سوچ میں پڑ جاتی کہ کہیں واقعی غلط اس کے ماں' باپ تو نہیں تھے۔ کیونکہ جب سے وہ یہاں آئی تھی اسے ہمیشہ بابا کے حوالے سے دیکھا جاتا۔ نباء کی یہ عادت احمد جیسی ہے۔ نباء کی آنکھیں احمد جیسی ہیں۔ نباء بایاں ہاتھ زیادہ استعمال کرتی ہے۔ احمد کی طرح۔ روز اس طرح کی کئی باتیں اس کے سامنے آتیں اور وہ اس چیز کو دل سے پسند بھی کرتی۔ خوش ہوتی کہ وہ اپنے بابا کے جیسی ہے۔

اس کی تنہائی کی وجہ سے دادو نے زینی کا بیڈ بھی اس کے کمرے میں سیٹ کروادیا تھا اور اسی وجہ سے اب ارتضیٰ کا بھی زیادہ وقت ان کے کمرے میں گزرتا تھا۔ وہ جو یہ عہد کرکے آئی تھی کہ کبھی پھر سے اس گھر کے مکینوں کے ساتھ فرینک نہیں ہوگی۔ آہستہ آہستہ پھر سے دوستی کے رنگوں میں رنگنے لگی تھی۔

آج موسم بے حد سرد تھا۔ اس نے چائے بنائی تو دادو کے لیے بھی بنالی۔ وہ چائے لے کر دادو کے کمرے کی طرف آئی تو تائی امی کا سخت لہجہ سن کر اس کے قدم وہیں رک گئے۔

"پرانی باتیں بھول جاؤ سکینہ۔ میں مانتی ہوں مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں نے ہمیشہ اپنی نافرمان اولاد کو تم جیسی فرماں بردار بہو پہ فوقیت دی۔ تمہیں کبھی اہمیت نہ دی' لیکن کب تک یہ نفرتوں کے بوجھ دل پہ رکھوگی۔ اتار دو یہ بوجھ۔" دادو کا لہجہ کمزور تھا۔

"میرے دل سے یہ خوف نہیں جاتا اماں۔ میں نے ساری عمر کبھی کسی بات کا شکوہ نہ کیا۔ صبر سے گزارہ کیا۔ گھر میں کیا کروں' مجھے وہ راتیں نہیں بھولتیں جب آپ احمد کی یاد میں روتے گزار دیتیں اور اس بار ایک مرتبہ پھر آپ وہی غلطی دہرا رہی ہیں اماں۔ اس دفعہ میرا بیٹا خطرے میں ڈال دیا ہے آپ نے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آج بھی آپ کے دل میں جو مقام احمد اور اس کی بیٹی کا ہے۔ وہ میں اور میرے بچے نہ پاسکے۔ یہ ناانصافی کیوں اماں۔" تائی امی تھوڑا رکیں۔

"لیکن خیر۔ میں آپ سے کہہ دیتی ہوں۔ اس دفعہ بھی یہ لڑکی آپ کی محبت میں نہیں' بلکہ کوئی اور سازش لے کر آئی ہے اور میری تو بس اتنی سی دعا ہے کہ اللہ میری اولاد کو اس شر سے بچائے۔ نباء اور اس کی ماں کے شر سے۔" تائی امی کے لہجے میں کتنی نفرت تھی۔ اس کے اور اس کی ماں کے لیے۔ نباء کا دل چاہا ابھی جاکر ان کی خوب بے عزتی کرے۔ مگر وہ دل ہی دل میں اپنا حق وصولنے کا عہد نو کرتے ہوئے کچن کی طرف چل دی۔ اس کی آنکھوں میں گہری سوچ کے سائے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو ایوری باڈی۔" پنک کلر کے خوب صورت کرتا اور چوڑی دار پاجامے میں اس کی گلابی رنگت مزید نکھر گئی تھی۔ ناشتے کی میز کے گرد بیٹھے سب ہی نفوس نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔

"کیسا ہے میرا بچہ۔ لگتا ہے آج کہیں سیر کا پروگرام ہے۔" اس کا موڈ دیکھ کر تایا جان خوشی سے بولے۔

"سیر تو بہت کرلی تایا جان' میں نے سوچا آرام بھی بہت کرلیا۔ اب ذرا کام بھی کرلیا جائے۔" وہ آرام سے کہتی اپنی کرسی پہ جا بیٹھی۔

"کام؟" تایا جان نے سوال کیا۔ مقتدیٰ کی گہری نیلی نگاہیں اسے واضح طور پہ خود پہ جمی محسوس ہو رہی تھیں۔

"جی کام۔ آفس کا کام۔" اس نے پر اعتماد انداز میں مقتدیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے چبا کر کہا۔ اس کی نیلی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"جی بابا۔ آپ کو بتایا تھا ناکہ نباء نے ایم بی اے کر رکھا ہے تو میں نے سوچا کیوں نہ اس کی مدد لے لی

جائے۔" نباء کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ مقتدی نے کتنی تیزی سے بات بنائی تھی اور وہ جو سمجھ رہی تھی کہ اس نے مقتدی کے ہوش اڑا دیے ہیں۔ اب خود منہ کھولے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"پھر ویسے بھی یہ گھر میں بور ہوتی ہے۔ مجھے سائٹ بھی جانا ہوتا ہے تو میں نے سوچا آفس یہ سنبھال لے گی۔" اس کے لبوں کی مسکراہٹ اس کی شخصیت کو مزید سحر انگیز بنا دیتی تھی۔ نباء پلکیں جھکا گئی۔

"تم ناشتا کر لو۔ دیر ہو رہی ہے۔ میں تمہیں آفس چھوڑتا ہوا جاؤں گا سائٹ پہ۔ عملہ بہت کوآپریٹو ہے۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔" مقتدی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ مقتدی کو سکینہ بی بی کی پریشان نگاہوں کا بخوبی مطلب پتا تھا۔ وہ سیدھا ان کے پاس کچن میں ہی چلا آیا۔ "اب یہ کیا مقتدی، گھر پہ مجھے تھوڑی اس لڑکی کی پریشانی ہے کہ اب دفتر میں بھی۔۔۔" وہ واقعی پریشان تھیں۔ مقتدی مسکرا دیا۔

"آپ کو مجھ پہ بھروسہ ہے نا امی۔ میں آپ کی مرضی کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھاتا کہاں اتنا بڑا فیصلہ۔ بولیں امی، آپ کو مجھ پہ یقین ہے نا۔" اس نے نرمی سے ماں کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر تھپتھپایا۔

"صرف تمہارا ہی تو یقین ہے خدا کے بعد کہ میں زندہ ہوں، ورنہ تو۔۔۔"

"بس امی۔۔۔ بری یادوں کو یاد نہیں کرتے۔ آپ آرام سے ناشتا کیجیے گا اور دوا بھی لیجیے گا۔ اوکے، میں چلتا ہوں۔" اس نے ماں کے سر پر بوسہ دیا اور باہر چلا گیا۔ سکینہ بی بی نم آنکھیں صاف کرتے ہوئے اس کی لمبی زندگی کے لیے دعا گو تھیں۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے بانو۔۔۔ کیوں اتنی گم سم بیٹھی ہو۔" بانو اس وقت اپنی امی کے گھر کے پچھلے چھوٹے سے پورشن میں اکیلے بیٹھی نہ جانے کن سوچوں میں گم تھیں کہ اماں نے آ کر چونکا دیا۔

"کچھ نہیں اماں۔۔۔ سوچ رہی ہوں جب تک احمد زندہ تھے تو میں کتنی شان سے آپ کے ساتھ اس بڑے گھر میں رہتی تھی۔ لیکن جوں جوں کڑا وقت آتا گیا۔ سب ہی رشتے جیسے میرے سامنے واضح ہوتے گئے۔" ان کی آواز میں پچھتاوا سا گھلا تھا۔ اماں کی نظریں خواہ مخواہ ہی جھکنے لگیں۔

"ارے تم تو ویسے ہی وہم پالنے لگی ہو۔ وہ تو گھر میں جگہ کم پڑنے لگی نا۔ اللہ لمبی زندگی دے تمہارے دونوں بھائیوں کو ان کی شادی۔۔۔ پھر بچے۔۔۔ ان کی بھی تو مجبوری تھی بیٹا۔ پھر اب بھی تمہیں اتنی اچھی جگہ میسر ہے۔ لو بھلا یہ ناشکری والی عادت اب چھوڑ دو۔" اماں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ اداسی سے مسکرا دیں۔

"اچھی جگہ۔۔۔ یاد ہے احمد کی زندگی میں، میں اس طرف آنا بھی گوارا نہ کرتی تھی۔ لیکن خیر اب مجھے اپنی چادر میں پاؤں پھیلانا آ گیا ہے اماں۔ اب تو بس یہی فکر ہے کہ میری غلطیوں کا خمیازہ میری نابو کو نہ بھگتنا پڑے۔ اللہ کرے اس کو بھی احمد کے جیسا وفادار اور محبت کرنے والا ساتھی ملے اور وہ میری طرح اس کی بے قدری نہ کرے۔ میں چاہتی ہوں اماں نابو ایک خوش حال زندگی بسر کرے۔" ان کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"اے لو۔۔۔ اتنی اچھی زندگی تو گزار رہی ہے، کس چیز کی کمی دی ہے تم نے بھلا اسے۔" اماں نے اسے سراہا۔

"آپ جانتی ہیں اچھی طرح سے کہ یہ سب کس کی بدولت ہے۔" بانو کے لہجے میں طنز اترا اور اماں نظریں چرا گئیں۔ پھر اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"دیکھ۔۔۔ وہ گئی ہے نا اپنا حصہ وصولنے۔ اللہ اسے کامیاب کرے۔ تیرا بھائی بھی سوچ رہا ہے کہ نباء کو کوئی بزنس سیٹ کرا دے اس کے پیسوں سے۔ نباء آ جائے تو وہ تم سے بھی بات کرے گا۔" اماں کے لہجے میں در آنے والی خوش دلی اس سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔ ویسے بھی اب وہ ان کے اندر باہر سے اچھی طرح

واقف ہو چکی تھیں۔ انہوں نے صرف سر ہلانے پہ ہی اکتفا کیا تھا۔

"یا اللہ... جس مقصد کے لیے میں نے ضیاء کو وہاں بھیجا ہے اسے پورا کر دینا میرے مالک۔ مجھے بس تیری ہی ذات سے امید ہے۔" انہوں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں دعا کی تھی۔

☼ ☼ ☼

مقتدی کے ساتھ آفس آتے وقت وہ دل ہی دل میں جتنا گھبرا رہی تھی۔ آفس آتے ہی اس کی ساری گھبراہٹ دور ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ مقتدی راستے میں ضرور اسے ڈانٹ ڈپٹ کرے گا۔ مگر وہ خاموش رہا تھا۔ آفس کا سارا اسٹاف واقعی بہت نائس تھا اور ضیاء کو ان سب سے مل کر واقعی... بہت اچھا لگا۔

سب سے اس کا تعارف کروانے کے بعد مقتدی اسے اس کے آفس میں لے آیا۔

"پہلے میں یہاں بیٹھتا تھا۔ پھر بابا کی صحت کی وجہ سے مجھے ان کی سیٹ سنبھالنا پڑی۔ تب سے یہ دفتر خالی پڑا ہے۔ آج سے تم یہ سیٹ سنبھالو گی۔ یہ ساتھ والا آفس میرا ہے۔ تمہیں کسی قسم کی بھی کوئی ہیلپ چاہیے جو مجھے نہیں لگتا کہ تمہیں ضرورت پڑے گی۔ پھر بھی مس نیلم یہاں کی سینئر ممبر ہیں۔ تم ان سے معلومات لے سکتی ہو۔ میری بڑی بہن کے جیسی ہیں وہ۔ تم بھی ان کا خاص خیال رکھنا۔" مقتدی دھیمے لہجے میں بولتا گیا اور وہ گم سم سی اسے دیکھے گئی۔ اس کی اس حالت پہ مقتدی کو ہنسی آ گئی۔

"ڈونٹ وری... ہمارے آفس کی درمیانی دیوار گلاس وال ہے۔ تم چاہو تو سارا دن مجھ پہ نظر رکھ سکتی ہو۔" اس کے چہرے کے ساتھ اس کے لہجے میں بھی شرارت در آئی تھی۔ ضیاء مارے خفت کے سرخ پڑ گئی۔ تب ہی دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی تو مقتدی اس طرف متوجہ ہو گیا۔ ضیاء نے لمبی سانس لے کر خود کو نارمل کیا۔ اس نے دل سے تسلیم کیا تھا کہ چاہے اندر ہی اندر وہ کتنی ہی پر اعتماد کیوں نہ ہو۔ مقتدی کے سامنے اس کا سارا اعتماد زائل ہو جاتا تھا۔

"مس نیلم... آئیں ابھی آپ کا ہی ذکر ہو رہا تھا۔ یہ ہیں میری کزن ضیاء احمد۔ انہیں آپ کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔" مقتدی نے ان دونوں کا تعارف کرایا۔

"آج میں سائٹ پہ رہوں گا' تو پلیز آپ اور ضیاء آج آفس سنبھال لیجیے گا۔ ضیاء بہت ٹیلنٹڈ ہے۔ آپ کو اس کے ساتھ کام کر کے مزا آئے گا۔" اس نے نیلم کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا تو مس نیلم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ مقتدی کے جانے کے بعد نیلم نے تقریباً" سارا دن اسی کے آفس میں گزارا اور ایک ہی دن میں وہ تقریباً" سب کام سمجھ چکی تھی۔ مس نیلم بھی اس کی ذہانت کی قائل ہو گئی تھیں۔

"سچ میں ضیاء تم تو بالکل سر کی کاپی ہو۔ ان ہی کی طرح چھا جانے والی شخصیت اور قابل رشک ذہانت۔" عمر میں بڑی ہونے کی وجہ سے وہ جلد ہی ضیاء کے ساتھ فرینک ہو گئی تھیں اور پھر آفس سے واپسی پر جب ضیاء کو لینے مقتدی عین وقت پر پہنچا تو اس کا دل بس ایک ہی گردان کر رہا تھا۔

"سر کی طرح چھا جانے والی شخصیت اور قابل رشک ذہانت۔" وہ سارا راستہ کن انکھیوں سے بار بار اس چوڑے وجود کو دیکھتی رہی۔ جس کی آنکھوں میں باوجود کوشش کے بھی ابھی تک وہ نفرت نہ تلاش پائی تھی۔ اسے ہمیشہ وہاں دوستانہ مسکراہٹ ہی نظر آئی تھی۔ گھر آتے آتے نہ جانے کیوں دل نے اس مغرور کو اپنا ماننے کی تکرار کی تھی اور ضیاء احمد مسلسل رد کرتی آئی۔

☼ ☼ ☼

"ہی... آپ جانتی ہیں ہمارے اللہ نے ہمیں معاف کر دینے کا حکم فرمایا ہے۔ پھر آپ نے خود ہی تو ہمیں ساری عمر یہی تعلیم دی ہے کہ نفرتوں کو جتنا ٹھکراؤ' محبتیں اسی قدر تمہارے قدم چومنے کے لیے بے قرار ہوں گی۔ میں مانتا ہوں جو کچھ بانو چچی نے کیا وہ

سب غلط تھا۔ مگر نباء یہ سب نہیں جانتی۔ پتا نہیں ہم سب وہاں کس طرح ڈسکس ہوئے ہیں۔ نباء بس ہمیں ویسا ہی سمجھے گی جیسا اس نے ہمیں سنا۔ حقیقت میں تو وہ اب ہمیں جانے گی جب وہ ہمارے رویے ہماری شخصیت کو نزدیک سے دیکھے گی' پرکھے گی۔ سو بھلے ہی ماضی میں بانو چچی ذمہ دار ہوں۔ اب ہم ذمہ دار ہوں گے امی۔ پھر آپ خود بھی تو کتنی پریشان رہتی تھیں اس کے لیے جب احمد چاچو کی ڈیتھ ہوئی اس کے بعد۔" سکینہ بی بی کی طبیعت مسلسل کر رہی تھی اور مقتدی اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ سب نباء کی اس گھر میں موجودگی اور نباء کی امی کے حوالے سے اس کی ماں کے ذہن پہ چھائے خوف کی وجہ سے تھی اور اس وقت وہ سونے سے پہلے ان کے پاس چلا آیا تھا۔ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامے وہ بالکل ان کے قریب بیٹھا تھا اور وہ یوں اس کی باتیں سن رہی تھیں جیسے کوئی چھوٹا بچہ۔ وہ ماں کے اس معصوم انداز پہ مسلسل مسکرا بھی رہا تھا۔

"یہ سارے خوف نکال دیں امی دل سے۔ اسے زیبی سمجھ کر دیکھیں۔ آپ کے سارے واہمے خود بخود دم توڑ دیں گے۔"

"وہ مجھے اب بھی بہت عزیز ہے بیٹا۔ بالکل میری زیبی کی طرح۔ لیکن نہ جانے کیوں میرا ذہن اب بھی ڈر جاتا ہے۔ تم سب تو چھوٹے تھے مگر مجھے یاد ہے کہ کس طرح تیری دادی راتوں کو روتے روتے صبح کر لیتی تھیں۔ جب تیری چچی کی چھوٹی سی ضد کی وجہ سے احمد یہ گھر چھوڑ کے چلا گیا۔ اماں نے کتنی منتیں کیں اس کی۔ کتنا سمجھایا اسے۔ مگر اس نے صرف بانو کی مانی۔ جس ماں نے اس کی پرورش کی۔ اس کے لیے راتیں جاگیں' کتنی تکلیفیں پائیں۔ اسی ماں کو چھوڑ کے چلا گیا۔ یقین مانو مقتدی' اگر اماں کے اختیار میں ہوتا تو وہ بانو کی ضد پوری کر دیتیں' مگر ابا نے زندگی میں ہی یہ گھر دونوں بھائیوں میں برابر تقسیم کر دیا تھا اور بانو کی ضد تھی کہ گھر اس کے نام کر دیا جائے۔ اماں کو اپنے شوہر کی وصیت توڑنا بھی گوارا نہ تھا۔ سو وہ بھی مجبور تھیں۔"

سکینہ بولتی تھیں۔ مقتدی یہ سب جانتا تھا مگر چپ چاپ سے انہیں سن رہا تھا۔ تاکہ ان کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔

"ان دنوں دروازے پہ ہونے والی ذرا سی آہٹ پہ اماں چونک جاتیں۔ فون کی ہر گھنٹی پہ انہیں یہی گمان ہوتا کہ احمد نے فون کیا ہوگا۔ مگر نہیں احمد نے یوں رابطہ توڑا کہ پھر مڑ کر ہی نہ دیکھا۔ اس کی آمد تو نہ ہوئی' مگر موت کی اطلاع آئی' وہ بھی ان کی موت کے تیسرے دن۔" وہ رونے لگیں۔ مقتدی نے ان کا سر اپنے سینے سے لگا دیا۔

"اچھا امی۔۔۔ بس بہت ہوگیا۔ طبیعت خراب ہوجائے گی آپ کی۔ آپ سو جائیں پلیز۔" اس نے ہلکے سے ماں کا سر تھپتھپایا۔

"ہاں۔۔۔ تم بھی جاؤ۔۔۔ سو جاؤ۔۔۔ پھر آفس میں بھی تھک جاتے ہو۔ میں سوتی ہوں۔۔۔ تم جاؤ آرام کرو۔" امی نے اسے تسلی دی تو وہ بھی سر ہلاتا اٹھ کھڑا ہوا۔

☼ ☼ ☼

"نباء۔۔۔ یہ کچھ فائلز ہیں۔ ان کو احتیاط سے دیکھ لینا۔ شام تک میں لے لوں گا پھر۔" مقتدی تیزی سے اس کے آفس میں آیا تھا اور فائلز اس کے سامنے میز پہ رکھتے ہوئے واپس مڑنے لگا۔ اس کے انداز میں جس قدر تیزی تھی۔ نباء بخوبی سمجھ سکتی تھی کہ اس وقت اسے روکنا کس قدر لطف دے سکتا ہے۔

"سوری۔۔۔ میں فارغ نہیں ہوں۔" اس نے قدرے اونچے لہجے میں کہا مقتدی ٹھٹک کے رکا۔ وہ مڑا تو نباء اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"کیا مطلب۔۔۔" اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"اب تم اتنے بچے بھی نہیں ہو مقتدی کہ میں تمہیں ہر بات کا جواب دے سکوں۔ میں نے تمہیں یہاں آتے ہی کلیئر کر دیا تھا کہ میں صرف یہاں اپنا حق لینے آئی ہوں۔ تمہاری نوکری کرنے نہیں آئی۔ میں یہاں جاب نہیں کرتی۔ جتنا یہ تمہارا آفس ہے اتنا ہی میرا بھی۔ سو تم کون ہوتے ہو یوں مجھے آرڈر دینے

والے۔" اس نے غصے سے کہا تو مقتدی چند لمحے اسے یوں گھورتا رہا، پھر ایک دم سے مسکرا دیا۔
"بس ہو گئی بات ختم۔" اس کا انداز ناک سے مکھی اڑانے جیسا تھا۔ وہ کہہ کر مڑنے ہی لگا کہ نباء اس کے سامنے آ گئی۔
"بات تو شروع ہوئی ہے مقتدی۔۔۔ تم لوگوں کے دل میں میری ماں کے لیے کتنی نفرت ہے۔ یہ میں اچھی طرح جان چکی ہوں کل رات۔" اس نے تلخی سے کہا تو مقتدی چونک پڑا۔
"تو تم نے میری اور امی کی باتیں سنی ہیں چھپ کر۔" وہ سنجیدہ ہوا۔
"مجھے کوئی شوق نہیں میں صرف زینی کو ڈھونڈ رہی تھی۔ کام تھا مجھے اس سے کہ اچانک تم لوگوں کی باتیں میرے کان میں پڑ گئیں تھیں۔"
"اور تم وہیں کھڑی رہ گئیں۔"
"بات مت بدلو مقتدی۔۔۔ تم لوگوں کو میری ماں کا قصور تو نظر آتا ہے۔ پر اپنا نہیں۔۔۔ میری ماں اور میں نے بابا کے بعد کتنی تکلیفیں گزاریں۔۔۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی میں ساری عمر تہی دامن رہی۔ ساری عمر یہی احساس مجھے جلاتا رہا کہ میں اپنے ماموؤں کے احسانات تلے دبی ہوئی ہوں۔ میں ان کے سامنے نہ تو سر اٹھا کر کھڑی ہو سکتی ہوں نہ ہی اپنا وقار، اپنی عزت نفس کے ساتھ۔۔۔ تم لوگوں نے ہی ہمیں بے سہارا کیا۔ صرف بابا کے اپنوں نے۔۔۔ لیکن اب مزید نہیں۔۔۔ تم جتنی جلدی ہو سکے مجھے میرا حصہ دے دو۔" وہ چلائی تو مقتدی لب کاٹ گیا۔ ضبط سے اس کا چہرہ سرخ پڑنے لگا تھا۔
"تمہیں تمہارا حصہ دینے سے کس نے انکار کیا۔ لیکن سچ بتاؤ نباء۔ کیا تمہیں ذرا سا بھی لگتا ہے کہ تمہارے ہمارے گھر آنے سے کسی کے ماتھے پہ شکن بھی آئی ہو۔
کیا تم نے نوٹس نہیں کیا۔ پاپا تمہارے آنے سے ایک دم کھل سے گئے ہیں۔ میں نے انہیں اتنا فریش زندگی میں اس وقت بھی نہیں دیکھا جب میں نے یونیورسٹی میں ٹاپ کیا۔ جب میں نے اپنی دوسری فیکٹری کا سنگ بنیاد رکھا۔ لیکن تمہارے آنے کے بعد وہ دوبارہ ان خوشیوں کو نوٹس کرنے لگے ہیں۔
کیا۔۔۔ تمہیں دادو نظر نہیں آتیں۔ ان کی صحت میں کتنا اچھا چینج آیا ہے۔ ہم سب تم میں احمد چاچو کو تلاشتے ہیں۔ کیا تمہیں یہ سب نظر نہیں آتا۔"
مقتدی نے اس کا دایاں بازو پکڑ کر اسے ہلایا۔
"یہی سب تو میں نہیں دیکھنا چاہتی۔" اس نے جھٹکے سے بازو چھڑایا۔
"کیوں تلاش کرتے ہو۔۔۔ اب تم سب مجھ میں بابا کو۔۔۔ یہی عزت، یہی پیار، یہی احترام ان کو دیا ہوتا تو وہ ہمارے درمیان ہوتے۔ جب ان کے لیے تم سب کے پاس یہ سب نہیں تھا تو میرے لیے کیوں، یہ سب جھوٹا دکھاوا ہے۔ تم سب کو اب یہی فکر لاحق ہے۔ جو میری ماں اور پاپا چاہتے تھے۔ میں بھی وہی نہ مانگ بیٹھوں۔ تم لوگ ہم سے نہیں، پیسے سے پیار کرتے ہو۔"
"یہ صرف تمہاری غلط سوچ ہے۔" مقتدی کو تاسف ہوا۔
"نہیں مسٹر مقتدی۔۔۔ اگر تم لوگوں کو مجھ سے حقیقی پیار ہوتا تو تم لوگ ہمیں یوں لاوارث نہ چھوڑتے اور جب اب میں بڑی ہو گئی تو تم لوگوں کو پھر سے اس فکر نے آلیا کہ آج تک جو تم لوگ اکیلے انجوائے کرتے رہے، اس میں پھر ایک حصہ دار پیدا ہو گیا۔ یقین کرو دادو اگر اپنی بیماری کے بہانے مجھے نہ بلواتیں تب بھی میں اپنا حصہ وصولنے ضرور آتی۔ اپنے بابا کا حق کبھی نہ چھوڑتی۔" اس کے تلخ لہجے کے باوجود اس کی آنکھوں کے بہتے آنسوؤں نے مقتدی کو سخت دکھ دیا تھا۔ وہ چاہ کر بھی اس کے آنسو صاف نہ کر سکتا تھا۔
"تم جو چاہتی ہو نباء ویسا ہی ہوگا۔ مگر پلیز آئندہ کسی بھی بات کے لیے اتنا پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔" اس کے دھیمے لہجے پہ نباء کی آنکھوں میں حیرت ابھری تھی۔ مقتدی کی آنکھوں میں جو کچھ بھی تھا اس کے لیے حیرت انگیز تھا۔ اس کے اس قدر

شدید برتاؤ کے بعد بھی وہ معتضدی سے ایسی نرمی کی توقع ہرگز نہ کرتی۔ وہ جا چکا تھا مگر نباء کو لگا جیسے وہ اپنا آپ اس کے پاس ہی چھوڑ گیا تھا۔

معتضدی نے زیادہ اس کے سامنے آنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے آفس آنے جانے کے لیے گاڑی بھی الگ کردی تھی اس نے۔ اب وہ اس سے بات کرنے کا بھی موقع نہ ڈھونڈ پاتی۔ اسے دل ہی دل میں اپنے رویے پہ شرمندگی ہوتی مگر وہ ظاہر نہ ہونے دیتی۔

زیبی اور ارتضٰی کے ساتھ بھی اس کا رویہ بس سو سو ہی تھا۔ تایا بھی جب تک خود نہ اس بلاتے وہ ان کے سامنے جانے سے کتراتی۔ تائی البتہ اب اس کے ساتھ نرمی سے پیش آنے لگیں۔ مگر اسے یہ بھی معتضدی کا ہی کوئی ڈرامہ لگتا۔

البتہ دادو کے ساتھ وہ کافی الیج ہو گئی تھی۔ ان کے ساتھ بیٹھنا' پرانے وقتوں کی باتیں سننا اور اپنے بابا کا بچپن جاننا' ان کی جوانی کے قصے سننا اسے بے حد دلچسپ لگتا۔

☆ ☆ ☆

آج موسم بے حد خوش گوار تھا۔ صبح سے ننھی ننھی بوندا باندی نے ماحول کو عجب سحر انگیزی بخشی۔ وہ شال لے کر باہر صحن میں ٹہلنے لگی۔ تب ہی اس نے زیبی اور ارتضٰی کو بائیک لے کر باہر نکلتے دیکھا اور اسی وقت ارتضٰی کی نگاہ بھی اس پر پڑ گئی۔

"اوئے میاؤں۔ چلو ساتھ۔ انجوائے کریں گے۔" ارتضٰی نے ہاتھ ہلایا اور وہ جوابی نفی میں سر ہلانے ہی لگی تھی۔ معتضدی کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔

"تم لوگ جاؤ۔ نباء عادی نہیں ہے۔ اس کی طبیعت بھی خراب ہو سکتی ہے۔" ٹیرس پہ کھڑا بلیک ٹو پیس سوٹ میں ملبوس وہ بے حد نکھرا نکھرا الگ رہا تھا۔

"نہیں ارتضٰی۔ میں بھی چلوں گی پلیز۔" وہ چلائی۔ اس نے دیکھا معتضدی کے چہرے پہ ایک دم ہی سنجیدگی طاری ہوئی تھی۔ وہ ٹیرس سے جا چکا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے برا لگا۔

"جلدی آؤ نا پھر۔" زیبی چلائی۔

اس کا دل چاہا کہ منع کردے۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر چلی آئی اور پھر ارتضٰی نے ان دونوں کو خوب گھمایا۔ اس نے بھی جی بھر کے انجوائے کیا۔

برستی بارش میں ارتضٰی نے انہیں خوب گھمایا۔ پشاور کی کتنی ہی مشہور جگہیں دیکھیں' خاص طور پہ اسے فردوس سینما کے ساتھ جلیل کے کباب بے حد پسند آئے۔ اس نے خاص طور پر فرمائش کرکے ارتضٰی سے گھر کے لیے بھی پیک کروائے تھے۔

"اے میاؤں۔ چنے چاٹ کھاؤ گی۔" اچانک ہی ارتضٰی کو خیال آیا۔

"ہاں۔ ہاں میں کھاؤں گی۔" زیبی مچلی۔

"میں تم سے نہیں نباء سے پوچھ رہا ہوں۔" ارتضٰی نے اسے چڑایا۔

"نباء کو تو رہنے دو۔ یہ تو گھر کا کھانا بھی بہت مشکل سے ہضم کرتی ہے' کہاں یہ مرچ مسالے والی چاٹ۔" زیبی ہنسی۔

"نہیں بھئی۔ اب تو میں ضرور کھاؤں گی۔ ویسے بھی لائف میں کبھی کبھی ایڈونچر بھی ہونا چاہیے۔" نباء نے بھی ہنستے ہوئے کہا تو اس بار زیبی کے ساتھ ارتضٰی بھی ہنس دیا۔

"یہ ہوئی نہ شیروں والی بات۔" ارتضٰی نے بائیک ایک چھپر نما ہوٹل کے اندر جا روکی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ مزے سے چاٹ کھا رہے تھے۔ ارتضٰی کے سوا ان دونوں کا برا حال تھا۔ وہ دونوں مسلسل سی سی کیے جا رہی تھیں۔ نباء کو مشکل ہوئی' مگر زیبی کی دیکھا دیکھی اس نے بھی خوب کھائی۔ تب ہی ارتضٰی کے سیل پہ بپ ہوئی۔ اس نے احتیاط سے سیل نکالا۔ معتضدی کی کال تھی۔

"جی بھائی۔" اس نے دونوں کو اشارہ کرکے چپ رہنے کا کہا۔

"کہاں ہو تم سب میں آتا ہوں تمہیں لینے۔ بارش تیز ہو رہی ہے۔ ایسے میں بائیک خطرناک بھی ہو سکتی

ہے۔" مقتدی کی آواز میں پریشانی تھی۔
"ڈونٹ وری بھائی ہم ٹیکسی لے لیں گے۔"
"چلو یہ ٹھیک ہے اور نباء میرا مطلب ہے اسے زیادہ باہر کی چیزیں مت کھلانا۔ وہ اس سب کی عادی نہیں ہے نا۔" مقتدی کے کیئرنگ انداز پہ ارتضیٰ خود بخود مسکرا دیا۔
"نہ بھائی۔ میری ذمہ داری ہیں۔ آپ بالکل آرام کریں۔" اس نے زینی کو آنکھ ماری۔ نباء نا سمجھی سے دونوں کو دیکھنے لگی۔
"مقتدی بھائی کچھ زیادہ ہی تمہاری کیئر نہیں کرنے لگے۔" کال ختم ہوتے ہی اس نے ڈائریکٹ نباء کو مخاطب کیا۔
"سو واٹ۔ آئی ڈونٹ کیئر۔" نباء کے اس قدر صاف جواب پہ ارتضیٰ چپ سا ہو گیا۔
"میرے خیال میں چلنا چاہیے۔" زینی نے باہر برستی بارش میں تیزی محسوس کرتے ہوئے کہا۔
"ہاں تم لوگ رکو۔ میں ٹیکسی دیکھتا ہوں۔" ارتضیٰ نے کہا اور چھپر سے باہر چلا گیا۔ نباء مقتدی کے متعلق سوچنے لگی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اگر وہ صرف چند دن اور رہی یہاں تو مقتدی کی شخصیت کا سحر ضرور اسے جکڑ لے گا۔ وہ جتنا اس سے دور رہنے کی کوشش کرتی دل اتنا ہی اسے دیکھنے کی چاہ کرتا۔ وہ اپنی حالت سمجھنے سے خود قاصر تھی۔ "چلو ٹیکسی آ گئی۔ میں بائیک چاچا کے حوالے کر کے آیا۔" وہ اس چھپر ہوٹل کے مستقل کسٹمر تھے اور اس کے مالک سے اس کی خوب دوستی تھی۔ تب ہی انہیں کوئی مشکل پیش نہ آئی تھی۔ ٹیکسی کی وجہ سے وہ بارش میں مزید بھیگنے سے محفوظ رہے تھے۔ مگر نباء کو سخت سردی محسوس ہو رہی تھی۔
"آر یو اوکے نباء۔" زینی کو لگا وہ ٹھیک نہیں تھی۔
"ہاں۔ ہاں آئی ایم اوکے۔" گھر پہنچتے ہی اس نے جلدی سے کپڑے تبدیل کیے۔ تب کہیں جا کے اسے کچھ سکون ملا۔ وہ اور زینی ابھی بستر میں گھسے ہی تھے کہ ارتضیٰ اور مقتدی بھی وہیں چلے آئے۔ مقتدی کے ہاتھ میں ٹرے میں موجود کپوں سے اڑتی بھاپ نے انہیں خوش کر دیا۔
"میں نے سوچا تم لوگ سردی انجوائے کر کے آؤ گے تو گرما گرم کافی ہونی چاہیے۔" مقتدی نے کہتے ہوئے ٹرے ارتضیٰ کو تھما دی۔ سب ہی تیزی سے اپنے کپ اٹھانے لگے۔
"واؤ تھینک یو بھیا۔ یو آر گریٹ۔" زینی نے کہا تو مقتدی مسکرا دیا۔
"پھر بھی آج تم لوگوں کو ایسے جانا نہیں چاہیے تھا۔ کافی ٹھنڈ ہے۔ تم لوگ بیمار بھی پڑ سکتے تھے۔" مقتدی نے عادت سے مجبور ہو کر ہدایت دی۔
"ارے نہیں ہم نے تو خوب انجوائے کیا' کیوں زینی۔" نباء تیزی سے بولی اور اس سے پہلے کہ زینی اس کی بات کا جواب دیتی نباء کو زور کی چھینک آئی۔
"اوہ آئی سی۔ اس کا مطلب ہمارے گھر میں ہی سردی تھی۔ باہر تو گرمی پڑ رہی تھی۔" مقتدی اسے یوں چھینکتا دیکھ کر شرارتی ہوا۔ زینی اور ارتضیٰ ہنس پڑے۔
"کافی جلدی جلدی ختم کر لو' اچھا فیل کرو گی۔" مقتدی نے نباء کو اشارہ کر کے کہا تو وہ خاموشی سے اثبات میں سر ہلا گئی۔
"اور تم لوگوں نے کچھ الا بلا تو نہیں کھایا تھا نا باہر۔ تم لوگ تو پھر بھی عادی ہو۔ مگر نباء نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ معدے میں بھی گڑبڑ ہو جائے۔ ویسے بھی دو' تین دن آفس میں اس کی بہت سخت ضرورت ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا' تو زینی ہونٹ دانتوں تلے دبا گئی۔ جبکہ نباء کا دل چاہا کافی کا کپ اسے دے مارے۔
"نہیں بھائی' میں کیوں ان کو کوئی غلط چیز کھلاتا۔" ارتضیٰ نے معصومیت سے کہا اور بھائی کے پیچھے ہی کمرے سے نکل گیا۔
تب ہی نباء کو پیٹ میں سخت مروڑ سی محسوس ہوئی۔ وہ تیزی سے واش روم کی طرف لپکی۔ جب وہ باہر آئی تو زینی اسے چڑا کر ہنسنے لگی۔ "کالی زبان والا" نباء نے دل ہی دل میں مقتدی کو نوازا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح جب دیر تک نباء نہ جاگی تو مجبوراً" زینی کو اسے جگانا پڑا۔ مگر نباء کے ہاتھ کو چھوتے ہی وہ گھبرا گئی۔ کیونکہ اسے بخار ہو رہا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سب گھر والے اس کے گرد جمع تھے۔ ارتضیٰ ڈاکٹر کو لے کر آیا تو ڈاکٹر نے معمولی زکام بخار بتا کر سب کو مطمئن کیا۔

ارتضیٰ نے مقتدی کو بھی فون کر کے بتا دیا۔ وہ بھی جلدی گھر لوٹ آیا تھا۔ نباء اب کچھ بہتر تھی۔ مگر بخار ٹھیک سے نہیں اترا تھا۔ وہ اس کے کمرے میں آیا تو وہ اکیلی لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔

"مجھے زمین پہ ڈھونڈا کرو۔ میں اتنی آسانی سے آسمانوں پہ جانے والا نہیں۔" نباء خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔

"منع کیا تھا نا کہ نہ جاؤ۔ مگر تمہیں تو بچپن سے نہ جانے مجھ سے کیا ضد ہے۔ خیر دوائی لی۔" مقتدی کے اس قدر کیئرنگ انداز پہ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"کیا ہوا نباء۔ آر یو آل رائٹ۔" وہ پریشان ہوا۔

"جب بھی میں تم سے بات کرتا ہوں تم ایسے کیوں بی ہیو کرتی ہو جیسے میں کوئی انجان ہوں تمہارے لیے' ہم کزن ہیں' باقی کوئی رشتہ نہ سہی' خون کا گہرا رشتہ ہے ہمارا۔ تم مجھ سے ہر بات شیئر کر سکتی ہو۔"

"مجھے اس سب پہ یقین نہیں آتا مقتدی۔ میرے لیے تم سب کا پریشان ہونا۔ میری خدمت کرنا۔ مجھ پہ اپنی محبت نچھاور کرنا۔ میرا دل لاکھ چاہے' مگر میرا دماغ اس سب کی نفی کرتا ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا۔" وہ سسک پڑی۔ مقتدی اسے دیکھتا رہا۔

"میں نے تم سے وعدہ کیا ہے نا کہ تمہارا مکمل حصہ تمہیں مل جائے گا۔ سو بس دل اور دماغ کو اس جنگ سے آزاد کر دو۔ جتنے دن چاہو یہاں رہو۔ کسی کو پرکھو مت نہ ہی یہاں کے کسی فرد کے رویے کو جج کرو۔ اس سے طاقت ور رشتے کمزور اور کمزور رشتے مکمل طور پر ٹوٹ جاتے ہیں نباء۔ کمزور ہی سہی۔ یہ سب تمہارے اپنے ہی ہیں۔ اگر جھوٹی محبت بھی تمہاری جھولی میں آ جائے تو بخوشی قبول کر لو۔ نیت صرف خدا جانتا ہے۔ یہ ہم انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ اب پلیز تم ریلیکس کرو۔ بعد میں بات کریں گے ہاں۔ تم دماغ پہ زیادہ زور مت دو۔" اس نے سائیڈ پہ لگا سوئچ آف کرتے ہوئے کہا اور باہر نکل گیا۔ نباء نے نم پلکیں فوراً" ہی بند کر لیں۔ چند لمحوں میں ہی وہ سو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

صبح اس کی طبیعت کچھ بحال تھی۔ اسی لیے اس نے آفس کے لیے تیاری کر لی تھی۔ مگر مقتدی نے اسے دیکھتے ہی صاف انکار کر دیا تھا۔

"تم ہوتے کون ہو مجھے منع کرنے والے۔" وہ اس کے پیچھے چلتے ہوئے اس کے کمرے میں آ گئی تھی۔

"میں آفس جاؤں گی او کے۔" مقتدی کی خاموشی پہ وہ مزید بھڑک اٹھی۔ "او کے ایز یو وش۔" مقتدی نے کندھے اچکائے اور موبائل نکال کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ نباء باہر جانے کے لیے پلٹی کہ مقتدی کی بات سن کر ٹھٹک کے رکنا پڑا۔

"ہاں سرور۔ آفس میں آج چھٹی کا اعلان کر دو۔" وہ واپس مڑی۔ مقتدی اس کی طرف دیکھتے ہوئے دوسری طرف کچھ سن رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ ساری میٹنگز کل پہ رکھ دو۔ مگر آج آفس بند ہونا چاہیے۔" اس نے قطعی لہجے میں کہتے ہوئے کال ختم کر دی۔

"تم پاگل ہو۔" وہ اس کے قریب آئی۔

"اگر ہوں تو۔" مقتدی مسکرایا۔

"تم جانتے ہو ان میٹنگز کے کینسل ہونے سے تمہیں لاکھوں کا نقصان ہو گا۔" نباء حیران تھی۔

"سو واٹ۔ جتنا بھی نقصان ہو۔ تمہاری صحت سے بڑھ کر کچھ نہیں۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ نباء کا دل دھڑکا۔

"میں رشتوں کو ویلیو دیتا ہوں نباء۔ میرے نزدیک پیسوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ اب تمہارے پاس سوائے ریسٹ کرنے کے اور کوئی آپشن نہیں بچا۔ سو ٹیک

کیئر۔" اس نے دھیرے سے نباہو کا کندھا تھپتھپایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ نباہو اپنے آس پاس صرف اس کی خوشبو محسوس کرتی رہی۔

☆ ☆ ☆

دوسرے دن بھی وہ گھر پر تھی۔ اس نے پھر آفس جانے کی ضد نہ کی تھی۔ ویسے بھی وہ ابھی تک خود کو کمزور سا محسوس کر رہی تھی۔ بخار نے جیسے اس کی ساری توانائی کھینچ لی تھی۔ ارتضیٰ اور زینی بھی کالج گئے ہوئے تھے۔ تایا جان اور دادو بھی سو رہے تھے ورنہ اس کا ٹائم اچھا گزر جاتا۔ تائی کو تو گھر کے کاموں سے ہی فرصت نہ ملتی۔ وہ اکیلی بور ہو رہی تھی۔

"پارک میں جاتی ہوں۔ آج موسم بھی اچھا ہے۔ تھوڑی چہل قدمی کروں گی تو طبیعت بھی اچھی ہو جائے گی۔" وہ چادر لے کر باہر آئی تو تائی امی گیلے کپڑے تار پہ ڈال رہی تھیں۔

"تائی امی۔ میں ذرا یہ سامنے پارک تک جا رہی ہوں۔" اس نے کہا اور ان کا جواب سنے بنا ہی تیزی سے گیٹ پار کر گئی۔

"ناراض تو ہوں گی لیکن اب میں ان کی ہر بات بھی نہیں مان سکتی۔"

اس نے غلط کام کیا تھا تبھی خود کو جھوٹی دلیل بھی پیش کی یہ اور بات کہ اس کا دل پھر بھی مطمئن نہ ہوا۔

موسم کافی اچھا تھا۔ نرم گرم دھوپ نے سردی کی شدت کو کافی کم کر دیا تھا۔ صاف ستھری تارکول کی سیاہ سڑک پار کر کے وہ پارک میں داخل ہوئی تو چاروں طرف پھیلے سبزہ زار نے روح و نظر میں عجیب سا سرور بھر دیا۔ پودوں کے پتے ابھی تک شادابی کا پتا دے رہے تھے۔ کہیں کہیں کچھ پودے ہی خزاں کی آمد کی نشانی بنے تھے۔ پتوں پہ پڑے چمکدار اوس کے قطرے ابھی تک تیز دھوپ نہ نکلنے کی وجہ سے خشک نہ ہو پائے تھے۔ خوب صورت سرسبز گھاس کے درمیان کہیں کہیں ماربل کی ہلکی روش ڈال دی گئی تھی۔ جس سے اس باغ کی خوبصورتی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ بہت دور پودے ابھی تک دھند کی دبیز تہہ میں لپٹے نظر آ رہے تھے۔ وہ کئی ثانیوں تک اس فسوں خیز منظر کو تکتی رہی۔

باغ میں لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ ویسے بھی روزمرہ مصروفیات کے باعث لوگ صرف فراغت کے روز ہی ادھر زیادہ آتے تھے۔

وہ سنگی روش پہ آگے بڑھنے لگی۔

خود بخود ہی اس کا دماغ اپنے اور ددھیال کے رشتے کو سوچنے لگا۔

اس نے ہمیشہ اپنے ماموؤں اور نانو سے جو کچھ سنا تھا، وہ سب یہاں وہ باوجود کوشش کے بھی نہ ڈھونڈ پائی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کی ماں نے کبھی اس کے سامنے اس کے باپ کے خاندان کی برائی نہ کی تھی۔ مگر یہ بھی ایک سچ تھا کہ اس کی ماں پاپا کے یہاں آنے سے سخت چڑتی تھیں۔ پاپا اکثر ان کو ساتھ چلنے کا کہتے مگر وہ ہمیشہ انکار کر دیتیں۔ اور واپسی پہ بھی کئی کئی دن ان کا موڈ آف رہتا۔ اور وہ ہمیشہ یہی سمجھتی کہ ان کو عزت نہیں ملتی تبھی ان کا وہاں جانا پسند نہیں۔ پھر اپنی امی کی خاطر ہی اس نے بھی پاپا کے ساتھ جانا چھوڑ دیا تھا۔ اور اتفاق کی بات ہی تھی کہ پاپا بھی اس کے بعد صرف ایک بار وہاں گئے۔ نہ جانے وہاں کیا ہوا کہ پاپا نے پھر مرتے دم تک وہاں کا رخ نہ کیا۔ وہ ان سب کا ذمہ دار اپنے ددھیال والوں کو ہی سمجھتی اور اس کی نانو اور ماموؤں کی باتوں نے اس کی اس سوچ کو مزید پختہ کر دیا تھا۔

لیکن یہاں آ کر وہ ہر روز تقریباً نئی باتوں سے آگاہ ہو رہی تھی۔ تایا جان اور دادو کی ہر بات میں احمد کا ذکر تھا۔ اتنا دکھاوا بھلا کون کر سکتا ہے۔ گھر کے ہر کمرے کی دیواروں پہ اس کے پاپا کی مسکراتی تصویریں سجی تھیں۔ اتنی پروا کون کرتا ہے جب تک سچی محبت نہ ہو دلوں میں۔ اس نے دن میں دو دو مرتبہ تائی جان کو وہ تصویریں صاف کرتے دیکھا تھا۔ وہ ان پر گرد کی ہلکی سی تہہ بھی نہ جمنے دیتیں تو کیا یہ سب وہ صرف اسے دکھانے کے لیے کر رہی تھیں۔ اس وقت بھی جب ان کی طبیعت سخت خراب ہوئی وہ اتنی تکلیف میں تھا محبت کے

کیسے کر سکتی تھیں۔

اس کے بابا کا کمرہ ویسے کا ویسا پڑا تھا۔ وہاں پہ سوائے تائی امی اور دادو کے کسی کو بھی دوسرے کو جانے کی اجازت نہ تھی کہ کہیں کوئی چیز اپنی جگہ سے نہ ہلا دے۔ اس کے بابا کے سارے ڈریس آج بھی ایسے احتیاط سے ہینگ تھے جیسے تائی امی اور دادو کی بہت بڑی متاع ہوں۔ جبکہ خود اس کی ماٹو نے امی کے اتنے اصرار کے باوجود بابا کے سب قیمتی سوٹ دونوں ماموؤں میں تقسیم کر دیے تھے اور باقی آس پڑوس کے غریب لوگوں میں۔

سب گھر والے اس کا کتنا خیال کرتے تھے۔ اس نے کتنی دفعہ ان سے بدتمیزی کی، سخت الفاظ استعمال کیے لیکن ان سب نے درگزر کر دیا۔ خصوصاً" مقتدی اسے کیا پڑی تھی کہ وہ اس کا غصہ برداشت کرتا۔ وہ مرد تھا۔ چاہتا تو اس سے بھی زیادہ سخت جواب دے سکتا تھا اسے، مگر اس کے معاملے میں مقتدی ہمیشہ خاموش ہو جاتا۔ اور اس کی وہ دوستانہ مسکراہٹ، مقتدی کا مسکراتا چہرہ نظروں کے سامنے آتے ہی خود بخود اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہوئے ہوئے۔ صدقے ہو جائیں۔ کیا مسکراہٹ ہے۔" انتہائی غلیظ لہجے پہ نباء چونکی تھی۔ اور سامنے کھڑے تین عجیب و غریب حلیے کے لڑکوں کو دیکھ کر اسے کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا۔ اس نے غور کیا۔ وہ سوچوں میں گم باغ کے کافی اندر تک چلی آئی تھی۔ اور اس وقت باغ کا یہ کونا بالکل سنسان پڑا تھا۔ ان کے چاروں طرف پیپل، سرو اور چنار کے اونچے درخت تھے۔ اور وقفے وقفے سے کیاریوں میں لگے گلابوں کے پودے جن کے پھول تو جھڑ چکے تھے مگر خار ابھی تک موجود تھے۔ چھوٹی قمیصوں اور کھلے پائنچوں والی لمبی شلواروں میں ملبوس وہ افراد اسے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق نظر آ رہے تھے۔ گھبراہٹ سے اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ تینوں دانت نکالے دھیرے دھیرے اس کے گرد پھیلنے کی کوشش کرنے لگے۔ نباء ڈر کر پیچھے ہٹی تو گلابوں کی کیاری میں جا گھسی۔ کتنے ہی خار اس کی ٹانگیں چھلنی کر گئے۔ وہ ہلکی سی سسکاری بھر کر رہ گئی۔ وہ تینوں لڑکے باقاعدہ ہنسنے لگے تھے۔ تبھی ایک نے جرات کر کے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا۔ نباء نے پورا زور لگا کے اسے دھکا دیا۔ اور اسی روش پہ واپس دوڑنے لگی جس پر چلتے چلتے وہ یہاں تک پہنچی تھی۔ کچی روش پہ اس کے پیچھے جوتوں کی پکار بے حد واضح تھی۔ لیکن نباء دوڑتی گئی۔ تبھی اچانک ہی وہ کسی مضبوط وجود سے ٹکرائی تھی۔ وہ خود کو سنبھال نہ سکی اور سامنے والے کے بازوؤں میں جھول گئی۔ مقتدی پہ نظر پڑتے ہی وہ اس کے مزید قریب ہو گئی تھی۔ آنسو خود اس کا چہرہ بھگونے لگے تھے۔

"کہاں چلی گئیں تم۔ میں کتنی دیر سے یہاں تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔" وہ حیرت سے ڈری سہمی نباء سے پوچھ رہا تھا۔ اس کی تیز نظریں ارد گرد کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ مگر وہ تینوں لوفر اس کو دیکھتے ہی رفوچکر ہو چکے تھے۔ تبھی اسے نظر نہ آئے۔

"نباء کیا ہوا ہے۔" ہچکیوں میں روتی نباء نے اسے جھنجلا دیا۔

"وہ غنڈے۔ غنڈے۔" وہ مزید تیزی سے رونے لگی۔ مقتدی سارا معاملہ سمجھ گیا۔

"تو تمہیں میں نے سمجھایا تھا ناکہ یہ اسلام آباد نہیں پشاور ہے۔ یہاں عورتوں کا اس طرح اکیلے گھومنے پھرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ تم انتظار نہیں کر سکتی تھیں کہ میں یا ارتضیٰ گھر آ جاتے۔ تم کیوں ہمارے لیے مسائل کھڑے کرنا چاہتی ہو نباء۔" اس نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اپنے سامنے کیا۔

"اب اگر میں نہ آتا اور تمہیں کچھ ہو جاتا تو کیا منہ دکھاتا میں اپنے مرحوم چاچا کو اور تمہاری امی کو۔ وہ تو شکر ہے خدا کا کہ امی نے مجھے کال کر کے جلدی گھر آنے کا کہا۔ اور میں بھی فوراً نکل آیا۔ ورنہ۔" غصے سے اس کا چہرہ لال پڑنے لگا تھا۔ نباء خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔

"اب گاڑی میں بیٹھو گی یا اٹھا کر لے جاؤں۔" مقتدی نے ہونٹ چباتے ہوئے سخت لہجے میں کہا تو

نباء کانپ گئی۔ مقتدی کو اپنے سخت الفاظ پہ تاسف سا ہوا مگر وہ آگے بڑھ گیا۔ نباء کو پاؤں میں سخت تکلیف محسوس ہو رہی تھی مگر بادل نخواستہ وہ بھی خود کو گھسیٹتی اس کے پیچھے ہولی۔ تکلیف سے اس کے آنسوؤں میں مزید روانی آگئی۔ اسے خود پہ حیرت بھی تھی کہ غنڈوں سے جان بچانے کے لیے وہ اتنی تیزی سے بھاگی مگر اسے درد کا شائبہ تک محسوس نہ ہوا۔ اور اب ۔۔۔ واقعی کچھ تکلیفیں اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ انسانی وجود کوئی اور درد محسوس کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ اپنے وجود پہ غلیظ نظروں کا حصار کتنا دردناک تھا۔ وہ جھرجھری لے کر رہ جاتی۔ مقتدی اسے گیٹ پہ ہی چھوڑ کے گاڑی بھگا لے گیا تھا۔ اور وہ اندر جا کر تائی امی کے گلے لگ کر خوب روئی۔ تائی امی نے اس کے زخمی پیر دیکھ کر مقتدی کو منہ ہی منہ بڑبڑاتے ہوئے خوب سنائیں۔ اس نے دل ہی دل میں آئندہ کبھی اکیلے باہر نہ جانے کی قسم اٹھائی۔

✡ ✡ ✡

سرد راتوں کو نرم گیلی گھاس پہ ننگے پیر چلنا اسے شروع سے بے حد پسند تھا۔ مگر آج نہ جانے کیوں اس کے دل پہ اس قدر اداسی چھائی تھی کہ کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ صبح والا واقعہ اسے بھلائے نہیں بھول رہا تھا۔ بار بار کسی آسیب کی طرح اس کے ذہن پہ سوار ہو گیا تھا۔ وہ لان میں آکر پلاسٹک چیئر پہ بیٹھ گئی۔ سر میں اٹھنے والی ہلکی ہلکی ٹیسوں کو ٹھنڈی نرم ہوا نے کافی کم کیا تھا۔ وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر کے خود کو پرسکون کرنے لگی۔

"آئی ایم سوری نباء" بہت قریب نرم سا تاثر لیے مردانہ آواز پہ اس نے جھٹ سے آنکھیں کھولی تھیں۔

سرمئی اونی شال لپیٹے مقتدی اپنی مکمل سحر انگیز شخصیت لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے اس قدر نرم لہجے پہ نباء کی آنکھیں بھر آئیں۔

"دراصل میں اتنا گھبرا گیا تھا یہ سوچ کر کہ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا یا ۔۔۔" وہ رکا۔ نباء کا دل دھڑکا۔ وہ کیا کہنے والا تھا۔ نہ جانے کیوں عورت کی چھٹی حس اتنی تیز ہوتی ہے۔ وہ سامنے والے کے انداز سے ہی جان جاتی ہے کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ اس کے متعلق۔ نباء کو لگا وہ کچھ خاص کہنے والا تھا۔ خود بخود اس کی پلکیں جھکنے لگیں۔ مقتدی نے اس کا یہ شرمیلا روپ آج پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ چپ رہ گیا۔

"کوئی بات نہیں۔" اس کی طویل خاموشی پہ نباء نے اس کی طرف دیکھے بنا ہی اس سکوت کو توڑا۔

"میری بات ابھی مکمل نہیں ہوئی نباء" مقتدی کے چہرے پہ وہی دوستانہ مسکراہٹ امڈ آئی۔ نباء اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"میں ڈر گیا تھا کہ اگر ۔۔۔ اگر میں تمہیں کھو دیتا۔" اس نے سادہ سے الفاظ میں کہا تھا۔ مگر نباء کا دل اس کے اختیار سے باہر ہونے لگا۔ مقتدی نے نظریں سامنے لگے انار کے درخت کی طرف پھیر لیں۔ نباء سمجھ نہ پائی یہ اقرار تھا یا پھر صرف رشتے داری کا بھرم۔

"یقین کرو۔ مجھے پتا بھی نہ تھا کہ تم زخمی ہو۔ ورنہ میں تمہیں اتنا سخت نہ سناتا۔ آئی ایم رئیلی سوری۔" اس نے بات ختم کر دی تھی۔ نباء کو ایک دم ہی مایوسی سی ہوئی۔ اسے خود اپنے آپ پر حیرانی ہوئی۔ "تو کیا وہ مقتدی مہدی کی طرف سے کسی اقرار 'اظہار کی منتظر ہے۔" اس نے حیرت سے سوچا۔

"آئندہ کبھی بھی ایسا مت کرنا نباء جب بھی تمہیں ضرورت ہو تو مجھے اور ارتضیٰ کو بلا تکلف کہہ سکتی ہو۔ اینی ٹائم۔ تمہیں ہماری ضرورت نہ ہو لیکن ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔" مقتدی نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا اور نباء اس کی گہری نیلی آنکھوں میں ڈوب سی گئی۔

"سردی بڑھ رہی ہے۔ اب کمرے میں جاؤ۔ ویسے بھی اس موسم میں بخار کا کافی اندیشہ ہوتا ہے۔ یوں نہ ہو پھر بخار ہو جائے ۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا تو نباء بھی اثبات میں سر ہلا گئی۔ اور اٹھ کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔

مقتدی یونہی اسے خود سے دور جاتا دیکھتا رہا۔

☼ ☼ ☼

"ارتضیٰ پلیز۔ مجھے تنگ مت کرو۔" وہ سی ڈی پلیئر پہ اپنی پسندیدہ فلم دیکھ رہی تھی۔ کہ ارتضیٰ اسے بلانے آگیا۔ ارتضیٰ اور زینی نے چھت پہ پتنگ اڑانے کا پروگرام بنایا تھا۔ مگر نباء نے بالکل صاف جواب دے دیا۔ لیکن وہ ارتضیٰ بھی کیا جو ٹل جاتا۔

"تنگ تو تم مجھے مت کرو میاؤں۔ سیدھی چلو۔ ورنہ آج کے بعد کبھی بات نہیں کروں گا۔" ارتضیٰ نے اس کے ہاتھ سے ریموٹ لینا چاہا۔

"ٹھیک ہے مت کرنا بات۔ بس۔" نباء نے جیسے ناک پر سے مکھی اڑائی۔

"او۔ کے۔" اس نے تھوڑا سا سر جھٹکا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ نباء اس کے اس انداز پر دل سے مسکرادی۔ اور پھر سی ڈی آف کرکے باہر نکل آئی۔ مقتدی کے کمرے کے ذرا آگے چھوٹی سی سیڑھی چھت پہ جا نکلتی تھی۔ چھت کے چاروں طرف چھوٹی سی چاردیواری تھی۔ وہ مقتدی کے کمرے کے سامنے سے گزرنے لگی۔ تبھی مقتدی کے منہ سے اپنی امی کا نام سن کر رک گئی۔

"بانو جی۔ انسان تب تک نہیں سنبھلتا جب تک وہ خود نہ سنبھلنا چاہے۔ معاف کیجیے گا مگر یہ سچ ہے کہ آپ نے ہمیشہ غلطی کی اور سارا کچرا دوسروں پر ڈال دیا۔ اور اس بار پھر آپ غلطی کررہی ہیں۔ جو چیز آپ کو خود ہینڈل کرنا چاہیے تھی آپ نے دوسروں کے سر ڈال دی۔" نباء کو حیرت سے زیادہ اپنی ماں پر غصہ آنے لگا۔ آخر وہ کیوں مقتدی کی یہ باتیں برداشت کررہی تھیں۔ وہ کون ہوتا تھا اس کی ماں کی غلطیاں جتانے والا۔ مقتدی کچھ پل خاموش رہا۔

"سوری۔ مگر نباء اب بچی نہیں رہی۔ اور میں بھی آپ کی ہر بات نہیں مان سکتا۔ نباء کو اب اپنا صحیح غلط خود سمجھنا ہوگا۔ نباء کے معاملے میں مجھ سے کسی قسم کی کوئی توقع نہ رکھیے گا۔ اللہ حافظ" اس نے کھٹاک سے فون رکھ دیا۔ نباء تیزی سے وہاں سے ہٹ گئی۔ اور اوپر جانے لگی۔ مقتدی کی باتوں سے جہاں اسے اپنی ماں کی بے عزتی پہ شدید غصہ آرہا تھا۔ وہیں اسے عجیب سی الجھن بھی ہورہی تھی۔

"مقتدی کس حق سے امی سے اس لہجے میں بات کررہا تھا۔ میں اپنا اچھا برا اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں۔ کیا مقتدی نے غنڈوں والی بات امی کو بتادی۔ وہ سمجھتا کیا ہے خود کو۔ میری مدد کرکے وہ میرا اولی وارث بن گیا ہے۔ اور امی۔۔۔ امی نے اس سے بات کیوں کی۔ بے عزت کرکے فون بند کردیتیں۔" اسے بے حد غصہ آرہا تھا۔

"لو آگئی نا بو۔ میں نے کہا تھا نا کہ ضرور آئے گی۔" پتنگ اڑاتے ارتضیٰ کے ساتھ کھڑی زینی نے اسے دیکھتے ہی خوشی سے نعرہ لگایا۔ ارتضیٰ نے ایک خفا خفا سی نگاہ اس پر ڈالی اور دوبارہ اپنی توجہ پتنگ پہ مبذول کرلی۔

"لگتا ہے بہت زیادہ ناراض ہوگئی ہے میری بہن۔" نباء نے اس کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے ارتضیٰ کا کان کھینچا۔ تو وہ دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

"ہاں۔ تو کیوں نہ ہو تم نخرے بھی تو اتنے کرتی ہو۔" ارتضیٰ نے پیار سے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔ وہ کھل کے مسکرادی۔

"یار۔ قسم سے ہم دونوں نے زندگی کی ہر گیم میں' ہر خوشی میں تمہیں کتنا مس کیا تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ اور اب جب تم ہمارے ساتھ ہو کر بھی ہم سے دور بھاگتی ہو تو ہمیں ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔" ارتضیٰ نے صاف گوئی سے کہا اور نباء اس کے چہرے سے اس کے لفظوں کی سچائی جانچتی رہی۔

"مجھے یقین نہیں آتا۔" وہ بھی صاف گوئی سے بولی۔

"تمہیں یقین دلانے کی ضرورت بھی نہیں نباء۔ کیونکہ یقین دلوں میں ہوتا ہے۔ زبردستی پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ اور میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تمہیں یقین آئے گا۔ اعتبار و فا ضرور پیدا ہوگا تمہارے

دل میں ہاں مگر یہ ہے کہ ٹائم لگ سکتا ہے۔ اور ہم انتظار کرسکتے ہیں۔" مقتدیٰ نہ جانے کب وہاں آیا تھا۔ نباء ہمیشہ کی طرح اس کی سحرانگیز شخصیت کے سامنے بت بنی کھڑی رہی۔ وہ جیسے آیا تھا ویسے ہی چلا گیا کسی تروتازہ ہوا کے جھونکے کی طرح۔

"واہ۔ بھائی بھی کیا ڈائیلاگ مارتے ہیں نا۔" زینی نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"اچھا چھوڑو ان کو۔ ان کی تو عادت ہے نصیحت کرنے کی۔ نباء آؤ۔ تم بھی ٹرائی کرو۔ دیکھیں تو تمہیں بھی پتنگ اڑانی آتی ہے کہ نہیں۔" ارتضیٰ نے اسے مخاطب کیا تو وہ سرہلا کے اس کی طرف بڑھ گئی۔ لیکن دل ہی دل سوچوں اور وسوسوں کا طوفان مچا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیسی ہیں امی۔" اس کا دل تو چاہ رہا تھا فون لگتے ہی وہ امی سے فوراً پوچھ لے مقتدیٰ اور ان کی ہونے والی گفتگو کے بارے میں۔ مگر وہ ایسا کرنہ سکی۔

"میں ٹھیک ہوں میری جان۔ تم بتاؤ کیسی ہے۔ دل تو لگ گیا نا وہاں۔" امی کی نرم آواز اسے مزید پرسکون کرنے لگی۔

"میں یہاں دل لگانے نہیں آئی امی۔ صرف اور صرف آپ کا اور بابا کا حق وصولنے آئی ہوں۔" اس نے تکیے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ نہ جانے کیوں امی خاموش ہوگئیں۔ وہ خود ہی بولنے لگی۔

"بس دادو کے مکمل طور پر فٹ ہونے کا انتظار کررہی ہوں۔ پتا نہیں کیوں مگر انہیں ہرٹ کرنے کا مجھے بالکل بھی دل نہیں کرتا۔ مجھے ان سے بابا کی مہک آتی ہے امی۔ وہی آواز' وہی لہجہ اور وہی انداز۔ ان کی ایک ایک ادا سے بابا کی جھلک دکھائی دیتی ہے مجھے۔"

"اور کسی میں تمہیں ان کی جھلک دکھائی نہیں دیتی نباء" بانو کی دھیمی آواز میں نہ جانے کیا تھا کہ وہ کچھ بول ہی نہ پائی۔

"محسوس کرو بیٹا۔ ہو سکتا ہے بابا نے تمہارے لیے اور بھی بہت کچھ چھوڑا ہو وہاں اپنے انداز اور لہجے کے علاوہ۔" وہ ان کی بات نہ سمجھ سکی۔

"امی۔ آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔ پلیز مجھے کھل کر بتائیں" اس نے حیرت سے ماں سے پوچھا۔

"نہیں نباء۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ کیا میری بیٹی رشتوں کو پرکھنے کی سکت رکھتی ہے۔ میں جاننا چاہتی ہوں بیٹا کہ تم زندگی کی کسوٹی خود حل کرنے کے قابل ہوئی ہو کہ نہیں۔" ان کی باتوں نے نباء کو مزید الجھن میں ڈال دیا۔

"لیکن میں ان رشتوں کو پرکھ کے اب کیا کروں گی امی۔ جو رشتے ساری عمر میرے بابا اور میری امی کو تڑپاتے رہے۔ جن کے دلوں اور گھر کے دروازے ان کے لیے ہمیشہ بند رہے۔ ان رشتوں کو جاننے اور ٹٹولنے کی مجھے ضرورت ہے نہ ہی شوق۔" اس نے صاف جواب دیا۔

"تمہارے لیے تو کھلے ہیں نا اس گھر کے دروازے۔" امی نے شاید اسے سمجھانا چاہا تھا۔ کیوں وہ یہ نہ سمجھ پائی تھی۔

"صرف اس لیے مما۔ کہ میں ان کا خون ہوں۔ ان کی اپنی' آپ نے وہ محاورہ تو سنا ہوگا کہ اصل سے زیادہ سود پیارا ہوتا ہے۔ بالکل ویسی ہی حقیقت ہے ان کے پیار کی۔

لیکن میری کوئی ایسی مجبوری نہیں ہے امی کہ میں ان لوگوں کی محبت آنکھیں بند کرکے خوشی خوشی قبول کرلوں' جس محبت کے لیے آپ ساری عمر ترستی رہیں اور بابا جس کی راہ تکتے تکتے اس دنیا سے ہی کوچ کر گئے۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

"نباء میں۔۔۔" بانو کچھ کہتے کہتے رکیں۔

"بولیں امی۔ کیا بات ہے؟" وہ پریشان ہوئی۔

"نباء میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں بیٹا۔" انہوں نے جیسے خود کو مضبوط کیا۔

"جی امی۔ میں سن رہی ہوں" وہ بولی۔ مگر دوسری جانب خاموشی ہی رہی۔

"امی۔ ہیلو" نباء نے خود ہی خاموشی کا وقفہ توڑا۔

"جی بیٹا۔ کچھ مہمان آگئے ہیں۔ میں تم سے بعد

میں بات کرتی ہوں۔ ہاں تم اپنا خیال کرنا۔" امی نے فون بند کر دیا تھا۔ نباء حیرت سے فون کو گھورتی رہ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆
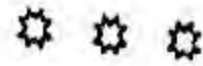
"مس نیلم۔ اس مہینے نقصان کی شرح نہ ہونے کے برابر رہی ہے۔ اگر ایسا رہا تو اگلے مہینے سے ہمیں ٹھیک ٹھاک منافع ملنا شروع ہو جائے گا۔" مقتدی نے سب فائلز دیکھنے کے بعد خوشی سے مخمور لہجے میں کہا تو نیلم بھی مسکرا دیں۔

"ان شاء اللہ! اور یہ سب نباء کی محنت کا نتیجہ ہے۔" ان کے لہجے میں رشک تھا۔ پچھلے دو تین مہینے سے مقتدی دوسری فیکٹری کی تعمیر میں اس قدر بزی رہا تھا کہ شوز کی اس فیکٹری میں اسے نقصان ہونے لگا۔ لیکن واقعی یہ سچ تھا کہ نباء کی وجہ سے نہ صرف ورکرز کے کام میں تیزی آئی تھی بلکہ دو بڑے آرڈر انہوں نے صرف دو ہفتوں میں مکمل کیے تھے۔

"میں چاہتی تھی کہ اگلے مہینے ورکرز کو کچھ بونس دے دیا جاتا۔ اس طرح ورکرز میں جذبہ بڑھے گا اور ان کی کچھ مدد بھی ہو جائے گی۔" نباء نے کچھ فائلز مقتدی کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ جب سے اس نے امی اور اس کی گفتگو سنی تھی۔ وہ اس سے کترائی کترائی رہتی۔ مقتدی اس کا یہ کترانا اچھی طرح سمجھ رہا تھا مگر اس کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ نباء کے رویے میں الڈنے والی اس اچانک تبدیلی اور رکھاؤ پہ وہ سخت حیران تھا۔

"جیسا تم مناسب سمجھو۔ آئی تھنک تم تو مجھ سے بھی زیادہ جاننے لگی۔ ہو کاروبار کے بارے میں۔" مقتدی نے مسکراتے ہوئے اس کی تعریف کی تھی۔

"او کے پھر میں نکلتی ہوں۔" نباء نے اسے مکمل طور پر نظر انداز کیا۔

"میں بھی نکل رہا ہوں۔ ساتھ چلتے ہیں۔" وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ نباء خاموش کھڑی رہی۔ مقتدی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے ہوئے بھی اسے عجیب محسوس ہو رہا تھا۔ نہ جانے کیوں دل اس شخص کی طرف جتنا جھکتا وہ اتنا ہی اس سے خار کھانے لگی تھی۔

"کچھ کھاؤ گی۔" وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ نباء نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"آئس کریم" وہ بولا تو نباء نے پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"کباب یا کچھ اور۔"

"نہیں۔ آپ کو سمجھ نہیں آتی۔ ایک بات کی۔ آخر چاہتے کیا ہو تم۔" مقتدی مسکرا دیا۔

"بس یہی چاہتا تھا۔"

"تمہاری یہ مسکراہٹ مجھے زہر لگتی ہے۔" اس کی مسکراہٹ سے چڑ کر وہ بولی تو مقتدی کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

"حالانکہ میری اس مسکراہٹ پر پوری یونیورسٹی کی لڑکیاں جان فدا کرتی تھیں۔ ہا۔ ہا۔ کیا دن تھے۔" وہ مصنوعی افسوس کرتے ہوئے بولا۔ نباء مزید چڑ گئی۔

"ان کی عقل گھاس چرنے گئی ہو گی۔"

"عقل کے پیر نہیں ہوتے فار یور کائنڈ انفارمیشن" مقتدی ذرا سا اس کی طرف جھکا۔

"اچھا اب مجھ سے زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں او کے۔" اس نے رخ مکمل طور پر کھڑکی کی طرف کر لیا۔

"اللہ کی شان ہے۔ اس دن تو۔" وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔ اور حسب توقع نباء اس کی طرف رخ موڑ چکی تھی۔

"کیا اس دن۔۔ ہاں؟" وہ تڑخی۔

"بتا دوں۔" وہی شریر مسکراہٹ۔

"ہاں ہاں بتاؤ۔ ذرا میں بھی سنوں کس بات پہ تمہیں اتنا مان ـــــ ہے۔" وہ پوری طرح چڑ گئی تھی۔

"دیکھ لو پھر بھاگ نہ ۔" اس نے گاڑی گیٹ کے سامنے روکتے ہوئے کہا۔ نباء سوالیہ نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

"اس دن باغ میں تو کیسے رو رہی تھیں مجھ سے لپٹ کر۔ تب تو منع نہیں کیا تھا مجھے۔" وہ اس کی

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے بولا۔ اور نباء کو تو جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔
"کیا ہوا مادام؟" شریر انداز سے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔ تو نباء نے جھٹکے سے دروازہ کھولا اور گیٹ کے اندر بھاگ گئی۔ مقتدی کے جاندار قہقہے نے اس کا پیچھا کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

بانو کھانا کھا رہی تھیں کہ موبائل پہ ہونے والی تیز میسج ٹون نے انہیں چونکا دیا۔ انہوں نے پیغام کھولا۔
"آپ کی رقم مطلوبہ جگہ پہنچا دی ہے۔ اپنا خیال رکھیے گا۔"
پیغام پڑھتے ہی ان کے دل پہ بوجھ سا آ دھرا۔ انہوں نے بددلی سے کھانے کے برتن دور کر دیے۔
"کب تک چلے گا یہ سلسلہ۔ کب تک میرے ضمیر پہ لدے اس بوجھ میں اضافہ ہوتے رہے گا۔ کیوں نہیں مل جاتی مجھے معافی۔" انہوں نے بے بسی سے سوچا تھا۔
"معافی مانگنے سے ملتی ہے۔ اپنا گناہ تسلیم کرنے سے اور اس کا کفارہ دینے سے معافی ملتی ہے بانو بیگم" اندر ہی جیسے کسی نے تلخی سے کہا تھا۔ ان کے سینے میں جلن سی ہونے لگی۔ وہ اٹھ کر باہر چھوٹے سے لان میں نکل آئیں۔
"میں کوشش تو کر رہی ہوں مگر گناہ کرنا جتنا آسان ہوتا ہے۔ اسے تسلیم کرنا اور پھر معافی مانگنا' بہت مشکل' دل بڑا کرنا پڑتا ہے۔ میں اپنا دل بڑا کیسے کروں۔ اگر یہ سب نباء کو پتا چل گیا تو۔۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑے موبائل پہ آیا پیغام دیکھتے ہوئے سوچا۔
"اتنا سب کچھ کھونے کے بعد' اتنی محبتیں' احمد' اپنا سب کچھ کھونے کے بعد میرے پاس صرف اور صرف نباء ہے۔ اگر یہ سب جاننے کے بعد وہ بھی مجھے معاف نہ کر سکی تو۔ نہیں نہیں۔ تو کیا میں نباء کو واپس بلوا لوں۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے نباء کا نمبر ڈھونڈنے لگیں۔
"نہیں مجھے نباء کو ابھی کچھ اور وقت دینا چاہیے۔ اس بار مجھے سب کچھ اپنے اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔" انہوں نے موبائل سائیڈ پر رکھتے ہوئے خود کو سمجھایا۔ اور کرسی پہ بیٹھے بیٹھے آنکھیں موند کر خود کو پرسکون کرنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"یہ تمہیں کیا ہوا ہے۔ جب سے کالج سے واپس آئے ہو۔ بوتھا لٹکا ہوا ہے۔" نباء نے لان میں اداس بیٹھے ارتضیٰ سے کہا تو اس نے اپنا جھکا چہرہ مزید جھکا لیا۔
"میں بتاتی ہوں۔" تبھی زینی بھی وہاں چلی آئی۔
"اے خبردار۔" ارتضیٰ نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔
نباء چونک گئی۔
"ارے واہ۔ ایسی بھی کیا بات ہے کہ خبردار۔ بڑی بہن ہوں تمہاری۔" نباء نے ارتضیٰ کو آنکھیں دکھائیں۔
"اچھا۔ بہن ہو ہماری تو ہر دوسرے تیسرے روز جانے کی دھمکی دیتی ہو۔" ارتضیٰ نے اس کی بات پکڑتے ہوئے اپنی بات بدلنی چاہی۔ مگر نباء بھی تیز تھی۔ فوراً اس کی نیت بھانپ گئی۔
"بات نہ بدلو لوگے۔ بتاؤ زینی کیا بات ہے۔" نباء نے اسے آنکھیں دکھاتے ہوئے زینی سے کہا۔
"اصل میں بات یہ ہے کہ آج اس کی زندگی اس سے روٹھ گئی۔" زینی نے آنکھ مارتے ہوئے قہقہہ لگایا۔
"اللہ نہ کرے۔ یہ کیا بدتمیزی ہے۔" نباء گھبرا گئی۔
"یار آج اس کی ایک کلاس فیلو اس سے ناراض ہو گئی۔"
"مطلب لڑکی۔" نباء کو کچھ کچھ سمجھ آنے لگا۔ وہ مسکرانے لگی۔
"جی۔ وہ بھی بہت پیاری لڑکی۔" ارتضیٰ نے لقمہ

دیا۔ تو زور سے ہنس پڑی۔
"اور وہ رو نمی کیوں۔" نباء مزید بولی۔
"موصوف نے اپنی کلاس کے ایک لڑکے کی مدد سے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔" زینی کی بات پہ نباء کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔ ارتضیٰ خفا خفا سا دونوں کو دیکھنے لگا۔
"یار تم خود جا کر کہہ دیتے۔ باجی مجھ سے دوستی کرو گی۔" نباء نے اسے مزید چھیڑا۔ ارتضیٰ نے منہ پھیر لیا۔
"اچھا اچھا۔ چھوڑو اس بات کو۔ تم سیدھے سیدھے تائی امی سے بات کیوں نہیں کرتے۔" اس بار نباء نے صاف بات کی۔
"پہلے معتمدی بھائی تو راستے سے ہٹیں تب نا۔" وہ اداسی سے بولا۔
"کیا مطلب۔" نباء نا سمجھی سے بولی۔
"ارے بے وقوف۔ اس کا مطلب ہے کہ پہلے بڑے بھائی کی شادی ہو گی تبھی اس کی باری آئے گی نا۔" زینی نے کسی بڑی بوڑھی کی طرح ہاتھ نچا نچا کر اسے سمجھایا۔
"اوہ۔" نباء سر ہلا گئی۔
"اور معتمدی بھائی کو نہ جانے کیا مسئلہ ہے۔ کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی۔" زینی بتانے لگی۔ کہ تائی امی نے کتنی جگہ اس کے رشتے کی بات چلانی چاہی۔ مگر معتمدی نے آرام سے منع کر دیا۔
"حالانکہ موصوف بتیس کراس کر چکے ہیں۔ لیکن نہ جانے کس حور پری کا انتظار کر رہے ہیں۔" نباء کی آنکھوں کے سامنے معتمدی کا خوبرو سراپا لہرا گیا۔
"خیر تم زیادہ ٹینشن نہ لو۔ اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ او کے۔" نباء نے اسے تسلی دی۔ تو وہ بھی دھیرے سے سر ہلا گیا۔

☼ ☼ ☼

"کیسی ہو بانو۔" بانو اپنے لیے چائے بنا رہی تھیں کہ ظہیر بھائی کی آواز سن کر چونک پڑیں۔ ان کے چہرے پہ حیرت پھیل گئی۔
"بھائی آپ۔" وہ اپنی حیرت چھپا نہ سکیں۔
"ہاں۔ بس آج کل کی تیز ترین زندگی میں اپنے اور اپنے رشتہ داروں کے لیے ٹائم نکالنا مشکل نہیں ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔" انہوں نے کمزور لہجے میں دلیل دی تھی۔ بانو کے چہرے پہ اداس سی مسکراہٹ ابھری۔
"آپ باہر بیٹھیں۔ میں چائے لے کر آ رہی ہوں۔" انہوں نے چائے کپ میں نکالتے ہوئے کہا۔ ظہیر سر ہلا کے باہر نکل گئے۔
"وہ چائے لے کر آئیں تو ظہیر بھائی کی آنکھوں میں تیرتی بے تابی انہیں مزید حیرت زدہ کر گئی۔ ظہیر بھائی کو ایک گھر میں ہوتے ہوئے بھی مہینوں بہن کا حال پوچھنا گوارا نہ تھا۔ کہاں خود آ کر ان سے بات کرنا۔ وہ اندر ہی اندر کچھ خوف زدہ بھی تھیں۔
"چائے تو پی ہی لیں گے کیوں نہ پہلے ضروری بات کر لی جائے۔" ظہیر بھائی ان کی مشکل آسان کرتے ہوئے خود ہی بول اٹھے۔
"جی۔" انہوں نے مختصر جواب دیا۔
"نباء بہت پیاری بچی ہے۔ جوں جوں وہ بڑی ہو رہی ہے۔ مجھے اس کی فکر زیادہ ہو رہی ہے۔"
"آپ بھول رہے ہیں بھائی۔ نباء اب بچی نہیں رہی۔ وہ اب کافی بڑی ہو گئی ہے۔ اس نے اپنی تعلیم مکمل کر لی ہے اور اب وہ اپنا خیال رکھنے کے بھی قابل ہو گئی ہے۔ تو ایسے حالات میں آپ خوامخواہ ہی فکر مند ہو رہے ہیں۔" خود بخود ان کی آواز میں طنز بھر گیا۔
"بالکل۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ کیوں نہ نباء اور توقیر کی منگنی کر دی جائے۔" بالآخر وہ اپنے مدعا پہ آ گئے تھے۔ بانو کے چہرے پر یہ چھائی طنزیہ مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔
"اور وہ جو موصوف کے پہلے دو تین طرف ہیں ان کا کیا؟" انہوں نے صاف گوئی سے کہا۔ مگر ظہیر

بجائے شرمندگی کے قہقہہ لگا کے ہنس پڑے۔
"یہ سب نوجوانی کا حصہ ہے۔ ایک بار شادی کی زنجیر گلے پڑ جائے۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔" انہوں نے ہنسی اڑائی۔ بانو کی آنکھوں میں تاسف اتر آیا۔
"آپ نے شاید وہ پرانا محاورہ نہیں سنا۔ کہ عادت کبھی نہیں چھوٹتی۔ مرتے دم تک انسان کے ساتھ رہتی ہے۔"
"یہ سب کتابی باتیں ہیں بانو۔ زندگی میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں۔" ظہیر بولے۔
"خیر جو بھی ہے نباء تو فی الحال یہاں ہے نہیں۔ سو میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ہاں نباء آجائے تو میں اس سے بات کر کے دیکھوں گی۔" انہوں نے سادہ سا جواب دیا۔
"کیا مطلب۔ اب زندگی کے اتنے بڑے فیصلے ہم یوں بچوں پر چھوڑ دیں گے۔" وہ برہم ہوئے۔
"نباء اب بچی نہیں رہی بھائی۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ سمجھ دار ہے۔ وہ اپنی زندگی کے فیصلے خود کر سکتی ہے۔ اور ویسے بھی احمد کی بھی یہی خواہش تھی کہ ان کی بیٹی اپنی زندگی کے ہر معاملے میں آزاد ہو۔ مجھے اپنی بچی پہ پورا بھروسا ہے۔" انہوں نے گویا بات ہی ختم کر دی تھی۔ سو اٹھنے لگیں۔
"چلو ٹھیک ہے جیسا تم مناسب سمجھو۔ اچھا بیٹھو تو کہاں چلیں۔" وہ انہیں اٹھتا دیکھ کر بولے۔
"جی مجھے کچھ کام ہے۔" بانو نے جواب دیا۔
"مجھے تم سے ایک اور ضروری بات بھی کرنی تھی۔"
"جی بولیں۔ میں سن رہی ہوں۔" بانو نے کھڑے کھڑے جواب دیا۔
"وہ میں سوچ رہا تھا کہ نباء آجائے تو میں نباء یا تمہارے نام سے کچھ کمپنیوں میں شیئر خرید لوں۔ تاکہ تمہارا وقت اور پیسہ برباد ہونے سے بچ جائے۔"
"پہلے بھی تو شیئر خریدے تھے۔ تب کتنا نقصان ہوا تھا۔" انہوں نے جیسے بھائی کو کچھ یاد دلانا چاہا۔ "اس وقت مجھے جاب اور پھر اپنا بزنس بھی دیکھنا پڑ گیا تھا نا۔ کچھ عرصہ پہلے ہی تو شروع کیا تھا۔" انہوں نے ڈھٹائی کی حد کر دی تھی۔
"تمہارے شیئرز سے پہلے نہیں بھائی۔ بعد میں۔ آپ شاید بھول رہے ہیں۔" بانو کے لہجے میں تلخی ابھری۔
"خیر۔ چھوڑو پرانی باتوں کو۔ اب تو میرا بھی کافی تجربہ ہے اور نذیر (چھوٹا بھائی) بھی کافی تیز ہے۔ پھر خود نباء کتنی سمجھ دار ہو گئی ہے۔" انہوں نے کہا تو وہ صرف تاسف سے سر ہی ہلا پائیں۔
"دیکھیں اللہ جو بہتر کرے۔ فی الحال تو نباء کے آنے تک میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔" بانو نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔
"اچھا بھائی میں ذرا نماز پڑھ لوں۔ آپ کو بیٹھنا ہے تو بیٹھیں۔ میں آتی ہوں کچھ دیر میں۔" انہوں نے جیسے جان چھڑانا چاہی۔
"نہیں میں چلتا ہوں۔ شام کو ایک ضروری میٹنگ ہے۔" ظہیر پر سوچ نگاہوں سے بہن کا چہرہ دیکھتے وہاں سے اٹھ گئے۔ بانو نڈھال سی دوبارہ کرسی پہ ڈھے گئیں۔
"یا اللہ میری مدد فرما۔ میری عزت رکھ لے اور نباء کو سیدھی راہ دکھانا۔ آمین۔" انہوں نے دل ہی دل میں دعا کی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یاہو۔ میرا بونس لگ گیا۔" زینی نے زور سے نعرہ لگاتے ہوئے کہا۔ لیپ ٹاپ پر کام کرتے مقتدی نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ فوراً" خاموش ہوئی۔
"یہ کیا تم لوگ اس جلاد سے ایسے ڈرتے ہو۔" نباء نے زینی کو کندھا مارتے وقت سرگوشی کی۔
"نہیں یار۔ ان کو ڈسٹرب کرنا تھا بھی۔" زینی نے جواب دیا۔ تو نباء مسکرا دی۔ اس گھر کے سبھی افراد ایک دوسرے کی کتنی پروا کرتے تھے۔

ہنگریلا۔" اچانک ہی دل کے کسی گوشے سے ٹیس سی اٹھی وہ سب لاؤنج میں بیٹھے تایا جان کے ساتھ سکریبل کھیل رہے تھے۔ جب کہ مقتدی وہیں صوفے پہ بیٹھا اپنا کام نبٹا رہا تھا۔

"یہ لو میرے ہوئے سو نمبر۔ نباء سے دو نمبر آگے ہو گیا میں۔" ارتضٰی کی پر مسرت آواز پہ وہ چونکی۔ واقعی اس کے نمبر نباء سے زیادہ ہو گئے تھے۔

"ابھی تو میری باری باقی ہے جگر۔ دیکھو تو کیسے تمہیں پیچھے چھوڑتی ہوں۔" وہ سامنے رکھے لیٹرز (Letters) سے الفاظ سوچنے لگی۔

"میں ہیلپ کروں۔" تب ہی مقتدی کی آواز پر وہ چونکی۔ وہ اس کے پیچھے ہی صوفے پہ بیٹھا تھا۔ مگر کیا اس کی توجہ شروع سے نباء پر ہی تھی۔ نباء سوچ کے ہی عجیب سا محسوس کرنے لگی۔ نہ جانے آج کل دل کو کیا ہوا جاتا تھا۔ مقتدی کی ذرا سی بات پر گھوڑے کی طرح سرپٹ جیسے اس کی طرف دوڑ لگانے کو مچل اٹھتا تھا۔

"بولو نا۔" مقتدی دوبارہ بولا۔

"جی نہیں۔ نو چیٹنگ اوکے۔" زینی نے انہیں وارن کیا۔

"ہاں۔ مقتدی۔ تم رہنے دو۔" تایا جان نے بھی اسے ہری جھنڈی دکھائی۔

"اوکے اوکے۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ ورنہ نباء جیسی ذی لاس (پر جوش) لڑکی کو میری کیا ضرورت۔" اس نے ہمیشہ کی طرح مقتدی کے لہجے میں مسکراہٹ ابھرتی محسوس کی تھی۔ تبھی وہ چونکی تھی۔ اس کے پاس ذی لاس کے بھی حرف موجود تھے۔ مقتدی نے اس کی مدد کر دی تھی۔ اب کے نعرہ لگانے کی باری اس کی تھی۔

"یاہو۔ میرا بھی سو سے اوپر اسکور بن گیا۔ یہ دیکھو۔" وہ خوشی خوشی سارے حروف ترتیب سے لگانے لگی۔ ارتضٰی اور زینی کا منہ بن گیا۔

"اب تو مشکل ہی ہے کہ ہم جیتیں۔" زینی نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

"ابھی تو پورا گیم پڑا ہے یار۔" ارتضٰی نے اس کی ہمت بندھائی۔

"چلیں ابو۔ اب آپ کی باری۔" زینی نے تایا کو مخاطب کیا تو نہ جانے کیوں نباء کے سامنے ایک مرتبہ پھر بابا کا سراپا لہرا گیا۔

"آخر میرے بابا ان خوشیوں سے کیوں محروم رہے۔ ان کا کیا قصور تھا۔ صرف اپنی بیوی سے محبت۔" دماغ پھر کسی اور طرف بھٹکنے لگا۔ تبھی تایا جان نے اپنا لفظ لگایا تھا۔

"یہ تو غلط ہے ابو۔" زینی چلائی۔ نباء نے دیکھا۔ تایا ابو نے لفظ (Better) لکھا تھا۔ مگر دوسرے E کی جگہ A لگا دیا تھا۔ تبھی ارتضٰی اور زینی کھل اٹھے تھے۔ اس غلطی کا اسکور ان کو صفر ملتا اور اس طرح وہ ارتضٰی سے کچھ پیچھے آجاتے۔

"ہاں تایا ابو۔ آپ نے Spell غلط کیا ہے۔ مان لیں تایا ابو۔ آپ بوڑھے ہو گئے ہیں۔" نباء نے منتشر ہوتے ذہن کو دوبارہ سے یکجا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ نہ جانے کیوں اسے اپنے اندر تک تلخی سی گھلتی محسوس ہوئی۔

"ہاں بیٹا۔ شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں واقعی بوڑھا ہو گیا ہوں۔ شاید تمہارے باپ کے جانے کے بعد سے ہی۔" ان کا لہجہ اداس ہونے لگا۔

"پلیز تایا ابو۔ میرے سامنے یہ جھوٹی محبت نہ دکھایا کریں میں نے آپ لوگوں کو جب اسی طرح ہی قبول کر لیا ہے تو اس سب کا کیا مطلب۔" اس کی تیز آواز اور تلخ لہجے پہ وہاں موجود سب ہی نفوس کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

"یہ کیا بد تمیزی ہے نباء" مقتدی فوراً" اپنے باپ کے پاس پہنچا تھا۔

"بد تمیزی۔ یہ بد تمیزی نہیں مقتدی سچائی ہے' کڑوی سچائی۔ جب تک بابا زندہ تھے۔ ان کی کوئی قدر نہ تھی۔ وہ کہاں تھے' کیسے تھے۔ کسی کو اس بات سے غرض نہ تھی۔ اور اب جب وہ اتنے سالوں کمل منوں مٹی تلے سو گئے تو اب یہ محبتیں یہ اقرار' یہ اظہار کس کام کا۔

تم لوگ کس طرح مل جل کر خوشیاں بانٹتے ہو۔ غم میں ایک دوسرے کا سہارا بن جاتے ہو۔ میرے بابا بھی تو ترستے رہے ہوں گے اس سب کے لیے۔ تب تو تم میں سے کسی کو ان کا خیال نہ آیا۔ اور اب سب کے دل میں ان کے لیے ہمدردی اور محبت اُمڈی چلی آتی ہے۔" وہ بولتی چلی گئی۔ مقتدی کی ضبط کے مارے آنکھیں سرخ ہونے لگیں۔

"نباء بیٹا۔" دادو نباء کی تیز آواز سن کر ہانپتی کانپتی وہاں پہنچی تھیں۔

"کیا ہوا۔ کس نے کچھ کہہ دیا نباء کو۔" وہ نباء کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے باقی سب کو تنبیہی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

"مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ اور نہ ہی کچھ کہہ سکتا ہے۔ بس مجھے آپ سب سے صرف اتنا کہنا ہے کہ پلیز میں یہاں اپنے باپ کی حصے کی محبتیں سمیٹنے نہیں آئی' نہ ہی آپ کے دلوں اور ضمیر پر پڑے بوجھ ہلکے کرنے۔ میں یہاں صرف اور صرف اپنے بابا کا حق لینے آئی ہوں۔ اپنا حق لینے آئی ہوں۔

میں یہاں مزید نہیں رہنا چاہتی۔ آپ سب کی محبتوں کا شکریہ' مگر مجھے ان سے سکون سے زیادہ درد محسوس ہوتا ہے۔ اپنے بابا کی حسرتوں کا درد' اپنی ماں کی محرومیوں کا درد۔"

"یہ تمہارا قصور نہیں نباء بیٹا۔ تمہیں یہ محبتیں جھوٹی لگتی ہیں۔ درد دیتی ہیں ——

جس کے ماں باپ کو یہ سچی محبت راس نہ آئی ہو وہ اس پیار کی قدر کیا جانے گا۔" تبھی تائی امی وہاں آئی تھیں۔ کالے دوپٹے کے ہالے میں ان کا پرنور چہرہ جیسے چمک رہا تھا۔

"امی پلیز۔" مقتدی نے انہیں روکنا چاہا تھا۔

"نہیں مقتدی۔ مجھے بتانے دو کہ سچائی کیا ہے۔ تھک گئی ہوں میں اس کی من گھڑت کہانیاں سن سن کر۔" مقتدی نے بہت مشکل سے انہیں سنبھالا۔

"ارتضیٰ۔ تم کل صبح کی ٹکٹ کنفرم کرواؤ۔ اور نباء تمہیں چند دن کے اندر سارے کاغذات مل جائیں گے۔ پھر تم جب چاہو آکر اپنا حصہ سنبھال سکتی ہو۔" مقتدی نے دادو اور اپنے باپ کی نم نگاہوں کو دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا تھا۔

"میں یہاں دوبارہ نہیں آنا چاہتی۔" وہ اسی طرح تلخ لہجے میں بولی۔

"جس شہر میں میرے باپ کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ مجھے وہاں آنے کا کوئی شوق نہیں۔"

"کیا مطلب" مقتدی نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے صرف کیش چاہیے۔ امید ہے تم مجھے جلد بھجوادو گے۔" وہ کہہ کر رکی نہیں تھی۔ اور اپنے کمرے کی طرف چل دی تھی' مقتدی نے لڑکھڑاتے باپ کو سہارا دیا تھا۔ اور تائی امی نے بڑھ کر زندگی میں ایک مرتبہ پھر اپنی ساس کے آنسو صاف کیے تھے۔

☆ ☆ ☆

نباء واپس آگئی تھی۔ اس نے امی اور نانی کو بتا دیا تھا کہ مقتدی جلد اس کا حصہ کیش کی صورت میں بھیج دے گا۔ نباء نے دیکھا تھا کہ اس کی واپسی پہ نانی اور دونوں ماموؤں میں جس قدر جوش بھرا تھا۔ امی اتنی ہی مایوس لگی تھیں اسے۔ رات کو جب سب سونے کے لیے اپنے پورشن میں چلے گئے تو وہ کچن میں برتن دھوتیں بانو کے پاس چلی آئی۔

"کیا ہوا امی۔ خیریت تو ہے۔ آپ مجھے خوش نہیں لگ رہیں۔"

وہ ان کے پاس ٹھہر کے پوچھنے لگی۔ بانو کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔

"نہیں کچھ نہیں نباء" انہوں نے ٹالنا چاہا۔

"پلیز امی بتائیں تو۔" وہ بضد ہوئی۔

"آؤ باہر لان میں بیٹھتے ہیں" وہ ہاتھ صاف کر کے اسے ساتھ لیے باہر صحن میں چلی آئیں۔ فروری کے اواخر دن تھے۔ سردی بس الوداع ہونے کو تھی موسم کی خنکی اب طبیعت کو ناگوار نہیں گزرتی تھی۔ خصوصاً" رات کے پہلے پہر ماحول فسوں خیز سا ہو جاتا اور شبنم کی بوندیں دل اور روح میں سکون ہی سکون

بھر دیتی تھیں۔ وہ نباء کو لیے صحن میں پڑی واحد چارپائی پہ آبیٹھیں۔

"تم نے بتایا نہیں کہ تمہیں وہاں کیسا لگا؟" امی نے اس کا دایاں ہاتھ سہلاتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے نہیں پتا امی۔ بس دعا کریں وہ لوگ آرام سے ہمارا حصہ دے دیں۔ مجھ سے اب ماموؤں کے مزید احسان نہیں اٹھائے جاتے۔" وہ سادگی سے بولی۔

"پھر بھی بتاؤ تو سہی۔ تمہیں وہ لوگ کیسے لگے' ان کا رویہ' تمہارے ساتھ ان کا برتاؤ' کیا تمہیں اس گھر میں کچھ بھی اچھا نہیں لگا بیٹا۔ وہ تو تمہارے بابا کا گھر تھا۔" انہوں نے نباء کی بات ان سنی کرتے ہوئے پوچھا۔ نباء کے دل کو کچھ ہوا۔

"ہاں امی۔ وہاں ہر کونے میں' ہر گوشے میں بابا کی یادیں' ان کی مہک رچی ہوئی ہے۔ ان کے گھر کے تمام لوگ مجھے اپنی زندگی مانتے تھے۔ اپنی محبتیں نچھاور کرتے تھے۔ لیکن مجھے ان محبتوں کی ضرورت نہیں امی۔ جنہوں نے میرے اتنے پیارے بابا اور اتنی معصوم ماں کو محرومی اور تنہائی کے انگاروں پہ جلا دیا۔" اس نے مسکراتے ہوئے ماں کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لیتے ہوئے کہا۔ بانو کو لگا۔ قدرت نے انہیں آج کٹہرے میں کھڑا کردیا تھا۔ جن محبتوں سے انہوں نے اپنے اتنے اچھے شوہر اور خود کو محروم کردیا تھا۔ آج ان کی بیٹی بھی محروم ہونے جارہی تھی۔ صرف ان کا اعتراف جرم ہی ان کی بچی کی قسمت سنوار سکتا تھا۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ان کی مزید دیر نباء کی قسمت سے مقتدی جیسا ستارہ مٹا کر توقیر جیسا پتھر لکھ سکتی تھی۔

"یہ سچ نہیں ہے نباء" ان کے منہ سے نکلتے الفاظ کے ساتھ ان کی آنکھیں بھی چھلک پڑی تھیں۔

"کیا مطلب امی۔" نباء انہیں حیرت سے دیکھنے لگی۔

"جو کچھ تم نے آج تک دیکھا' محسوس کیا یا سنا وہ سب صرف تصویر کا ایک رخ تھے۔ بے حد بھیانک رخ۔ مگر میں آج تمہیں اس تصویر کا دوسرا رخ دکھانا چاہتی ہوں بیٹا۔ جو شاید پہلے سے بھی زیادہ خوف ناک اور مسخ شدہ ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ اس سے تمہاری زندگی سنور جائے۔ بس تم مجھ سے ایک وعدہ کرو۔ کہ تم سب کچھ سننے کے بعد مجھے معاف کردو گی۔" نباء نا سمجھی سے انہیں دیکھے گئی۔

"بولو نباء"۔ امی تڑپیں۔

"نہیں امی۔ میں بھلا آپ سے ناراض کیسے ہو سکتی ہوں۔ مگر پلیز آپ کھل کر بات کریں۔ آخر بات کیا ہے؟" وہ بے چین ہوئی۔

"تمہارے بابا سے میری ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی تھی' تب ہمارے گھر کے حالات اتنے اچھے نہ تھے۔ وہ کسی ٹور پر آئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی نہ جانے انہیں کیا ہوا کہ انہوں نے اسی دن مجھے اپنانے کا اظہار کردیا۔ میں نے بھی انہیں اپنا ایڈریس بتا دیا"۔ وہ ذرا رک کر بولیں"۔" امی کو بھی شاید کسی ایسے رشتے کی تلاش تھی۔ انہوں نے احمد سے ملتے ہی انہیں اپنی رضامندی بتادی۔ اب مرحلہ تھا احمد کا اپنے گھر والوں کو منانے کا۔ احمد کا تعلق ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب احمد کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال کر وہ ہمارے گھر آئے تھے' میں اور احمد دونوں ہی اس دن بے خوش تھے۔ اس دن ان کے جانے کے بعد اماں نے مجھے سمجھایا میرے سسرال کے لوگ مغرور لگ رہے ہیں۔ مجھے اپنانا ان کی مجبوری ہے۔ اس لیے ہمیشہ ان سے ہوشیار رہوں۔ یہ پہلی بوند تھی ہمارے رشتے میں۔ جس نے شک سا بو دیا میرے دل میں۔ پھر جب بھی میری احمد سے ملاقات ہوتی میں یہ سوال ضرور کرتی کہ تمہارے گھر والے تو خوش ہیں نا اس رشتے سے۔ مگر احمد ہمیشہ مسکرا کر کہتے کہ جو وقت ہمارے لیے ہے اسے دوسروں کی باتوں میں ضائع نہ کرو ــــــــ" وہ مجھے ہمیشہ ٹال دیتے تھے۔

ہماری شادی بے حد دھوم دھام سے ہوئی۔ شادی کے بعد اماں کا آنا جانا ہمارے گھر میں بہت زیادہ ہونے لگا۔ اور میں یہی سمجھتی رہی کہ کیونکہ میں ان کو بے حد

عزیز ہوں تو ایسا وہ اس لیے کرتی ہیں۔ اماں جب بھی آتیں احمد کے سامنے اپنی مشکلات بیان کرتیں۔ میں بے حد پریشان ہو جاتی تب احمد میری وجہ سے ان کی ٹھیک ٹھاک مدد کر دیتے۔

پھر تم پیدا ہوئیں تو جیسے ہماری زندگی مکمل ہو گئی۔ تب احمد کی اسلام آباد پوسٹنگ ہوئی۔ وہ زیادہ تر وہیں رہنے لگے۔ میں ابھی تک اماں کی باتیں دل سے نہیں نکال سکی تھی۔ تم بھی بڑی ہو گئی تھیں مگر میں ہر وقت گھر والوں کے رویوں کو جج کرتی رہتی۔ میں جان بوجھ کر اپنی ماں کے کہنے پر گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہ لگاتی۔ سکینہ بھابی اکیلے ہی سارا گھر سنبھالتیں۔ اور میں اماں کو مغرور سے انداز میں کہتی کہ احمد کے خوف سے سارا گھر میرے پیچھے پھرتا ہے"۔

"امی۔" نباء نے انہیں روکنا چاہا۔ مگر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔

"انہی دنوں امی نے مجھے کہا کہ ان کا میرے بغیر گزارہ نہیں ہوتا سو میں احمد سے ضد کر کے ان کے پاس شفٹ ہو جاؤں۔ تب ان کی بات مان کر میں نے پہلی دفعہ احمد سے جھوٹ بولا کہ ان کے بعد میرا کوئی خیال نہیں رکھتا۔ میں تنہا ہو جاتی ہوں اور میری توقع کے عین مطابق احمد اگلی دفعہ ہی مجھے لے کر اسلام آباد شفٹ ہو گئے۔ ان دنوں میں بے حد خوش تھی۔

پھر احمد وہاں سب سے ملنے جا رہے تھے۔ تم بھی ان کے ساتھ جاتی تھیں۔ میں بھی جانا چاہتی تھی مگر اماں نے مجھے ان لوگوں کے خلاف احمد کے دل میں میل ڈالنے کے لیے نہ جانے کا مشورہ دیا۔ میں نے بھی احمد کے سامنے یوں ظاہر کیا جیسے میں ان لوگوں سے سخت خفا ہوں۔ ان دنوں اماں کی ہدایت کے مطابق روز کسی نہ کسی بہانے سے احمد کو بھڑکاتی رہی۔ کہ ان کے بعد وہاں میرے ساتھ کیا کیا ہوتا رہا۔ اماں نے بھی احمد کو اپنا گھر سمجھنے کا کہا اور مجھے کبھی واپس اس جہنم میں نہ بھیجنے کا عہد کیا۔ احمد کو اپنے گھر والوں سے نفرت سی ہونے لگی۔ وہ مجھ پہ اندھا اعتبار کرتے تھے نباء۔ اپنی ماں سے بھی زیادہ۔ اپنے سگے بھائی سے بھی زیادہ۔ میں اور اماں اس چیز کا فائدہ اٹھاتے رہے۔

انہی دنوں میں نے احمد کو اپنے حصے کا گھر میرے نام کرنے پہ راضی کر لیا تھا۔ اور جب تمہارے دادی نے تمہارے دادا کی وصیت کی وجہ سے اس بات کو ماننے سے انکار کیا تو احمد مکمل طور پر متنفر ہو گئے۔ میں ایسا نہیں چاہتی تھی لیکن اماں کی باتوں اور پھر احمد کی محبت کی ایک ہی حق دار بننے میں مجھے کچھ خاص شرم بھی نہ آئی۔ احمد نے میرے لیے اپنی جنت کو ٹھکرا دیا۔ ان کی ماں نے ان سے ملنے' ان کو فون کرنے کی کتنی کوشش کی مگر وہ اپنی ضد پہ قائم رہے۔ یہ چیز اندر ہی اندر بھلے ان کو کھاتی رہی مگر مرتے دم تک انہوں نے اپنی انا نہ توڑی"۔

"امی۔ پلیز بس کریں"۔ نباء کو لگا اس کا دل پھٹ جائے گا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے۔

"میں نے اماں کے کہنے پر تمہارے باپ کی موت کی اطلاع بھی نہ دی تھی۔ وہ تو ان کے کسی دوست نے بھائی کو بتا دیا اور تمہاری دادو اور تایا اگلے دن ہی ادھر آپہنچے۔ وہ بار بار تم سے ملنے' اور ہمیں ساتھ لے جانے کی ضد کرتے رہے۔ مگر اماں نے ان کی خوب بے عزتی کی"۔ نباء پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ وہ کتنی اندھی تھی اسے آج پتا چلا تھا۔

"میں نے تمہیں جائیداد لینے کے لیے وہاں نہیں بھیجا تھا۔ کیونکہ تمہارا باپ مرنے سے چند ماہ قبل ہی سارا حصہ کیش کی صورت میں لے چکا تھا۔ یہ جو میرے بھائیوں کا اتنا بڑا کاروبار تم دیکھ رہی ہو۔ یہ سب اسی پیسے کی دین ہے۔ تمہارے ماموؤں نے اس کے باوجود بھی نہ کبھی میری کسی ضرورت کا خیال رکھا نہ تمہاری۔ تمہیں پتا ہے تمہارے سارے تعلیمی اخراجات کس نے اٹھائے؟" وہ سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھنے لگی۔

"متقی نے اس نے ساری عمر پس پردہ رہ کر مجھے یہ عزت کی زندگی گزارنے میں مدد دی۔ ورنہ یقین مانو نباء بھائیوں نے تو مجھے بھیک مانگنے کے لائق بنا کر چھوڑا تھا۔

تمہاری تائی کے سرد رویے کی بھی یہی وجہ ہے کہ لاکھ خدمتوں کے باوجود بھی ان کے حصے میں میرے جیسی محبت نہ آئی۔ میں نے تمہیں اسی لیے وہاں بھیجا کہ سالوں سے غلط بیانی سے نفرت اور کدورت کی جو گرد تمہارے دل پر جم گئی ہے۔ وہ اس گھر کے لوگوں کی محبت سے ہی صاف ہو نہ کہ میرے لفظوں کی سچائی سے مگر خدا کو شاید یہی منظور تھا"۔ ان کا سر جھکا تھا۔ اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"میں تم سے شرمندہ ہوں نباء۔ تمہارے باپ سے شرمندہ ہوں۔ وہ تو شاید مجھے کبھی معاف نہ کریں۔ مگر پلیز تم مجھے معاف کر دو۔ تمہارے ماموں ایک مرتبہ پھر تمہارے حصے کا سن کر لالچ میں آگئے ہیں اور تمہاری شادی توقیر سے کرنا چاہتے ہیں۔ ساری عمر ان پر سب کچھ لٹا کر بھی میں ان کے دل میں جگہ نہ بنا سکی۔ اور جو مجھ پہ محبت نچھاور کرنے کے لیے ترستے رہے ہیں ان سے دور بھاگتی رہی۔ مگر تم لوٹ جاؤ نباء۔ تمہارے لیے محبتوں کے دروازے کھلے ہیں۔ میری طرح انہیں دھتکارو مت۔ ان کی طرف لوٹ جاؤ نباء" وہ روتے روتے چپ ہو گئی تھیں۔ اور نباء ایسی کی تو جیسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی ختم ہو گئی تھی۔

"پتا ہے نباء مقتدیٰ بھائی ہمیں تمہارے متعلق ہر خبر دیتے رہے۔ نباء نے ٹاپ کیا ہے۔ اب نباء کالج میں ہے۔ نباء نے MBA کر لیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ"۔ اس کے کانوں میں زینی کی آواز گونجی۔

"رویوں پہ ہی غور کرتے رہنے سے دلوں میں صرف شک اگتا ہے۔ اور جہاں شک پیدا ہو جائے وہاں محبت کی جگہ تنگ پڑ جاتی ہے۔" مقتدیٰ کہیں آس پاس ہی مسکرایا تھا۔

"تم میں تو مجھے میرا احمد نظر آتا ہے"۔ دادو نے کتنے پیار سے کہا تھا۔

"تمہاری بہن ہو تم۔ اب کبھی ہمیں چھوڑ کے مت جانا"۔ ارتضیٰ کی منت بھری آواز گونجی۔ اس نے دونوں کانوں پہ ہاتھ دھر دیے۔

"نباء۔ کیا ہوا میری بچی"۔ بانو تڑپ کے اس کے قریب آئیں۔

"چھوڑ دیں امی۔ چھوڑ دیں مجھے۔ آپ نے میرے ساتھ بھی کتنا برا کر دیا آپ جانتی نہیں۔ اگر آپ یہ سب پہلے مجھے بتا دیتیں تو۔ اف میں نے ان سب کی کتنی بے عزتی کی۔ کس طرح ان کی محبت کو گالی دی۔ پاؤں سے ٹھوکر لگا دی ان کی طرف سے ملنے والی عقیدت، محبت اور عزت کو۔ اور اب۔ اب آپ کہتی ہیں کہ میں لوٹ جاؤں۔ میں نے سب دروازے بند کر دیے۔ امی۔ مبارک ہو آپ کو۔ آپ کی بیٹی نے بھی آپ کی طرح محبت کو زندگی سے خفا کر دیا۔ خزاں بنا دیا آپ نے میری زندگی کو امی۔ برباد کر دیا۔ مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا آپ نے۔"

روتے روتے اس کی سانس پھولنے لگی تھی۔

تبھی ماموں ممانیاں دوڑتے ہوئے آئے تھے۔

"کیا ہوا نباء کو کیوں چیخ رہی ہے۔" سب ہی کے چہرے بے زاری لیے ہوئے تھے۔

"چلے جائیں آپ سب لوگ یہاں سے۔ نفرت ہے مجھے آپ سب سے"۔ اس نے خود کو گلے لگاتی تائی سے پرے ہوتے ہوئے چیخ کے کہا تھا۔ اور تبھی خود کو سنبھال نہ پائی تھی اور پورے قد سے زمین پہ آگری تھی۔ بانو متوحش ہو کر اس کی طرف بڑھی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"امی۔" سکینہ بی بی نماز کی نیت باندھنے ہی لگی تھیں کہ مقتدیٰ کی آواز سن کر چونک گئیں۔

"کیا ہوا مقتدیٰ۔ خیریت تو ہے نا"۔ مقتدیٰ ان کو پریشان دیکھ کر حیرت سے مسکرا دیا۔

"کمال ہے۔ کیسے پتا چل جاتا ہے آپ کو کہ میں پریشان ہوں؟" وہ ان کے پاس زمین پہ آکے بیٹھ گیا۔

"ماں ہوں بیٹا۔ میں نہیں سمجھوں گی تو اور کون سمجھے گا۔" انہوں نے شفقت سے اس کے گھنے بالوں پہ ہاتھ پھیرا۔

"امی۔ مجھے آپ سے اجازت لینا تھی"۔ وہ شاید تذبذب کا شکار تھا۔

"تحمل کر لو مقتدیٰ"۔ انہوں نے اسے ڈھارس دی۔

"نباء کو نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے۔ تو میں۔"

"یا اللہ خیر۔ کیسی ہے وہ۔ ٹھیک تو ہے۔" سکینہ بی بی نے اس کی آدھی بات میں ہی ٹوک دیا۔

"ابھی ہوش نہیں آیا۔ ڈاکٹرز نے چوبیس گھنٹے بتائے ہیں۔ لیکن پھر بھی کچھ نہیں کہا جاسکتا میں چاہتا تھا کہ میں۔" وہ پھر رکا۔

"ارے اس وقت بھی تم پوچھ رہے ہو پاگل۔ تم جلدی نکلو۔ اور دیکھو پتا نہیں بانو کے ساتھ کوئی اور ہے بھی کہ نہیں۔ سارا بندوبست کر کے جانا۔ ہماری بیٹی ہے نباء۔ اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے عقیدت سے اپنی سادہ لوح ماں کے ہاتھ چوم لیے۔

"اور ہاں ہمیں بتاتے رہنا ورنہ چین کہاں آئے گا۔ تم زینی سے کہو تمہارا سامان تیار کرے۔ میں ذرا نماز حاجات ہی پڑھ کر دعا کر لوں۔ اور نکلتے وقت تم بھی مجھ سے دم کرواتے جانا"۔ انہوں نے ہدایت کر کے نیت باندھ لی۔ مقتدیٰ عقیدت سے انہیں دیکھتا باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

اسے پورے بتیس گھنٹے بعد ہوش آیا تھا۔ امی مسلسل اس کے پاس رہی تھیں۔ مگر نباء نے ان سے بات تک نہ کی تھی۔ وہ اسے پکارتی رہتیں۔ معافی مانگتیں مگر نباء چپ چاپ آنسو بہائے جاتی۔

امی نے اسے بتایا تھا کہ اس کی طبیعت کا سن کر مقتدیٰ بھی اسی روز سے یہیں ان کے ساتھ ہسپتال میں ہے۔ اس بات نے اسے مزید شرمندہ کردیا تھا۔ وہ خود کا سامنا بھی نہیں کرپارہی تھی۔ مقتدیٰ اگر اس کے سامنے آگیا تو اس کا سامنا کیسے کرے گی۔ یہ سوچ کر اس کی طبیعت پھر سے نڈھال ہونے لگتی۔

"نباء۔ میرے بچے۔ پلیز مجھے معاف کردو بیٹا۔ میں تمہاری گناہ گار ہوں۔ مجھے اتنی سزا تو نہ دو"۔ اس کی مسلسل چپ نے بانو کو تڑپنے پہ مجبور کردیا تھا۔

"نہیں امی۔ آپ نے بھی مجھے میرے ددھیال کے خلاف ایک لفظ بھی برا نہیں کہا۔ آپ کا قصور تو بس اتنا ہے کہ آپ تب خاموش رہیں جب یہاں سب میرے کانوں میں زہر گھولتے رہے میرے پیاروں کے خلاف۔ قصور تو میرا ہے امی۔ مجھے اللہ نے اور آپ نے کتنا پیارا موقع دیا تھا ان محبتوں کو اپنی آنکھوں سے اپنے دل و دماغ سے پرکھنے کا۔ اور میں ان سب کو صرف دکھاوا قرار دے کر اپنے پاؤں تلے روند آئی"۔ اندر آتے مقتدیٰ کے قدم وہیں رک گئے۔ نباء کو نم آواز نے اسے اداس کردیا تھا۔

"مجھ پہ جان نچھاور کرنے والے ان محبت کے امین لوگوں کے پاس بھلا اب میری کیا جگہ باقی رہ گئی ہے۔ کاش کہ میں مرجاتی۔" وہ رو دی تھی۔

"اللہ نہ کرے بیٹا۔ مایوسی کی باتیں نہیں کرتے۔ اللہ بڑا غفور ہے۔ شکر کرو کہ اس ذات پاک نے تمہیں سب سے معافی مانگ کر اپنی نظروں میں سرخرو ہونے کا موقع دیا ہے۔ یہ موقع خوش نصیبوں کو ہی ملتا ہے"۔ امی نے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ مگر وہ یونہی چپ چاپ آنسو بہاتی رہی۔

"تب ہی مقتدیٰ اندر آیا تھا۔

"السلام علیکم" اسی دوستانہ مسکراہٹ سے وہ براہ راست نباء سے مخاطب ہوا۔ اسے دیکھتے ہی خود بخود نباء کی بھیگی پلکیں جھکنے لگیں۔ بانو مسکرادیں۔

"اچھا ہوا بیٹا۔ تم آگئے۔ تم ذرا نباء کے پاس رکو۔ کہیں یہ پھر رو رو کر طبیعت نہ خراب کرے۔ مجھے کچھ ضروری کام ہے"۔ انہوں نے اٹھتے ہوئے مقتدیٰ سے کہا تو نباء نے ان کا ہاتھ پکڑلیا۔

" ابھی آتی ہوں بیٹا۔ تمہاری کچھ رپورٹس ڈاکٹرز سے ڈسکس کرنا تھیں۔ مقتدیٰ ہے نا تمہارے پاس

۔ گھبرانا نہیں"۔ انہوں نے آرام سے اپنا ہاتھ چھڑالیا۔ اور اس کے گال تھپک کے کمرے سے نکل گئیں۔

مقتدیٰ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے بیڈ کے پاس پڑی کرسی پر آبیٹھا۔ نباء کی دھڑکن بس سے باہر ہونے لگی تھی۔ "نہ جانے اب یہ مجھے کیا کیا سنائے گا"۔ وہ دل ہی دل میں اداس ہوئی۔ شرم سے وہ نظریں ہی نہ اٹھاپائی تھی۔

"بہادر لوگ دنیا کا سامنا نظریں اٹھا کر کرتے ہیں۔ یوں جھکا کر نہیں"۔ مقتدیٰ نے مسکراتے ہوئے کہا تو نباء نے بس ایک نظر اس پہ ڈالی۔

"بہادر لوگ ہمیشہ صحیح ہوتے ہیں۔ غلط لوگ کمزور ہوجاتے ہیں۔ مقتدیٰ۔ خود سے بھی نظر ملانے کے قابل نہیں رہتے وہ۔" اس نے بے بسی سے کہا۔

"جو لوگ خود کو غلط تسلیم کرکے اپنی غلطیوں کو سدھارنے کے خواہش مند ہوں وہ کمزور نہیں ہوتے نباء۔ بلکہ اصل بہادر تو وہی ہوتے ہیں"۔ مقتدیٰ کی نرم آواز نے اس کی آنکھوں میں مزید نمی بھردی۔

"الفاظ تراشنا" کہنا اور دوسروں کو اس کی تاکید کرنا بے حد آسان ہوتا ہے مقتدیٰ! مگر جب اصلی زندگی میں آپ کو خود ان حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تو پھر سوائے رونے' اور کچھ کھودینے کے خوف کے آپ کے پاس کچھ نہیں رہتا۔

میں بھی خود کو کتنا عقل مند' بہادر اور سب کچھ جانتے اور سمجھ لینے والی سمجھتی تھی۔ مگر دیکھو جن کے چہروں پہ نقاب تھے انہیں اصل اور جو بالکل شیشے کی طرح صاف اور اجلے تھے انہیں نقل سمجھتی رہی۔ ان کی محبت' خلوص اور وفا کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھتی رہی۔ اور اب' اب جب خود حقیقت ایک مجسم سراپا بن کر میرے سامنے چلی آئی تو بتاؤ میرے پاس کیا بچتا ہے۔ سوائے پچھتاووں کے"۔ وہ مقتدیٰ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ جس کے لبوں پہ وہی دوستانہ مسکراہٹ سجی تھی۔

"پچھتاووں کے لیے وقت ہی نہ چھوڑو بلکہ آگے بڑھو۔ جو گزر گیا تمہارا ماضی تھا۔ اس پہ روتے رہنے کی بجائے اپنا آج سنوار لو۔ یاد رکھو نباء۔ وہ محبت وہ خلوص اور وفا ہمیشہ زندہ رہے گی۔ تم جو بھی فیصلہ کرو۔ ہمیں منظور ہوگا۔ لیکن یہ بات کبھی مت بھولنا کہ ہماری محبت تمہاری منتظر ہوگی"۔ وہ کہہ کر اٹھا اور کمرے سے باہر جانے لگا۔ کہ نباء نے مدھم آواز میں پکارلیا۔

"مقتدیٰ وہ آہستہ سے مڑا تھا۔ اس کی خوب صورت نیلی آنکھیں پوری محبت سے نڈھال سی نباء پہ جمی تھیں۔

"مجھے محبت منتظر نہیں۔ میری ہم سفر چاہیے۔ مجھے اب محبتوں سے دور رہ کر اور نہیں تڑپنا۔" اس نے پلکیں جھکاتے ہوئے اعتراف کیا تھا۔ مقتدیٰ کے دل میں سکون سا اترا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا نباء کے پاس چلا آیا۔ اور دھیرے سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

"محبت کل بھی تمہاری ہم سفر تھی اور آج بھی ہے۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں نباء میں تمہیں کبھی مایوس نہیں کروں گا"۔ اس کی مضبوط گرفت میں ہاتھ آتے ہی نباء نے سکون سے آنکھیں موند لی تھیں۔ پچھتاوے دم توڑ چکے تھے۔ امید اور بہاریں اس کے دروازے پہ کھڑی تھیں کیونکہ محبت اس کی ہم سفر تھی۔

☆ ☆

حمیرہ خان
نئی سوچ

"سلام چاچا، بڑے دن بعد نظر آیا، کیسا ہے؟" گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر برآمدے میں بیٹھے غلام رسول پر پڑی تو وہ ایک انداز سے پوچھنے لگی۔ غلام رسول نے ایک گہری نظر اس کے بھرے بھرے متناسب جسم اور تروتازہ چہرے پر ڈالی اور گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

"ٹھیک ہوں، مجھے کیا ہونا ہے بھلا۔"

"ویسے ہی پوچھ لیا چاچا اس عمر میں بیماریاں تو ہر دم ساتھ لگی رہتی ہیں نا۔" شبو کی آنکھوں میں شرارت لہرائی۔

"نا یہ میری عمر کو کیا ہوا ہے؟ کرم ہے رب کا صحت مند ہوں۔" شبو نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا تڑپنا تو لازمی تھا اور وہ مزے سے اس کے تڑپنے کا نظارہ کر رہی تھی۔

"تو سنا کیسی ہے تو؟ اور یہ کیا ہر وقت گھر سے باہر گھومتی رہتی ہے اب تو بچی نہیں رہی گھر میں ٹک کر، تم نے اسے کچھ زیادہ آزادی نہیں دے رکھی خیرو؟" آخر میں اس نے روئے سخن شبو کے باپ کی طرف موڑ لیا ورنہ جواب میں اس سے جانے کیا سننے کو مل جاتا وہ اس کی زبان کی کاٹ سے اچھی طرح واقف تھا۔

✡ ✡ ✡

"کب سے تیرے انتظار میں بیٹھا ہوں اور تو اب آ رہی ہے۔" جان محمد عرف جانو جو انتظار کی وجہ سے کوفت میں مبتلا ہو چکا تھا شبو کو دیکھتے ہی جھنجلا کر بولا۔

"آ گئی ہوں اسی کو کافی سمجھ، یہی حال رہا تو آئندہ دیر سے بھی نہ آ سکوں گی۔" شبو کے تھکے تھکے لہجے میں اداسی کی جھلک نمایاں تھی۔

"کیا ہوا ہے؟ ایسا کیوں کہہ رہی ہے؟" جانو بے چین ہو گیا شبو سے نہ ملنے کا خیال ہی اتنا جان لیوا تھا۔

"ہونا کیا ہے وہ تیرا چاچا ہے نا پتا نہیں اماں ابا کے کان میں کیا کیا کھسر پھسر کرتا رہتا ہے اماں نے کہہ دیا ہے اب تو اکیلی باہر نہ جایا کر جس کسی سے ملنا ہوگا اگر تجھ سے مل جایا کرے گی یا پھر میں تجھے ملانے لے جاؤں گی۔" اس نے بے زاری سے اماں کی بات دہرا دی۔

"تو اب تو نہیں آیا کرے گی۔"

"آیا کیسے نہیں کروں گی کوئی روک سکتا ہے کیا مجھے اور وہ تمہارا چاچا اس کو تو میں ایسا سبق سکھاؤں گی کہ یاد کرے گا۔" جان محمد کے لہجے کی اداسی پر شبو لمحوں میں اپنی جون میں لوٹ آئی اور اس کا خاطر خواہ اثر بھی ہوا تھا جان محمد کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑنے لگی یہ تو وہ جانتا تھا شبو جو کہتی ہے وہ کرتی ہے اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اس سے بہت زیادہ پیار کرتی ہے ورنہ اب تک پرائی ہو چکی ہوتی۔

"آج اتنی اچانک کیوں بلایا مجھے؟"

"ارے ہاں یہ دیکھ میں نے شہر سے تیرے لیے کیا منگوایا ہے۔" شبو کے پوچھنے پر جانو کو جیسے کچھ یاد آیا جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کاغذ کا پیکٹ نکال کر شبو کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"یہ کیا ہے؟" شبو کے لہجے میں اشتیاق نمایاں تھا۔

"تو خود دیکھ لے۔" شبو نے تجسس سے لفافہ کھولا اندر سفید موتیوں کی خوب صورت مالا اور اس کے ساتھ کے ٹاپس تھے۔

"کیسے لگے؟"

"بہت خوب صورت، بہت ہی خوب صورت" شبو کے لہجے میں محبت کا فخر جھلکنے لگا۔ جانو نے اپنے ہاتھوں سے اسے وہ دونوں چیزیں پہنا دیں، جنہیں گھر جانے سے پہلے اتار کر دوبارہ لفافے میں رکھتے ہوئے شبو نے اپنے دوپٹے کے پلو میں چھپا لیا تھا۔

✡ ✡ ✡

جان محمد اور شبانہ قریبی رشتے دار تھے، برادری کے رواج کے مطابق بچپن میں ہی ان کا رشتہ طے کر دیا گیا تھا۔ شبو اور جانو ایک دوسرے کی ضد تھے شبو اپنی بات منوانے والی غصے کی تیز اور نڈر قسم کی لڑکی تھی تو دوسری طرف جانو کم گو حد سے زیادہ مروت رکھنے والا

لڑکا تھا لیکن ان دونوں میں ایک بات مشترک تھی دونوں ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے۔ جانو اپنے دھیمے مزاج کی بدولت محبت کے اظہار میں بھی پر سکون بہتی ندی کا سا مزاج رکھتا تھا جبکہ شبو شور مچاتی لہراتی بل کھاتی لہروں کی مانند من چلی تھی۔ جانو کے ماں باپ عرصہ ہوا اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے تھے اور وہ اکلوتی اولاد ہونے کی بنا پر ماں باپ کے جانے کے بعد اکیلا رہ گیا تھا' ایسے میں شبو کا وجود ہی اس کی تمام تر محبت اور توجہ کا مرکز تھا۔ دوسری طرف شبو بھی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اور اس کی ہر صبح کا آغاز اور ہر دن کا اختتام جانو کے خیال سے ہی ہوتا تھا اور وہ اپنی اس زندگی میں بے حد مگن اور خوش تھی۔ غلام رسول جانو کا سگا چچا تھا اور اس کا گھر جانو کے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ یہ اور بات کہ سیدھا سادا جانو نہ جانے کیوں اپنے چچا کو ایک آنکھ نہ بھاتا البتہ چچی کا رویہ کافی بہتر تھا اسی انداز میں زندگی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اماں کہہ رہی ہے کھانا کھانا ہے تو آجاؤ ورنہ پھر وہ سو جائے گی۔" وقاص نے کمرے میں جھانک کر پیغام پہنچایا اور دوسرے ہی لمحے اس کا سر دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا۔

"سو جائے گی۔ نواب کی بچی' ایسے ہی سو جائے گی۔" غلام رسول جو کافی دیر سے کسی مسئلے پر سوچ بچار کر رہا تھا اس مداخلت اور الفاظ پر جھلا اٹھا لیکن پھر گھڑی کی طرف نظر اٹھی تو واقعی کافی دیر ہو رہی تھی وہ عموماً" مغرب کے بعد رات کا کھانا کھا لیا کرتا تھا لیکن آج رات کے دس بج گئے تھے اور اسے کھانے کا خیال تک نہ آیا تھا۔

یہی سب سوچتا ہوا وہ گھر کے اندرونی حصے میں بنے اپنے کمرے میں چلا گیا جہاں آسیہ اس کی منتظر تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ اٹھی اور باورچی خانے سے کھانا لا کر اس کی چارپائی پر رکھ دیا وہ بھی خاموشی سے ہاتھ دھو کر کھانے میں مگن ہو گیا اس دوران آسیہ نے کوئی بات کی نہ ہی غلام رسول نے اس کی طرف کوئی توجہ دی۔ کھانا کھا کر اس نے ٹرے پرے سرکائی تو آسیہ نے بڑھ کر ٹرے اٹھائی اور باورچی خانے میں رکھ کر لوٹ آئی تب تک غلام رسول بایاں ہاتھ سر کے نیچے رکھے اپنی چارپائی پر لیٹ چکا تھا اب اس کی نظریں چھت پر جمی جانے کس تلاش میں سرگرداں تھیں۔ اپنی چارپائی پر بیٹھی آسیہ نے بے چینی سے پہلو بدلا اور ٹانگیں جھٹک کر چارپائی کی پائنتی پر ڈالا تو اس دوران اس کی کلائیوں میں پڑی چوڑیاں بج اٹھیں اور غلام رسول اس آواز سے چونک اٹھا۔

"مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔" آسیہ نے اتنی سی توجہ سے ہی فائدہ اٹھایا اور اس سے پہلے کہ وہ نظروں کا زاویہ بدلتا اپنی بات کہہ ڈالی۔

"ہاں پوچھ کیا پوچھنا ہے تو نے۔" غلام رسول نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا' لہجے میں بے رخی کی جھلک واضح تھی۔ غلام رسول کے اس لہجے اور انداز پر آسیہ کی آنکھوں کی سطح گیلی ہونے لگی' پچھلے کچھ مہینوں سے آسیہ سے بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ ایسا ہی بے زار اور بے گانہ ہو جایا کرتا تھا۔ آسیہ بھرے بھرے جسم اور صاف رنگت والی ایک دلکش عورت تھی شادی کے بیس سال بعد بھی اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتی تھی مگر نہ جانے کیوں غلام رسول کی نظریں بدل گئی تھیں۔

"پوچھ بھی کیا پوچھنا ہے؟" اس کی طرح سوچوں میں گم ہونے پر غلام رسول نے ذرا اونچی آواز میں پوچھا تو وہ خیالوں سے چونک گئی۔

"میں نے گاؤں کے کچھ لوگوں سے سنا ہے کہ آپ ـــ آپ دوجا ویاہ (دوسری شادی) کرنے لگے ہو۔"

"ہاں بالکل ٹھیک سنا ہے تو نے' کر رہا ہوں میں دوجا ویاہ' کوئی نیا کام کرنے لگا ہوں کیا؟ ہمارے خاندان کے کتنے ہی لوگوں نے دو' دو تین' تین شادیاں کر رکھی ہیں' خود تیرے بھائی ریاض کی بھی تو تیسری شادی ہے اور سننے میں آیا ہے کہ وہ چوتھی کے لیے شہر کے چکر کاٹ

رہا ہے۔" غلام رسول نے ذرا بھی بات رکھے بنا صاف جتاتے ہوئے آخر میں آپ کے بھائی پر چوٹ کی۔

"مجھے بھار یاض سے کچھ لینا دینا نہیں میرا تعلق تو آپ سے ہے، مجھے تو اپنے گھر کا سوچنا ہے نا۔"

"کچھ نہیں ہو رہا تیرے گھر کو، تیری زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑنے والا، آرام سکون سے زندگی گزار تو اپنی۔" وہ اس کے دل میں آگ لگا کر سکون کا مشورہ دے رہا تھا۔

"کس سے کرو گے؟"

"پتا لگ جائے گا تجھے بھی جب کروں گا شادی۔ چل اب رات بہت ہو گئی ہے، مجھے سونے دے اور تو بھی آرام کر۔" وہ نظریں چراتے ہوئے کروٹ بدل گیا۔

☼ ☼ ☼

بظاہر آنکھیں بند کر کے لیٹا غلام رسول دراصل سوچوں میں گم تھا۔ آج اچانک ہی اسے کچھ ماہ پہلے کا وہ دن آیا جب وہ خیردین کے گھر گیا تھا۔ اور — دروازے پر دستک دیے بنا اندر چلا آیا۔ صحن میں دروازے کی طرف پیٹھ کیے شبو بڑے مگن انداز میں باورچی خانے کی کچی دیوار پر لپائی کرنے میں مصروف تھی۔ اس کا دوپٹا ساتھ رکھی چارپائی پر پڑا تھا اور شلوار کے پائنچے موڑ کر اوپر کی طرف کیے ہوئے تھے۔ وہیں ریڈیو پر گانوں کا کوئی پروگرام چل رہا تھا۔ دھوپ نے ابھی دیواروں سے نیچے اتر کر صحن میں پھیلنا شروع ہی کیا تھا، مگر گرمی ابھی سے ستانے لگی تھی۔ وہ یقیناً بہت دیر سے اس کام میں مصروف تھی۔ تب ہی اس کی قمیص پسینے میں بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گئی تھی۔ ایسے میں اس کے جسم کے نشیب و فراز بڑی وضاحت سے اپنا نظارہ کروا رہے تھے۔ غلام رسول کی آنکھیں اس کے وجود سے چپک کر رہ گئیں۔ اس کی نظروں کا انداز بدل گیا۔ شبو جو کچھ دیر پہلے تک صرف ان کے نالائق بھتیجے (ان کی نظر میں) جانو کی منگیتر تھی۔ اب صرف ایک خوب صورت لڑکی رہ گئی۔

جانے کتنی دیر گزر گئی ریڈیو پر چلتے گانوں کے بولوں کے ساتھ آواز ملاتی محویت سے کام کرتی شبو غافل ہی رہتی اگر جو بلی کو کمرے کی طرف جاتے دیکھ کر اسے بھگانے کے لیے پیچھے نہ مڑتی۔ بت بنے غلام رسول کی آنکھوں کے بدلتے رنگوں کو اس کے اندر کی عورت نے ایک لمحے میں بھانپ لیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے مٹی بھرے ہاتھوں کا خیال کیے بنا اس نے چارپائی پر پڑا دوپٹا اٹھا کر اپنے گرد لپیٹ لیا۔

"کیا بات ہے چاچا، آج صبح صبح ادھر کیسے آ نکلا؟" شبو کا لہجہ خود بہ خود سخت ہو گیا تو غلام رسول اپنی چوری کا خیال کر کے بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"مجھے خیرو سے کچھ کام تھا، کہاں ہے وہ۔"

"ماں اور بابا سویرے سویرے پھوپھی کے گھر گئے ہیں، اسے رات سے بخار آیا ہوا ہے۔"

"چل فیر میں چلتا ہوں، تجھے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

"مجھے بھلا کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔" وہ پہلے کبھی یہ بات کہتا تو یہ عام سی بات ہوتی، لیکن آج غلام رسول کے انداز اور لہجے پر شبو کے اندر تک تلخی اتر گئی۔ غلام رسول کچھ لمحے اس کے چہرے پر چھائی بے زاری اور آنکھوں سے جھلکتے غصے کو دیکھتا رہا، پھر کچھ کہے بنا باہر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ شبو نے اس کے گھر سے نکلتے ہی دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی اور سکون کا سانس لیا۔

"جاتے جاتے بھی اماں کہہ گئی تھی۔ کنڈی ضرور لگا لینا، لیکن میں ہوں کہ —" خود کو ڈانٹتے ہوئے اسے ایک بار پھر غلام رسول کے چہرے کے تاثرات یاد آ گئے۔

"کتی قوم۔" وہ غصے سے بڑبڑائی، پھر مٹی لگے ہاتھ دھونے نلکے کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"تو روز شہر سے گھر واپس آتا ہے، وہیں کہیں کوئی کوارٹر لے کر کیوں نہیں رہ لیتا۔ وہ پیسے بھی بچیں گے

کام آئیں گے تیرے۔" جانو نے اپنے ہوش میں پہلی
بار اپنے چاچا کو اتنے میٹھے لہجے میں بات کرتے سنا تھا۔
وہ اپنے بھتیجے کی بھلائی کے لیے سوچ رہا تھا۔ اس مہربانی
پر جانو خوش ہونے سے زیادہ حیران ہو رہا تھا۔
"لیکن چاچا وہاں رہ کر میرے خرچے بڑھ جائیں
گے۔ یہاں اپنا گھر ہے' وہاں کوارٹر کا کرایہ دینا ہو گا۔ بعض
چیزیں بھی شہر میں زیادہ مہنگی ہیں اور پھر گھر سے کالج دور
ہی کتنا ہے۔ سائیکل پر آدھے پونے گھنٹے کا سفر ہے بس۔"
جان محمد کا باپ سرکاری کالج میں چوکیدار تھا۔ باپ
کے مرنے کے بعد اس کی جگہ جان محمد کو نوکری مل گئی
تھی۔
"ایک تو آج کل کے دور میں کسی کا بھلا سوچنا ہی
مصیبت ہے' نہ تو نہ سہی میں تو اس لیے مشورہ دینے
چلا آیا کہ کبھی یہ نہ کہے کہ چاچا نے کبھی میرے لیے
سوچا نہیں۔" جان محمد کی بات کے جواب میں غلام
رسول کے ذہن میں اور کوئی سوال نہ آیا تو وہ بھڑک اٹھا
اور باتیں سناتا وہاں سے رخصت ہو گیا۔ جان محمد چاچا
کے پل پل بدلتے مزاج پر حیران ہوتا کھانا پکانے کی
تیاری میں لگ گیا۔ ماں کے مرنے کے بعد کچھ عرصہ وہ
شبو کے گھر کھانا کھاتا رہا۔ پھر اسے خود ہی احساس ہوا تو
اپنا کھانا خود بنانے لگا۔ شبو۔ اور اس کے ماں باپ
کے لاکھ اصرار کے بعد بھی اس نے ان کی یہ بات نہ مانی
تھی کہ وہ تین ٹائم کھانا ان کی طرف کھا لیا کرے۔ البتہ
ہفتے میں ایک بار شبو اپنی ماں کے ساتھ آ کر اس کا گھر
سمیٹ جایا کرتی اور بغیر دھلے کپڑے دھو کر استری کر
کے رکھ دیتی۔ اس پر بھی جانو نے اسے منع کیا تھا۔ مگر
شبو نے ناراض ہونے کی دھمکی دے کر اسے اس پر
راضی کر لیا تھا۔ ان ہی خیالات میں کھویا ہوا جان محمد
اپنا کام کر رہا تھا۔ دوسری طرف غلام رسول غصے میں
بل کھاتا شبو کے گھر جا پہنچا۔ شبو اس وقت اپنی ایک
سہیلی کے گھر گئی ہوئی تھی۔
"میں نے سنا ہے گاؤں والے اپنی شبو اور جان محمد
کو لے کر بڑی باتیں بنانے لگے ہیں۔" رسمی علیک
سلیک کے بعد کچھ دیر گاؤں والوں اور فصل کے بارے
میں تبادلہ خیال کرنے کے بعد غلام رسول اپنے مقصد
کی طرف آ گیا۔
"کیا مطلب کیسی باتیں؟ سارا گاؤں جانتا ہے کہ
شبو جان محمد کی منگ ہے۔" شبو کی ماں نے جواب دیا'
جبکہ خیرو چپ چاپ ان کی باتیں سن رہا تھا۔ لیکن اس
کی آنکھوں سے تشویش جھلکنے لگی تھی۔
"بات یہ ہے نوری بہن کہ مارتے کا ہاتھ پکڑا جا سکتا
ہے۔ لیکن بولنے کی زبان نہیں۔"
"لیکن آخر گاؤں والوں کو اعتراض کس بات کا ہے
بھلا؟"
"دیکھو بہن یہ تو ہمیں پتا ہے یا تم جانتے ہو کہ شبو
کتنی نیک شریف بچی ہے۔ لیکن آخر بچی ہی تو ہے
ناسمجھ ہے' ابھی ایسے میں جان محمد کا روز' روز وقت بے
وقت تمہارے گھر آنا جانا اور شبو کا اس کے گھر جا کر کام
کرنا لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع تو ملے گا ہی' بلکہ میں
نے تو یہ بھی سنا ہے کہ......"
"کیا سنا ہے تو نے جانا۔" غلام رسول جان بوجھ کر
خاموش ہوا' لیکن یہ خاموشی شبو کے ماں' باپ کو اور
بے چین کر گئی' آخر خیرو بول پڑا۔
"گاؤں میں باتیں ہو رہی ہیں کہ شبو اور جان محمد بند
کھوہ (بند کنویں) کے پاس تنہائی میں ملتے ہیں۔"
"لعنت ہے گاؤں والوں پر' بلاوجہ میری بے چاری
معصوم بچی پر الزام لگاتے ان کی زبان کو آگ نہ لگ گئی
' ضرور یہ باتیں صغری نے پھیلائی ہوں گی' وہی پھاپھا
کٹنی ہے گاؤں میں۔"
"یہ باتیں کس نے پھیلائی ہیں' کس نے نہیں'
اب اس بات کو سوچنے کا کوئی فیدہ (فائدہ) نہیں ہے
نوری بات کا کیا ہے' منہ سے نکلی چوبارے چڑھی'
ہمیں تو اس کا حل سوچنا چاہیے بس۔"
"پھر تو ہی بتا دے غلام رسول کہ کیا کرنا چاہیے۔"
"کرنا کیا ہے' شادی کر دیتے ہیں شبو کی جانو سے'
سب کی زبانیں آپ ہی بند ہو جائیں گی۔"
"ارے اتنی جلدی اتنے بڑے بڑے فیصلے نہ کرو'
ابھی جانو کی نوکری لگے کیم ہی کتنا ہوا ہے' تھوڑا جمع کر

لے فیر شادی کا سوچنا' ابھی شادی کرنا تو شبو کی زندگی مصیبت بنانا ہی ہو گا۔ آخر میں چاچا ہوں اس کا' اس کے بھلے کا ہی سوچوں گا' ابھی تو تم بس اتنا کرو اسے سمجھا کر گھر آنے سے منع کر دو اور شبو کو بھی سمجھا دو' شادی تک اس کے گھر نہ جائے' نہ اس سے ملے' خود ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔" نور کی بات پر بد حواس ہوتا غلام رسول جلدی جلدی بولتا چلا گیا۔

"بات تو اس کی ٹھیک ہے' شبو کی ماں' ایک وایک تو دھی ہے اپنی' کون سی جلدی ہے اسے تورنے کی۔ (رخصت کرنے کی)" خیرو کے کہنے پر نوری بھی سر ہلاتے ہوئے اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگی تو غلام رسول بھی سکون کا سانس لیتا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے پہلا مرحلہ بخوبی طے کر لیا تھا' اسے اپنی منزل زیادہ دور دکھائی نہ دے رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آج میری کیسے یاد آ گئی چوہدری صاحب۔" حاجراں بی بی غلام رسول کے بلاوے پر آ تو گئی تھی۔ لیکن اس کے پرانے رویے کی خرابی جتانا نہیں بھولی۔

"یاد تو تمہاری آتی ہی رہتی ہے حاجراں' بس بلاوا آج بھیجا ہے۔" غلام رسول نے معنی خیزی سے ہنستے ہوئے جواب دیا تو وہ بھی ہنس پڑی۔

"یہ پکڑ کچھ پیسے ہیں' کچھ کپڑے وغیرہ بنا لینا' کیا حال بنا کے رکھا ہے تو نے اپنا۔" کچھ نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ اپنائیت اور بے تکلفی سے بولا۔

"اتنی مہربانیاں' اللہ خیر کرے' کام کوئی خاص لگتا ہے۔" پیسوں کو دوپٹے کے پلو میں باندھتی حاجراں ایک بار پھر معنی خیزی سے بولی۔

"پوچھ تو ایسے رہی ہے جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو' گاؤں کے کس گھر کی کون سی بات ہے' جس سے تو بے خبر ہے۔" حاجراں واقعی چلتا پرزہ قسم کی عورت تھی۔ گاؤں کے ہر گھر میں ہمدردی کا لبادہ اوڑھ کے داخل ہوتی اور اندر تک کی خبریں نکال لاتی' پھر انہیں جب جہاں جیسے ضرورت پڑتی استعمال کرتی۔

"تو یہ سچ ہے کہ آپ کی نظر نوری کی دھی شبو پر ہے۔"

"بالکل سچ ہے' اب تو ذرا اپنی زبان کا جادو چلا اور خیرو اور نوری کو اس رشتے کے لیے تیار کر۔"

"ہاں' ہاں کیوں نہیں' میں تو نوکر ہوں آپ کی' وہ تو آپ ہی ہم غریبوں پر سے نظر کرم ہٹا لیتے ہیں۔"

"اچھا چل' اب زیادہ باتیں نہ بنا' یہ بتا میرا کام کتنے دن میں ہو جائے گا؟"

"کام تو سمجھو بس ہو گیا۔ چوہدری صاحب' آپ بے فکر ہو جائیں' اب میں جانوں اور شبو کے ماں' باپ' ویسے بھی انہیں آپ سے اچھا داماد اس دنیا میں کہاں ملنا ہے۔" آخر میں وہ مکھن لگاتے ہوئے بولی' جس کا خاطر خواہ اثر بھی ہوا' غلام رسول مونچھیں مروڑتے ہوئے مسکرانے لگا۔

"ارے ہاں یاد آیا چوہدری صاحب میں خود ایک' دو دن میں آپ کے پاس حاضر ہونے والی تھی' میرا منجھلا بیٹا گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ پھر پھر کے آوارہ ہوتا جا رہا ہے' میں سوچ رہی تھی اگر آپ تھوڑی مہربانی کر دیں تو اسے سبزی کی دکان کھلوا دوں' دو پیسے کمانے لگے گا تو بہو گھر لے آؤں گی۔ ذمہ داری سر پر پڑے گی تو خود ہی سدھر جائے گا۔"

"ہاہاہا بڑی تیز چیز ہے تو' موقع سے فائدہ اٹھانا تو کوئی تجھ سے سیکھے' پکی سیاست دان ہے۔ بھیج دینا اپنے لڑکے کو ڈیرے پہ' دیکھتے ہیں اس کا کیا کر سکتے ہیں۔"

"بس جی آپ ہی مائی باپ ہیں' ہر مشکل میں آپ کی طرف ہی دیکھنا ہے نا۔" حاجراں کے لہجے میں عاجزی و انکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

"اچھا تو فیر میں چلتی ہوں' ایک چکر آج ہی لگا لیتی ہوں' نوراں کے گھر کا۔" غلام رسول سے اور ہدایات لینے کے بعد حاجراں وہاں سے رخصت ہو گئی اور غلام رسول آگے کے بارے میں منصوبہ بندی کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے حاجراں' بڑے دن بعد چکر لگایا' کہاں

رہی اماں دن۔

"بس کیا بتاؤں نوراں، گھر کے کام کاج جان چھوڑیں تو کہیں نکلا جائے، تجھے تو پتا ہے گھر میں کام کرنے والے ہم دو ہی جی ہیں، ایک میں تو ایک میری بہو، وہ تین مہینے سے اپنے ماں، پیو کے گھر گئی ہوئی ہے۔ بیٹا ہوا ہے اس کے گھر، تو بس اب گھر کی ساری ذمہ داری آ پڑی مجھ بڑھیا کے سر، ایسے میں کیا کسی کی خبر لیتی۔"

"ارے ماسی تو کہاں سے بوڑھی ہو گئی، ابھی بھی جوانوں سے زیادہ جوان دکھتی ہے۔ اگر تو کہے تو کہیں رشتے کی بات چلائیں تیری؟" ان کی باتیں سنتی شبو نے شرارت سے حاجراں سے پوچھا تو حاجراں اور نوراں دونوں ہنس پڑیں۔

"چل تو اپنا کام کر، کتنی واری سمجھایا ہے بڑوں کے بیچ میں نہ بولا کر اور بڑی بڑی باتیں تو بالکل نہ کیا کر، چل جا کے سالن چڑھا، تیرے ابے کے آنے کا ٹائم ہو گیا ہے۔"

"تو تو مجھے ایسے ہی ڈانٹتی رہتی ہے، اماں میں نے تو سالن پکا بھی لیا ہے، بلکہ کل والے جوڑے بھی دھو کے پھیلا دیے ہیں، اب میں کچھ دیر کے لیے لالی سے ملنے چلی جاؤں؟" نوراں کی ڈانٹ پر وہ بسورتے ہوئے تفصیل سنانے کے بعد جانے کی اجازت مانگنے لگی تو نوراں نے جانے کیا سوچ کر اثبات میں سر ہلا دیا اور شبو نے ایک منٹ بھی دیر کیے بنا دروازے کی طرف دوڑ لگا دی کہ اسے ڈر تھا کہیں اماں کو چاچے غلام رسول کی باتیں نہ یاد آ جائیں اور وہ اسے جانے سے روک دے۔ چار دن ہو گئے تھے اسے جان محمد سے ملے ہوئے۔ اب وہ اس سے باتیں کرنے کو بے تاب تھی۔ اسی لیے اپنی ہمراز لالی کا نام لے کر گھر سے نکل آئی تھی۔

"اللہ نظر بد سے بچائے۔ ماشاء اللہ بڑی سوہنی کڑی دی ہے تجھے رب نے، شریف تے سلیقہ مند بھی ہے، جس گھر جائے گی جنت کر دے گی۔"

"ارے جانا کہاں ہے حاجراں، تجھے تو پتا ہی ہے جان محمد کی بچپن کی منگ ہے، تو اسی کے گھر جائے گی نا۔"

"برا نہ ماننا نوراں، لیکن زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ اب کون مانتا ہے بچپن کی منگنیوں کو، سب اپنے بچوں کا بھلا برا دیکھ کر فیصلہ کرتے ہیں۔" حاجراں نے بڑے اطمینان سے پہلا تیر چلایا اور نوراں کے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔

"تو ٹھیک کہتی ہے، مگر جان محمد میں کیا کمی ہے۔ اچھا لڑکا ہے، سمجھ دار ہے۔ سرکاری نوکری بھی اور سب سے بڑھ کر ہماری شبو کی قدر کرے گا ساری عمر۔"

"ہاں بس قدر ہی کرتا رہے گا ساری عمر۔" حاجراں نے اس بار ناک چڑھا کر مذاق اڑاتے لہجے میں کہا تو نوراں چونکی۔

"تیرا مطلب کیا ہے حاجراں، سیدھی بات کر، تو کہنا کیا چاہتی ہے؟"

"دیکھ نوراں، میں تو خدا لگتی کہوں گی، جانو کے پاس نہ زمین رہی، نہ جائیداد، لے دے کے یہ ایک گھر ہی بچا ہے۔ وہ بھی جانے کب گر جائے۔ اس کے بعد اس میں اتنی گنجائش بھی نہیں کہ ایک پکا کوٹھا ہی ڈال سکے۔ نوکری سرکاری سہی، مگر وہ کون سا کوئی افسر لگا ہے۔ وہی روکھی سوکھی کھلائے گا تیری دھی کو بھی جو خود کھاتا ہے۔ مجھے تو یہ سمجھ نہیں آئی کہ تو اپنی پھولوں جیسی نازک بیٹی کو اس جہنم میں ڈالنے کے لیے تیار کیسے ہے؟ تو ماں ہے۔ ذرا دل پہ ہاتھ رکھ کے سوچ تیری ایک و ایک دھی ہے اور پھر ایک ایسی خوب صورت جوان لڑکی کو رشتوں کی بھلا کیا کمی۔ اچھا چل میں اب چلتی ہوں، کافی دیر سے گھر سے نکلی ہوئی ہوں، گھر جا کے رات کا کھانا بھی بنانا ہے۔ اے ہے، ایک تو یہ گھٹنے کا درد چین نہیں لینے دیتا، اچھا فیر تو سوچنا میری بات پہ، ابھی سب کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے۔" گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر نوراں کو سوچنے پر مجبور کیا اور اسے سوچتا چھوڑ کر اپنے گھر کی راہ لی۔

☼ ☼ ☼

دن کافی نکل آیا تھا۔ مگر جان محمد ابھی تک بستر پر پڑا کروٹیں بدلے جا رہا تھا۔ اتوار کا دن تھا۔ اس لیے اسے کہیں جانے کی جلدی نہ تھی۔ حالات اچانک ہی عجیب ہو گئے تھے۔ شبو کے ماں، باپ کا رویہ بڑی تیزی سے بدلا تھا اور بہت کوشش کے باوجود بھی شبو سے اس کی ملاقات نہ ہو پا رہی تھی۔ ایسی ایسی خبریں سننے میں آ رہی تھیں جن پر یقین کرنے کو اس کا دل نہ مانتا تھا۔ کل رات بھی اس کے دوستوں نے باتوں باتوں میں اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اس کا چاچا کسی چکر میں ہے۔ کیونکہ آج کل شبو کے گھر اس کے چکر بہت لگ رہے ہیں۔ جبکہ جان محمد کو شبو کے گھر والوں نے سائیڈ پہ لگا دیا ہے۔ وہ سب باتوں پہ یقین کر بھی لیتا۔ مگر یہ بات ماننے والی نہیں تھی کہ شبو اس کی جگہ کسی اور سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو گئی ہے۔ لیکن اصل حقیقت تو شبو سے ملنے کے بعد ہی پتا چل سکتی تھی۔ سو وہ بے چینی سے اس سے ملنے کا منتظر تھا۔ آج بھی اس کا ارادہ یہی تھا کہ سارا ٹائم گھر پہ گزارے گا۔ کیا پتا موقع دیکھ کر شبو اس سے ملنے چلی آئے۔ مگر یہ اس کا خیال ہی تھا۔ کیونکہ شبو کے آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہ ایک طرح سے اپنے گھر میں قید کر دی گئی تھی۔

نوراں سارا دن حاجراں کی باتیں سوچتی رہی تھی اور شام تک وہ اس کی باتوں سے پوری طرح متفق ہو چکی تھی، ہر ماں کی طرح اسے بھی اپنی بیٹی کو گہنوں سے سجا دیکھنے کی خواہش تھی۔ خیر وسے جب اس نے بات کی تو پہلے تو اس نے کافی غصہ کیا۔ لیکن نوراں بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔ اس نے اپنی بات منوا کر ہی دم لیا۔ ویسے بھی اس گھر میں آج تک ہوتا تو وہی تھا جو نوراں چاہتی تھی۔ اگلے ہی دن نوراں نے حاجراں کو بلوا بھیجا تھا تو اسی بلاوے کی منتظر تھی۔ سو وہ دوڑی چلی آئی۔

"ہاں بتاؤ کیسے بلوایا مجھے؟ کوئی کام ہے کیا؟" حاجراں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا تو نوراں نے ساری بات اس کے سامنے رکھ دی اور کسی اچھے رشتے کی تلاش کا ذمہ بھی حاجراں کو ہی دے دیا۔

"تو پھر رشتہ ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے۔ رشتہ تو ہمارے پاس پہلے سے موجود ہے۔" حاجراں نے ہنستے ہوئے کہا تو نوراں ناسمجھی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ارے اپنا چوہدری ہے نا، چوہدری غلام رسول۔"

"کیا۔۔۔ جان محمد کا چاچا۔۔۔ یہ تو کیا کہہ رہی ہے۔ ذرا ہوش کر کے بول، حاجراں کہاں میری پھول سی بچی کہاں وہ، عمر میں اس کے باپ کے برابر ہی ہو گا اور پھر پہلے سے شادی شدہ اور بچوں کا باپ یہی رشتہ ملا تجھے میری دھی واسطے۔" نوراں کا موڈ اچھا خاصا خراب ہو چکا تھا۔ لیکن سامنے بھی حاجراں تھی، جسے موڈ بدلنے میں کمال حاصل تھا۔

"تو بھی نا نوراں بڑی بھولی ہے، اری عمر میں تھوڑا بہت فرق تو ہمارے یہاں عام سی بات ہے۔ ویسے بھی مرد کی عمر نہیں جیب دیکھی جاتی ہے۔ تیری پھولوں جیسی دھی کو پھولوں کی طرح ہی سنبھال کے رکھے گا۔ سر آنکھوں پہ بٹھائے گا اور دوسری شادی کرنا کہاں کا جرم ہے بھئی۔ تو یہ سب چھوڑ، صرف یہ سوچ کہ تیری شبو چوہدری کے گھر اور دل پر راج کرے گی۔ اچھا گھر زمین جائیداد سبھی کچھ تو ہے اس کے پاس۔" حاجراں نے شبو کے خوشحال مستقبل کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا کہ نوراں کو یہ رشتہ قدرت کا انعام دکھائی دینے لگا۔ رہی سہی کسر غلام رسول کی طرف سے روز، روز بھیجے جانے والے مہنگے مہنگے تحائف نے پوری کر دی۔ اپنے شوہر سے مشورہ کر کے اس نے حاجراں کو گرین سگنل دے دیا۔

اگلے ہی دن غلام رسول کچھ قریبی رشتے داروں کے ساتھ پھلوں کے کریٹ اور مٹھائی کے ڈبوں کے ساتھ منگنی کا سامان لے کر حاضر ہو گیا۔ شبو کو ابھی تک اس سارے معاملے سے بے خبر رکھا گیا تھا۔ لیکن جب اسے بتایا گیا کہ آج اس کی منگنی غلام رسول کے ساتھ طے پا رہی ہے تو اس نے اک طوفان اٹھا دیا رو، رو کر اپنی حالت خراب کر لی۔ "اچھا جا" وہ کمرے میں بند ہو گئی اور مہمانوں سے ملنے تک نہ گئی مگر غلام رسول کو

اس کی یہ بات بھی ناگوار نہ گزری، وہ جلد از جلد اس حسن کی ملکہ کو اپنے گھر کی مالکہ بنانے کو بے تاب تھا۔

☼ ☼ ☼

جان محمد کو جب اس رشتے کا پتا چلا تو وہ سیدھا اپنے چاچا کے پاس پہنچ گیا۔

"خیر ہے، کیسے آنا ہوا۔" غلام رسول نے اسے دیکھ کر انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تو نے اچھا نہیں کیا چاچا، تیرے برے سلوک کے باوجود میں نے ہمیشہ تجھے اپنے باپ کی جگہ سمجھا ہے اور تو میری ہی منگیتر سے شادی کرنے چلا ہے۔ تجھے شرم نہ آئی اپنی ہونے والی بہو کا رشتہ بھیجتے ہوئے۔" ہمیشہ دب کر رہنے والا سر جھکا کے بات کرنے والا جان محمد آج تن کے کھڑا لعن طعن کر رہا تھا۔

"اوے چپ زیادہ بکواس نہ کر، مجھے شرم دلاتا ہے، تجھے شرم نہیں آتی، اپنے چاچا کے سامنے اونچی آواز میں بولتے ہوئے اور جہاں تک میرے رشتے کی بات ہے میرا حق ہے، میری مرضی ہے، میں گاؤں کی کسی بھی لڑکی کے لیے اپنا رشتہ بھیج سکتا ہوں، تو کون ہے مجھے روکنے یا شرم دلانے والا، اگر شبو اور اس کے گھر والوں نے یہ رشتہ قبول کیا ہے تو کچھ دیکھ کر ہی قبول کیا ہے نا، ہے کیا تیرے پاس دو ٹکے کا چوکیدار نہ رہنے کو ڈھنگ کا گھر نہ کھانے کو اچھا کھانا، اپنی اوقات دیکھ اور پھر کچھ بول۔" غصے سے بولتا غلام رسول ایک لمحے کو سانس لینے کو رکا، پھر زہر اور میٹھے لہجے میں کہنے لگا۔

"دیکھ جانور رشتہ تو اب میرا ہو ہی گیا ہے اللہ کرے گا جلدی شادی بھی ہو جائے گی، تیرے لیے یہی بہتر ہے کہ چپ چاپ اپنے چاچے کی خوشی میں شامل ہو جا ورنہ ہونا ہوانا ویسے بھی کچھ نہیں ہے۔" مونچھوں کو بل دیتے ہوئے غلام رسول نے اپنے مخصوص تضحیک آمیز لہجے میں کہا تو جان محمد بل کھا کے رہ گیا۔

"وہ میری منگ ہی نہیں میری محبت بھی ہے، چاچا شادی تو وہ مجھ سے ہی کرے گی، بہتر ہے تو اپنی حرکتوں

سے باز آجا۔" سرد لہجے میں جواب دیتا جان محمد آنکھوں میں غصے کی سرخی لیے وہاں سے رخصت ہو گیا۔

"اونہہ۔۔۔" غلام رسول سر جھٹک کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کی نظر میں جان محمد کی باتیں دیوانے کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"آسیہ او آسیہ' کہاں رہ گئی ہے' جلدی ادھر آ۔" ہاتھوں میں ڈھیر سارے شاپرز لیے گھر میں داخل ہوتے ہی غلام رسول نے آوازیں لگانا شروع کر دی تھیں۔ خوشی اس کے انگ انگ سے جھلک رہی تھی۔

"جی آ گئی باورچی خانے میں تھی' یہ سب کیا ہے؟" غلام رسول کے ہاتھ سے شاپر تھامتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

"کچھ کپڑے جوتے ہیں شبو کے لیے' سنبھال کے رکھ لے اور ہاں سن کل تو بھی میرے ساتھ شہر چلنا' اپنے اور بچوں کے کپڑے بھی لے لینا اور زیور بھی کل ہی خرید لیں گے۔ میں آج گیا تھا دکان پر' لیکن مجھے تو کچھ سمجھ ہی نہیں لگی کہ کیا لوں اور کیا نہ لوں' کل تیار رہنا' دس بجے نکلیں گے۔" شاپر اس کے ہاتھ میں تھما کر وہ صحن سے ہی واپس پلٹتا ہوا کہنے لگا۔

"ابھی کہاں چل دیے کھانا تو کھاتے جائیں۔"

"کھانا میں نے کھا لیا تھا شہر میں' ابھی بہت کام ہیں' سارا کچھ مجھ اکیلے نے ہی دیکھنا ہے' یہ نوکر تو سارے حرام خور ہیں' نظر نہ رکھو تو ہر کام الٹا کر دیتے ہیں۔" وہ نوکروں پر غصہ نکالتا باہر چلا گیا۔

آسیہ کو اس لمحے جان محمد اور شبو پر بے حد ترس آیا' سوتن ہونے کے ناتے اسے شبو سے کسی قسم کا حسد محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ وہ سوچ رہی تھی کہ اکثر ماں باپ رشتہ کرتے ہوئے دھن دولت' جائیداد' گھر اور خاندان سبھی کچھ دیکھتے ہیں' مگر یہ دیکھنا اور سوچنا بھول جاتے ہیں کہ یہ سب ہوتے ہوئے بھی کیا یہ رشتہ ان کے بچوں کو خوشی دے پائے گا؟ ان کو ایک خوب صورت زندگی اور مستقبل دے سکے گا؟ مگر اتنا کون سوچتا ہے' ضرورت بھی کیا ہے۔ اس نے بے دلی سے سوچا' ان سوچوں نے آسیہ کے اندر کی اداسی میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ وہ اپنے ہاتھوں میں تھامے شاپرز کو دیکھنے لگی چیزوں سے بھرے شاپرز یقیناً" بھاری تھے۔ لیکن اتنے بھاری نہ تھے جتنے اس وقت آسیہ کو محسوس ہو رہے تھے۔ آنکھوں میں آتے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلتی وہ شاپر اٹھائے کمرے میں چلی آئی۔ تاکہ انہیں محفوظ جگہ رکھ سکے۔

☼ ☼ ☼

"روٹی کھا لے شبو' اتنی ضد اچھی نہیں ہوتی لڑکیوں کے لیے۔" بہت سمجھانے پر بھی جب شبو نے کھانا نہ کھایا تو نوراں نے ذرا سخت لہجہ اپنانا بہتر سمجھا۔

"اماں تو ہی سوچ' ضد میں کر رہی ہوں کہ تو' تو میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہے' اماں میرے ساتھ ایسا نہ کر' تجھے اللہ رسولﷺ کا واسطہ۔" التجا کرتی وہ تڑپ تڑپ کر رونے لگی تو نوراں کا دل پھر موم ہونے لگا۔

"دیکھ شبو' ہم تیرے ماں' باپ ہیں' تیرا بھلا ہی سوچیں گے نا' میرا یقین کر تو بہت خوش رہے گی وہاں۔"

"میرے دل کی خوشی صرف جان محمد کے ساتھ ہے اماں یہ بات تو بھی اچھی طرح جانتی ہے۔ لیکن اب نہ جانے کیوں اس بات سے انکار کر رہی ہے۔"

"جان محمد کا نام مت لے میرے سامنے' اب ہمارا اس سے کوئی رشتہ نہیں رہا۔" نوراں اس کی تکرار پر جھنجھلا گئی۔ دو دن سے سمجھا سمجھا کے تھک گئی۔ وہ تھی کہ ہاں کے نہیں دے رہی تھی۔

"آج تو جان محمد کا نام لینے سے بھی منع کر رہی ہے اماں' لیکن میں تو یہی ایک نام سنتے سنتے جوان ہوئی ہوں' میں نے اسی کے ساتھ زندگی گزارنے کے سپنے دیکھے ہیں اور اس کے سپنے دیکھنے کا حق بھی تو تم نے ہی مجھے دیا تھا نا' اسے میرا منگیتر بنا کے' اب تو کہتی ہے میں اسے بھول جاؤں' بنا کسی قصور کے' اسے چھوڑ دوں'

میں ایسے کیسے کروں' اماں بتا مجھے کیسے کروں۔" وہ سسکیوں کے درمیان بولتی چلی گئی۔

"جیسے وہ تجھے بھول گیا ہے' ایک بار آیا تھا ہمارے گھر' تیرے باپ نے کہہ دیا ہم نے رشتہ توڑ دیا' وہ بھی اس بات کو ختم سمجھے' چپ کرکے بیٹھ گیا' ایک تو ہے اس کے لیے اپنے ماں' باپ کے سامنے کھڑی ہو رہی ہے۔ رو' رو کے اپنی حالت خراب کر رکھی ہے۔ ایک وہ ہے جو آرام سے تیرا ساتھ چھوڑ گیا ہے۔ اگر اسے تجھ سے کوئی لگاؤ ہوتا تو یوں آرام سے نہ بیٹھتا' سمجھی۔"

"تو یوں مجھے طعنے نہ دے اماں' میں جالو کو بہت اچھے سے جانتی ہوں' وہ چپ ہے تو صرف ہماری عزت کے واسطے' وہ بول نہیں رہا' لیکن اس کا دل بھی میرے لیے ایسے ہی تڑپ رہا ہو گا۔ تجھے اور ابا کو ماں' باپ کی طرح سمجھتا ہے وہ۔ اگر آج وہ مجھے ایک بار اشارہ کر دے نا اماں تو میں ایک منٹ بھی نہ لگاؤں اس کے ساتھ گھر سے بھاگنے میں اور۔۔۔"

"چٹاخ۔۔۔" زندگی میں پہلی بار نوراں کا ہاتھ اپنی لاڈلی بیٹی پر اٹھا اور اس کے گال پر نشان چھوڑ گیا۔ حیرت اور دکھ کی شدت سے شبو کی آنکھوں کے آنسو جیسے جم سے گئے۔ نوراں بھی اپنی جگہ گم سم تھی۔ تب ہی نوراں کے جسم میں حرکت ہوئی اور وہ تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔ دوسری طرف شبو بھی شدید حیرت اور دکھ کی کیفیت سے نکل آئی تھی اور آنسو ایک بار پھر بڑی روانی سے اس کے گالوں پر بہنے لگے۔

☼ ☼ ☼

وہ رات خود احتسابی کی تھی۔ کمرے میں شبو جاگ رہی تھی تو نوراں کی آنکھوں سے بھی نیند غائب تھی۔ بار بار اس کے ذہن میں شبو کی کہی باتیں گونج رہی تھیں اور اس کی آنسوؤں سے بھری التجا کرتی آنکھیں اس کے سامنے آ کھڑی ہوتیں۔ وہ کروٹ پہ کروٹ بدلتی رہی مگر کسی طرح چین آ کے نہ دے رہا تھا۔ آخر وہ تھک کر سیدھا لیٹ گئی اور تاروں بھرے آسمان کو تکنے لگی۔

"آخر وہ میں ہی تو تھی جس نے آج تک ہر موقع پر بڑھ چڑھ کر شبو کو یہ احساس دلایا تھا کہ جالو اس کا ہونے والا گھر والا ہے۔ اب جب وہ اپنی آنکھوں میں خواب سجا بیٹھی تو میں ہی ان خوابوں کو نوچنے میں سب سے آگے آگے ہوں' مگر میں جو بھی کر رہی ہوں' اس کی بھلائی کے لیے ہی تو کر رہی ہوں' جالو بھلا کیا دے پائے گا اسے؟ شاید بہت سا پیسہ اور عیش کی زندگی نہ دے سکے' مگر محبت اور سکون کی دولت سے تو مالا مال کر دے گا۔ اس کی آنکھوں کے خواب اور ہونٹوں کی مسکراہٹ تو قائم رہے گی۔ لیکن غلام رسول بھی اسے پیار سے رکھے گا۔"

"ہاہاہا۔۔۔" وہ اپنے ساتھ تکرار میں مصروف تھی کہ اس کی آخری بات پر اس کے اندر کوئی اس پر ہنسا۔۔۔ وہ چپ کی چپ رہ گئی۔ اپنی دلیل کے کھوکھلے پن کا احساس اسے خود بھی تھا۔ نوراں نے بروقت دل اور گھر کے بسنے کے فرق کو سمجھ لیا تھا اور وہ فیصلہ کیا تھا جس سے اس کی بیٹی کی زندگی خوشیوں سے بھر سکتی تھی۔ فیصلہ کرکے وہ جلدی سے چارپائی سے اٹھی اور شبو کے کمرے کی طرف بڑھی۔ تاکہ اسے بھی یہ خوش خبری سنا سکے' ساری رات اسی ادھیڑبن میں گزر گئی تھی۔ لیکن آنے والی صبح ایک نئی سوچ کا سورج بھی ہمراہ لائی تھی۔

☼ ☼

سرورق کی شخصیت

ماڈل	رافیہ خان
ٹرانسپیرنسی	موسیٰ رضا
میک اپ	روز بیوٹی پارلر

نبیلہ عزیز

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دونوں بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصے سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

"ہاں کروں گی پوری، ضرور کروں گی تم شرائط رکھو تو سہی؟" علیزے تو جی جان سے رضامند تھی۔
"سوچ لو۔ ایک بار پھر سوچ لو۔" وہ سنجیدگی سے کہتا عین اس کے سامنے آرکا تھا۔
"پچھلے چوبیس گھنٹوں سے تمہارے سوا اور کوئی سوچ آہی نہیں رہی میں اور کیا سوچوں؟"
وہ اپنے سامنے کھڑے دل آور کو اس نظر سے دیکھ رہی تھی جس سے اسے یقین تھا کہ وہ اسے کھڑے کھڑے فتح کرلے گی۔ کیونکہ اس کی یہ نظر زندگی کی پہلی ایسی نظر تھی جس سے وہ کسی مرد کو دیکھ رہی تھی تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ مرد اس کی اس مخمور نظر سے بچ جاتا۔ اور اس پہ اثر نہ ہوتا۔
"ساری دنیا سے ناتا توڑ لوگی؟ میری خاطر؟ یہاں تک کہ بڑی حویلی والوں سے بھی۔۔۔؟" وہ اس کے چہرے پہ نظریں جمائے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
"ہاں۔ توڑ لوں گی۔۔۔ سب سے توڑ لوں گی۔۔۔ تم سے ناتا جوڑنے کی خاطر میں سب سے ناتا توڑنے کی ہمت رکھتی ہوں۔۔۔ کیونکہ اگر میری مما آسیہ آفندی اپنے ہزبینڈ کی خاطر ملک حویلی والوں کو چھوڑ سکتی ہیں تو میں بھی چھوڑ سکتی ہوں۔۔۔ بلکہ یہ کہنا بھی ٹھیک ہی ہوگا کہ میں بھی اس وقت بڑی حویلی والوں کو چھوڑ کر ہی آئی ہوں۔۔۔ وہ بھی صرف تمہاری خاطر۔"
علیزے نے بڑے سکون اور بڑے اطمینان سے اسے جواب دیا تھا۔ مگر اس کے اس ایک جواب سے دل آور کی تسلی نہیں ہونے والی تھی۔۔۔ وہ کچھ اور بھی سننا چاہتا تھا۔
"تو کیا ساری دنیا سے کٹ کے رہ لوگی؟ اتنا حوصلہ ہے تم میں؟" وہ بھی جواباً سنجیدگی سے ہی پوچھ رہا تھا۔ "مجھے اتنا حوصلہ بخشنے والے بھی تو تم ہی ہونا؟ میں ساری دنیا سے کٹ کے رہ سکتی ہوں یا نہیں یہ بات تم سے بہتر کوئی بھی نہیں جانتا۔ ہاں یہ بات اور ہے کہ اب کی بار تو میں خود چاہتی ہوں کہ تم مجھے ساری دنیا سے کاٹ کر سب سے الگ بیسمنٹ میں قید کر رکھو۔ جہاں تمہارے سوا کسی کا بھی آنا جانا نہ ہو۔ جہاں صرف علیزے ہو۔۔۔ اور اس کا ڈرائیور ہو۔"
علیزے کے ایسے بہکے بہکے سے جواب پہ دل آور کے دل کو کچھ ہوا تھا اور اک منہ زور جذبات کی لہر اس کی نس نس میں دوڑ گئی تھی کیونکہ وہ بڑے ہی اعتماد سے اپنے اور اس کے بیچ کے فاصلے مٹا کر اک بالکل ہی نئی اور لودیتی قربت کا حصار سا باندھتی جارہی تھی۔
"میری بیوی بن کر رہو گی؟ یا میری اماں کی بہو؟" وہ دو قدم اٹھاتا مزید اس کے قریب آگیا تھا۔
"تمہاری اماں کی بہو بن کر رہوں۔" علیزے کے پاس تو ہر جواب پہلے سے تیار تھا۔
"وہ کیوں؟" اس کی نظریں دل آور کی سوالیہ نظروں سے لپٹ کر جھک گئیں۔
"کیونکہ تمہاری اماں کی بہو بننے میں بڑا فائدہ ہے۔" اس کے شفاف ہونٹوں پہ بکھرتی مدھم مسکراہٹ دل آور کی نظروں سے مخفی نہیں رہ سکی تھی۔
"کیسا فائدہ؟" وہ مزید آگے بڑھا۔
"تمہاری اماں کی بہو بنوں گی تو میرا تم پہ رعب رہے گا۔۔۔ اور اگر تمہاری بیوی بن کے رہوں گی تو تمہارا مجھ پہ رعب رہے گا۔۔۔ اور اس رعب کی وجہ سے میں ہمیشہ تم سے ڈرتی ہی رہوں گی۔" وہ بڑی دور کی سوچیں سوچ رہی تھی۔
"رعب تو تم مجھ پہ ہمیشہ سے جماتی ہو۔۔۔ ہمیشہ تم نے مجھے ڈرائیور سمجھا ہے، دل آور نہیں۔" وہ اور آگے بڑھا۔ اور علیزے اسے اپنے اتنے قریب دیکھ کر بے ساختہ جھجک کر دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔
"تمہیں کیا پتا کہ اس ڈرائیور میں کیا چھپا ہے؟" وہ بے ساختہ مسکرا اٹھی۔

"کیا چھپا ہے؟" اس کی نظریں علیزے کے چہرے پہ گہری ہو گئیں۔
"دل آور۔۔۔" اس کے ہونٹ دھیمے سے کپکپائے۔
"اور دل آور میں کیا چھپا ہے؟" اس کے چھوٹے چھوٹے سوال بڑھتے جا رہے تھے۔
"علیزے کی محبت۔" علیزے بھی بڑے تحمل کے جواب دے رہی تھی۔
"تو پھر اس محبت سے دور کیوں ہٹ رہی ہو؟ قریب آؤ نا۔" دل آور نے ہاتھ بڑھا کے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔
"قریب ہی تو آنا چاہتی ہوں۔" علیزے کی آواز لرز گئی تھی۔
"کتنا قریب؟" دل آور کی آواز کی گمبھیرتا بھی کچھ کم نہیں تھی۔ علیزے کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں اور اس کی دھڑکنوں سے جیسے پورا ماحول ہی دھڑک اٹھا تھا۔ کمرے میں فسوں خیزی بڑھنے لگی تھی۔
"اتنا قریب کہ درمیان کچھ نہ رہے۔۔۔" علیزے کہتی ہوئی اس کے قریب ہوئی تھی۔
"یہ قریب ہونا بھی کوئی قریب ہونا ہے؟" دل آور فی الحال اسے شرم دلا رہا تھا کیونکہ ان دونوں کے بیچ ایک قدم کا فاصلہ اب بھی حائل تھا اور وہ یہ فاصلہ بھی نہیں چاہتا تھا۔
"تو پھر کیسا قریب ہونا 'قریب ہونا' ہوتا ہے؟" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔
"یہ تو تمہیں پتا ہونا چاہیے۔" دل آور فوراً ہی لاپروا سا بن گیا تھا۔ جس پہ علیزے کو اس کی لاپروائی دیکھتے ہوئے خود ہی جھجک کا دامن چھوڑنا پڑا تھا اور وہ اپنے اور اس کے بیچ کا فاصلہ مٹاتے ہوئے بے حد آہستگی سے اس کے سینے سے لگ گئی تھی اور دل آور کو یوں لگا جیسے اس کی صدیوں سے بھٹکتی اور تڑپتی روح کو قرار مل گیا ہو، جیسے ایک دم سے ہر چیز شانت ہو گئی ہو۔ جیسے اس کی ذات پہ چھائے عذاب پل میں چھٹ گئے ہوں۔
اور اس عذاب سے نکلتے ہی اس کی روح ہلکی پھلکی سی ہو گئی تھی۔ اس کا تن من سرشار سا ہو گیا تھا اور اسی سرشاری اور خماری کے ہاتھوں بہکتے ہوئے اس نے اپنے سینے سے لگی علیزے کو اپنے مضبوط بازوؤں کے شکنجے میں انتہائی زور سے بھینچ لیا تھا۔ اتنے زور سے کہ علیزے کو لگا وہ اس کے سینے میں پیوست ہو جائے گی۔
"اور زور سے۔۔۔" علیزے کی پسلیاں ٹوٹنے کو تھیں مگر پھر بھی وہ چاہتی تھی کہ وہ اسے زور سے بھینچنے کی حد کر ڈالے۔
"مر جاؤ گی۔" وہ اس کے کان کے قریب سرگوشی سے بولا۔
"مر جانے دو۔" وہ اس سے بھی زیادہ سرگوشی سے بولی تھی۔
"ایک بار پھر سوچ لو۔" وہ اسے اپنی بانہوں میں بھرتے ہوئے اور بھینچتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
"سوچ کر ہی تو آئی ہوں۔" علیزے نے کہتے ہوئے اس کے گریبان میں چہرہ چھپا لیا تھا اور اس کے چہرے کا لمس دل آور کے سینے سے ٹکرانے لگا تھا جس سے دل آور کی رگوں میں سر پٹختا جذبات کا جنون اور بھی منہ زور ہونے لگا تھا۔
"میرے جذبات کی شدتوں کو سہہ نہیں پاؤ گی۔" اس نے علیزے کو بازوؤں کے حصار سے آزاد کرتے ہوئے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر عین اپنے چہرے کے سامنے کر لیا تھا۔
"تم اپنی شدتیں آزماؤ تو سہی۔" علیزے کا لہجہ بھی بوجھل ہو رہا تھا اور اس کے الفاظ بھی۔
"میری شدتوں سے پہلے میری شرائط تو تم نے سنی ہی نہیں۔" وہ اپنے ہاتھوں کے انگوٹھوں سے علیزے کے رخساروں کو سہلا رہا تھا۔
"مجھے تمہاری کسی بھی شرط سے انکار نہیں۔۔۔ چاہے تو سائن کروا لو۔"

"سائن بھی کرواؤں گا۔ مگر آخری شرط کے بعد۔ جو سب سے زیادہ اہم ہے۔"
"آخری شرط؟ وہ کیا؟" علیزے کو حیران ہوئی۔
"بتاؤں؟" وہ تصدیق چاہ رہا تھا۔
"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔
"میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرو۔ اور اتنی شدید محبت کرو کہ باقی ہر شے کو بھول جاؤ۔ یہاں تک کہ اپنے آنے والے بچوں کو بھی۔" دل آور کی شدتیں اس کے اظہار اور اس کے الفاظ سے ہی ظاہر ہو رہی تھیں۔
"بچوں کو بھی؟ تو پھر ان سے محبت کون کرے گا؟" علیزے کو خفگی ہوئی تھی۔
"میں کس لیے ہوں آخر؟ میں کروں گا ان سے محبت۔ تم صرف مجھ سے محبت کرو گی صرف مجھ سے۔ شرط منظور ہے تو بات کرو۔" دل آور کی نظریں اس کے چہرے کے اک اک نقش کو چھو رہی تھیں اور بوسے دے رہی تھیں۔
"لاؤ کاغذ قلم۔ میں سائن کرتی ہوں۔" وہ یہ شرط ماننے کو بھی تیار تھی۔
"کاغذ قلم لانا ضروری تو نہیں۔ سائن تو تم کسی بھی جگہ کسی بھی چیز پہ کر سکتی ہو۔ بلکہ یوں کہنا ٹھیک ہو گا کہ مہر بھی لگا سکتی ہو۔" دل آور کا اشارہ اس کے گلابی شفاف ہونٹوں کی طرف تھا اور علیزے اس کا اشارہ سمجھ کر بے ساختہ بدک گئی تھی۔
"لیکن ڈرائیور۔" اس نے احتجاجاً کچھ کہنا چاہا تھا۔
"اب تم محبت کی ہامی بھر چکی ہو۔" دل آور نے کہتے ہوئے اسے کچھ بھی کہنے کی مہلت نہیں دی تھی اور اس کے سارے احتجاج اور سارے الفاظ اپنے ہونٹوں میں سمیٹ لیے تھے اور وہ بھی اتنی شدت سے کہ علیزے اس کی شرٹ اپنی مٹھیوں میں دبوچتی رہ گئی تھی۔ لیکن پھر بھی اپنا آپ چھڑا نہیں سکی تھی۔
"ڈرائیور۔" بڑی مشکل سے بڑی دیر بعد اس کے کھوئے ہوئے الفاظ واپس آئے تھے اور وہ بڑی کوششوں کے بعد کچھ کہنے کے قابل ہوئی تھی۔
"جی ڈرائیور کی جان۔ کہو۔ میں سن رہا ہوں۔" اس نے چکراتی ہوئی علیزے کو ایک بار پھر بانہوں میں لے لیا تھا اور اس کے بعد بے حد سلکی بالوں میں ہاتھ پھنساتے ہوئے انہیں سہلایا تھا۔
"میں رات بھر نہیں سوئی۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔" وہ بیڈ پہ لیٹنا چاہتی تھی۔
"میرا بھی یہ حال ہے۔" وہ گمبھیر آواز میں کہتا اس کے بالوں کو اور گردن کو نرمی سے چھو رہا تھا اور اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔
"تو پھر سونے دو نا مجھے؟" علیزے ______ اس کی سانسوں کے لمس سے کسمسائی تھی۔
"آؤ سلاتا ہوں تمہیں۔" وہ اسے یوں ہی بانہوں میں لیے بیڈ پہ بیٹھ گیا تھا اور بے حد نرمی اور بے حد آہستگی سے اسے بیڈ پہ لٹا بھی دیا تھا۔
"اور تم؟" علیزے کو اب اس کا خیال آیا تھا۔
"تم بتاؤ۔ میں کیا کروں؟ جاگتا رہوں یا سو جاؤں؟" وہ اس کے دائیں بائیں بیڈ پہ دونوں ہاتھ جمائے اس کے اوپر ذرا سا جھکا ہوا تھا۔
"سو جاؤ۔" علیزے نے کہتے ہوئے اس کے گلے میں بازو حمائل کر دیے تھے۔
"میں پاگل نہیں ہوں کہ آج کی رات بھی سو جاؤں۔" وہ استہزائیہ سے لہجے میں بولا تھا۔
"کیوں؟ آج کی رات کیوں نہیں سو سکتے؟" وہ نا سمجھی سے بولی۔

"کیونکہ آج کی رات میرے پاس، میرے سامنے، میری بانہوں میں میرے جاگنے کا سامان موجود ہے۔ آج کی رات سونے سے تو بہتر ہے کہ میں اپنی کنپٹی پہ ریوالور رکھ کے گولی ماروں اور مر جاؤں۔"
"پلیز۔ ایسا تو مت کہو۔" علیزے نے بے ساختہ تڑپ کر اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔
"تو پھر سلانا کیوں چاہتی ہو؟" وہ مصنوعی خفگی سے بولا۔
"میں کب سلانا چاہتی ہوں؟ میں تو چاہتی ہوں کہ تم خود بھی جاگو اور مجھے بھی جگاؤ۔" بے حد دھیمی آواز میں کہتے ہوئے اس نے پلکیں جھکالی تھیں اور دل آور بے ساختہ چلا اٹھا تھا۔
"علیزے۔" وہ انتہائی زور سے اور انتہائی خطرناک تیوروں سے دھاڑا تھا اور علیزے کھلکھلاتی ہوئی چہرہ چھپا گئی تھی کیونکہ دل آور اب پوری طرح سے اس پہ حاوی ہو چکا تھا اور وہ بے تحاشا ہنستی ہوئی اور کھلکھلاتی ہوئی اس سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کی کھلکھلاہٹوں سے پورا کمرہ گونج رہا تھا۔

"پلیز ڈرائیور پلیز۔ بس کرو۔ میں پاگل ہو جاؤں گی۔" علیزے اپنے چہرے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے احتجاجاً چلائی تھی۔ کیونکہ دل آور نے اسے واقعی پاگل کر ڈالا تھا۔ وہ چند جسارتوں پہ ہی بوکھلا گئی تھی۔
"او کے۔ او کے۔ اب کچھ نہیں کرتا۔ تم بس مجھے سلانے کی کوشش کرو۔ اور میں تمہیں جگانے کی کوشش کرتا ہوں۔" وہ معنی خیزی سے کہتا اس کے چہرے کے قریب جھک آیا تھا۔ اتنا کہ ان کی سانسیں ایک دوسرے میں رچنے لگی تھیں۔ جس پہ ان دونوں کے ہی اعصاب اک عجب سے سحر کی زد میں آ گئے تھے۔
"کیا مطلب؟" علیزے کے حواس بکھرنے لگے تھے۔ اس کا لہجہ اور اس کی آواز دل آور کو پاگل کرنے کے لیے کافی تھے اور اس کے صبر اور ضبط کا دامن چھوٹنے لگا تھا۔
"آج کی شب میری بانہوں میں رہو، سارے مطلب سمجھاؤں گا۔" وہ سرگوشی سے کہتا لیمپ کی تیز روشنی گل کر چکا تھا اور علیزے نے بڑے سکون سے اور پوری آمادگی کے ساتھ ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے خود کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس ــــــ کے حوالے کر دیا اور اس کی اس سپردگی پہ کب سے ٹھہری ہوئی کالی رات بھی مسکرا اٹھی تھی۔
کیونکہ ان کا یہ ملن بڑے صبر، بڑی برداشت اور بڑے ضبط کے بعد ہوا تھا۔ بڑی اذیتیں اور بڑے عذاب جھیلے تھے انہوں نے۔ اس لیے اس وصال کی رات پہ تو اب پورا پورا حق تھا ان کا اور اس حق کو پورے استحقاق سے وصول کرنے میں وہ دونوں ہی گم تھے۔ اس طرح کہ کائنات کا باقی ہر احساس ہی پس پشت ڈال دیا تھا۔ سوائے ایک دوسرے کے۔ کیونکہ اس وقت علیزے کے لیے اس کا ڈرائیور۔ اور ڈرائیور کے لیے اس کی علیزے ہی کل کائنات تھی۔

☆ ☆ ☆

دل کی پوچھتے ہو تو پھر سن لو
ہم نے بخشا تمہیں قیامت تک

وہ کپڑے چینج کر کے فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد بیڈ روم سے باہر نکل آئی تھی۔ حالانکہ سیڑھیاں اترتے ہوئے اور چڑھتے ہوئے اسے اب بھی بڑی دقت ہوتی تھی مگر آج اس کا موڈ فریش اور خوشگوار تھا۔ اس لیے وہ درد کے باوجود بھی ریلنگ کا سہارا لے کر سیڑھیاں اتر آئی تھی۔ اس کا رخ باہر لان کی طرف تھا۔
اور شبنم آلود گھاس پہ پاؤں رکھتے ہی اس کی روح سرشار ہو اٹھی تھی۔ اس کا من صبح کی ایسی تازگی پہ جھوم گیا

تھا اور وہ آہستہ آہستہ پھولوں کی کیاریوں کے پاس چلتی چند نوخیز پھولوں کو چن چن کر اپنی جھولی میں بھرنے لگی تھی اور اپنی بے دھیانی میں اسے پتا ہی نہ چلا کہ اس نے کتنے ہی پھول چن ڈالے تھے۔

"زری! تم یہاں۔۔۔ تم خود آئی ہو کیا؟" نگارش بھی تھوڑی دیر بعد نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر نیچے آگئی تھی اور نیچے لان میں ٹہلتی زری کو دیکھ کر وہ سخت حیرانی اور خوشگواریت کا شکار ہوئی تھی۔

"ہاں میں۔۔۔" زری مسکراتی ہوئی اس کی طرف پلٹی۔

"لیکن تم یہاں کیسے؟" نگارش کو واقعی حیرت ہو رہی تھی کیونکہ زری ابھی بھی چلتے ہوئے لڑکھڑا جاتی تھی۔ اس کے قدم ابھی جم نہیں رہے تھے اور نہ ہی ان کی مضبوطی قائم ہو رہی تھی۔

"میں یہاں خود آئی ہوں۔ بغیر کسی سہارے کے۔۔۔" زری نے خوشی خوشی بتایا تھا۔

"لیکن کیوں زری؟ تم نے ایسا رسک کیوں لیا؟ اگر تم سیڑھیوں سے گر جاتیں تو۔۔۔؟" نگارش کو سوچ کر ہی جھرجھری سی آگئی تھی۔

"ارے ڈونٹ وری بھابھی۔۔۔ کچھ نہیں ہوتا۔۔۔ میں نے یہ رسک اپنے آپ کو آزمانے کے لیے لیا ہے۔۔۔ اپنی ہمت اور اپنا حوصلہ دیکھنے کے لیے کیا ہے یہ سب۔۔۔ اگر آج میں کسی قدم پہ گر جاتی تو آپ نہیں جانتیں کہ میں زندگی بھر اٹھ نہیں سکتی تھی۔۔۔ سنبھل نہیں سکتی تھی۔۔۔ اپنے پیروں پہ چل نہیں سکتی تھی۔۔۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔۔۔ میں کہیں بھی نہیں گری۔۔۔ اس لیے سمجھ لیں ــــــ کہ سنبھل گئی ہوں۔۔۔ اور چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی ہوں۔۔۔ میرے قدم کمزور نہیں رہے۔۔۔ مضبوط ہو گئے ہیں۔۔۔ اب میں کسی بھی سہارے کے بغیر چل سکتی ہوں۔۔۔ اکیلی چل سکتی ہوں۔۔۔ خود اکیلی۔۔۔" زری نے کچھ اس انداز اور الفاظ میں اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ نگارش فوراً" ہی چونک گئی تھی۔۔۔ "کیا بات ہے؟ تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟ کیا ہوا ہے؟" نگارش پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"میں اس لیے ایسا کہہ رہی ہوں کہ میں آج بہت خوش ہوں۔۔۔ بہت زیادہ خوش۔۔۔" زری کی خوشی ایسی تھی کہ اس کے لہجے سے بھی جھلک رہی تھی۔

"کیوں۔۔۔؟ ایسا کیا ہوا ہے آج کہ تم اتنی خوش نظر آ رہی ہو؟" نگارش کو حیرت پہ حیرت ہو رہی تھی۔

"کیونکہ علیزے دل آور شاہ کے پاس واپس آگئی ہے۔۔۔ اپنے گھر۔۔۔ اپنے شوہر کے پاس۔۔۔ اور مجھے اس کے آجانے کی بہت خوشی ہوئی ہے۔۔۔ کیونکہ ان دونوں کا گھر ٹوٹنے سے بچ گیا ہے۔۔۔ اور دل آور شاہ کو اس کی علیزے واپس مل گئی ہے۔۔۔ اسی لیے آج فجر کی نماز کے بعد صرف ان دونوں کے لیے ہی دعا کی ہے کہ اللہ ان کا یہ ساتھ ہمیشہ سلامت رکھے۔ میری پھوپھو کی علیزے ہمیشہ سہاگن رہے' آباد رہے' اور ان کی جھولی ایسے خوب صورت پھولوں سے بھر دے۔"

زری نے کہتے ہوئے اپنی جھولی میں بھرے پھولوں کو بڑی نرم نگاہوں سے دیکھا تھا اور سارے پھول نگارش کی جھولی میں ڈال دیے تھے اور خود دھیمے دھیمے قدم اٹھاتی اندر کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"بھابھی! میں سوچ رہی تھی کہ ہم نبیل حیات اور دل آور شاہ کو کھانے پہ انوائیٹ کرتے ہیں۔ اس طرح انہیں اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ آنے کا موقع مل جائے گا اور عبداللہ بھائی بھی اپنے دوستوں سے مل کر خوش ہو جائیں گے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟" وہ جاتے جاتے پلٹی تھی اور جواباً" نگارش محض سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

انا پرست ہوں

ضدی ہوں
سرپھرا ہوں
مگر مجھے تمہاری محبت بدل بھی سکتی تھی
صبح اس کی آنکھ بھی بہت دیر سے ہی کھلی تھی اور آنکھ کھلتے ہی اس کی پہلی رات بہت دیر تک جاگنے کی وجہ سے نظر دل آور کے سوئے ہوئے چہرے پہ پڑی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کا دل بڑے زور سے اور بڑے بے ساختہ انداز میں دھڑکا تھا کیونکہ اس کا چہرہ علیزے کے چہرے سے بے حد قریب تھا اور اسے اتنے قریب سے پہلی مرتبہ دیکھنے کی وجہ سے اس کے دل میں عجیب عجیب سے جذبات ابھرنے لگے تھے اور عجیب عجیب سے خیالات آنے لگے تھے اور تب اسے احساس ہوا تھا کہ واقعی محبت کیا کچھ نہیں بدل سکتی؟ محبت انسان کی نفرت کو بھی محبت میں بدل سکتی ہے اور اس کا ادراک اسے کل شب دل آور شاہ کا محبت بھرا روپ دیکھ کر ہی ہو گیا تھا۔

"ڈرائیور۔" علیزے نے اس کی پیشانی پہ بکھرے بالوں کو بے حد آہستگی سے پیچھے ہٹاتے ہوئے سرگوشی نما آواز میں اسے پکارا تھا۔

"ہوں۔ بولو۔ کیا دیکھ رہی ہو؟" دل آور یوں ہی آنکھیں بند کیے بولا تھا اور علیزے اس کے اتنے اطمینان سے بولنے پہ بدک گئی تھی۔

"تم جاگ رہے ہو؟" علیزے کا دل اور بھی بری طرح دھڑکا تھا۔

"سوئے ایک ساتھ تھے تو جاگنا بھی تو ایک ساتھ ہی تھا نا؟" دل آور نے آنکھیں کھولتے ہوئے اسے بازو کے حصار میں لے کر اپنے قریب کھینچ لیا تھا۔

"تمہاری زندگی کی اک نئی صبح مبارک ہو تمہیں۔" علیزے نے پلکیں جھکائے اس کے سینے پہ انگلی پھیرتے ہوئے کہا تھا اور دل آور اس کی اس شرمیلی سی ادا پہ مسکرا دیا تھا۔

"اور تمہیں بھی۔" اس نے اس کی پیشانی پہ ہونٹ رکھ دیے تھے اور علیزے نے روح تک شانت ہوتے ہوئے پلکیں موند لی تھیں۔

"بڑی حویلی چلو گی؟" دل آور نے بہت سکون سے سوال کیا تھا مگر علیزے نے پٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔

"کیا؟ بڑی حویلی؟" اسے شدید ترین حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

"ہاں۔ بڑی حویلی۔" مگر اس کا اطمینان ہنوز تھا۔

"مگر ڈرائیور۔" اس سے بات کرنا ہی مشکل ہو گیا تھا۔

"دیکھو علیزے۔ اگر میری اماں تمہاری خاطر وقار آفندی کو معاف کرنے کا حوصلہ کر سکتی ہیں تو پھر تمہاری خاطر یہ حوصلہ میں بھی کر سکتا ہوں۔ معاف کروں گا تو پوری طرح سے کروں گا کوئی کم ظرفی نہیں دکھاؤں گا۔ البتہ رات کو میں نے تم سے جو کچھ بھی کہا وہ بس تمہیں جان بوجھ کر ڈگمگانے کے لیے اور آزمانے کے لیے کہا تھا کہ تم میرے لیے کس حد تک جا سکتی ہو؟ یا پھر تمہارے اندر میرے لیے کتنا احساس باقی ہے؟ تم مجھ سے محبت بھی کر سکتی ہو یا صرف مجھ سے ہمدردی محسوس کرتے ہوئے یہاں تک آ گئی ہو؟ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ تم ڈگمگائی نہیں اور نہ ہی تمہیں مجھ سے ہمدردی ہوئی ہے۔ بلکہ تم یہاں تک میری محبت اور میرے احساس میں آئی ہو۔ کیونکہ مجھے پتا ہے کہ کسی کی محبت دل میں ساری عمر دبائے رکھنے والے بھی اک دن برداشت کا دامن چھوڑ دیتے ہیں اور کھل کے سامنے آ جاتے ہیں۔ اور محبت جاگنے میں تو صرف اک لمحہ لگتا ہے۔ اور وہ لمحہ ہی پوری زندگی پہ حاوی ہو جاتا ہے۔

اس لیے یہ بات اچھی طرح سمجھ لو۔ کہ میں تمہیں کبھی بھی قید کر کے یا دنیا سے کاٹ کے نہیں رکھوں گا' بلکہ تم اپنی پوری آزادی سے اپنی مرضی سے اور اپنی حکمرانی سے زندگی جیو گی۔۔ یہ گھر تمہارا ہے۔ میں تمہارا ہوں اور میرا سب کچھ تمہارا ہے۔ تم جو چاہو کر سکتی ہو کیونکہ اب تم مالک ہو' میری بھی اور میری ہر چیز کی بھی۔" دل آور نے کوئی بھی لگی لپٹی رکھے بغیر صاف صاف کہہ دیا تھا اور علیزے بے ساختہ اٹھ بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔

"لیکن ڈرائیور۔۔ میں بڑی حویلی نہیں جانا چاہتی۔" اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"کیوں؟ کیوں نہیں جانا چاہتیں؟" وہ بھی اس کے برابر ہی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"کیونکہ اس طرح جانے سے نہ تمہاری عزت' عزت رہے گی اور نہ میری۔"

"تو پھر۔" دل آور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"اگر بڑی حویلی والوں کو ہماری کوئی قدر یا ضرورت ہوئی تو انہیں ہمارے گھر خود آنا ہو گا۔۔ ہمیں اپنے گھر بلانا ہو گا۔۔ ورنہ اس طرح بن بلائے میں بھی نہیں جاؤں گی' کبھی بھی نہیں۔"

اس نے سختی سے کہتے ہوئے انکار کر دیا تھا اور دل آور اس کا اتنا عقل مندانہ فیصلہ سن کر پہلے چند سیکنڈز کے لیے چپ ہوا تھا۔ پھر حیران ہوا تھا اور پھر بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ بہت سیانی ہو گئی ہو؟" وہ اسے قریب کرتے ہوئے بولا تھا۔

"جو عورت اپنے گھر اور اپنے شوہر سے محبت کرنا جان لیتی ہے نا۔۔ وہ سیانی ہو ہی جاتی ہے۔" علیزے اس وقت خالصتاً "بیویوں والے روپ میں نظر آ رہی تھی اور دل آور کے دل میں عجیب شرارتی سی کھد بد ہونے لگی تھی۔

"نہ کرو یار نہ کرو۔۔ تمہاری ایسی محبت پاش باتوں سے مجھے پھر سے نشہ ہونے لگے گا۔۔ اور میں بھول جاؤں گا کہ اس وقت صبح ہے یا رات؟" وہ بے حد گمبھیر لہجے میں کہتے ہوئے اس کے سلکی بالوں میں چہرہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا اور علیزے اس کے گمبھیر لہجے اور اس کی بات کے مفہوم سے ہی چونک گئی تھی اور یکدم بیڈ کے بیڈ سے اٹھ بھی گئی تھی۔ جس پہ دل آور قہقہہ لگا کر ہنستا رہ گیا تھا اور واش روم میں گھس گئی تھی' لیکن دو سیکنڈ بعد وہ دروازہ کھول کر ذرا سا باہر جھانکتے ہوئے مخاطب ہوئی تھی۔۔ مگر بڑے ہی شریر سے انداز میں۔۔

"سوری ڈرائیور۔۔ ایک بات تو میں نے کہی ہی نہیں۔۔ حالانکہ رات سے کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔"

"کیا بات؟" وہ بھی کمبل ہٹا کر بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"یہی کہ۔۔" وہ اٹکی۔

"کیا یہی کہ؟" وہ متجسس ہوا۔

"آئی۔۔ رئیلی۔۔ لو۔۔ یو۔۔" وہ ایک ایک لفظ بڑا ٹھہر ٹھہر کر بولی تھی اور دل آور پیروں میں سلیپر پہنا بھول گیا تھا۔

"کیا۔۔ کیا کہا؟ ایک بار پھر کہو؟" وہ واش روم کی طرف پلٹتے ہوئے بولا۔

"آئی لو یو۔۔ آئی۔۔ رئیلی۔۔ لو۔۔ یو۔۔" وہ پھر بولنے سے باز نہیں آئی تھی۔

"ذرا قریب آ کر کہو۔۔ کیا کہہ رہی ہو؟" وہ بے قدموں واش روم کی طرف بڑھا تھا اور علیزے اس کے جھپٹنے کا ارادہ بھانپتے ہی یکدم کھلکھلاتے ہوئے دروازہ بند کر چکی تھی اور دل آور ہاتھ ملتا رہ گیا تھا۔

"علیزے۔۔" وہ جھنجلایا تھا۔

"جی علیزے کی جان۔۔ سن رہی ہوں۔" علیزے نے اندر سے ہی بڑے محبت بھرے انداز میں پوچھا تھا۔

"باہر آؤ۔ مجھے بھی کچھ کہنا ہے۔" وہ واش روم کا دروازہ بجاتے ہوئے بولا۔
"شاور لے لوں۔ پھر آجاؤں گی۔" وہ بھی وہیں سے ہی جواب نواز رہی تھی۔
"بعد میں لے لینا۔ پہلے میری بات تو سن لو۔" وہ خفگی سے کہہ رہا تھا لیکن اندر اب پانی کی آواز کے سوا خاموشی چھا گئی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ شاور لینا اسٹارٹ کر چکی ہے، جب ہی دل آور غصے سے دروازے کو گھورتا پلٹ گیا تھا۔
"باہر آؤ۔ پھر پوچھتا ہوں تمہیں۔" اس کی مصنوعی دھمکی پہ علیزے کے ہونٹوں پہ بھی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

جودت کے کارنامے کا سن کر بڑی حویلی والوں کو ایک بار پھر سانپ سونگھ گیا تھا اور وہ اپنی اپنی جگہ پہ سن سے ہو کر رہ گئے تھے۔ جبکہ آذر اپنے پورے ہوش و حواس میں ان سب سے یکسر مختلف کیفیت میں گھرا اپنے خیالات اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل سے آگاہ کر رہا تھا۔
اور اس کا پہلا اعلان یہی تھا کہ کوئی بھی تاخیر کیے بنا آج شام پوری تیاری سے شگن لے کر مریم آفندی کے گھر جایا جائے۔ کیونکہ اب وہ مریم فاروق نیازی نہیں، بلکہ مریم آفندی ہو چکی تھی۔ اب اس گھر کی عزت تھی وہ۔ اس لیے وہ یہ کام جلد از جلد نبٹانا چاہتا تھا۔
"صرف شگن لے کر جانے سے کیا ہوگا؟" اسرار آفندی نے بھی لب کشائی کی تھی۔
"صرف شگن لے کر جانے سے یہ ہوگا کہ شادی کی ڈیٹ فکس ہو جائے گی اور ہم اس ڈیٹ پہ بارات لے جائیں گے اور دوسری بات یہ کہ ان لوگوں کو آپ سے مل کر تسلی ہو جائے گی کہ ان کی بیٹی محفوظ ہاتھوں میں جا رہی ہے اور اسے ہر طرح کا تحفظ ملے گا۔" آذر اب ہر محاذ پر اکیلا ہی جنگ لڑ رہا تھا۔
"حق مہر میں دو کروڑ کا اماؤنٹ لکھوا کر بھی انہیں ابھی اور تحفظ کی ضرورت ہے کیا؟" ثمرو بیگم نے خفگی سے کہا تھا۔
"ہاں۔ ہے ضرورت۔ کیونکہ ایک شریف اور عزت دار آدمی کی عزت کے سامنے یہ دو کروڑ کچھ بھی نہیں اور ویسے بھی یہ دو کروڑ انہوں نے نہیں ہمارے اپنے صاحبزادے نے لکھوائے ہیں۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو دس کروڑ لکھواتا۔ لیکن افسوس کہ یہ نکاح میرے جانے سے پہلے ہو چکا تھا۔" آذر نے اپنی ساس کو ایک کرارا جواب دیا تھا۔ جس پہ باقی سب بھی چپ ہو گئے تھے۔
"تو شادی کی ڈیٹ کب کی فکس کرنی ہے؟" اسرار آفندی بیٹے کی رائے پوچھ رہے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آذر جو بھی کہہ رہا ہے ٹھیک کہہ رہا ہے اور اب انہیں وہی کرنا ہے، جو وہ کہے گا۔
"جب ہماری شادی ہوگی۔" وہ ہر بات دو ٹوک طریقے سے کر رہا تھا۔
"یعنی تینوں شادیاں ایک ہی ڈیٹ کو رکھنی ہیں؟"
"نہیں۔ پہلے میری اور جودت کی شادی ہوگی۔ اور دوسرے روز دانیال کی۔ کیونکہ حرمت کو رخصت کرنے کے لیے ہمارا فارغ ہونا زیادہ ضروری ہے۔" آذر کا مشورہ اچھا تھا۔ اس لیے کوئی بھی انکار نہیں کر سکا تھا اور اس نے یہ بھی اعلان کر دیا تھا کہ مریم آفندی کے ساتھ کوئی بھی اجنبیت اور ناانصافی نہیں برتے گا۔ اس کے ساتھ بھی وہی رویہ رکھا جائے گا جو اس حویلی کی باقی بیٹیوں اور بہوؤں کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ اپنائیت، شفقت، محبت اور عزت والا۔

اس کے اس اعلان پہ سب نے سر تسلیم خم کر دیے تھے۔ کیونکہ اب اس حویلی کا سارا انتظام اور دارومدار اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس لیے ثروت بیگم آج شام مریم کے گھر شگن لے کر جانے کی تیاری کرنے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے عبداللہ بھائی اور نبیل بھائی سے کوئی کانٹیکٹ نہیں ہے تمہارا۔" علیزے ناشتا کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"کیوں؟ تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟" وہ چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔

"کل سے ان کا کوئی ذکر۔ یا ان کا کوئی فون نہیں سنا اس لیے۔" علیزے جوس پینے لگی۔

"کیا کل سے مجھے تم سے فرصت ملی ہے۔ جو میں ان کا ذکر کرتا۔"

دل آور اس کے مقابل والی کرسی پہ بیٹھا اسے خاصی بے باک نظروں سے دیکھتا ہوا بڑے ذومعنی انداز میں بولا تھا اور اس کی نظروں کی ایسی تپش اور لفظوں کی ایسی معنی خیزی پہ علیزے کا چہرہ شرم سے گلابی پڑ گیا تھا۔

"لیکن میں نہیں چاہتی کہ تم میری ذات میں گم ہو کر اپنے بھائیوں جیسے دوستوں کو بھول جاؤ۔" وہ پلکیں جھکاتے ہوئے بولی تھی۔

"اف یار۔۔۔ کب بھول رہا ہوں؟ ابھی تمہاری ذات میں گم ہوئے ایک دن ہی تو گزرا ہے۔ اور تم سے یہ بھی برداشت نہیں ہو رہا۔" وہ خفگی سے کہتا چائے کا کپ واپس ٹیبل پر رکھ چکا تھا۔

"ہاں تو ٹھیک کہہ رہی ہوں نا اگر تم ان کی ذات میں گم ہو کے مجھے بھول جاؤ گے یا مجھے کم ٹائم دو گے تو مجھے تکلیف ہو گی' دکھ ہو گا' اسی طرح اگر میری ذات میں گم ہو کر انہیں بھول جاؤ گے یا انہیں کم ٹائم دو گے تو انہیں تکلیف ہو گی' انہیں دکھ ہو گا۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم اس چیز میں بیلنس رکھو۔۔۔ اور تینوں دوست پہلے کی طرح رہو۔۔۔" علیزے نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور دل آور مسکراتے ہوئے سمجھ بھی گیا تھا۔

"او کے مادام۔۔۔ جو آپ کا حکم۔" اس نے سر خم کر دیا تھا۔

"مومنہ بھابھی کے کیس کا کیا بنا؟" علیزے کورٹ کے فیصلے سے انجان تھی۔

"سزا ہو گئی ہے ملک حق نواز کو۔" وہ دوبارہ چائے پینے لگا۔

"اچھا۔۔۔ کب۔۔۔؟" وہ حیران ہوئی۔

"جب تم اسپتال میں تھیں۔" وہ لاپروائی سے بتا رہا تھا۔

"کیا سزا ہوئی ہے اسے؟" وہ جاننا چاہ رہی تھی۔

"سزائے موت۔۔۔" اس کا انداز ہنوز تھا۔

"وہ کیوں؟ یہ سزا تو شاید مرڈر کیس والوں کو ہوتی ہے؟" اسے بھی تھوڑا بہت علم تھا۔

"ہاں۔۔۔ مرڈر کیس والوں کو ہی ہوتی ہے اور ملک حق نواز کی گردن پہ چھ لوگوں کے خون کے چھینٹے تھے۔ حالانکہ اس نے کئی بے گناہ اور معصوم لوگوں کی زندگی کا خاتمہ کیا ہے' لیکن چھ لوگ ایسے تھے جن کے لواحقین پولیس اسٹیشن تک بھی پہنچے' مگر ملک حق نواز کے بندوں کے ہاتھوں دبوچ لیے گئے تھے۔ اس لیے ان کی فائلز اوپن کروا کر سامنے لائی گئی اور ثبوت اور شواہد اکٹھے کیے گئے تو ملک حق نواز کے لیے عدالت کو سزائے موت کے علاوہ اور کوئی سزا نظر نہیں آئی' جبکہ ملک اسد اللہ ابھی تک اسے بچانے کی تگ و دو میں لگا ہوا ہے' جو کہ بہت ہی ناممکن سی بات ہے۔" دل آور نے اسے ذرا تفصیل سے بتایا تھا۔

"ہوں۔۔۔ تو پھر مومنہ بھابھی تو بہت خوش ہوں گی آج کل؟"

"ہاں۔ بہت خوش ہیں۔ کیونکہ نبیل نے ان کے ساتھ کوئی ناانصافی اور کوئی کوتاہی نہیں برتی۔ بہت عزت کرتا ہے ان کی۔ اور بہت خیال بھی رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ فائزہ آنٹی نے پورا گھر ان کے ہاتھوں میں سونپ دیا ہے۔ اب سب کچھ کرنے دھرنے والی مومنہ بھابھی ہی ہیں۔ اور دوسری طرف انہیں انصاف بھی مل چکا ہے۔" دل آور بڑے سکون سے اسے آگاہ کررہا تھا۔

"اوہ۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ پھر۔" علیزے کو حقیقتاً "بہت خوشی ہوئی تھی۔

"صاحب جی! وہ باہر نبیل صاحب آئے ہیں۔" زلفی کافی عجلت میں اندر داخل ہوا تھا۔

"لیجیے جناب! آگئے آپ کے نبیل بھائی۔" دل آور ٹیشو سے ہاتھ پونچھ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"بٹھاؤ اسے میں وہیں آرہا ہوں۔ علیزے تم چائے بنادو اس کے لیے۔" وہ زلفی سے کہہ کر علیزے کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"او کے۔ بنادیتی ہوں۔ آپ جائیں۔" وہ بڑی عزت اور بڑے احترام سے بولی تھی اور دل آور ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

"کیا کہا؟ آپ۔" اس نے آپ پہ زور دیا۔

"کیا کروں؟ آپ کی عزت کا سوال ہے۔ دوسروں کے سامنے اتنا احترام تو پھر کرنا ہی پڑتا ہے؟" علیزے نے جیسے مجبوری ظاہر کی تھی۔

"اور اکیلے میں؟" وہ اس کا اگلا جواب سننے کا منتظر تھا۔

"اکیلے میں احترام نہیں ہوتا۔" وہ شرارت بھرے لہجے میں کہتی ہوئی آہستگی سے کرسی سے اٹھ کر ٹیبل کی دوسری سائیڈ پہ چلی گئی تھی۔

"تو پھر کیا ہوتا ہے؟" دل آور کے قدم پوری طرح سے واپس پلٹ چکے تھے۔

"پیار ہوتا ہے۔ محبت ہوتی ہے۔ اور ڈرائیور اور علیزے ہوتے ہیں۔" اس کا انداز ایسا تھا کہ دل آور کا دل مچل گیا تھا اور ابھی وہ اس کی طرف لپکنے ہی والا تھا کہ زلفی دوبارہ آگیا تھا۔

"نبیل صاحب کے ساتھ عدیل صاحب بھی ہیں۔ ان کے لیے بھی چائے بنادیجیے گا۔"

"اف زلفی۔" دل آور اس کی مداخلت پہ دل مسوس کے رہ گیا تھا اور علیزے اپنی ہنسی دباتی ہوئی کچن میں گھس گئی تھی۔

"کیا ہوا صاحب جی؟" وہ اب صاحب جی کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"کچھ نہیں ہوا۔ آؤ میرے ساتھ۔" وہ کہہ کر باہر نکل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم نبیل بھائی!" علیزے بہت سلیقے سے دوپٹا اوڑھے ان کے لیے چائے لے کر آئی تھی۔

"وعلیکم السلام! کیسی ہیں بھابھی۔" نبیل اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور عدیل کو بھی اس کی تقلید کرنا پڑی تھی۔

"الحمدُللہ! بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں مومنہ بھابھی، مدیحہ اور فائزہ آنٹی کیسی ہیں؟ آپ ان لوگوں کو بھی ساتھ ہی لے آتے؟" علیزے تو یوں بات کررہی تھی جیسے اس کی ان سب سے صدیوں سے بے تکلفی اور گہرے مراسم چلے آرہے ہوں۔

"آپ دعوت دیں گی تو ضرور آئیں گے۔" نبیل مسکرایا۔

"لیکن میرا خیال ہے کہ انہوں کو دعوت دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی وہ خود ہی چلے آتے ہیں۔" اب تو وہ کافی سمجھ داری والی باتیں کرنا سیکھ گئی تھی۔

"یہ بھی ٹھیک کہا آپ نے۔ اوکے ہم بغیر دعوت کے ہی آجائیں گے۔"

"تھینک یو۔ پلیز بیٹھیے نا۔" وہ چائے کی ٹرے ٹیبل پر رکھ چکی تھی۔

"تھینکس۔ پلیز آپ بھی بیٹھیے۔ میں یہاں اسی لیے آیا ہوں کہ آپ دونوں سے بات ہو سکے۔"

"جی۔ کہیے؟" علیزے اندر سے جھجکتی ہوئی ول آور کے ساتھ ہی صوفے پہ بیٹھ گئی تھی کیونکہ اس سے ذرا ہٹ کے یا دوسرے صوفے پہ بیٹھتی تو یقیناً "نروس" ہو جاتی۔

"مجوودت کے نکاح کا پتا چلا آپ کو؟" نبیل نے بات شروع کی۔

"مجوودت کے نکاح کا؟ کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں؟" اس نے ذرا الجھ کر ول آور کی سمت دیکھا۔

"میں بتاتا ہوں آپ کو۔" نبیل نے بات بتانی شروع کی اور پھر اینڈ تک جا کر ہی اسٹاپ لیا تھا۔ لیکن اتنے میں علیزے کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں گونجنے لگی تھی۔

"پلیز آپ پریشان نہ ہوں۔ معاملہ حل ہو چکا ہے۔ بس اب یہ مسئلہ ہے کہ وہ لوگ آج شام کو شگن لے کر آنا چاہ رہے ہیں اور شادی کی ڈیٹ فکس کرنا چاہ رہے ہیں۔ اس لیے عدیل پریشان ہے اور الجھا ہوا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ کیا اتنی جلدی یہ سب کرنا ٹھیک ہو گا؟ ہم لوگ تو آپ کی فیملی کو نہیں جانتے۔ لیکن آپ کی فیملی کو آپ دونوں سے بہتر کوئی بھی نہیں جانتا۔ اس لیے زیادہ بہتر مشورہ آپ ہی دے سکتے ہیں۔" نبیل نے ان دونوں کے چہروں کی سمت دیکھا تھا۔

"اس میں زیادہ پریشان ہونے کی اور مشورے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ لوگ شگن لے کر آتے ہیں۔ آپ شگن لے کر رکھ لو اور شادی کی ڈیٹ بھی فکس کر دو۔ کیونکہ ایسے کاموں میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ میں نے ان دونوں کا نکاح کروایا تھا تو بہت سوچ سمجھ کر کروایا تھا۔ مریم تمہاری نہیں ہماری بھی بہن ہے۔ اس لیے ہم تمہیں کوئی غلط مشورہ ہرگز بھی نہیں دیں گے۔ باقی رہا شادی کے اخراجات کا مسئلہ تو سمجھو کہ وہ بھی حل ہو جائے گا۔ ہم تمہیں کوئی خیرات نہیں دیں گے۔ البتہ تم ہم سے ادھار ضرور لے سکتے ہو۔ بعد میں آہستہ آہستہ رقم ادا کر دینا۔" ول آور ہمیشہ کی طرح اصل مسئلے تک جا پہنچا تھا۔

"اس طرح تو تم ایمن کی شادی بھی نبٹا سکتے ہو۔ شہریار سے کہو وہ بھی آج ہی شگن لے آئے۔" نبیل کو ایمن کا بھی خیال آیا تھا۔

"مگر۔" عدیل نے کچھ کہنا چاہا۔

"اگر مگر کچھ نہیں۔ آج یہ دونوں کام نبٹ جانے چاہئیں۔ شہریار کی امی کو کال کرو۔" نبیل بضد ہوا اور پھر عدیل کو مجبوراً "یہ کام کرنا ہی پڑا تھا۔

"ویری گڈ۔ اب یوں سمجھو کہ تم ان دونوں فرائض سے فارغ ہو گئے اور سرخرو بھی۔" نبیل نے اسے تھپکی دی تھی۔

"تھینک یو سر۔ یہ سب آپ لوگوں کی ہیلپ اور حوصلہ افزائی کی وجہ سے ہی تو ہو رہا ہے۔ ورنہ تو۔" عدیل نے مایوسی سے سر ہلایا تھا۔

"ارے نہیں یار! ہوتا وہی ہے جو انسان کی قسمت میں ہوتا ہے۔ بس میرے اور تمہارے جیسے لوگوں کو اللہ وسیلہ بنا دیتا ہے۔ حالانکہ ہم کرتے کچھ بھی نہیں بس وسیلہ بنتے ہیں۔ کرنا تو اللہ کی ذات کا کام ہے۔ ہم تو اس کی رضا کے بغیر ہل بھی نہیں سکتے۔" نبیل نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

دل آور، نبیل اور عبداللہ جب بھی کسی کی ہیلپ کرتے تھے تو کچھ اس طرح کہ اگلے بندے کے ضمیر پہ کسی قسم کا کوئی بوجھ نہ پڑتا اور نہ ہی اسے شرمندگی ہوتی۔۔۔ عدیل کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی سلسلہ تھا ان کا۔ کیونکہ انہیں پتا تھا کہ وہ غریب ہونے کے ساتھ ساتھ خوددار بھی ہے۔

"میں نے ایک فیصلہ اور کیا ہے دل آور۔۔۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں نے تم سے مشورہ نہیں کیا۔۔۔ بس سچویشن ایسی تھی کہ مجھے بات کرنا پڑ گئی۔ اگر بہت سوچ سمجھ کر کرتا تو تم سے پوچھے بغیر نہ کرتا۔" نبیل نے اب دوسری بات کہنے کے لیے تمہید باندھی تھی۔

"یہی نا کہ تم مدیحہ کا رشتہ عدیل کے ساتھ طے کر چکے ہو؟" دل آور نے اس کی بات کا پردہ خود ہی ہٹا دیا تھا اور نبیل، عدیل اور علیزے تینوں ہی بے ساختہ چونک کر دیکھنے پہ مجبور ہو گئے تھے۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" نبیل کو شدید ترین حیرت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

"تو کیا مدیحہ کے صرف ایک تم ہی بھائی ہو؟ میں کچھ بھی نہیں ہوں؟ ہر بات کا تمہیں ہی پتا چل سکتا ہے، مجھے نہیں؟" دل آور کے لہجے میں خفگی تھی۔

"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں ایسا کب کہہ رہا ہوں۔۔۔ مگر یہ بات تو۔۔۔" نبیل کی حیرت ہنوز تھی۔

"تم مجھ سے کوئی بات چھپا سکتے ہو مگر مدیحہ نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"اوہ۔۔۔ تو یہ بات مدیحہ نے بتائی ہے؟" نبیل ریلیکس ہو گیا تھا۔

"ہاں۔۔۔ اور مجھے اس کا انتخاب بہت اچھا لگا ہے۔ اس کے حوالے سے اگر ہم بھی کچھ سوچتے تو ایسا ہی سوچتے۔ میری طرف سے ہاں ہے۔ بس اب شادی کے بارے میں کوئی فیصلہ مت کرنا۔۔۔ وہ میں خود کروں گا۔" دل آور نے آخر میں نبیل کو سمجھا بھی دیا تھا۔ جس پہ وہ تینوں ہی مسکرا دیے تھے۔

☼ ☼ ☼

آج منڈے تھا اور رات کو دل آور اسے تاکید کر کے سویا تھا کہ وہ اسے صبح ذرا جلدی جگا دے کیونکہ اسے ایک کیس کے سلسلے میں کورٹ پہنچنا تھا۔ اسی لیے علیزے اسے دوبار آواز دے کر جا چکی تھی، مگر تیسری بار اس نے کوئی اور حربہ آزمانے کی کوشش کی تھی۔

"ڈرائیور۔۔۔" وہ آہستگی سے سرگوشی کرتے ہوئے بولی تھی۔

"ہوں۔۔۔" وہ گہری نیند سے بولا۔

"ڈرائیور میری جان! کورٹ جانے کا ٹائم ہو رہا ہے۔ اٹھنا نہیں ہے کیا؟" علیزے کی ایسی جان لیوا سرگوشی پہ دل آور کی ساری نیند ہوا ہو گئی تھی۔

"علیزے۔۔۔" وہ خاصی بوجھل آواز میں بولا۔

"ہوں۔۔۔" جواباً وہ بڑی نرمی سے پیش آ رہی تھی۔

"میری جان! تمہیں پتا ہے نا۔۔۔ تمہاری ایسی سرگوشیوں اور تمہاری ایسی اداؤں پہ کیا حال ہو جاتا ہے میرا؟ مجھ سے برداشت نہیں ہو پاتا۔ پاگل ہونے لگتا ہوں میں۔۔۔ اور تم صبح ہی صبح میری نیت خراب کرنے کے درپے ہو رہی ہو؟" دل آور نے جس انداز میں کہا تھا علیزے کے لیے خطرے کی گھنٹی بج گئی تھی۔ اس نے یکدم دل آور کے کندھے سے الگ ہونا چاہا تھا مگر تب تک وہ یکدم کروٹ بدلتے ہوئے اسے اپنے حصار میں جکڑ چکا تھا۔

"اب کہاں؟ اب ہر بار تمہاری چالاکی ہی تو کام نہیں آئے گی نا؟" دل آور نے اسے اپنے سینے میں بھینچ لیا تھا

اور علیزے بری طرح پھڑپھڑائی تھی۔
"اُف پلیز ڈرائیور۔۔۔ میں کچن کھلا چھوڑ آئی ہوں۔۔۔ بلی سب کچھ خراب کر دے گی۔" وہ چیخی تھی۔
"اور یہ بلی جو صبح سے شیر کو سونے نہیں دے رہی' اس کا کیا کروں میں؟" دل آور نے دیکھتے ہی دیکھتے کئی گستاخیاں کر ڈالی تھیں اور علیزے اپنا بچاؤ ہی کرتی رہ گئی تھی۔
"دل۔۔۔" علیزے زور سے چیخی تھی اور دل آور نے یک دم اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا تھا۔ لیکن علیزے کی حالت دیکھ کر بے ساختہ مسکرا بھی دیا تھا۔
"آئندہ کبھی تمہیں جگانے کی کوشش نہیں کروں گی۔" وہ غصے سے تلملائی تھی۔
"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔۔۔ کیونکہ اتنے اچھے اور رومینٹک طریقے سے جگانے کی کوشش کرو گی تو کس کافر کا جاگنے کو دل چاہے گا؟ اس سے تو بہتر ہے کہ میں الارم سیٹ کر کے سو جاؤں۔" دل آور اسے چھیڑنے والے انداز میں کہہ رہا تھا اور علیزے خفا ہو گئی تھی۔
"اوکے! نہیں جگاؤں گی۔۔۔ لیکن اب اگر جاگ ہی گئے ہو تو براہِ مہربانی نیچے آ کر ناشتا کر لو' مجھے مدیحہ وغیرہ کے ساتھ شاپنگ پہ بھی جانا ہے۔" وہ خفگی سے کہہ کر باہر نکل گئی تھی اور دل آور ہنستا ہوا دس منٹ میں تیار ہو کر نیچے کچن میں آ گیا تھا۔
"علیزے چولہے پہ کیتلی رکھے اس کے لیے چائے بنانے میں مصروف تھی' جب دل آور نے پیچھے سے آ کر بے حد نرمی سے اسے قریب کیا۔
"گڈ مارننگ میڈم!" وہ اس کے بالوں ــــ پہ بوسہ دیتے ہوئے بولا جس پہ علیزے کو بے ساختہ ہلکی سی گدگدی سی ہوئی تھی۔۔۔ مگر اس نے کہا کچھ نہیں تھا۔
"خفا ہو۔۔۔؟" دل آور اس کے ہاتھ کو بہت ہی نرمی سے چھو رہا تھا اور علیزے اس کے ہاتھوں میں موم کی طرح پگھلنے لگی تھی۔ کیونکہ اس کی قربت کی اور اس کے ہاتھوں کے لمس کی تپش ہی کچھ ایسی تھی کہ۔۔۔
"بولو نا۔۔۔ خفا ہو مجھ سے۔" دل آور نے اسے آہستگی سے بھینچا۔
"نہیں۔۔۔ پتا نہیں کیا بات ہے۔۔۔ مجھے لگتا ہے کہ میں کبھی تم سے خفا نہیں ہو سکتی۔۔۔ ایسا کروں گی تو مر جاؤں گی۔" علیزے نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا تھا۔
"لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے بار بار خفا ہوتی رہو اور میں تمہیں ہر ہر طرح سے منانے کی کوششیں کرتا رہوں۔" وہ کہتے کہتے ایک شرارت بھی کر گیا تھا اور علیزے بے ساختہ اس کے حصار سے نکل کر اسے گھورنے لگی تھی۔
"لیکن فی الحال مجھے منانے کی کوشش کرنے سے بہتر ہے کہ تم کورٹ جانے کی کوشش کرو' کیونکہ ٹائم زیادہ ہو گیا ہے۔" اس نے کلاک کی طرف اشارہ کیا تھا اور وال کلاک کی سمت دیکھ کر دل آور کا دماغ گھوم گیا تھا۔
"او مائی گڈ۔۔۔ جلدی ناشتا دو۔" وہ سر پہ ہاتھ مارتا فوراً کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا اور علیزے نے بڑی سعادت مندی سے ناشتا لگا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

مریم اور جودت کی شادی سے ایک دن پہلے مدیحہ اور عدیل کی منگنی ارینج کی جا رہی تھی اور مدیحہ نے اس موقعے سے لنکفی کی تیاری کے لیے مومنہ' نگارش اور علیزے کو خاص طور پہ انوائیٹ کر رکھا تھا اور شاپنگ بھی ایک ساتھ کرنے کا کہا تھا۔ اسی لیے علیزے دل آور کے کورٹ جانے کے فوراً بعد ہی گلاب خان کے

ساتھ بیل کے گھر آئی تھی اور پھر نگارش کے آتے ہی وہ لوگ فائزہ بیگم کو ساتھ لیے گلاب خان کی نگرانی میں شاپنگ کرنے چلی گئی تھیں۔ اور دن بھر شاپنگ کے لیے خوار ہونے کے بعد علیزے واپس گھر آئی تو دل آور کو بے حد آف موڈ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے میگزین الٹ پلٹ کرتے دیکھا تھا۔ وہ اس کے تیور دیکھ کر دور سے ہی پریشان ہو گئی تھی۔

"السلام علیکم!" ڈرتے ڈرتے سلام کیا گیا تھا۔

"وعلیکم السلام!" اس نے بغیر اس کی سمت دیکھے جواب دیا تھا۔

"آپ کب آئے؟" وہ آہستگی سے شاپنگ بیگز صوفے پہ رکھتے ہوئے خود بھی بیٹھ گئی تھی۔

"پانچ بجے۔" جواب انتہائی مختصر تھا۔

"اور اب سات بج رہے ہیں۔۔۔ دو گھنٹے ہو گئے ہیں۔۔۔ اور تم ابھی تک ایسے ہی بیٹھے ہو۔۔۔ چینج بھی نہیں کیا۔" علیزے کو اچنبھا ہوا تھا۔

"تم صبح سے بے فکر پھر رہی ہو کیا تمہیں میرا ذرا بھی خیال نہیں تھا کہ میرے گھر آنے کا ٹائم ہو رہا ہے؟" دل آور ایک روایتی شوہر کے سے روپ میں نظر آیا تھا۔

"خیال تو تھا۔ لیکن وہ مدیحہ۔۔۔" علیزے کچھ جز بز سی ہونے لگی تھی۔

"مدیحہ۔۔۔ مدیحہ اہم ہے یا میں؟" وہ یک دم میگزین پٹخ کر کھڑا ہو گیا تھا اور علیزے دبک گئی تھی اور اس کو یوں دیکھتے دیکھ کر دل آور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اوپر اپنے بیڈ روم میں چلا گیا تھا اور اس کے جاتے ہی علیزے کا دماغ کچھ فریش ہوا تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بحال ہوئی اور ذہن میں اک خیال کوندے کی طرح لپکا تھا۔ اسی لیے دس پندرہ منٹ بعد وہ بھی کمرے میں آگئی تھی۔

"ایم سوری۔۔۔ تمہیں مجھ پہ بہت غصہ ہے۔۔۔ لیکن میں اس غصے کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ میں بڑی حویلی جا رہی ہوں۔۔۔ گلاب خان سے کہو مجھے چھوڑ آئے۔"

علیزے بہت نارمل طریقے سے کہتی ہوئی وارڈروب کی طرف بڑھ گئی تھی اور اس میں سے بلاوجہ ہی کچھ تلاش کرنے لگی تھی۔

"کیا۔۔۔ کیا کہا تم نے؟ تم بڑی حویلی جا رہی ہو؟" وہ ابھی ابھی شاور لے کر نکلا تھا اور اس کی بات سنتے ہی تولیہ رگڑتے اس کے ہاتھ ٹھہر گئے تھے۔

"میں نے وہی کہا ہے جو تم سن چکے ہو۔۔۔ میں بڑی حویلی جا رہی ہوں۔۔۔ اللہ حافظ۔" علیزے کہہ کر وارڈروب بند کر کے دروازے کی سمت بڑھ گئی تھی اور دل آور کے تو جیسے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے تھے۔

"علیزے۔" وہ یک دم اس کے پیچھے لپکا اور اسے دروازے کے قریب ہی دبوچ لیا تھا۔

"پاگل ہو گئی ہو؟" اس نے علیزے کو جھنجوڑ ڈالا۔

"تو پھر تم غصہ کیوں کر رہے تھے؟ ناراض کیوں ہو رہے تھے؟" وہ منہ پھلا کر بولی۔

"میں تو مذاق کر رہا تھا۔۔۔ ستا رہا تھا تمہیں۔" وہ خفگی سے جھنجلایا۔

"تو میں کون سا سیریس کہہ رہی ہوں؟ میں بھی تو مذاق کر رہی ہوں۔۔۔ ستا رہی ہوں تمہیں۔" علیزے نے بڑی معصومیت سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

"واٹ۔۔۔؟" وہ یک دم چیخا اور علیزے اس کا ردعمل دیکھ کر یک دم کھلکھلا کے ہنسی تھی اور دل آور اتنے بڑے شاک کے باوجود اس کی ہنسی میں کھو گیا تھا اور یوں ہی ایک دوسرے کو دیکھتے دیکھتے اور ہنسی ہنسی میں وہ دونوں

ہی اک دوسرے میں گم ہوئے تھے۔ دروازے سے پشت ٹکائے کھڑی علیزے کے دونوں ہاتھوں کا لمس دل آور کے سینے پہ محسوس ہو رہا تھا اور دل آور کے دونوں ہاتھ اس کے دائیں بائیں دروازے پہ جمے ہوئے تھے اور مدہوشی ایسی تھی کہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو پائے تھے۔ کیونکہ اس فسوں خیز اور قیمتی لمحات میں تو ان کی سانسیں بھی ایک ہو چکی تھیں۔ وہ اس سحر سے نکلتے بھی تو کیسے؟

لیکن افسوس کہ مداخلت کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی پہنچ ہی گیا تھا۔ دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔ مگر ان دونوں نے دروازے کے قریب کھڑے ہونے کے باوجود بھی کوئی نوٹس نہیں لیا تھا اور نہ ہی جواب دیا تھا۔ اسی لیے پھر دوبارہ دستک ہوئی تھی۔

"علیزے بی بی۔ نیچے آئیے۔ بڑی حویلی والے آئے ہیں۔" گل نے باہر سے ہی پیغام پہنچا دیا تھا اور اس کے پیغام پہ وہ دونوں ہی چونک کر حواسوں میں لوٹ آئے تھے۔

"بڑی حویلی والے۔؟" علیزے ٹھٹکی۔

"اٹس اوکے۔ پہلے فریش ہو جاؤ، پھر نیچے جاؤ۔" دل آور اطمینان سے اس کا گال تھپکتا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا رکا تھا اور شرٹ پہن کر بٹن بند کرنے لگا تھا۔

"اور تم۔؟" وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

(آخری قسط ان شاء اللہ اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں)

✡ ✡

رفاقت جاوید

آج اسپتال میں ہاؤس جاب کے لیے نئے ڈاکٹرز کا نیا گروپ آرہا تھا۔ چند کو میرٹ کے لحاظ سے ہاسٹل میں جگہ دی گئی۔ دور کے کچھ رہائشی مل جل کر رینٹ پر رہنے لگے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر جس نے کنگ ایڈورڈ سے ایم بی بی ایس کیا تھا۔ آصف علی زیدی انڈین مسلم تھا۔ جس کا خاندان کئی سالوں سے لندن میں مقیم تھا۔ اسے وہاں بالاخر میڈیکل میں داخلہ نہ ملا تو اس نے پاکستان میں ایڈمیشن کے لیے ٹرائی کیا لاہور کنگ ایڈورڈ میں اسے داخلہ مل گیا۔

مکمل ناول

یہاں کے ماحول میں بے پناہ اپنائیت کے احساس کے ساتھ مسلم ملک میں آزادی سے سانس لینے کے مزے نے اسے یہاں کا گرویدہ کرلیا۔ حالانکہ والدین پاکستان تک جانے پر اتنے مطمئن تو نہ تھے۔ مگر بیٹے کی خوشی میں راضی برضا ہونے میں ہی مصلحت جانی۔

ایک سال ہاسٹل میں گزارنے کے بعد اس نے کالج کے قریب ہی دو بیڈ روم کا چھوٹا سا گھر والدین سے ضد کرکے خرید لیا اور بمعہ ایک ملازم کے گھر میں شفٹ ہوگیا اور اپنے ہی اسٹائل سے گھر کو اتنا آرام دہ اور خوب صورت بنالیا تھا کہ اس گھر کو دیکھ کر اندرون شہر کے محلے کا گمان تک نہ ہوتا تھا۔ یہاں رہتے ہوئے اسے بے حد اپنائیت اور لگاوٹ کا احساس ہوتا تھا وہ فخر سے خود کو پاکستانی کہہ کر دوسروں کے لیے اہم ہوجاتا۔ والدین اس کے اظہار عقیدت و پسندیدگی کو لاابالی اور جذباتی پن کا نام دیتے۔

وہ والدین کے ساتھ چھٹیاں گزارنے کینیڈا گیا ہوا تھا۔ جب اسے اپنے رزلٹ کا مژدہ فرحت سنایا گیا۔ اس کا دل چاہا کہ اڑ کر پاکستان پہنچ جائے۔ مگر فوری طور پر ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے اس پر ان گنت ذمہ داریاں بھی عائد تھیں۔ وہ انہیں وہاں تنہا چھوڑ کر واپس آنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ مگر والدین کو اس کے مزاج کو سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ انہوں نے اس کی خوشی کی خاطر چند دنوں میں ہی لندن جانے کا پروگرام بنالیا اور یوں آصف لندن سے ہوتا ہوا پاکستان آگیا۔

اس کے پہنچنے تک ملازم نے گھر کو چمکا دیا تھا۔ مالی نے گملوں کو رنگ کرکے موسمی پھول لگادیے تھے۔ چھوٹے سے صحن میں تمام گملوں کو سجانے سے اک زندگی کا احساس ہوتا تھا۔ ملازم نے فریج میں اس کی پسند کا کھانا اور بیکری کا سامان بھر دیا تھا۔ اپنی اس چھوٹی سی آزاد دنیا میں آکر اس نے آزادی و تسکین سے بھرپور اک طویل سانس لیا۔

چھوٹے سے گھر میں پھرتے ہوئے وہ مسلسل سوچ رہا تھا کہ پاکستانی تو بہت مخلص اور ہمدرد لوگ ہیں۔ سب سے خوب صورت بات یہ کہ اسلامی ملک ہے۔ مذہبی اور مخصی آزادی ہی تو زندگی ہے۔ گھٹ گھٹ کر سانس لینا، اپنی عیدوں کو خاموشی سے گزارنا اور اپنی ہر عبادت میں ان کی دخل اندازی، نفرت و حقارت کو صرف اس لیے ہنس کر برداشت کرلینا کہ کہیں انہیں

دربدر ہی نہ کردیا جائے۔ ان کی جوان بہنوں اور بیٹیوں کی بے حرمتی نہ ہو جائے۔ ان بچوں کو کوئی اٹھا نہ لے جائے کتنا خوف ناک ہے۔

یہی سوچتے ہوئے وہ صوفے پر لیٹ کر اپنے دوستوں کو فون پر واپس آنے کی اطلاع خوشی خوشی دینے لگا۔

دوسرے موبائل پر ڈیڈی کی طرف سے آنے والی رنگ ٹون نے اسے چونکا دیا۔ خود کو کوستے ہوئے دوستوں کو اللہ حافظ کہہ کر دوسرا فون اٹینڈ کرتے ہوئے ندامت سے بھرپور لہجے میں بولا۔

"آئی ایم سوری ڈیڈی۔ آپ کو خیریت سے پہنچنے کی اطلاع ہی نہ دے سکا۔ ویسے مجھے گھر پہنچے گھنٹہ ہی تو ہوا ہے۔"

"نیور مائنڈ بیٹا۔ آئی تو تمہیں پہنچے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ بس بیٹا اب تو مجھے بھی یاد آنے لگے ہو۔ مگر کروں گا وہی جس میں میرے بچے کی بہتری ہے۔" وہ مستحکم لہجے میں بولے۔ تو وہ تشکر آمیز لہجے میں بولا۔

"یو آر ٹو گریٹ ڈیڈی' آئی لو یو۔ ہاں تو ممی کیسی ہیں۔ مسٹل ویری سیڈ۔"

"ہاں بیٹا۔ تم تو جانتے ہو نا۔ خاموش ہو جاتی ہے۔

جب اداس ہوتی ہے خاموش حسینہ بنی بیٹھی ہیں محترمہ۔"

"ڈیڈی بات کرادیں۔" وہ بھی اداس ہو کر بولا تو ڈیڈی نے فون ماں کو پکڑا دیا۔

"ممی اگر آپ اداس ہیں تو میں واپس آجاتا ہوں۔ مجھے آپ کی خوشی عزیز ہے۔ میرا کیا ہے؟ میں تو ہر حال میں خوش رہنے والا انسان ہوں۔ مجھے تو فقط اپنی ماں کی دعا اور تسلی کی ضرورت ہے۔ آپ حکم کریں ممی بسرو چشم۔" وہ خود پر قابو پاکر آواز کو شگفتہ بناتے ہوئے بولیں۔

"ایسی بھی اداس نہیں ہوں۔ بس انتظار ضرور ہے۔ اس پر تو اپنا اختیار ہی نہیں بیٹا! یہ دل ہی تو ہے۔" لہجے کی بے بسی پر وہ چونک گیا۔

"ممی۔۔۔ آپ اداس نہ ہوں۔ بس دعا دیں مجھے۔ آخر کار میں نے آپ کے پاس ہی تو واپس آنا ہے۔"

"بس بیٹا جلد ہی وہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔ ہمارا اکیلا رکھا ہے پاکستان میں۔ میں ہر وقت خوف زدہ ہی رہنے لگی ہوں۔ کہیں تم ادھر کے ہی ہو کر نہ رہ جاؤ۔ بھول گھر در کو۔ خوامخواہ تم نے وہاں پراپرٹی خریدلی۔ مجھے لگتا ہے اب تمہارا وہاں دل لگ گیا ہے۔" وہ فکر مندی سے بولیں۔

"آپ فکر نہ کریں۔ وائنڈ اپ کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ چٹکی بجاتے پہنچ جاؤں گا۔ میں بھی تو آپ کے بغیر اداس ہو جاتا ہوں۔"

وہ ماں کو خوش کرنے کے انداز میں بولا۔ تو وہ آنسو صاف کرکے ہنستے ہوئے بولیں۔

"ذرا مسکہ کم لگاؤ۔ میں تمہیں جانتی ہوں کتنے فرماں بردار ہو۔"

☆ ☆ ☆

آصف علی نے آج ڈنر پر اپنے قریبی دوستوں کو گھر پر مدعو کیا ہوا تھا۔ جس میں میمونہ اور سائرہ بھی موجود تھیں۔ جن کے گھروں میں آنا جانا معمول کا کام تھا۔ دونوں کے پیرنٹس اسے پیار بھی کرتے تھے اور پاکستانی میزبان ہونے کی حیثیت سے ان کا خیال رکھ رہے تھے۔

کھانے کے دوران سب آصف علی کو یہاں ہی ہاؤس جاب کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ عالم تذبذب میں گھرا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ والدین پاکستان میں ہاؤس جاب کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دیں گے، پھر بھی سب کے اصرار پر اس نے ممی سے بات کی۔ سب کان لگائے، ان کی گفتگو سن رہے تھے۔

"ممی۔۔۔ ایک سال کی تو بات ہے۔ پلک جھپکتے گزر جائے گا۔ میرے کیریر کے لیے بھی تو مفید ہے۔" وہ ہر طریقے سے سمجھا رہا تھا۔ مگر ممی اپنی ہی ضد پر اڑی ہوئی تھیں کہ ایشین یہاں اپنی ایجوکیشن کمپلیٹ کرتے ہیں۔ بھلا پاکستان تمہیں کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

"ممی میری پیاری ممی! آپ ایسی ضدی تو کبھی نہ تھیں۔" وہ پیار سے بول رہا تھا۔ "تمہاری ممی تمہارے پیار میں ضدی تو کیا بہت ظالم بھی ہو گئی ہے۔ بس تم جلد واپس پہنچو۔ میری آنکھیں تمہاری راہ دیکھتے ہوئے تھک گئی ہیں۔" وہ کہتے ہوئے روہانسی ہو گئیں۔

"ممی ہاؤس جاب شروع ہونے سے پہلے ملنے آجاؤں گا۔" وہ تسلی دیتے ہوئے بولا۔

"تم نہیں جانتے میرے بچے، میں نے پانچ سال کا عرصہ تمہاری جدائی میں کیسے گزارا ہے۔ میں نے کبھی اظہار نہیں کیا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تمہیں۔" اک توقف کے بعد بولیں۔ "اب میں تمہاری دوری کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

"ٹھیک ہے ممی چند ہفتوں میں ہی آجاؤں گا۔" وہ اداسی و مایوسی بھرے لہجے میں بولا۔

"یہ ہوئی نا فرماں بردار بچوں والی بات۔ تم پر میری ہر سانس قربان۔ آئی لو یو بس تمہارے آتے ہی اپنی برادری میں لڑکی دیکھتی ہوں۔ بہت حسرت ہے کہ تمہارے سر سہرا سجا ہوا دیکھوں۔ اپنے پوتے اور

پوتیاں کھلاؤں۔" وہ پیار سے بول رہی تھیں۔
"یہ تمہارے ڈیڈی بھی آگئے ہیں۔ خدا کے لیے ان سے مشورہ مت لینا۔ وہ میری بات کی کھل کر مخالفت کریں گے۔ میری ایک نہیں سنیں گے۔ اپنی ہی منوا کر چھوڑیں گے۔ پہلے بھی ان ہی کی خواہش تھی کہ تم ہر صورت ڈاکٹر بنو۔ چاہے سات سمندر پار ہی کیوں نہ جانا پڑے' اب وہ تو تمنا پوری ہو گئی۔" وہ سنجیدگی سے بولیں۔
"کیا باتیں ہو رہی ہیں ماں' بیٹے میں' ذرا میں بھی سنوں۔" وہ قریب آکر مسکراتے ہوئے بولے۔
"کوئی خاص نہیں۔" وہ ٹالتے ہوئے بولیں اور ریسیور انہیں دے دیا۔
"بھئی کیا گفت و شنید ہو رہی تھی۔ تمہاری ماں بتانا نہیں چاہ رہی؟" انہوں نے فون کان سے لگا کر آصف سے پوچھا۔
"کوئی خاص نہیں ڈیڈی۔ ادھر ادھر کی باتیں بتا رہی تھیں ممی اور آپ کے بارے میں کوئی اچھی رپورٹ نہیں دے رہیں۔ یعنی آپ ان کا خیال نہیں رکھتے۔ راتوں کو گھر دیر سے آنے لگے ہیں۔ ڈیڈی۔۔۔ کیا چکر ہے؟ مجھے بھی تو بتا دیجیے نا۔ ذرا انجوائے ہی کر لوں گا سن کر۔" وہ چھیڑتے ہوئے بولا۔
"یہ تو عورتوں کی خاص الخاص خصلت ہوتی ہے۔ مگر تمہاری ماں تو ایسی نہیں۔ یہ تمہاری اپنی ہی اختراعات ہیں۔ ہاں تو یہ بتاؤ کب آ رہے ہو۔ اکیلا پن تنگ کرنے لگا ہے اب۔ اگر گھر سیل ہونے میں دیر ہے تو کرائے پر ہی دے دو؟" وہ شگفتہ لہجے میں کہہ رہے تھے۔
"میں سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ ہاؤس جاب یہاں سے ہی کر لوں۔ لوگ بھی خوب ہیں۔ بہت عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ دوست بھی بے مثال ہیں۔ ان کے گھروں میں میرا آنا جانا رہتا ہے۔ پیرنٹس جس تپاک سے مجھے ویلکم کہتے ہیں۔ میں حیران ہی ہو جاتا ہوں۔ بہت اچھا وقت گزرا ہے میرا۔ لندن میں اتنے سال رہنے کے باوجود بھی ہم ان کے لیے اور وہ ہمارے لیے اجنبی ہیں۔ بس نفسا نفسی کا عالم ہے وہاں۔ عجیب سی زندگی ہے وہاں کی۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔
"بیٹے! تمہاری ماں کو یہی تو خدشہ ہے۔ دن رات پریشان رہنے لگی ہے کہ کہیں تم وہیں کے ہو کر نہ رہ جاؤ۔ وہاں شادی نہ کر لو۔ پھر تو تم ادھر آنے سے رہے۔ بیٹا ماں کے ذہن میں عام لوگوں سے ہٹ کر ایک ایکسٹرا حس ہوتی ہے اولاد کے لیے۔ وہ اولاد کے من کو خوب پہچانتی ہے۔ آج تمہاری باتیں سن کر مجھے تو یقین ہونے لگا کہ تم ماں سے کہاں تک چھپ سکتے ہو۔ اب تم بچے نہیں رہے۔ بیٹے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا سیکھو۔ اس وقت تمہیں نہایت دانش مندی سے فیصلہ کرنا ہے۔ وہاں کے دوستوں کی خاطر تم اپنا گھر اور والدین تو نہیں چھوڑ سکتے۔ بیٹا جب پریکٹیکل لائف میں آجاؤ گے تو دور کے دوست دل سے بھی دور ہو جائیں گے۔ کیونکہ طالب علمی کے زمانے کی تمام باتیں تمام فیلنگز بہت عارضی ہوتی ہیں۔ ہمارا پاکستان سے بھلا کیا واسطہ کہ تم وہیں سیٹل ہو جاؤ۔"
"آپ کی کسی بات سے انکار نہیں۔ میں ویسے ہی آپ کو بتا رہا تھا کہ یہ لوگ سب محبت کرنے والے ہیں۔ اپنے اپنے سے لگتے ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔
"تمہاری ممی نے سنا تو ہارٹ اٹیک ہو جائے گا۔ ذرا سوچ سمجھ کر بولو یار میں حیران ہوں اس بات پر کہ وہ اپنی سوچ میں کتنی سچی نکلی۔ لیکن میں یہ سب کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ تم جلد از جلد واپس آؤ' بس بہت ہو گئی۔" وہ اضطراری کیفیت میں بولے وہ ہنستے ہوئے بولا۔
"اچھا ٹھیک ہے۔ ذرا ممی سے تو بات کرا دیجیے۔ وہ میرے مسئلے کو ضرور سمجھ پائیں گی' آخر ماں ہیں۔"
"ہاں بولو بیٹا۔" وہ سنجیدگی سے بولیں۔
"ٹھیک ہے ممی آپ کی طرف سے اجازت نہیں تو میں آجاتا ہوں' بلکہ سمجھیں آگیا۔" وہ پیار بھرے لہجے میں بولا۔ اسے ماں سے ہر بات منوانے کا طریقہ آتا تھا۔ اس نے ضد یا ہٹ دھرمی دکھانے کے بجائے ان کی بات مان جانے کی ایکٹنگ کی۔ جو کافی حد تک

کامیاب ہوتی نظر آئی۔ وہ ایک دم سے تڑپ کر بولیں۔

"ہائے میرا بچہ، سچ بتا کہ کیا تمہارے فیوچر کے لیے وہاں کا ہاؤس جاب بہتر ہے۔ کیا یہاں تمہیں مشکلات کا سامنا کرنے پڑے گا۔" وہ ایک دم سے نرم پڑ کر سنجیدگی سے پوچھنے لگیں تو شوہر اپنی شریر سی مسکراہٹ دباتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئے۔

"جی ممی۔ لیکن میں بھی تو آپ کے بغیر بہت اداس ہو جاتا ہوں اور آپ تو انگلیوں پر دن گننے بیٹھ جاتی ہیں۔ فیوچر کو ماریں گولی۔ ماں، بیٹا مل کر خوب مزے کریں گے۔ یہ ضروری ہے۔ ہمارے پاس پیسے کی کمی تو ہے نہیں کہ میں نوکری کروں۔ آپ میرے گھر بیٹھنے پر خوش ہیں تو مجھے اور کیا چاہیے؟ تینوں سب سے پہلے ورلڈ ٹور پر نکلیں گے۔" وہ پرجوش لہجے میں بولا۔

"اللہ نہ کرے کہ تمہارا فیوچر میری خود غرضی کی نذر ہو جائے۔ تم اپنی زندگی بے کار کیوں کر گزارو بیٹا۔ دولت ہر کمی کو پورا نہیں کر سکتی۔"

"ایسی بات نہیں ممی۔ مجھے تو آپ کی خواہش کو ہر صورت اور ہر حال میں پورا کرنا ہے۔ آپ کی خوشی کی خاطر سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔ یہ تو ایسی خاص قربانی نہیں کہ کل مجھے پچھتانا پڑے۔" وہ دوستوں کی طرف شرارت سے دیکھ کر بولا۔

"میرے بچے تمہاری یہی فرماں برداری تو میرے حوصلے بلند کرتی ہے۔ کیا یاد کرو گے کہ کس ماں سے پالا پڑا تھا۔ تمہیں ہم دونوں کی طرف سے وہاں ہاؤس جاب کرنے کی اجازت ہے۔ کیوں جی؟ میں نے صحیح کہا نا۔" انہوں نے ڈیڈی سے پوچھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہپ ہپ ہرے۔" اس نے فون بند کیا اور خوشی سے لبریز نعرہ ڈرائنگ روم میں گونجنے لگا۔ تمام دوست مسرور تھے اس کے پاکستان رہنے پر۔

☼ ☼ ☼

ٹریننگ کے بعد آج صدیقہ سسٹر کا I.C.U میں پہلا دن تھا۔ آصف علی زیدی بھی اپنے سینئر ڈاکٹر کی ہدایات کے بعد ہر پیشنٹ کی فائل کھول کر ہسٹری پر غور کر رہا تھا۔ سسٹر صدیقہ نے الیکٹرک کیٹل میں پانی ابال کر دو مگز میں چائے دم کی اور میز پر اس کے سامنے رکھ کر نہایت ملائمت سے گویا ہوئی۔

"سر بسکٹ لیجیے۔" اس نے ڈبا کھول کر بسکٹ پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"تھینک یو۔ ویسے اس وقت چائے کی طلب ہو رہی تھی؟" وہ بسکٹ پلیٹ سے اٹھاتے ہوئے بولا۔ "رات کی ڈیوٹی تو اسی کی مرہون منت ہے۔ ورنہ رات بھر جاگنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"یس سر۔" وہ مودبانہ انداز میں سر اثبات میں ہلا کر بولی۔

"انگریزوں کو دعائیں دینی چاہئیں جنہوں نے اسے دریافت کیا۔"

"انگریز کے پاس یہ چائے چائنا سے طویل مسافت طے کر کے پہنچی تھی۔ دعا کے اصل حق دار تو چینی بھائی ٹھہرے۔" وہ چائے کی چسکی لیتے ہوئے بولا۔

"ہم ہر بات میں انگریز کو کیوں گھسیٹ لیتے ہیں۔ وہ تو یہاں سے رخصت ہو گیا۔ مگر اپنے چیلے لاکھوں کی تعداد میں یہاں چھوڑ گیا۔" ڈیوٹی کا دورانیہ صدیقہ کی خاموشی اور ڈاکٹر آصف کی بال کی کھال نکالنے میں گزرا۔ جاتے وقت اس نے مسکرا کر سسٹر سے پوچھا۔

"فرسٹ ڈے کیسا رہا؟"

"سر آپ کی وجہ سے بہت اچھا گزرا۔ آپ نے میرے کانفیڈنس میں جو اضافہ کیا ہے۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔"

"ابھی میں کچھ مہینے اسی جگہ پر ہوں۔" وہ ذو معنی سی بات کہہ کر کوریڈور میں نکل گیا۔

"سر! میں اپنی ڈیوٹی آپ کے ساتھ ہی کرنا چاہتی ہوں۔" وہ بھی باہر نکل کر بولی۔

"وائے ناٹ۔" وہ لیب کوٹ کو درست کرتے ہوئے بولا۔

"سر! میں آپ کے ساتھ بہت کمفرٹیبل ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"آئی ایم آل سو ویری کمفرٹیبل ود یو۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "ویسے میں تو ہر پاکستانی کے ساتھ بہت کمفرٹیبل ہی رہتا ہوں۔ دے آر ناٹ کمپلیکیٹڈ۔"

"سر! کیا آپ کا تعلق پاکستان سے نہیں ہے۔" وہ حیرت سے بولی۔

"میرا تعلق۔" وہ توقف کے بعد مسکرا کر بولا۔ "کئی ملکوں سے ہے۔" دونوں باتیں کرکے آگے بڑھ رہے تھے کہ کوریڈور میں ہی اسے میمونہ مل گئی۔ وہ وہیں پر رک گیا اور سسٹر آگے نکل گئی۔ آج دونوں کی نائٹ ڈیوٹی تھی۔ دن بھر کی تھکن اتارنے دونوں اپنی اپنی جائے پناہ چلے گئے۔ کیونکہ شام سات بجے سے پھر انہیں اسپتال ڈیوٹی پر پہنچنا تھا۔ سردی کا موسم تھا۔ باہر کی ہوا میں خاصی ٹھنڈک تھی۔ صدیقہ جو کمبل میں دبک کر لیٹی تو ایسی گہری آنکھ لگی کہ شام سات بجے روم میٹ سسٹر ثمینہ کی آواز پر کھلی۔ تیزی سے تیار ہو کر وہ باہر نکلی اور سرد ہوا میں لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ دائیں بائیں سے گزرنے والے لوگ گرم کپڑوں میں بھی ٹھٹھر رہے تھے۔ گاڑیوں میں بھی ہیٹر آن تھے۔ لیکن صدیقہ حسب معمول دودھ کی مانند چمکتے ہوئے یونیفارم میں تیزی سے چلتی ہوئی گردوپیش کے ماحول سے بے خبر اسپتال کی طرف بڑھ رہی تھی کہ یکدم بادل گرجا' بجلی چمکی اور تھمے ہوئے انداز میں بارش ہونے لگی۔ اس نے پرس کو ٹٹولا۔ والٹ نکال کر نقدی کا جائزہ لیا۔ مہینے کے آخری چند دن باقی رہ گئے تھے۔ اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ رکشا لے اور ٹائم سے اپنی ڈیوٹی پر پہنچ سکے۔ اب اس کے چلنے میں تیزی بتدریج بڑھنے لگی کہ اس کے قریب کالی ٹیوٹا کرولا آکر رکی۔ ہارن کی آواز پر وہ چونکی اور مڑ کر دیکھا تو آصف علی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اس کا سانولا رنگ اس دھندلکے میں اور بھی گہرا لگ رہا تھا۔ اس کی حیرت پر وہ دوسری جانب کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

"سسٹر صدیقہ۔ آجائیے اس وقت اس سردی میں یہاں کیا کر رہی ہیں؟ نمونیہ کرانے کا ارادہ ہے کیا۔ ایک تو ان لڑکیوں کو اللہ ہی سمجھے۔ لگتا ہے مٹی سے نہیں کسی دھات سے بنی ہیں۔"

وہ بغیر سوچے سمجھے دوسری طرف آکر سیٹ پر بیٹھ گئی اور بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"سر! آج میری نائٹ ہے۔ دوپہر کو جو سوئی تو سوتی ہی چلی گئی۔ آنکھ کھلی تو صبح کا گمان ہونے لگا۔ کتنی ہی دیر بعد ذہن بے دار ہوا تو وقت دیکھا اور بھاگ پڑی۔"

"کوئی ٹیکسی' رکشا ہی منگوالیا ہوتا۔ سردی میں کیا ضرورت ہے سپر گرل بننے کی۔ بیمار پڑ گئیں نا۔ تو چھٹی ہو جائے گی پکی۔"

"جی۔" وہ آہستگی سے بولی۔ اسے حقیقت کیسے بتاتی کہ پرس خاصا ہلکا ہو چکا ہے۔ ان امیروں کو کیا خبر کہ ہم پہلی تاریخ کا انتظار دس تاریخ کے بعد ہی شروع کر دیتے ہیں۔

"چلو اچھا ہوا کہ آج میں بھی لیٹ ہوں۔ ورنہ آپ صحیح معنوں میں بھیگی بلی کی صورت میں اسپتال میں پہنچتیں۔" وہ چھیڑنے کے انداز میں بولا۔ وہ خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔

آصف نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا' اس کی گوری رنگت سردی کی وجہ سے ایسے لگ رہی تھی جیسے میدے میں سندور کی آمیزش کر ڈالی ہو۔ ماتھے پر بھیگے ہوئے بالوں کی سیاہ لٹیں اور سیاہ آنکھوں میں بلا کی سوچ۔ اسے آج پہلی دفعہ سسٹر صدیقہ حسن کا مجسمہ ہی تو لگی تھی۔ شاید آج کی تنہائی اور ایسے موسم کا فسوں تھا کہ وہ جھوم اٹھا۔ وہ بالکل خاموش تھی۔ بار بار موبائل آن کرتی اور ٹائم دیکھ کر باہر دیکھنے لگتی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس وقت لیٹ ہو جانے پر فکر مند ہے۔

"پریشانی کی بات نہیں۔ آپ کی ڈیوٹی میرے ساتھ ہی تو ہے۔ آج تو بچ جائیں گی۔ آئندہ کے لیے بی کیر فل۔"

وہ تسلی دیتے ہوئے اسپتال کی پارکنگ میں پہنچ گیا۔ جوں ہی گاڑی پارک کرکے باہر نکلا۔ میمونہ اپنی ڈیوٹی

سے واپس جانے کے لیے ساتھ والی گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ صدیقہ کو آصف کے ساتھ دیکھ کر چونک گئی اور صدیقہ کے چہرے پہ نظریں گاڑ دیں۔ وہ جھینپ کر دوپٹا درست کرتی ہوئی وہاں سے غائب ہو گئی۔ آصف بھی میمونہ کو ہاتھ سے اللہ حافظ کہتا ہوا اس کے پیچھے چل دیا۔ اگلے دن یہ خبر اسپتال میں کام کرنے والے ہر فرد کی زبان پر تھی۔ تمام سسٹرز اسے حیرت اور بغض و عناد سے دیکھتی رہ گئیں۔ یہ روز کا معمول بن گیا کہ آصف صدیقہ کو ہاسٹل سے پک کرتا ہوا اسپتال آنے لگا۔ صدیقہ نے بھی انکار نہ کیا۔ اس کے ردعمل میں مکمل طمانیت تھی۔ وہ ہر موضوع پر بات کرتا اور وہ بہترین سامع کا ثبوت دیتی۔ اب کافی مانوسیت ہو چکی تھی۔ ایک شام واپسی پر آصف اسے ایک ریسٹورنٹ میں ڈنر کے لیے لے گیا تو اس نے احتجاج نہ کیا۔ زندگی میں ایسی تبدیلی کا اس نے کبھی خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ حاجت مند والدین کی بیٹی تھی۔ پوری لگن اور ہمدردی سے ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ آصف کے ساتھ ریسٹورنٹ میں خاموشی سے بیٹھی سوچے جا رہی تھی۔ آصف نے مینو کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اپنائیت سے کہا۔

"آج۔ آپ کی پسند کا ڈنر کریں گے۔" وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی اور تذبذب کے عالم میں بولی۔

"مجھے نہیں معلوم۔"

"میری پسند کہ اپنی پسند۔" وہ مسکرایا۔

"دونوں کی۔" پھر سوچتے ہوئے بولی "سر! میں یہ سب نہیں جانتی۔ بالکل ہی ناواقف ہوں۔ یہ سب کچھ ہم جیسے لوگوں کے لیے نہیں بنا۔"

"کیسے؟" حیرت اس کی آنکھوں میں پھیل گئی۔

"سر! سمپل سی بات ہے۔ میرے حالات اجازت نہیں دیتے کہ فائیو اسٹارز ہوٹلز میں لنچ اور ڈنر کرتی پھروں۔ میرا تعلق اس طبقے سے ہے جو ریڑھی پر کھڑے ہو کر دہی بڑے اور گول گپے کھا کر خوش ہو جاتے ہیں۔ جبکہ میرے ساتھ رہنے والی تمام سسٹرز مجھ سے بہت مختلف ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کے حالات مجھ سے سازگار ہوں۔"

"میں جانتا ہوں صدیقہ۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ تمہارا انتخاب کرنے میں دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔" وہ قریب ہو کر آہستگی سے بولا۔

"میں سمجھی نہیں۔" وہ اچنبھے سے بولی۔

"میرا مطلب ہے کہ۔۔۔" وہ خاموش ہو گیا۔ سوچنے لگا کہ اسے کیا کہے اور کیسے کہے؟

"بتائیے نا۔" وہ بے چینی سے بولی۔ جیسے وہ کچھ بھلا سننے کی خواہشمند ہو۔

"تمہاری کمپنی میں رہنا مجھے بھلا لگنے لگا ہے۔ اپنے بارے میں تم خود ہی بتا دو کہ تمہیں میرے ساتھ کام کرنا کیسا لگ رہا ہے۔ کہیں بوریت تو نہیں ہوتی میری کمپنی میں۔" وہ اتنا سنجیدہ کبھی نہ تھا۔ وہ یہ سن کر چونک اٹھی۔

"سوچنا پڑے گا۔" وہ بے ساختہ بولی اور مینو کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے جھجک سی گئی۔

"کھانا تم آرڈر کرو گی۔" وہ اپنا مینو کارڈ بند کرتے ہوئے بولا۔ "سر! میں۔۔۔ نہیں آپ" وہ گھبرا کے بولی۔

"تم آج ہمیں دال روٹی ہی کھلا دو۔" وہ شگفتہ لہجے میں بولا۔ "یہاں وہ بھی ملتی ہے۔ ممی دال مکھنی بناتی ہیں تو اوور ایٹنگ کر جاتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میرے گھر میں جو پکتا ہے۔ اسی کا آرڈر دیتی ہوں۔ پھر تو اگلے کئی دن آپ کو کھانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔ ایسی اوور ایٹنگ کر بیٹھیں گے۔" وہ ہنستے ہوئے بولی تو آصف اس کی ہنسی میں ہی گم ہوتا چلا گیا۔

"دیسی اور مزے دار ہوگا۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر پھر کھل کر ہنسی مگر وہ کچھ نہ بولا۔ صدیقہ نے سرسوں کا ساگ مکئی کی روٹی اور تازہ مکھن اور ساتھ دیسی مرغ کا قورمہ، نان، کھیر اور سوجی کا حلوہ آرڈر کر دیا۔

"اب مجھ پر چھوڑا ہے تو یہ سب کھانا پڑے گا۔" وہ ہنس رہی تھی۔

کھانا آیا تو آصف نے خوب انجوائے کیا اور پھر وہ

اشتیاق سے اس کے گاؤں کے بارے میں پوچھنے لگا۔
اس نے بھی سچ بیان کیا کہ ماں اور باپ بہت چھوٹے زمیندار ہیں۔ مجھے میٹرک کرایا اور نرسنگ کی ٹریننگ کے لیے اپنوں کی مخالفت کے باوجود شہر بھیج دیا۔
میرے پیرنٹس کا تو جواب نہیں ڈاکٹر صاحب۔ بہت غریب ہیں وہ۔ لیکن غیرت مند ایسے کہ میں انہیں جب بھی اپنی تنخواہ بھیجتی ہوں تو برا مان جاتے ہیں۔
اب میں بہنوں کے ہاتھ میں ان کی اسکول فیس پکڑاتی ہوں اور ماں کے صندوق میں چپکے سے باقی رقم رکھ آتی ہوں۔" وہ ایک دم سے رو پڑی۔
"یہ خوشی کے آنسو ہیں نا۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ہنس کر بولا۔
"دکھ اور خوشی میں بہنے والے آنسو ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔
"خوش قسمتی سے، جوں ہی میرے والدین کا خواب پورا ہوا تو میں والدین کے لیے آزمائش بن گئی' پھپھو نے مجھے بہو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ بچپن کی منگنی پل میں ٹوٹ گئی۔" وہ آنسو پیتے ہوئے بولی۔ "بے چارے ابا خاندان بھر میں رسوا ہوگئے۔"
"اس میں رسوائی کیوں' سب کو اپنی شخصی آزادی کا حق ہے۔ اب تمہارا رشتہ بہت اچھے اور پڑھے لکھے لڑکے سے طے پا جائے گا۔ گاؤں کے رشتے کا ٹوٹ جانا عذاب نہیں' رحمت ہے۔ اللہ کی طرف سے شکر کرو کہ تمہاری بچت ہوگئی۔ ورنہ زندگی بھر حسرت و یاس کی تصویر بنے زندگی گزار دیتیں؟"
آصف کو اس کی معصومیت پر ٹوٹ کر پیار آنے لگا اور وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتا چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

کئی راتوں سے وہ جاگ رہی تھی۔ اسے آصف کی لگاوٹ کی چاشنی سے لبریز باتیں آکاش کی رفعتوں کی سیر کراتی رہتیں۔ "کیسی عجیب بات ہے کہ کھو دینے کا کرب بھی چین سے سونے نہیں دیتا اور کچھ پالینے کی آس میں بھی بے قراری رہتی ہے اور نیندیں حرام ہوجاتی ہیں۔" اس نے یہ سوچ کر کروٹ بدلی۔ "میں ڈاکٹر تو نہ بن سکی۔ اتنی اونچی اڑان کے لیے میرے پر بہت کمزور جو تھے تو ایک ڈاکٹر کی بیوی بننے میں کیا مضائقہ ہے؟" اس نے بڑبڑاتے ہوئے پھر کروٹ بدلی تو روم میٹ سسٹر ثمینہ نے خفگی سے کہا۔
"خدا کے لیے سو جاؤ صدیقہ۔ کن چکروں میں پڑ گئی ہو۔"
"نیند نہیں آرہی' چکروں سے نکلنا بھی چاہتی ہوں۔ لیکن اس گولڈن چانس کو ضائع بھی نہیں کرنا چاہتی۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔
"آئی فیل ہی لوز می۔"
"پگلی! اس بندے کے بارے میں تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ کس بل بوتے پر نیندیں حرام کر بیٹھی ہو۔" وہ نیم غنودگی میں بولی۔
"خدا کے لیے دل سے یہ بے ہودہ خیالات نکالو اور سو جاؤ۔"
"ثمینہ! ڈاکٹر آصف باتوں اور عادتوں سے کسی اونچے گھرانے کا معلوم ہوتا ہے۔ والدین کا اکلوتا اور بہت دولت مند خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے شادی کا خواہشمند ہے تو یوں سمجھو لاٹری نکل آئی۔" وہ اس کے پلنگ پر بیٹھ کر پرمسرت لہجے میں بولی۔
"بے وقوف مت بنو' سو جاؤ اس وقت' اپنی زندگی برباد کرنے پر کیوں تل گئی ہو؟ تمہارے والدین تمہیں اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ انہوں نے زندگی کے بے شمار روپ دیکھے ہیں۔ اک پردیسی انجان پر کیونکر بھروسہ کریں گے۔" وہ تاسف سے اسے دیکھ کر بولی۔
"احمق مت بنو' اپنی ڈیوٹی چینج کرالو اور اس کے ساتھ گھومنا پھرنا چھوڑ دو اب ہر ایک کی زبان پر تمہارا نام ہے۔"
"ثمینہ! اگر مجھے اپنا اسٹینڈرڈ ہائی کرنے کا چانس مل گیا تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ سب جائیں جہنم میں۔" وہ مستحکم لہجے میں بولتی ہوئی اپنے بستر پر چلی گئی۔

"مثلاً" کیا کرو گی؟ اس کے ساتھ بھاگ جاؤ گی۔"
وہ چونک کر بولی۔

"ہاں۔۔۔ اماں اور ابا کو بتانے کی ضرورت کیا ہے؟ یہاں اس کا اپنا گھر ہے۔ پاکستان اسے پسند ہے۔ سب ٹھیک رہے گا۔ بس تم میرا راز اپنے تک ہی رکھنا۔" وہ سوچتے ہوئے طمانیت سے بولی۔

"پھر ایک دن انہیں بھی منالوں گی۔ جب اپنی بیٹی کو ملکہ کے روپ میں دیکھیں گے تو غلطی کی معافی ہو ہی جائے گی۔"

"میرے کانوں اور میرے دل و دماغ کو یہ سب کچھ بھلا نہیں لگ رہا۔ صدیقہ! تم ایک غریب والدین کی بیٹی ہو۔ ہوش میں آجاؤ۔ ایسی شادیاں خوشی سے شروع ہوتی ہیں لیکن عمر بھر کے پچھتاوے پر ان کا اختتام ہوتا ہے۔ لڑکیاں اتنی خوش قسمت ہوتیں تو ہمارے ساتھ کب کا معجزہ ہو چکا ہوتا۔ ہم سسٹرز نہیں، ڈاکٹرز بن چکی ہوتیں۔"

"یہ معجزہ ہونے ہی تو جا رہا ہے ثمینہ۔" وہ سنجیدگی سے بولی اور لیٹ گئی۔

"ان خاردار راہوں سے پلٹ آؤ صدیقہ، یہ مرد تمہیں دھوکا دے گیا تو کیا کرو گی۔ پھر تمہارے والدین تمہیں قطعاً قبول نہیں کریں گے صدیقہ۔ گاؤں کے لوگ بہت غیرت مند ہوتے ہیں۔ کیوں بھول گئی ہو گاؤں کے اصول اور قانون، وہ تمہیں مار دیں گے۔ کسی کو خبر تک نہ ہونے دیں گے، سوچ لو۔" وہ پریشانی سے بولی۔

"ثمینہ تم میری بات کا یقین کرو۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔" صدیقہ نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔

"یعنی کہ تم میری بات نہیں مانو گی۔ تم نے اس آگ میں کودنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" وہ افسردگی سے بولی۔

"میری بات پر غور تو کرو۔"

"ہرگز نہیں۔۔۔ میں نے اس کی نظروں میں پسندیدگی دیکھی ہے۔ اس کی باتوں میں محبت کی گھلاوٹ محسوس کی ہے۔ ثمینہ یقین کرو۔ میری غربت کی داستان سن کر وہ تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ میرے لیے کچھ کرنا چاہتا ہے؟" صدیقہ سوچتے ہوئے بولی۔

"مثلاً"۔۔۔ میں بھی تو سنوں۔" ثمینہ نے پریشانی سے کہا۔

"یہ تو معلوم نہیں ثمینہ۔۔۔ ہو سکتا ہے شادی کے لیے پرپوز کرے۔" وہ یقین سے بولی۔

"اگر یہ معجزہ رونما ہو گیا تو سمجھو پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔"

"اللہ کرے ایسا ہو۔ چلو آنکھیں بند کرو اور سو جاؤ۔" وہ افسوس سے بڑبڑائی۔

"تمہاری تو عقل گھاس چرنے جا چکی ہے۔ آنکھوں پر اس کے اسٹیٹس کی پٹی بندھ چکی ہے۔ اب تم کام سے گئیں۔" وہ تلخی سے بولی اور کروٹ بدل لی۔

✿ ✿ ✿

ہاؤس جاب ختم ہوتے ہی آصف کا لندن سے بلاوا آگیا۔ یہ سن کر صدیقہ مضطرب ہو گئی۔ اس نے جو سپنے دیکھے تھے اور پرپوزل کے انتظار میں اس کے دن رات کا چین غارت ہوا تھا۔ وہ سب رائیگاں ہوتا ہوا نظر آیا۔

بہار کی آمد آمد تھی۔ چار سو رنگ برنگے شوخ و شنگ پھولوں کی بہار تھی۔ اسپتال کے وسیع و عریض لان میں گھاس گرین ویلوٹ کے کارپٹ کی مانند لگ رہی تھی۔ صدیقہ چھٹی کے بعد باہر نکل کر بینچ پر بیٹھ گئی۔ بالکل ہی تنہا۔ اسی جگہ وہ گھنٹوں آصف کے ساتھ بیٹھا کرتی تھی۔ مگر اب تو وہ جانے کی تیاری میں تھا۔ اس کا اسپتال آنا بہت کم ہو گیا تھا۔ اب وہ اپنے کولیگز سے ملنے آتا یا اسے ڈنر پر لے جانے کے لیے آیا کرتا تھا۔ وہ اسی سوچ میں تھی کہ آصف کی گاڑی سامنے سے آتی نظر آئی۔ وہ فوراً کھڑی ہو کر ہاتھ ہلانے لگی۔ وہ گاڑی پارک کر کے اس کے قریب آگیا اور سرخ گلاب کی ادھ کھلی کلیوں کا خوب صورت گلدستہ اسے تھماتے ہوئے بولا۔

"آج میں بہت خوش ہوں۔"
"ضرور آپ نے واپسی کی سیٹ بک کرالی ہوگی۔" وہ پھولوں کو سونگھتے ہوئے بولی۔
"تمہارا اندازہ بالکل ہی غلط نکلا۔ چلو کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔ جانے سے پہلے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا تو اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ ذہن جو پچھلے ایک مہینے سے ماؤف سا رہنے لگا تھا۔ اس نے بھی انگڑائی لی۔ وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چلتی ہوئی کار تک آگئی۔
دونوں گاڑی میں بیٹھ کر شہر کی سڑکوں پر بے مقصد گھومتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ آصف کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں، جبکہ صدیقہ بہت اداس اور غم زدہ لگ رہی تھی۔ اسے آصف کے چہرے کی خوشی دیکھ کر حیرت کے ساتھ غصہ بھی آرہا تھا۔ اپنے جذبات پر قابو رکھنے کے باوجود اس کی نگاہوں میں خفگی سی تھی۔ آخر میں وہ ڈنر کے لیے پی سی چلے گئے۔ کھانے کے دوران وہ اپنی ماں کی باتیں کرتا رہا اور صدیقہ غور سے سنتی رہی۔ آئس کریم کھانے کے بعد آصف نے بریف کیس کھولا اور کالے رنگ کی مخملیں ڈبیا کو کھول کر اندر سے ہیرے کی چمکتی دمکتی انگوٹھی نکالی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر انگوٹھی اس کی مخروطی انگلی میں ڈال کر پیار سے مغلوب ہو کر بولا۔
"آئی ہوپ، تم انکار نہیں کروگی۔" حیرت سے وہ منہ کھولے اسے دیکھے جارہی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے مسرت وانبساط سے جھوم اٹھا۔
صدیقہ تھوڑی دیر بعد حیرت کے سمندر سے باہر نکلی تو اک پرتسکین سی مسکراہٹ لبوں پر پھیل گئی۔ اسے اپنے تمام خوابوں کی تعبیر اس انگوٹھی میں لکھی ہوئی نظر آرہی تھی۔ سب اتنی جلدی ہوگا اس نے تو کبھی سوچا نہ تھا۔
"تم خوش ہو نا۔" وہ قریب ہو کر بولا۔ مگر وہ کچھ شرم وحیا سے اور کچھ بے پناہ خوشی سے جواب نہ دے سکی۔
"کچھ تو بولو۔" وہ بے قرار سا ہو گیا۔
"کیا آپ نے اپنی ممی سے اجازت لے کر یہ فیصلہ کیا ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔
"میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔ کیونکہ میری ممی ایسی بے مثال خاتون ہیں کہ جب تمہیں اپنے بیٹے کے ساتھ دیکھیں گی تو ہلکی سی ناراضی کے بعد تم پر جان نثار کرنے سے دریغ نہیں کریں گی۔ تم اپنے پیرنٹس کا بتاؤ۔ کیا ری ایکشن ہوگا ان۔"
"کچھ اچھا نہیں۔۔۔ بہتر یہی ہے کہ ابھی ہم دونوں اس فیصلے کو راز میں ہی رکھیں۔" وہ نظریں جھکائے بولی۔
"مجھے مشورہ پسند آیا تو نکاح کرنے میں کیا قباحت ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔
"سوچنے تو دیجیے مجھے۔ آپ سے شادی کا فیصلہ پیرنٹس کو انفارم کیے بغیر کرنا بہت عجیب لگ رہا ہے۔" وہ بہت سنجیدہ ہو گئی تھی۔
"اگر ان سے مشورہ لینے کی غلطی کی تو وہ گھنٹے بھر میں ہی مجھے کسی جاہل ان پڑھ کزن سے نکاح پڑھوا کر رخصت کردیں گے کیا کروں۔ عجیب ہی مخمصے میں گھر گئی ہوں۔"
"ایسے کرتے ہیں جلد از جلد کورٹ میرج کرتے ہیں۔ بعد میں سوچا جائے گا کہ اپنے پیرنٹس کو کیسے انفارم کیا جائے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
"آپ تو واپس جارہے ہیں، یہ سب کیسے ممکن ہے۔" وہ متذبذب تھی۔
"میں واپس نہیں جارہا۔۔۔ مجھے یہاں اسپتال میں جاب مل گئی ہے۔ میں نے پیرنٹس کو اطلاع دے دی ہے۔ رونے دھونے کے بعد دونوں ہی نارمل ہو گئے ہیں۔"
"مجھے یقین نہیں آرہا۔" اس کے چہرے پر خوشی ہویدا تھی۔ مگر خود پر مکمل کنٹرول تھا۔ جسے آصف نے بھی محسوس کیا۔ وہ اس کے چہرے کے خوب صورت خدوخال میں کھویا سوچے جارہا تھا۔
"ایسی حسینہ میرے نصیب میں کہاں۔ میں دھان پان سا کالا کلوٹا ان امپریسو پرسنالٹی کا ساتھ انڈین

باشندہ اور یہ ہارٹ آف پنجاب کے بھرپور جمال و جوبن کی منہ بولتی تصویر اور ———— نسوانی وقار و کروفر کی مثال۔ اس نے چھ مہینوں کی شب و روز کی رفاقت میں ایک بار بھی اظہار محبت کیا' نہ ہی عشق میں مرجانے کے دعوے کیے۔ آج انگوٹھی پہنائی تو ہلکا سا احتجاج بھی نہ کیا۔ نہ ہی خوشی سے پاگل ہوتی نظر آئی۔ کیا لڑکی ہے۔ میرا فیصلہ میرے والدین کو شاک تو دے گا لیکن ابھی سے بتا دیکھے میں ان کی مخالفت پسند نہیں کروں گا۔"

وہ اس کی نظروں کی تپش سے پگھل رہی تھی۔ جھینپ کر ساتھ والے ٹیبل پر بیٹھے افراد کی طرف دیکھنے لگی ———— حسین و اسمارٹ کپل اپنے دو عدد بچوں کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ اس نے سامنے بیٹھے ڈاکٹر آصف کی طرف سرسری نظر دوڑائی اور ٹیبل پر پڑے گلاب کے پھولوں سے کھیلتے ہوئے سوچنے لگی۔ "میرا حسن میرے پیرنٹس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ تعلیم کی وقعت مہینے کی پہلی تاریخ کے بعد بے معنی ہو جاتی ہے۔ انہیں میرے جوڑ کا لڑکا ڈھونڈنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی' کسی بھی وقت ان کی طرف سے میری شادی کا بلاوا آسکتا ہے اور میں پھر اتنی بے بس اور مجبور ہو جاؤں گی کہ نکاح نامے پر دستخط کرکے تاحیات' قفس کو سینے سے لگاؤں گی۔ مجھے اپنے ہونے والے ان پڑھ مردانہ وجاہت سے بھرپور کزن کا کیا فائدہ؟ کہ جو میری تنخواہ پر بسر اوقات کرتے ہوئے صبح و شام میری درگت بھی بنائے گا۔ اپنے خاندان کو مضبوط و قوی بنانے کے لیے درجن بچے بھی پیدا کروائے گا اور اپنی انا اور غیرت کی تسکین کی خاطر سب کے سامنے مجھے ذلیل بھی کرے گا۔ اگر مجھے اپنی زندگی کو بہتر بنانے کا چانس مل رہا ہے تو اپنی روایات اور رواجوں کو کیوں یاد رکھوں۔ مجھے چاہیے کہ میں بھول جاؤں۔ والدین کی ضروریات اور پیار کو بھول جاؤں اپنے گاؤں کو۔ جہاں سوائے گندگی' مچھر اور مکھیوں کے اور کچھ نہیں۔"

"کیا سوچ رہی ہو؟ میں پریشان ہوں کہ تم مجھے ری جیکٹ نہ کردو۔" وہ اسے سوچتے ہوئے دیکھ کر اضطراری کیفیت میں بولا۔ وہ چونک گئی اور ناقدانہ انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

"صدیقہ کیا بات ہے؟ کچھ مضطرب سی لگنے لگی ہو۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

"فیصلہ دو زندگیوں اور دو خاندانوں کا ایک دوسرے سے مختلف سیٹ اپ کا ہے۔ کیا ان کا ملاپ درست رہے گا۔" وہ استہزائیہ لہجے میں بولی۔

"صدیقہ ہم دونوں کی نئی زندگی کی بنیاد پسند' محبت اور وفا کے اصولوں پر رکھی جارہی ہے۔ جن میں پنجابی اور مدراسی قوانین کا دخل ہے' نہ ہی میں ان پر بلیو کرتا ہوں۔" وہ لگاوٹ سے بولا۔

"یہ یاد رکھیے گا کہ میں اور آپ عمر بھر کے لیے اپنوں سے دور ہو جائیں گے۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔

"میں جانتا ہوں۔" وہ سر جھکا کر بولا۔ "مشکلات ہوں گی۔ اس کے لیے تیار رہنا پڑے گا۔"

"تو پھر مجھ سے وعدہ کیجیے کہ آپ مجھے والدین کے اعتراض و انکار پر ری جیکٹ نہیں کریں گے۔ کیونکہ مجھے آپ کو اپنانے کے بعد اپنے گاؤں کی جانب جانے والے تمام راستوں پر بند باندھنے ہوں گے۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"صدیقہ ملک ابھی وقت ہے اپنے تمام خدشات کا اظہار کرو اور اپنی ہر بات منوالو۔ تاکہ بعد میں یاددہانی کراسکو۔" یہ اس نے دل ہی میں کہا۔

"ایسی سوچ بھی گناہ ہے صدیقہ۔ گو کہ میری ماں کا مجھ سے پیار بے پناہ ہے میری فرماں برداری اور لگن میں بھی عبادت کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود آئی لو یو۔ کیونکہ یہ میرے حقوق کے زمرے میں آتا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔ ماں تا ہمیشہ اولاد کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔" وہ مستحکم لہجے میں بولا۔

"اگر ایسا نہ ہوا تو۔" وہ آنکھیں جھکائے ہی گویا ہوئی۔

"تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ صدیقہ تم میری

زندگی ہو۔ مجھ پر اعتماد رکھو۔ دھوکہ نہیں دوں گا۔ میں تمہیں اس وقت تک لندن لے کر نہیں جاؤں گا جب تک ہمارے پیرنٹس رضامند ہو کر ہمیں قبول نہیں کرلیتے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میرے والدین کی نظروں میں اُمڈنے والی نفرت کا نشانہ بنو اور مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"لیکن سر! میرے والدین مجھے کسی قیمت پر معاف نہیں کریں گے۔ ہمارے خاندان میں آج تک ایسا نہیں ہوا۔ میرا یہ انقلابی قدم مجھے اپنے خاندان کے ہر فرد سے دور کردے گا۔ آپ مجھے اپنے گھر اپنوں میں لے چلیں۔ تاکہ میں کسی خاندان کی باسی بن کر ایک باعزت زندگی گزار سکوں۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔

"میرے والدین۔۔۔ فی الحال۔۔۔" وہ ابھی بات مکمل بھی نہ کرپایا تھا کہ وہ بول پڑی۔ "مجھے ان کی نفرت و حقارت منظور ہے۔ ایک دن جیت میری ہی ہوگی۔" وہ خوداعتمادی سے بولی۔

"کچے بعد دیگرے ہمارے مسائل حل ہوتے چلے جائیں گے۔ اس کی فکر نہ کرو۔ فوری طور پر نکاح ضروری ہے۔ نہ کہ والدین کو بتا کر ہارٹ اٹیک دینا۔ آخر کار تم نے جانا تو لندن ہی ہے۔ رہنا تو میرے ہی ساتھ ہے۔" وہ تسلی دینے کے انداز میں بولا۔

"اگر میں اپنوں کو بھلا نہ سکی تو۔۔۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"ارے شوہر جورو کا غلام بن کر رہے گا تو تمہارے دل و دماغ سے تمہارے اپنے کیسے رفوچکر نہ ہوں گے۔ میری جان تمہاری اتنی پوجا کروں گا کہ تم اپنوں کو کیا دنیا ہی بھول جاؤ گی۔" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا' بہت لگاؤ اور اپنائیت سے۔ مگر صدیقہ نے ہاتھ تو نہ بڑھایا' مسکرا کر رہ گئی۔

"ہم شادی کے بعد کراچی چلے جائیں گے۔ وہاں ایک بڑا سا بنگلہ خریدوں گا۔" وہ مسکرا کر بولا تو اس کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آگیا۔ مگر تاسف بھرے لہجے میں بولی۔

"سر! جب میرے والدین کو میری شادی کی خبر پہنچے گی تو وہ گاؤں میں اپنے رشتے داروں کے طعنوں و تشنوں سے چھلنی ہوجائیں گے۔ سر! یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے لگا ہے۔" وہ روہانسی ہوگئی۔ "میں ایسا نہیں کرسکتی سر! مجھے معاف کیجیے۔"

"میں ان سے ملنے کو تیار ہوں۔" وہ ایک دم سے پریشان ہوگیا۔

"یہ تو ناممکن ہے سر؟" وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔

"تو پھر کیا کیا جائے؟ تم ہی بتاؤ۔" وہ افسردہ ہوگیا۔

"آپ کو بھی اپنے والدین چھوڑنے ہوں گے۔ کیونکہ میں ان چاہی بہو بن کر آپ کے گھر کا فرد کیسے بن سکتی ہوں؟ سراسر ذلالت اور ندامت ہے میرے لیے۔ آپ نے درست فرمایا ہے کہ میں ان کی نفرت برداشت نہیں کرپاؤں گی۔ نہ ہی انہیں جیتنا آسان ہے۔ تو میں نے سوچا ہے کہ میں اپنی اچھی بھلی زندگی کو کیوں تکمر داغ دوں۔"

"میں نے تمہیں یہی تو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ہم پاکستان میں ہی اپنی نئی زندگی کا ہر لمحہ گزاریں گے۔ چھ مہینے بعد والدین سے مل آیا کروں گا۔ اس کی اجازت تو دے ڈالو۔ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"مگر انہوں نے آپ کی شادی کردی تو۔۔۔ میرا کیا بنے گا؟" وہ ڈر کر بولی۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟ وہ مجھ پر زبردستی نہیں کریں گے۔" وہ اعتماد سے بولا۔

"پھر بھی۔۔۔ آپ میری خاطر ہی سہی۔" وہ نظریں جھکا کر بولی۔

"محبتیں شرائط کی محتاج نہیں ہوتیں صدیقہ۔ میں تم سے دل و جان سے پیار کرتا ہوں تو تم بھی تو مجھ سے بے پناہ محبت کرتی ہو۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر انگوٹھی دیکھنے لگا تو وہ شرما کر مسکرادی۔

"تم اتنے ہمدرد اور مضبوط کردار کے انسان ہو کہ شکل و صورت بیک گراؤنڈ میں جاچھپی ہے۔ مجھے تم سے والہانہ پیار تو نہیں۔ مگر پسندیدگی کا لیول بہت ہائی

ہے۔ میں دل و جان سے تمہاری عزت کرتی ہوں۔ بے شک میرا انٹرسٹ اپنی جگہ بہت اہم ہے۔" وہ اپنے گورے ہاتھ کو اس کے سیاہ ہاتھ میں دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔

"کل میرے گھر کی ڈیل بھی ہو گئی ہے۔ تمہارے انکار پر میں یہ ملک ہمیشہ کے لیے چھوڑ جاتا۔ اب میں اس ملک کا باشندہ بن کر رہوں گا" آئی ایم سوری۔" وہ اس کی خاموشی کو محسوس کرکے بولا۔

"ہم فوراً" کراچی شفٹ ہو جائیں گے۔ میں اپنے والدین کا سامنا نہیں کر سکوں گی۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "کیونکہ ثمینہ انہیں فوراً" بتادے گی اور وہ مجھے آپ کے پاس نکاح کے باوجود نہیں چھوڑیں گے۔ چھین کر لے جائیں گے۔"

"او کے۔ وہی ہو گا جو تم چاہو گی۔ کل تمہارے برائیڈل ڈریس اور جیولری کی شاپنگ ہو گی۔ پرسوں ہمارا نکاح ہو گا اور ہم سیدھے ہوٹل چلے جائیں گے۔ اگلے دن کراچی کے لیے روانگی ہو گی۔" وہ تیزی سے پروگرام بتا رہا تھا۔

"ایک بار پھر سوچ لیں کہ والدین کو چھوڑنے کے بعد آپ کی انکم کا ذریعہ کیا ہو گا؟ یہ دولت ایسی چیز ہے ہاتھ میں نہ ہو تو سراسر حسرت اور دردسری ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "والدین کو چھوڑنا گویا تمام آسائشات کو چھوڑنا ہے۔ اک معمولی ڈاکٹر بن کر زندگی بسر کریں گے۔ کہیں مجھے پانے کا پچھتاوا تو نہیں ہو گا۔" وہ کریدنے کے انداز میں بولی۔

"اب تم صحیح رستے پر آئی ہو۔ پگلی بھلا میں انہیں چھوڑوں ہی کیوں؟" وہ مسکرا کر بولا۔

"تم اور میں یہاں خوش و خرم رہیں اور پیرنٹس اپنی جگہ مطمئن رہیں۔ اس لیے مجھے بیلنس کرنا ہو گا۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"زیرو بڑھانے کے چکر میں لوگ اپنے پیاروں کو بھول جاتے ہیں۔ بیوی اور بچوں کے لیے وقت نہیں ملتا ہے اور پیار بھی سیکنڈری ہو جاتا ہے۔ ابھی بھی وقت ہے سوچ لیں کہ کہیں مجھے چھوڑ تو نہ دیں گے۔"

وہ سوچ کر سہم گئی۔

"ڈر اور اندیشوں سے باہر نکل آؤ صدیقہ۔" وہ سنجیدہ سا ہو گیا۔

"آپ مائنڈ کر گئے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"ڈر خوف اور اندیشے شک کی ہی قسم ہیں۔ ہم اپنی ازدواجی زندگی شکوک و شبہات میں کیونکر گزاریں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے قربانی دینے جا رہے ہیں۔ پھر وسوسے اور وہم کیوں؟" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"سر! جب کسی کو پالینے کی خواہش کو تسکین ملتی ہے تو کھو جانے والے تمام رشتوں کی یاد اک پچھتاوا بن جاتی ہے۔ پچھتاوے کبھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اس طرح گزرنے والے شب و روز عذاب بن جاتے ہیں۔ دل کی دھڑکن اپنے پیاروں کے نام پر چلتی ہے۔ ذہن ماضی کے دھندلکوں کو کلیئر کرنے لگتا ہے۔ رشتوں کی قربانی گناہ کبیرہ بن کر ہوش و حواس پر چھا جاتی ہے اور یوں تمام وعدے وعید پس پشت ڈالنے میں ہی عافیت محسوس ہونے لگتی ہے۔ آپ مرد ہیں۔ پھر سے اپنی نئی زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں۔ میرے لیے زندگی اور دنیا بہت تنگ ہو جائے گی۔ ایک بار پھر سوچ لیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ کیونکہ اسے تسلی بخش جواب کی توقع تھی۔ وہ اس وقت اس سے ہر طرح کے عہد و پیمان لینا چاہتی تھی۔ وقتی جوش میں خود کو برباد نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم بھروسا تو کرکے دیکھو۔ کبھی پچھتاوا نہیں ہو گا تمہیں۔" اس نے پریقین لہجے میں کہا۔

اتنی دیر میں ویٹر بل لے آیا۔ اس کی ادائیگی کے بعد وہ کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی چہرے پر مسکان سجائے کھڑی ہوئی اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر شرما سی گئی۔

"کل صبح تمہارا پہلا کام ریزائن دینا اور شام شاپنگ کے لیے جانا ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا تو وہ جھومتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"اسے کہتے ہیں قسمت کا دھنی ہونا۔" اس نے خود

سے سرگوشی کی۔

☼ ☼ ☼

عبائے میں ملبوس آصف کے پیچھے چلتی ہوئی وہ اندر تک لرز گئی تھی۔ اسے لگا جیسے اس کی مہار آصف پکڑے جہاں چاہے اسے لے جانے کے تمام اختیارات حاصل کر چکا ہے۔ دل میں خوشی سے زیادہ بے تحاشا کرب سمایا تھا۔ گاڑی میں آصف کے ساتھ بیٹھتے ہوئے اسے بیکورٹی سے زیادہ کم مائیگی کا احساس ہو رہا تھا۔ والدین پر زیادتی کرنے اور ان کی تکلیف کو محسوس کرتے ہوئے وہ عبائے میں زار و قطار رونے لگی تھی۔ اس کی خاموشی پر آصف نے پرجوش لہجے میں کہا۔

مبارک ہو حدیقہ۔ آج سے تم میری حدیقہ ہو۔ آئی لائک دس نیم۔ تمہیں اعتراض تو نہیں۔ حدیقہ از اے گڈ نیم۔ اس کے معنی بھی بہت اچھے ہیں۔

"اب ماں کے رکھے ہوئے نام سے بھی سبکدوش ہو جاؤ صدیقہ۔" اس نے تلخی سے دل میں سوچا اور آنسو صاف کرنے لگی۔

"سر۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ میں نے کہیں غلط فیصلہ تو نہیں کر دیا۔" وہ روئے جا رہی تھی۔

"آج سر کی گردان بھی ختم ہو جانی چاہیے۔ تمہارا سرتاج ہوں۔ شوہر نامدار اور تم سے بے پناہ پیار کرنے والا تمہارا دوست ہوں۔ پھر فیصلہ غلط کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ خوشی سے چہک رہا تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

دونوں گاڑی سے اترے۔

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر لفٹ کی طرف چل دیا۔ گراؤنڈ فلور پر پارلر میں اسے چھوڑ کر پیار سے بولا۔

"بیگم صاحبہ! جب تیار ہو جائیں تو موبائل پر میسج کر دیجیے گا۔ بندہ چند منٹ میں حاضر ہو جائے گا۔" وہ نگاہیں نیچی کیے مسکرا دی اور دو موٹے آنسو رخساروں پر پھسل آئے۔

☼ ☼ ☼

وہ پارلر کے باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا کہ صدیقہ پارلر کی اونر کے ساتھ باہر نکلی۔ آصف کو دیکھ کر چونکی اور صدیقہ کی طرف حیرت و افسوس سے دیکھ کر آصف سے مخاطب ہوئی۔

"یو آر سو لکی۔" وہ مطلب سمجھ کر کھسیانی سی ہنسی سے صدیقہ کی طرف اچٹتی نظر ڈال کر بولا۔

"آپ نے درست فرمایا۔" لجاجت سے بھرپور لہجے کو صدیقہ نے بھی محسوس کیا۔ مگر وہ تو اس کے حسن میں کھویا ہوا تھا۔ پانچ فٹ دس انچ کے قد میں میرون اور گرے کلر کے غرارے میں وہ کسی پرستان کی مخلوق لگ رہی تھی۔ اس نے اسے آج تک سفید یونیفارم میں ہی دیکھا تھا۔ آج پہلی بار اس کا حسن و جمال کھل کر اس کے سامنے آیا تھا۔ وہ عالم فسوں میں اس کے قریب گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر لفٹ کی طرف چل پڑا۔ لفٹ میں ہی اس نے اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ شرمائی۔

رستے میں جنہوں نے اس جوڑے کو دیکھا۔ آصف کی تقدیر پر رشک کیے بغیر نہ رہ سکا۔

کمرہ دلہن کے سامنے ماند پڑ گیا تھا اور دلہن کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی قسمت پر نازاں و فرحاں ہونے لگی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے خاک کے ذرے سے آسمان کا چمکتا دمکتا ہوا ستارہ بنا دیا تھا۔ اس کی مسرت و تسکین دیدنی تھی۔

اگلی صبح وہ تیار ہو کر آئینے کے سامنے کھڑی خود کو دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

"یہ صدیقہ تو کسی طرف سے نہیں لگ رہی۔ اس کی تو مرگ ہو چکی ہے۔ یہ تو ڈاکٹر آصف علی زیدی کی حدیقہ ہے۔" وہ پنک کلر کے لہنگے میں غضب ہی تو ڈھا رہی تھی۔ آج انہوں نے کراچی کے لیے روانہ ہونا تھا۔ شام کی فلائٹ تھی۔ لنچ پر اسی ہوٹل میں آصف نے اپنے تمام دوستوں کو دعوت پر مدعو کر کے سنت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ولیمہ کیا تھا۔ سب کو ان کی ملاقاتوں کی خبر تو تھی۔ مگر ازدواجی رشتے میں یہ دونوں اتنی جلدی منسلک ہو جائیں گے

اس کا اندازہ نہ تھا۔ سب بظاہر خوش و خرم نظر آرہے تھے۔ لیکن دل صدیقہ کی اس حرکت کو تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ لنچ کے بعد چائے کا دور چل پڑا اور یوں پانچ بجے سب چہ میگوئیاں کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔ صدیقہ اور آصف نے کپڑے تبدیل کیے اور اگلے سفر کے لیے تیار ہو کر سامان سمیت ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

لاہور کو خیرباد کہہ کر آصف نے ایک ہفتے بعد اسپتال جوائن کرلیا۔ صدیقہ کی زندگی گھر تک محدود ہو کر رہ گئی۔ زندگی میں اتنا آرام و سکون بھی ہوگا یہ تو اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ صبح آصف کو اسپتال رخصت کرکے وہ خواب خرگوش کے مزے لوٹتی۔ اپنی مرضی سے اٹھتی۔ تیار ہو کر آصف کا لنچ پر انتظار کرتی۔ اسے یہ سب بہت بھلا لگ رہا تھا۔ کبھی کبھار والدین اور بہن بھائیوں کی یاد ستاتی تو اسے فوری طور پر قلب و ذہن سے نکال دیتی اور خود کلامی کرتی۔ میں نے جرم نہیں کیا۔ اپنی پسند کی شادی گناہ نہیں' یہ میرا حق تھا۔ میں نے اپنی روایات سے ٹکرلے کر نسوانی حقوق کو حاصل کرنے کی اک مثال قائم کی ہے۔ میں غریب خاندانوں میں پیدا ہونے والی لڑکیوں کے لیے ایک خوش آئند پیغام ہوں اور اک کامیاب زندگی گزارنے کا بہترین آزمودہ سبق ہوں۔

رہے والدین کے مسائل تو ان شاء اللہ انہیں اس جھونپڑی سے اٹھا کر لاہور کے پوش علاقے کے باعزت رہائشی بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگادوں گی۔ فی الحال وہ اس چونکا دینے والی خبر کو ہضم تو کرلیں۔ غم و غصہ اور ناراضی پر گزرے وقت کی دھول تو جم جائے۔ تب تک میں بھی سیٹل ہو جاؤں گی۔ ایک آدھ بچہ میرے اسٹیٹس کو مزید اعلا اور شان دار بنادے گا۔ پھر پوچھوں گی ثمینہ سسٹر سے کہ تم نے زندگی میں کیا کھویا؟ اور میں نے کیا پایا۔ وقت کی بات ہے اسی معاشرے میں پروان چڑھنے والے میرے رشتے دار میری اس معمولی سی نافرمانی کو دور اندیشی اور دانشمندی کا نام دے کر میری ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب ہوا کریں گے۔ کتنا اچھا لگے گا جب گاؤں میں میری گاڑی داخل ہوگی اور گلیوں میں گلی ڈنڈا کھیلنے والے بچے بھاگ کر گھروں میں میرے آنے کی اطلاع دیں گے۔ میرے والدین خوشی سے بے قابو ہو کر گلی میں ہی مجھے خوش آمدید کہنے کو نکل آئیں گے۔ بہن' بھائی مجھے اپنے حصار میں لے کر مجھ پر بوسوں کی بارش کردیں گے اور پھر میں ان کو قیمتی تحائف دے کر ان کے چہروں پر مچلنے والی خوشی کو ان آنکھوں میں اتار کر خود کو سیراب کرتی نہال ہو جاؤں گی۔ لیکن ابھی مجھے اس وقت کی آمد کا انتظار کرنا ہوگا۔ وہ خود بخود میرے روبرو آکر مجھ سے گفت و شنید کرے گا۔ ذرا صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا صدیقہ۔

آصف مجھ سے پیار کرتا ہے اور میں بھی اس سے پیار تو کیا عشق کرنے لگی ہوں۔ دولت اور اسٹیٹس کی چاہ اک طویل مسافت طے کرتی ہوئی محبت میں گرفتار ہو کر دیوانگی و جنون کا روپ دھار چکی ہے۔ اس میں کمال میرا نہیں۔ آصف آپ کی بے پناہ چاہت اور ان گنت خوبیوں کا ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں اس پاک ذات کو حاضر و ناظر جان کر۔ کبھی دغا نہیں دوں گی۔ آپ کے نام پر قیامت کے دن اٹھائی جاؤں گی۔ لیکن آپ کے رزق میں میرے غریب والدین کی حصے داری نہ ہوئی تو مجھے جاب کرکے ان کی ضروریات زندگی کو پورا کرنا پڑے گا۔ ان کو آرام دہ اک باعزت زندگی دینا مقصد حیات ہے۔

یہ دونوں جس وسیع بنگلے میں آکر رہائش پذیر ہوئے تھے۔ وہ رینٹ پر لیا گیا تھا صدیقہ۔ باتوں باتوں میں کتنی بار اپنی اس خواہش کا اظہار کرچکی تھی کہ اپنے لیے ایک خوب صورت سا گھر ہم خود تعمیر کروائیں گے۔ جسے وہ سنی ان سنی کردیتا تھا اور وہ بھی خاموش ہو جاتی۔ دن ہنستے مسکراتے گزرتے جارہے تھے۔ لیکن صدیقہ کا دل مطمئن نہ تھا۔ ایک دھڑکا سا رہنے لگا تھا۔ کیونکہ اس کے پاس اپنا گھر تھا' نہ ہی جاب اور نہ ہی کوئی اور

بیکوری۔

☆ ☆ ☆

وہ شان بے نیازی سے لان میں چہل قدمی کرتے ہوئے رنگ برنگے پھولوں سے محظوظ ہو رہی تھی کہ پورچ میں آصف کی کار آکر رکی۔ وہ ننگے تلے قدموں سے چلتی ہوئی اس کے قریب چلی گئی۔ وہ اسے پیار سے گھورتے ہوئے سوچنے لگا۔ زندگی کی آسائشات کا بھی اپنا ہی مزاج ہے۔ زیبائش سرچڑھ کر بولنے لگتی ہے۔ نزاکت ہر ادا سے چھلکنے لگتی ہے۔ صدیقہ کیا تھی۔ ڈرپوک' احمق اور خود اعتمادی سے عاری' ہر بات پر لیس کہنے والی اور اب یہ ہے ایک بالکل الگ صدیقہ۔

"کہاں کھوگئے جناب۔" وہ کار کا دروازہ کھولتے ہوئے اپنائیت سے بولی تو آصف چونک اٹھا۔

"کہاں گم ہیں جناب' میں تو مدہوش رہتی ہوں آپ کی رفاقت کے نشے سے ابھی تک باہر نہیں نکلی۔ ابھی تک مدہوش ہوں۔" وہ جھومتے ہوئے بولی۔

"آئی تھنک طویل نشہ اپنی ذمہ داریوں سے کنارہ کشی کا دوسرا نام ہے۔ میڈیم اب مدہوشی سے باہر تشریف لے آیئے اور اپنی ذمہ داریوں کو پہچانیے۔" لہجے کی سختی پر وہ چونک کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ آج اس کے دیکھنے اور بولنے کے انداز میں ہی فرق تھا۔ دل کو دھڑکا تو لگا ہی رہتا تھا۔ ایک دم سے جیسے ڈوبنے لگا۔

"یہ بتاؤ کہ کبھی والدین کی یاد ستائی۔ ملنے کو دل بھی بے تاب ہوا۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "کیونکہ ایک لیسے بندے کی خاطر جس سے واسطہ اور تعلق فقط چند مہینوں کا ہے۔ ان خونی رشتوں کو کیسے بھلایا جاسکتا ہے۔ جن سے آپ کا رشتہ قائم ہوئے سالہا سال بیتے ہوں۔ مد و جزر اور نشیب و فراز میں ساتھ ساتھ گزرے ہوں۔ ان کو میں تو فراموش کرنے میں ناکام رہا ہوں۔ تم کیسی بے مروت بیٹی ہو کہ اپنے والدین کی غربت کا احساس تک نہ رہا۔ جبکہ تم جانتی تھیں کہ والدین کی بسر اوقات تمہاری ہی تنخواہ پر ہے۔ تم نے مجھ سے کبھی فکرمندی کا اظہار تک نہ کیا۔ مجھ سے غربت کیوں برتی؟ کیا وقت گزاری کر رہی ہو میرے ساتھ۔ جیسے تم نے والدین کے ساتھ کیا۔ اسی کیٹیگری میں مجھے بھی لاکر کھڑا کردیا۔" لہجے میں حد درجے خفگی تھی۔

"آپ کی یہ باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ پلیز۔ مسئلہ کیا ہے۔ کھل کر بتائیں۔"

وہ چپل پاؤں کے قریب رکھ کر جوتے اور موزے اٹھاتے ہوئے بولا ــــ "مسز ثمینہ کا فون آیا تھا۔ بتا رہی تھی کہ تمہارے والدین کو شادی کی خبر پہنچ چکی ہے اور دونوں بستر سے لگ چکے ہیں۔ ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے نہ پیسہ ہے' نہ ہی ہمت ہے۔" وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مخبر رساں ثمینہ خود ہے۔ بھلا وہ جل ککڑی اتنی بڑی خبر کو کیسے ہضم کرسکتی ہے۔ چسکے لے کر بتایا ہوگا۔ حالانکہ ایسی انہونی اور ہلا دینے والی خبریں کبھی چھپتی تو ہیں نہیں۔ وہ نہ بتاتی تو بھی پتا تو چل ہی جاتا۔" وہ غصے میں بول رہی تھی۔

"تمہارے والدین کی حالت کا سن کر میں خاصا پریشان ہوگیا ہوں۔ جیسے میری ماں کو سنتے ہی ہارٹ اٹیک ہو جائے گا اور میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ تم سخت دل بیٹی ہو۔ سہہ جاؤ گی۔ اپنی لطافت بھری زندگی میں مگن ہو جاؤ گی۔ مگر میں اپنے والدین کی وہ اولاد ہوں جو ان کے اشاروں پر ناچتی ہے۔" وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا۔ وہ ششدر ہو کر اسے دیکھے جارہی تھی۔

"میرا دل چاہ رہا ہے فوراً ان کے پاس چلا جاؤں۔ موقع و محل دیکھ کر اپنی اس غلطی کا اعتراف کرلوں۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"آصف میرا دل ڈر رہا ہے۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم دونوں اک بہت بڑے طوفان کی زد میں آنے والے ہیں۔ کیونکہ نیا بے مہار ہو کر ڈولنے لگی ہے۔ آصف ہمارا بنا بنایا گھر ڈوب جائے گا۔ آپ

ہوش میں آجائیں۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے' پلیز آصف۔" وہ اس کے گھٹنوں پر سر رکھ کر رو دی۔

"سویا ہوا ضمیر جاگ اٹھا ہے صدیقہ۔ آج مسٹر ثمینہ کی باتوں نے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ہم نے اپنے والدین پر ایسی زیادتی کر ڈالی ہے۔ جس کا ازالہ مشکل ہے۔ ہمیں ایک دن تو اس طوفان کا سامنا کرنا ہی تھا۔ سو وہ وقت آ ہی گیا۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"سب سے پہلے یہ چیک اپنے مجبور اور لاچار والدین کو پہنچاؤ۔ تم نے بھی تو حد ہی کر دی ہے۔ ذرا سوچو اتنے مہینے انہوں نے کیسے گزارے ہوں گے؟ خود غرضی اور لاپروائی کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔ مجھے سوچ کر ہی افسوس ہونے لگا ہے کہ تم والدین کو اتنی جلدی بھلا سکتی ہو' تو میں کس زمرے میں آتا ہوں۔" وہ قریب ہی کارپٹ پر اس کے گھٹنوں سے سر اٹھا کر بے بسی سے دیکھنے لگی۔

"تسوے بہانے سے تم اپنے والدین کے درد کو دھو نہیں سکتیں۔ تم نے ان کی خبر ہی لی ہوتی کہ کس حال میں ہیں۔ میں نے ان سے ناتا توڑنے کا نہیں کہا تھا۔ شادی کو صیغہ راز میں رکھنے کی تلقین کی تھی۔ وہ بھی تھوڑی مدت کے لیے۔" وہ قدرے خفگی سے بولا۔

وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی کہ وہ مورد الزام اسے ہی ٹھہرا رہا تھا۔ اپنی پارسائی اور بے گناہی کے کلمات اس کی زبان پر تھے۔

"میں غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا۔ حقیقت سے تمہیں روشناس کرنا چاہتا ہوں کہ شادی کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ والدین سے عمر بھر کے لیے کنارہ کشی اختیار کر لیں۔ کم از کم میں تو ایسا گناہ نہیں کر سکتا۔" وہ تلخی سے بول رہا تھا۔

"آپ کھل کر کیوں نہیں کہہ دیتے کہ آپ کو اب پچھتاووں نے گھیر لیا ہے۔ میں آپ کی نظروں سے گر گئی ہوں۔ کیونکہ میں نے آپ کی خواہش کو اولیت دی۔ آج آپ مکمل طور پر ہوش میں آچکے ہیں۔ کیونکہ رات بیت چکی ہے۔ طلوع سحر نے نشہ توڑ دیا ہے۔ اب سابقہ غلطی کا احساس سر اٹھانے لگا ہے اور میں آپ کے دل و دماغ سے نکل کر دور بہت دور جا چکی ہوں۔ لیکن یاد رکھیے میں نے آپ کے ساتھ جینے مرنے کا عہد کیا تھا۔ ہمیشہ اسی پر قائم پائیں گے۔ یہی تو فرق ہے آپ اور مجھ میں۔" وہ مری ہوئی آواز میں بولے جا رہی تھی۔

"تمہیں چھوڑنے کا کب کہہ رہا ہوں۔ والدین سے ملنے کی بات ہو رہی ہے۔" وہ نرمی سے بولا۔

"میں ان کا سامنا نہیں کر سکتی آصف۔ اگر آپ یہ باتیں شادی سے پہلے کرتے تو کتنا ہی اچھا ہوتا۔ پہلے والدین کی آمادگی ہوتی' پھر ان کی دعاؤں کے سائے میں ہم نئی زندگی کا آغاز کرتے۔ نارمل طریقہ تو یہی تھا۔"

وہ اپنی خوشیوں میں تو رونا بھول گئی تھی۔ مگر آج آصف کے طعنوں نے پرانی تمام تلخ یادوں کو جگا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ جس کا آصف پر رتی بھر اثر نہ ہو رہا تھا۔

"میرا فیصلہ تو نہایت جذباتی تھا۔ کاش تم نے اپنی روایات کی قدر کی ہوتی۔ ہم دونوں کے ملاپ کا اس سے بہتر طریقہ ڈھونڈ لیا ہوتا۔ تم بھی عاقبت نااندیش ہی نکلیں۔ مرد اور عورت میں یہی تو فرق ہے۔ تم کیسی عورت ہو۔ دغاباز بیٹی اور خود غرض بیوی۔ جسے فقط اپنی خوشیوں سے غرض ہے۔" وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔

"آپ درست فرما رہے ہیں۔ میں جلد ہی والدین سے ملنے گاؤں جاؤں گی۔ اگر انہوں نے مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو پھر میرے لیے کون سا راستہ بہتر رہے گا۔ آپ ہی بتا دیجیے۔" وہ پریشانی میں کانپ اٹھی تھی۔ "واپس آجاؤں یا ان ہی گلیوں کی دھول بن جاؤں۔"

"تم اپنے حالات سے بخوبی واقف ہو۔ میں کسی راستے کا تعین نہیں کر سکتا۔" لہجے کی رکھائی سے وہ اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے سوچنے لگی کہ کیا شوہر اتنی تیزی سے بے لحاظ اور بے مروت ہو سکتا ہے۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا اور پھر آصف جیسا مرد لگتا ہے ثمینہ نے کچھ لگائی بجھائی سے کام لیا ہے۔ وہ

میری لگژری لائف سے جیلس تو پہلے دن سے ہی تھی۔"

"کیا سوچ رہی ہو؟" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"آپ اتنی جلدی بدل جائیں گے۔ کاش میں پہلے جان پاتی۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"میں رتی بھر نہیں بدلا میری جان۔ مجھے ثمینہ سسٹر نے تمہارے والدین کے بارے میں بتایا ہے۔ اسے سن کر بہت افسوس ہو رہا ہے۔ میں تو نہیں جانتا تھا یہ سب کچھ۔" وہ تلملا کر بولا۔ "میں نے آپ کو تفصیلاً سب کچھ بتایا تھا۔ آپ نے ترس کھا کر مجھ سے شادی کی تھی نا۔ یہی بات ہے میں ہی نا سمجھ تھی۔ اب آپ آسانی سے حاصل کر کے خود غرض اور بے وفا کا لقب دے کر مجھ سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔" وہ تڑپ کر بولی۔

"میں ان کی بہتر لائف کے بارے میں ہر وقت سوچتی رہی ہوں۔ منصوبے بناتی رہی۔ مگر آپ سے شیئر کرنے کی جرات نہ کر سکی۔ آپ اس معاشرے کو تو جانتے ہیں۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان کی مجبوریوں اور مشکلات کو نظر انداز کر کے میں اپنی زندگی میں مگن اور خوش ہوں۔ کاش میرے دل میں چبھے ہوئے کانٹے کو کبھی محسوس ہی کیا ہوتا تو آج اتنی سننے کو نہ ملتیں۔ میں نے آپ کے رزق کی حفاظت کی۔ آپ کی عزت کا پاس رکھا۔ پھر گلہ کیوں؟"

"تم نے مجھ سے غیریت کیوں برتی؟" وہ سنجیدہ تھا۔

"غیریت نہیں آصف، میری غیرت آڑے آتی رہی۔" وہ نظریں جھکائے ہوئے تھی۔

"صدیقہ مجھے اس حقیقت کا اندازہ تو ہو ہی گیا ہے کہ جو بیٹی اپنے والدین کو دھوکہ دے سکتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کی وفادار کیسے ہو سکتی ہے۔" وہ تلخی سے بولا۔

"یا میرے اللہ! جس کے لیے اپنی دنیا تنگ کر لی۔ وہ بار بار جتا رہا ہے۔" وہ تڑپ کر بولی۔

"میری دنیا کہاں سے وسیع ہے۔" وہ برجستہ بولا۔

"تو یہ سوچ پہلے آنی چاہیے تھی۔ میں نے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"میں جان گیا ہوں۔ وہ سب فراڈ تھا۔ تم نے مجھ سے پیار نہیں کیا صدیقہ۔ تمہیں محض اپنا اسٹیٹس بدلنے کی چاہ تھی۔ اک ڈاکٹر کی بیوی بن کر بنگلے گاڑی کا لالچ تھا۔ میں یہ سن کر دہل گیا ہوں۔ زمین میرے پاؤں کے نیچے سے سرک گئی ہے۔ مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔" وہ دکھ میں بول رہا تھا۔

"ثمینہ سراسر غلط کہہ رہی ہے آصف۔ میرے پیار پر بھروسا کیجیے۔" وہ تڑپنے لگی تھی۔

"ہاں ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں آپ، جنہوں نے اپنا پیٹ کاٹ کر دنیا کی شدبد سکھائی۔ میں نے انہیں چھوڑ کر اسے اپنایا جس نے میرے لیے کچھ نہ کیا۔ بلکہ مجھے اپنی ہی نظروں میں ذلیل و رسوا کر دیا۔ نہ دین کی رہی، نہ دنیا کی۔ آپ کے اس ظلم کو پیار سمجھ کر آپ کی ہو گئی؟" وہ رو رہی تھی۔

"مرد بہت جذباتی واقع ہوا ہے صدیقہ۔ تم اپنے ارادوں میں مستحکم رہتیں۔ میرے اس ظلم پر تم نے سر تسلیم خم کیوں کر لیا؟ مجھے اس گناہ کبیرہ کا مرتکب کیوں ہونے دیا۔" وہ افسردگی سے بولا۔

"مجھے اس غلطی پر معاف کر دیجیے۔" وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "میں جان گئی ہوں کہ آپ مجھے چھوڑ کر جانے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ میں بھی آپ کے ساتھ ہی جاؤں گی۔ میں ہر حال میں آپ کے والدین کے ساتھ رہنے کو تیار ہوں۔ ان کی خدمت گزاری اور فرماں برداری ہی میری بخشش کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اپنے والدین تو میری شکل بھی دیکھنے کے روادار نہیں ہوں گے۔ آپ کی باتیں درست ہیں۔ مگر میں آپ کے حق میں بری ہرگز نہیں۔"

"میرے والدین۔۔۔" وہ طنزیہ ہنستے ہوئے توقف کے بعد بولا۔ "ایسی لڑکی کو کیسے سینے سے لگائیں گے، جس کے سینے میں دل نہیں دھڑکتا، بلکہ فقط بے حس گوشت کا لوتھڑا۔"

"میرے خدا میں یہ کیا سن رہی ہوں۔ آصف کیا میری خوشیوں کی مدت چند مہینے ہی تھی۔ کاش میں

پہلے جان پائی کہ مرد کی وفا اور پیار پر یقین رکھنے والی عورت پرلے درجے کی حماقت کا ثبوت ہی کروائی جاتی ہے۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی۔ کاش بیتا ہوا وقت واپس آجائے اور میں آپ کی میٹھی باتوں کا جواب نفی میں دے کر آپ سے اتنی دور چلی جاؤں' جہاں تک آپ کی رسائی ناممکن ہو۔" وہ بھی قدرے زور سے بولی۔

"مجھے جواب دیجیے اس سوال کا کہ میری غربت اور کمزوری کو دیکھ کر آپ نے مجھے سبز باغ کیوں دکھائے تھے؟ مجھے اپنانے کا ڈھونگ رچانے والا باوفا کیسے ہوسکتا ہے۔ بتائیے کہ دغاباز کون ہے میں کہ آپ بیچ منجدھار میں چھوڑ کر بھاگنے لگے ہیں بہانہ بنا کر۔ مجھے گناہ گار اور قصوروار ٹھہرا کر' جبکہ اس ضمن میں پہل آپ نے کی تھی۔ میں نے بار بار سوچنے کا کہا' میں جانتی ہوں کہ آپ کی دولت کی چندھیا دینے والی روشنی اور پیسوں کی جھنکار نے میری سماعت اور بینائی کو مفلوج کردیا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں کل آپ کو چھوڑ کر کسی اور کی تجوری پر قابض ہوجاؤں گی۔ سب مجھے چھوڑنے کے بہانے ہیں۔"

"اب اس کا سدباب کرلو۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

"مثلاً" کیسے تفصیل بتائیے۔ میں نادان اور احمق لڑکی ذو معنی باتوں کو کیا جانوں؟" وہ رکھائی سے بولی۔

"میں 'کالا' تمہارے قابل نہ تھا۔ آئی ایم ایکسٹریملی سوری جناب۔" وہ غصے سے بولا۔

"کمینہ آپ کو اس نام سے پکارا کرتی تھی آصف۔ اس نے یہ الزام مجھ پر تھوپ دیا۔" وہ رونے لگی۔

"میں تمہاری کسی بات پر یقین نہیں کروں گا۔ کیونکہ تم ایک خود غرض لڑکی ہو۔ کل کسی اور طرف چل پڑوگی۔" وہ زچ ہو کر بولا۔

"ان تمام خدشات کا وقت بیت چکا ہے آصف۔ میں نے اپنی تمام زندگی آپ کے نام لکھ دی ہے۔ یہی میرا قصور ہے۔ جس کی سزا مجھے دے ڈالیے۔" وہ نرمی سے بولی مگر وہ خاموش ہی رہا۔

"مگر یہ یاد رکھیے گا کہ میرے گناہ کی سزا میں انصاف ضرور کیجیے گا۔ میرے قصور سے بڑھ کر سزا تجویز کی تو آپ کی پکڑ دونوں جہانوں میں عبرت ناک ہوگی۔ کیونکہ انصاف کرنے والا ہمیں دیکھ رہا ہے۔" وہ بے بسی سے بولی اور وہ اسے نظر انداز کرتا باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

"یا میرے اللہ۔ یہ محل نما گھر یہ وسیع و عریض لان اور آگے پیچھے بھاگتے دوڑتے ملازمین جنہوں نے مجھے خود اعتمادی اور تفاخر کا درس دیا۔ سب ہی فریب دے گئے۔ کاٹ کھانے کو دوڑنے لگے ہیں۔ میری مجروح انا اور خودداری چیخ چیخ کر مجھ سے سکون و اطمینان کی بھیک مانگ رہی ہے۔ اس کرب نے مجھے آدھ موا کردیا ہے۔ کاش میں مرجاؤں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کوئی ہے پرسان حال۔ کوئی ہے میرا ہم راز۔" سوچتے ہوئے اس نے کروٹ بدلی۔ نیند کوسوں دور تھی۔ آصف نے گھر میں جو آگ لگا دی تھی۔ وہ اس کی حدت و تپش سے محفوظ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا اور وہ اس کی لگائی ہوئی آگ میں بھسم ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ آہستہ سے اٹھی اور باہر برآمدے میں آکر جھولے پر بیٹھ گئی اور دھیرے دھیرے وہ جھولے پر بے سدھ ہوتی چلی گئی۔

رات کے پچھلے پہر آصف نے اس کی غیر موجودگی کو محسوس کیا تو اس نے ٹیبل لیمپ آن کرکے وال کلاک کی جانب نیم وا آنکھوں سے دیکھا اور غیر ارادی طور پر ہی کمرے سے باہر نکل کر اسے پکارا۔ جواب نہ ملنے پر وہ گھر کا کونا کھونا چھانتے ہوئے باہر نکل آیا۔ برآمدے میں اسے جھولے پر سوتا دیکھ کر اچنبھے میں اسے جھنجھوڑنے لگا۔ وہ تیزی سے ہڑبڑا کر آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی۔ چند لمحوں میں درد نے پورے وجود میں انگڑائی لی اور وہ آصف کے سینے سے لگ کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ وہ اسے سہارا دے کر کمرے میں لے آیا۔ اسے بیڈ پر لٹا کر اس کے قریب بیٹھ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ صدیقہ کے وجود میں

سکون و طمانیت کی لہر دوڑ گئی۔
"آئی ایم سوری صدیقہ۔" لہجے میں ندامت تھی۔
وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
"آئی لو یو صدیقہ اس کا تو تمہیں یقین ہے نا۔" وہ اس کی سرخ آنکھوں میں جھانک کر بولا۔
"جی۔" اس نے معصومیت سے اثبات میں سر ہلایا۔ "دراصل صدیقہ اس وجود میں ایک ضمیر نام کا چھوٹا سا حصہ بھی بسیرا کرتا ہے۔ وقتاً فوقتاً اپنے ہونے کا احساس ضرور دلاتا ہے۔ آج کل میں اسی سچویشن سے گزر رہا ہوں۔" وہ افسوس سے بولا "غور غیرت و مردانگی کو ٹھیس پہنچے تو مر جانے کو دل چاہتا ہے۔"
"آپ سو جائیے۔ میری وجہ سے آپ کی نیند خراب ہو گئی۔ ویری سوری۔" اس نے رکھائی سے کہا۔ وہ اس کے پہلو میں لیٹ گیا۔ وہ بہت کچھ سوچ رہا تھا۔

✲ ✲ ✲
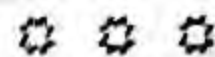
وہ ہاسپٹل چلا گیا اور صدیقہ بولائی بولائی گھر کے کبھی ایک کونے میں تو کبھی دوسرے کمرے میں پھرتی رہی۔ دل کا چین و سکون غارت ہو چکا تھا۔ اسے یہ گھر پرایا سا لگ کر اسے بے کل کر رہا تھا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اس کی بادشاہت کا سورج ڈھلنے والا ہے اور وہ بے دست و پا اس بھری دنیا میں تجارت کی تاریکیوں میں بھٹکتی ہوئی دوسروں کے لیے اک عبرت ناک داستان بن جائے گی۔ وہ سر تا پا لرز گئی اور لاؤنج کے صوفے پر ڈھے گئی۔
"بیگم صاحبہ! طبیعت ناساز ہے تو صاحب کو فون کر کے بتاؤں۔ اگر آپ کی طرف سے اجازت ہو۔" خانساماں نے ہمدردی سے کہا۔ تو وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔
"میں ٹھیک ہوں۔ تم میری فکر نہ کرو۔" وہ ذرا نرمی سے بولی۔ "کہنا تو نہیں چاہیے مگر آپ سے مجھے بہت انسیت ہو گئی ہے۔

بیگم صاحبہ! غیروں سے رشتہ جوڑنا سراسر بے وقوفی ہے جی۔ تنہائی قبر کے دہانے تک پہنچا کر بھی کہیں چھوڑتی۔ دیکھیں نا' آپ کے قریب کوئی بہن ہے' نہ بھائی۔ نہ ہی ماں' باپ اور عزیز' رشتہ دار' ایسے ہی وقت وہ سہارا بن کر دلاسے دیتے ہیں۔ ہمت بڑھاتے ہیں اور زندگی گزارنے کے گر سکھاتے ہیں۔ آپ کسی بہن بھائی کو اپنے پاس بلالیں۔ دل بہل جائے گا۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔
وہ سوچنے لگی۔
"سچ ہی تو کہتا ہے چاچا۔ زندگی اپنوں کے بغیر مجبوری بن جاتی ہے اور ناقابل برداشت بوجھ بن کر ہر پل اپنے دکھوں اور محرومیوں کا احساس دلاتی ہے۔ یہ اس کا تجربہ بول رہا ہے۔ میری کم عمری کا یہ فیصلہ مجھے سراسر رسوائی اور پشیمانی کی جانب دھکیلنے جا رہا ہے۔ آج اسے بھی میری کم عقلی کا اندازہ ہو گیا ہے۔ آصف اک پڑھا لکھا دولت مند خاندان کا پروردہ میری عزت کا پاس کب تک رکھ سکتا ہے۔ میں نے جو بیج بویا ہے۔ فصل اسی بیج سے پروان چڑھی ہوئی کاٹوں گی۔
"بیگم صاحبہ! میرے ہوتے ہوئے کسی پریشانی یا فکر کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کے گاؤں جاؤں گا۔ معاملہ سلجھانے کی کوشش کروں گا۔" اس نے تسلی دی۔
"تو مطلب یہ کہ اس نے ہماری تمام گفتگو سن لی ہے۔" اس نے افسردگی سے سوچا۔
"آپ اتنی فکر مند کیوں ہوتی ہیں؟ اللہ تعالیٰ بہت بڑا رحیم و کریم ہے۔ خطائیں بھی وہی معاف کرتا ہے۔ توبہ کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کا ساتھ بھی وہی دیتا ہے۔" وہ عقیدت بھرے لہجے میں بولا۔
"میرے لیے دعا کیجیے گا چاچا۔" وہ دودھ کا گلاس پکڑتے ہوئے بولی اور چاچا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

✲ ✲ ✲

"آج ثمینہ کا فون آیا تھا۔ اس نے ایک بری خبر دی ہے۔" آصف نے کہا تو صدیقہ سر تا پا لرز گئی۔

"تمہاری ماں تمہیں یاد کرتے کرتے اس دارفانی سے چل بسی۔" وہ دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" وہ تڑپ اٹھی۔

"ہائے ماں چلی گئی۔ آصف مجھ سے خفا ہی چلی گئی۔" وہ چیخ اٹھی۔ آنسو رکے ہوئے تھے۔ چہرہ فق تھا اور پشیمانی انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

"حدیقہ! میں نہیں چاہتا کہ کل میری ماں بھی مجھ سے ناراضی کی حالت میں سدھار جائے۔ میں خود کو معاف نہیں کروں گا۔ میں ان کے پاس جانا چاہتا ہوں۔" وہ تڑپ کر بولا۔

"انہیں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ ہوسکتا ہے مجھے گالی گلوچ اور بددعائیں دے کر نارمل بھی ہوجائیں والدین ہیں' بچوں سے کتنے دن ناراض رہ سکتے ہیں۔ میں تمہیں یہی تو سمجھانا چاہ رہا تھا کہ گاؤں جاکر انہیں منالو۔ مگر تم نے میری ایک نہ سنی۔ اپنے ہی ڈر اور خوف کے جال میں پھنسی رہیں۔" وہ رنجیدہ ہوگیا تھا۔

"اب بھی دیر نہیں ہوئی چلی جاؤ۔ ماں کا منہ دیکھ لو اور باپ سے معافی مانگ لو۔"

"اب جانے کا کیا فائدہ؟ آصف! ماں جس سے مجھے درگزر کی امید تھی وہ ہی چلی گئی۔ اب مجھے وہاں کوئی تحفظ نہیں دے سکتا۔" وہ رو پڑی۔

"سوچ لو۔ میں نے تو اپنی کل کی سیٹ بک کرالی ہے۔ بہتر تھا کہ تم بھی چلی جاتیں۔ شاید تمہارا ضمیر مطمئن ہوجاتا۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"آپ کل چلے جائیں گے۔ مجھے اس رنج والم میں تنہا چھوڑ کر۔" وہ حیرت سے بولی۔

"میرے ضمیر کے اطمینان کے لیے جانا بہت ضروری ہوگیا ہے۔ دعا کرو والدین آنے کی اجازت دے دیں۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"یعنی اگر اجازت نہ ملی تو آپ واپس نہیں آئیں گے۔" وہ ایک دم سے دہل گئی۔

"ہاں۔ انہیں روتا بلکتا چھوڑ کر کیسے آسکتا ہوں۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

"ان کی آہیں مجھے برباد کردیں گی۔ میں اپنی زندگی کا ہر لمحہ ان کے قدموں میں گزارنا چاہوں گا۔"

"آپ مجھے تنہا کس کے سہارے چھوڑ کر جارہے ہیں۔ یہ تمام باتیں سوچنے کا وقت گزر گیا ہے۔ آپ نے مجھ سے جو وعدے کیے تھے۔ وہ بھول گئے۔ میں بھلا اکیلی کیسے رہ سکتی ہوں۔" وہ تڑپ اٹھی۔

"اس لیے تو کہتا ہوں۔ اپنوں میں چلی جاؤ۔ اگر میں واپس آگیا تو تمہیں بلالوں گا۔ نہ آیا تو طلاق بھیج دوں گا۔ شادی کرلینا' میرے انتظار میں اپنی جوانی ضائع نہ کرنا۔" وہ نارمل ہی بول رہا تھا۔

"نہیں آصف! میں اپنے گھر سے ہرگز نہیں جاؤں گی۔ یہاں اکیلے رہ کر زندگی گزارنا زیادہ بہتر ہے۔ وہاں کی ذلالت سے۔ ان کا سامنا کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔" وہ روئے جارہی تھی۔

"جیسی تمہاری مرضی ہے کرو۔ یہ گھر تو کرائے پر ہے۔ اگر میں بروقت نہ پہنچ سکا تو یہ گھر ہر صورت چھوڑنا پڑے گا۔ اور پھر اتنے بڑے شہر میں تمہارا تنہا رہنا مناسب بھی تو نہیں۔ لاہور کے چپے چپے سے تم واقف ہو۔ وہاں چلے جانا بہتر ہے۔ تم بہت ضدی عورت ہو۔ اور بے وقوف بھی۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔" وہ غصے میں بولا۔

"میں آپ کے بغیر مرجاؤں گی۔ مجھے ساتھ لے جایئے۔ میں بہت اکیلی ہوں یہاں۔ آپ کے بغیر میرا کوئی نہیں آصف۔"

وہ تڑپ کر بولی۔ "میرا دل گواہی دے رہا ہے آپ واپس نہیں آئیں گے۔"

"پگلی! میں بھی تو تمہارے بغیر خوش نہیں رہ سکتا۔ اگر مجبوری آڑے آگئی تو کچھ نہیں کرسکوں گا۔ میرے بوڑھے والدین میرے لیے بہت پریشان رہنے لگے ہیں۔ میں ان کا انجام تمہارے والدین جیسا نہیں چاہتا۔ انہوں نے مجھے اس دن کے لیے پیدا نہیں کیا تھا۔ کہ انہیں بے سہارا کردوں۔ تم اپنا دل بڑا کرو۔ مضبوط ہوجاؤ۔ بالکل اسی طرح جیسے والدین کو چھوڑتے ہوئے تم نے خود کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنالیا

تھا۔"

وہ پھر طنز کر کے اسے تڑپا گیا تھا۔

آصف آپ کو کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔ اوپر والا میری نیت سے بخوبی واقف ہے۔ میں والدین اور بہن بھائیوں کے لیے کیا کچھ سوچتی رہی۔ آپ تو یقین نہیں کریں گے۔ کیونکہ مسز ثمینہ نے جو عینک آپ کو پہنا دی ہے۔ وہ اترنی مشکل ہے۔ لیکن میری ایک بات یاد رکھیے گا۔ جسے آپ بے وفا کہہ رہے ہیں۔ ایک دن اس کی وفا آپ کو میرے قریب لے آئے گی۔ اگر آپ نہیں آسکتے تو طلاق کی تکلیف مت کیجیے گا۔ مجھے آپ کے نام پر بیٹھنے میں فخر ہوگا۔ اور مرتے دم تک اس نام کی عزت و شان کی نگہداشت کرنا میرا فرض ہوگا۔"

"میں ہر صورت کل روانہ ہو جاؤں گا۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "تم دو دن میں ہی سنبھل جاؤ گی۔ میں تمہیں بہت اچھی طرح جاننے کے بعد گارنٹی سے کہہ رہا ہوں۔ مجھے بھول کر نئی راہ کا چناؤ تمہارے لیے ہرگز مشکل نہیں۔ تم بہت مضبوط سخت دل کی لڑکی ہو۔ اس لیے تمہاری طرف سے میں بے فکر ہوں۔" وہ طنز سے بول رہا تھا۔

"میں جانتی ہوں کہ آپ سچائی پر ہیں آصف۔ اور والدین کو دغا دینے کا جو قدم میں نے اٹھایا تھا۔ اس کی سزا دینے میں آپ کا انصاف بے مثال ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ بھی انصاف کا سلوک روا رکھے۔ اور جس سے آپ محبت کریں وہ آپ کے سائے سے بھی دور بھاگے۔ شاید پھر میری یاد آجائے۔ میری بے گناہی کا احساس ہو جائے۔" وہ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

وہ خاموش اور بے پروا بیٹھا رہا تھا۔ چاچا نے تمام باتیں سماعتوں میں ڈالیں اور وہاں سے آنسو صاف کرتا ہوا اٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

"پھر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" وہ کپڑے اٹیچی میں رکھتے ہوئے بولا۔ وہ اس کے کپڑے ہینگر سے اتارتے ہوئے دکھی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"جیسے آپ کا فیصلہ اٹل اور مستحکم ہے۔ اسی طرح میرا بھی۔ ہمارے بیچ چلنے والے تمام ایشو کسی اہمیت کے حامل نہ تھے۔ لیکن آپ انہیں کوہ ہمالیہ کی طرح بلند و وسیع بنا کر مجھ سے جان چھڑانا چاہ رہے ہیں۔ میں بے وقوف نہیں ہوں۔

اور نہ ہی اپنی بدقسمتی کا رونا ہے۔ مگر یاد رکھیے گا کہ آپ جس عمل کو کار ثواب سمجھ رہے ہیں۔ اس کی بنیاد میری دبی ہوئی آہوں اور گھٹی ہوئی سسکیوں پر رکھ کر آپ کو کبھی سکون اور ذہنی اطمینان نصیب نہیں ہوگا۔ مجھ سے آپ پر بھروسا کرنے سے جو غلطی سرزد ہوئی ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی سزا بہت جلد سنا دی۔ محفوظ آپ بھی نہیں رہیں گے۔ وقت آپ کے ساتھ بھی ایسا ہی انصاف کرے گا۔ جیسا آپ نے مجھ سے کیا ہے۔"

"بددعائیں نہ دو۔ بندہ خاکی تم سے کبھی بھی بے انصافی نہیں کرے گا۔ آخر کو تم میرا پیار ہو۔ میری بیوی ہو۔ ہو سکتا ہے واپس آبھی جاؤں اگر ایک مہینے میں نہ پہنچ سکا تو پھر بھی انفارم کر دوں گا۔" اس کے چہرے پر ڈھٹائی اور بے لحاظی تھی۔ جبکہ صدیقہ کا چہرہ مظلومیت کی داستان بن چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

باہر شام کے دھندلکے رات کی تاریکی میں ڈوبتے جا رہے تھے۔ چوکیدار نے پورچ اور گیٹ کی لائٹس آن کر دی تھیں۔ مگر گھر تاریکی میں گھرا ہوا تھا۔ اس کے کمرے کی لائٹ میں آصف اپنی پیکنگ مکمل کر کے باتھ روم جا چکا تھا۔ صدیقہ ——— اپنی تقدیر کو کوستی گھر کے کسی کونے میں دہائی دے رہی تھی۔

تیار ہو کر آصف نے صدیقہ کو آواز دی۔ مگر جواب نہ پا کر چاچا کو بلایا اور اس کے ہاتھ میں چیک دے کر لاپروائی سے کہنے لگا۔

"مہینے کے آخر میں تمام بلز اور اس گھر کا کرایہ ادا

کردینا۔ اور اپنی نوکری آج سے ہی ڈھونڈنی شروع کردو۔ صدیقہ میرے آنے تک اپنے والدین کے پاس رہے گی۔ بھلا اتنے بڑے گھر میں وہ تن تنہا کیسے رہ سکتی ہیں۔" سامان گاڑی میں رکھ دو بعد میں ڈرائیور گاڑی شوروم پہنچاوے گا۔ سامان گاڑی میں رکھو۔ مجھے دیر ہورہی ہے۔ اور اپنی بیگم صاحبہ کو بتانا کہ میں جلد ہی آنے کی کوشش کروں گا۔ اور سیدھا اس کے گاؤں ہی پہنچ جاؤں گا۔ نجانے اس وقت کہاں چلی گئی ہے۔ کہیں فلائٹ ہی نہ نکل جائے۔" وہ گھڑی کی طرف دیکھ کر بولا۔

صدیقہ کے کانوں کو اس کی آواز کس قدر اذیت دے رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ آصف کی میٹھی زبان ہے جو خنجر کا کام کررہی تھی۔ "وہ مجھے قصوروار ٹھہرائے بغیر بھی روپوش ہو سکتا تھا۔ اس نے ایسا کیوں نہیں کیا۔" وہ سوچے جارہی تھی۔ "اس کی نیت میں فتور تھا۔ جو آج تک مجھے اپنے گھر کا ایڈریس اور اپنے کسی رشتے دار کا نمبر تک دیا۔ اف کتنا بڑا دھوکے باز نکلا۔"

دو ہفتوں میں ہی "آنا" فانا" اس کی کایا ہی پلٹ گئی تھی وہ آکاش کی رفعتوں سے دھرتی کی پستیوں اور گہری کھائیوں میں منہ کے بل گر گئی تھی۔ اس ثمینہ کا جو بھی رول تھا۔ آصف ہی کانوں کا کچا اور فیصلے میں جلد باز نکلا تھا۔ اس نے صدیقہ کو بے وقوف بنانے کے بعد چھوڑنے کا فیصلہ تو کرلیا تھا مگر اتنی جلدی وہ انجام تک پہنچ گیا وہ خود بھی حیران تھا۔

☼ ☼ ☼

"بیگم صاحبہ! کچھ تو کھالیں۔ صاحب کے جانے کا کب تک سوگ منائیں گی۔" اس نے لاؤنج میں صوفے پر آنکھیں بند کیے صدیقہ کو دکھ سے دیکھ کر سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ اضطراری کیفیت میں لیٹی رہی۔

"بیگم صاحبہ یوں سوگوار رہنے اور آہ و بکا کرنے کا کیا فائدہ۔ آپ یہ مت بھولیں کہ آپ نے اکیلے ہی حالات سے مقابلہ کرنا ہے۔ کوئی اپنا ہمدردی کرنے آئے گا نہ دلاسا دینے پہنچے گا۔ آپ نے ڈاکٹر صاحب کو اپنے پاؤں پر کھڑا رہ کر دکھانا ہے۔" وہ بے اختیاری میں کہہ گیا۔ صدیقہ نے اس کی طرف آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ سر جھکائے "احتراما" کھڑا تھا۔

وہ اس کے سامنے سر جھکائے مودبانہ انداز میں کھڑا تھا۔ صدیقہ کی نظروں کا مطلب سمجھ کر آہستگی سے بولا۔ "بیگم صاحبہ آپ میری بیٹی کے برابر ہیں۔ ایک باپ اپنی بیٹی پر ہونے والی زیادتی کو کیسے برداشت کرسکتا ہے۔ مجھے غلط نہیں سمجھیے گا۔ سوری۔"

"سوری کی کوئی بات نہیں چاچا۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ "آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ آپ کا عمر بھر کا تجربہ ہے۔ مشاہدات ہیں آپ مجھے بہتر مشورہ ہی دیں گے۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"آپ کو ایک بار گاؤں جانا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو قدم قدم پر پچھتاووں کا سامنا کرنے پڑے۔ کہ اپنوں سے مل لیا ہوتا۔ تو بہتر ہوتا۔" وہ پرے ہٹ کر قالین پر بیٹھ گیا۔

"چاچا میں ملک خاندان کی بیٹی ہوں۔ وہ میری جدائی میں مرتے مرجائیں گے مگر مجھے معاف نہیں کریں گے۔ مجھ سے انجانے اور نا سمجھی میں بہت بڑی زیادتی ہوئی ہے۔

اگر آج ماں زندہ ہوتی تو میرے لیے ڈھال بن جاتی۔ چاہے اسے اس کی قیمت ہی ادا کیوں نہ کرنی پڑتی۔ اب میں بہت لیٹ ہوگئی ہوں۔ سوچتی ہی رہ گئی کہ انہیں وہاں کے عذاب سے ایک دن نکال کر لے آؤں گی۔ مگر وہ خواب ہی ادھورا رہ گیا۔"

"یہ گھر تو ہمیں لامحالہ چھوڑنا ہی ہے۔ میں آپ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ میرے غریب خانہ کو عزت بخش دیں۔ اوکھے سوکھے دو چار دن کی تکلیف سہنی پڑے گی۔ میں خود ملک صاحب سے مل کر بات کرتا ہوں۔ آپ کی معصومیت میں کی گئی غلطی کو وہ ضرور معاف کردیں گے۔ آپ کو ان کے حوالے کرکے شہر میں ہی نوکری ڈھونڈ لوں گا مگر پہلے آپ کو

ٹھکانے پر پہنچادوں بعد میں میرا کام ہوتا رہے گا۔ بیگم صاحب یہ دنیا بڑی ظالم ہے۔ میں آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ ڈاکٹر صاحب نے پھینک دیا تو کیا باپ تو چشم پوشی نہیں کر سکتا۔" وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔
"مگر انہوں نے مجھے ٹھکرادیا تو۔" وہ خوف زدہ ہو کر لرزا ٹھی۔
"تو دنیا بہت وسیع ہے بیگم صاحب۔ آپ پڑھی لکھی ہیں۔ جاب کی کوشش کریں۔ تب تک کے لیے میرا غریب خانہ حاضر ہے۔ میں جانتا ہوں انسان سہل پسندی کی طرف بہت جلد مائل ہوجاتا ہے۔ آپ کو ایسی شاہانہ زندگی گزارنے کے بعد کافی مشکلات کا سامنا کرنے پڑے گا۔ آپ ایک بات یاد رکھیں۔ آپ کو گری ہوئی بے بس اور مجبور عورتوں کو اٹھا کر سینے سے لگانے کے قابل بننا ہوگا اور اپنے اس تلخ تجربے سے جو آپ نے سبق سیکھا ہے۔ اسے ہر معصوم کے گوش گزار نا ہوگا۔"
"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں چاچا! یہ ایسا دکھ ہے کہ زندگی کی ہر مشکل اور آزمائش آسان لگنے لگی ہے۔ میں جھونپڑی میں زندگی گزار سکتی ہوں۔
———— بشرطیکہ فریب اور جھوٹ کی ہلکی سی رمق کا گزر میری زندگی میں نہ ہو۔ جہاں صرف سچائی ہو اور عزت نفس کو کوئی بھی مجروح کرنے والا نہ ہو۔ مجھے نفرت ہوگئی ہے ایسی دولت سے۔ جس کے سامنے میں خاک کے ذرے سے بھی کمتر ہوگئی۔" وہ پچھتاووں میں گھری گومگو کی کیفیت میں بولے جارہی تھی۔

☼ ☼ ☼

آصف راستے بھر اضطرابی کیفیت سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا رہا۔ خود کو کبھی میگزین کی ورق گردانی کرنے، کبھی سامنے لگے ٹی وی پر ہندی موی دیکھنے کی طرف مائل کرنے میں کوشاں تھا۔ مگر لمحہ بہ لمحہ اعصابی تناؤ بڑھتا جارہا تھا۔ اس سے جو زیادتی صدیقہ پر ہوئی تھی ———— اس ری ایکشن کا اندازہ نہ تھا۔ آصف نے جلد یا بدیر اس سے کنارہ کشی تو کرنا ہی تھی۔ مگر سب اتنی جلدی اور آسانی سے ہوجائے گا۔ اس نے سوچا ہی نہ تھا۔ ثمینہ کی باتیں تو اک بہانہ تھا۔

صدیقہ کی بچے کی ڈیمانڈ سے وہ دل ہی دل میں تلملا جاتا۔ گھر سے بھاگی ہوئی بیوی کے بطن سے وہ اپنی نسل کا سوچ کر دہل جاتا تھا۔ کیونکہ یہ اس کی پلاننگ میں نہیں تھا۔ حالانکہ وہ ماڈرن دور کا جیتا جاگتا نمائندہ بھی تھا اور کئی سال لندن میں گزر جانے کی وجہ سے خود مختاری اور آزادی کو بہت فوقیت بھی دیتا تھا۔ عشق کا ڈھونگ رچانا انجوائے کرنا اور چھوڑ دینا اس کے لیے بہت معمولی بات تھی۔ لیکن افزائش نسل کے تمام اصولوں پر پابند رہنا اس کی تربیت کا حصہ تھا۔
جلد بازی اس کی فطرت کا حصہ تھی۔ طبعاً جذباتی اور لاابالی تھا۔ پل میں تولہ اور ماشہ ہوجانا اس کے لیے اک عام سی بات تھی۔
وہ راستے بھر مضطرب رہا اور سوچتا رہا کہ کہیں پہلے فیصلے کی طرح اب بھی فیصلہ جلد بازی میں تو نہیں کرگیا۔ لیکن والدین کے پیار کے سامنے ہر زیادتی جائز تھی۔

صدیقہ کی قربت کے فسوں سے نکلنا بھی اک فطری امر تھا۔ والدین سے ملنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کاٹ کھانے والی تنہائی کا احساس رگوں میں سرائیت کرگیا تھا۔ صدیقہ کی زندگی کو دکھوں کا آماجگاہ بنانے کا کرب اور ندامت سر چڑھ کر بولنے لگی تھی۔ مگر خود کو یہ کہہ کر تسلی دے دیتا کہ میرا فیصلہ درست ہے۔ ایسی لڑکیوں کے ساتھ عشق تو لڑایا جاسکتا ہے۔ ان سے نسل چلانا سراسر نادانی ہے۔ ان کے ساتھ چند راتوں کا ساتھ تو درست ہے عمر بتانے کا تصور بھی حماقت ہے۔ مگر کب تک ضمیر کی لعنت ملامت اور چیخ و پکار کو دبائے رکھتا۔ جنے بولنے والا آصف چند دنوں میں ہی ڈپریشن میں چلا گیا۔ والدین کے ان گنت سوالات کے باوجود وہ منہ سے ایک لفظ نہ بول سکا کہ اس کے دل میں جو کانٹا چبھ گیا ہے وہ اس

کے وجود سے خون کے آخری قطرے کو بھی نکال سکتا ہے۔ مگر خاموش تھا۔ کچھ بھی بتانا نہیں چاہتا تھا۔

☆ ☆ ☆

صدیقہ نے اپنا سامان پیک کیا۔ کپڑے، جوتے، پرس اور جیولری کے علاوہ اس بنگلے کی کسی اشیا پر اس کا حق نہ تھا۔ پھر بھی وہ پرملال اور الوداعی نظروں سے ایک ایک چیز کا جائزہ لے کر آصف کے ساتھ گزرا ہوا حسین وقت یاد کرنے لگی۔ اب آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی رک گئی تھی۔ اب طبیعت میں سکوت تھا۔ اگلے سفر کا خوف تھا۔ ٹیکسی باہر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ چاچا سامان ٹیکسی میں رکھ چکا تھا۔ اس کا انتظار کرنے کے بعد وہ اندر آیا۔ صدیقہ کو اپنے بیڈ پر ہارے ہوئے جواری کی طرح پشیمان و حسرت زدہ دیکھ کر بے اختیار ہو کر بولا۔

"بیگم صاحبہ ایسے تو زندگی گزرنے سے رہی۔ ہمت اور حوصلے سے کام لیں۔"

"چاچا تم تو جانتے ہو نیا اور تازہ زخم کتنا درد دیتا ہے۔ وقت کے ساتھ گھاؤ بھرتا جائے گا۔ طبیعت سنبھلتی جائے گی۔" وہ اپنا پرس اٹھا کر بولی۔

"کبھی آصف سے بچھڑے وہ ہفتے ہی تو ہوئے ہیں۔ چاچا انہیں تو مجھ سے والہانہ محبت تھی۔ یہ سب کیوں اور کیسے ہو گیا۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس کھری اور سچی محبت کا انجام اتنا عبرت ناک ہوگا۔ جس کی خاطر سب رشتوں کو چھوڑ دیا۔ اس کی خوشی کی خاطر اس کے گھر کی باندی بن کر رہ گئی۔ وہی روٹھ کر چلا گیا۔ اس بات پر جو میرے لیے قربانی تھی 'ایثار تھا' اس نے میری قدر کرنے کی بجائے مجھے کن کن خطابات سے نوازا۔ چاچا کیا محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ وقت کے تقاضوں میں مقید حالات و واقعات کی غلام۔" وہ آنسو صاف کرنے لگی۔

"بیگم صاحبہ یہ تقدیر کے فیصلے ہیں۔ آپ کو دوش دینا تو ایمان کی کمزوری ہے۔ آصف صاحب کو آپ سے کبھی پیار تھا ہی نہیں۔ آپ جب تک اس حقیقت کو تسلیم نہیں کریں گی۔ آپ کی زندگی کا سفر مشکل سے مشکل تر ہوتا جائے گا۔" وہ اپنائیت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا اور وہ اپنا پرس اٹھا کر گھر کو الوداعی نظروں سے دیکھتی ہوئی چاچا کے پیچھے باہر نکل گئی۔

جہاز میں بیٹھتے ہی وہ ماضی کے ان لمحوں میں کھو گئی۔ جب وہ آصف کے ساتھ کھلکھلاتی ہوئی کراچی آئی تھی۔ اسے کراچی کی روشنیوں اور گہماگہمی میں اپنوں کو بے دردی سے چھوڑنے کا افسوس کبھی نہیں رہا تھا اور آج واپسی میں چاچا ساتھ تھا۔ اس کے درد کو محسوس کرتے ہوئے اور اندر ہی اندر کراہ رہا تھا اور اس کے مستقبل کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔

جوں ہی جہاز نے لاہور کے ایئرپورٹ پر لینڈ کیا۔ صدیقہ کو اک لمبی قے آئی اور یکے بعد دیگرے یہ سلسلہ بتدریج بڑھتا چلا گیا۔ اسے وہیل چیئر میں بٹھا کر لاؤنج میں لے جایا گیا اور نیم غنودگی کی حالت میں وہ چاچا کی سرپرستی میں اسپتال ایڈمٹ ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

اسپتال کی صبح بھی کس قدر کڑوی اور کسیلی ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے جہاں بھر کی بیماریاں وجود میں سما گئی ہوں۔ وہ نرس کی مدد سے بیڈ سے اٹھی اور دھیمے قدموں سے باتھ روم تک چلی گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلی ہی تھی کہ نرس وہیل چیئر لیے کھڑی ملی۔ وہ اسے لیب لے گئی اور ہر طرح کے ٹیسٹ کے بعد واپس کمرے میں چھوڑ گئی۔ چاچا دروازے کے باہر ہی کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے گاؤں کا ایڈریس مانگا۔ کیونکہ وہ آج ہی وہاں جانا چاہتا تھا۔ صدیقہ نے لرزش زدہ ہاتھوں سے ایڈریس لکھ کر اسے تھماتے ہوئے کہا۔

"آپ کو وہاں جا کر پچھتاوا ہی ہوگا۔"

"مجھے بھلے کی امید ہے بیگم صاحبہ۔ اولاد سے منہ موڑنا اتنا آسان نہیں جتنا آپ نے سمجھ رکھا ہے۔" وہ

سرگوشی کے انداز میں بولا۔
"اف اولاد کے لیے کس قدر آسان ہے ایسا کرنا۔ میں بھی تو ایسی بے وفا اور نامراد نکلی ہوں۔ بات تو یہ ہے میں چاہے کتنے ہی دلائل دے کر خود کو بے وقوف کیوں نہ بنالوں۔ حقیقت کو کب تک جھٹلاؤں گی۔"
وہ دل میں ہی سوچتی رہ گئی اور چاچا اس وقت اسے اک مسیحا اور آسمان سے نازل ہونے والا فرشتہ لگا۔
اللہ تعالیٰ انسانوں کی شکل میں فرشتے بھیج کر غم زدہ اور رنجیدہ لوگوں کی مدد فرماتا ہے۔ ورنہ یہ دنیا تو آہوں' سسکیوں اور آنسوؤں کی آماجگاہ بن جائے۔ اس نے چاچا کے مضطرب چہرے کی طرف دیکھ کر سوچا۔
رات بھر جاگنے کی وجہ سے اس کی طبیعت میں کسلمندی کے ساتھ لاغرپن بھی حد درجے کا تھا۔ ڈاکٹر راؤنڈ پر آئی تو اس کا بی پی دیکھ کر گھبرا گئی۔ پھر سے ڈرپ لگانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور ساتھ ہی اسے انجکشن دے کر سلادیا۔

☼ ☼ ☼

"کم ان صدیقہ۔" لیڈی ڈاکٹر سحرش نے صدیقہ کو آفس میں آتے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔
"تمہارے لیے گڈ نیوز ہے۔" صدیقہ نے اچنبھے سے اسے دیکھ کر دل میں ہی سرگوشی کی۔ "گڈ نیوز میرے لیے اٹ از امپاسبل۔"
"آپ ماں بننے والی ہیں۔" صدیقہ کے کانوں میں آواز گونجتی ہوئی دور ہوتی گئی اور وہ سنبھلنے کے باوجود کرسی پر لڑھک گئی۔ اسے وہیں اسپکشن ٹیبل پر لٹا دیا۔ پانچ منٹ بعد ہی وہ آنکھیں کھول کر حیرت سے گردوپیش کا جائزہ لیتے ہوئے مکمل طور پر ہوش میں آگئی۔ "وہ ماں بننے والی ہے۔" وہ بڑبڑائی۔ "بات تو خوشی کی ہے۔ لیکن اتنی بڑی ذمہ داری کیسے نبھاؤں گی۔" وہ بے بسی سے سامنے کھڑی ڈاکٹر کو دیکھنے لگی۔
"صدیقہ! فرسٹ بے بی کی خوشی کا تو جواب ہی نہیں ہوتا مگر میں نے آج تک ایسی عورت نہیں دیکھی جو یہ خبر سن کر مارے مسرت کے اپنے ہوش و حواس ہی کھو بیٹھے۔" وہ مسکرا کر اس کا بلڈ پریشر چیک کرنے لگی۔
"ڈاکٹر صاحبہ مجھے بچہ نہیں چاہیے تھا۔ ابھی تو ہم سیٹل بھی نہیں ہوئے۔" وہ بمشکل بول پائی۔
"نجانے اس کے والد کو واپس آنے میں کتنا ٹائم لگے میں اکیلی کیسے سروائیو کروں گی اس کے ساتھ۔"
"جاب کرو اور اپنی ماں یا چھوٹی بہن کو اپنے پاس رکھو۔ جب تک میاں نہیں آتا۔" وہ لاپروائی سے بولی۔ "خود کو مصروف رکھو گی تو نو مہینے گزرنے کا پتا بھی نہیں چلے گا۔"
"ماں کا انتقال ہوچکا ہے۔ یہ سفر مجھے تنہا ہی طے کرنا پڑے گا۔" وہ روہانسی ہوگئی۔
"اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں' ہمت کرو' اسی اسپتال میں اس وقت ویکنسی بھی ہے۔ دو کمروں کا فلیٹ تمہارے لیے کافی رہے گا' با آسانی مل جائے گا۔"
اس کے لہجے میں اتنی ہمدردی تھی کہ وہ زاروقطار رونے لگی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی روداد سنا کر آنکھیں موندلیں۔ جیسے ندامت سے وہ اس سے نظریں ملانے سے قاصر ہو۔
"صدیقہ! میں نے تمہیں پہچان بھی لیا تھا اور تمہارے چہرے پر پچھتاوؤں کو بھانپ بھی لیا تھا۔ مگر میں اپنے وہم اور سوچ کو غلط قرار دیتی ہوئی قدرے مطمئن تو ہوگئی تھی' مگر تمہاری آنکھوں کی پژمردگی اور سیاہی مجھے ہر بار اک سندیسہ دے جاتی۔ صدیقہ اس نے تم سے دستبرداری کا بہانہ ڈھونڈا ہے۔ اس نے تم سے کبھی پیار کیا ہی نہ تھا۔ اس کے سر پر ہوس کا وقتی بھوت سوار تھا۔ وہ اتر گیا اور وہ تمہیں تڑپتا بلکتا تنہا چھوڑ کر چلتا بنا۔ تم اسے بھول جاؤ۔ وہ واپس نہیں آئے گا اور یہ بچہ تمہارے لیے باعث رحمت اور مقصد حیات ہوگا۔" وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔
"میں آپ کی تمام باتوں سے اتفاق کرتی ہوں۔ مجھ سے نجانے اسے کیا دشمنی تھی۔ کس ستم کا بدلہ لیا ہے اس نے۔"

[illegible] بھوت سوار تھا۔ اگر وہ شادی کے بغیر اتر جاتا تو وہ تم سے شادی کرنے کو اہم نہ سمجھتا۔ مگر تم تھیں ایک نیک اور پاکیزہ لڑکی۔ خیر جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ وہ ماضی تھا' بیت گیا' اب اپنے حال اور اس معصوم کے مستقبل کی فکر کرو۔ اس ننھی جان کا کیا قصور ہے؟ کہ اسے اس دنیا میں آنے سے روک دیا جائے۔

اس گناہ کبیرہ کے بارے میں کبھی سوچ بھی ذہن میں نہ لانا۔" وہ سنجیدگی اور سختی سے بولی۔

"تھینک یو ڈاکٹر سحرش۔" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ "مگر یہ سب کیسے مینیج ہوگا؟"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں تمہاری جاب کا انتظام کرتی ہوں اور رہائش اور سیکورٹی کا۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"بس تمہیں صرف اس ٹینشن سے مکمل طور پر آؤٹ ہونا ہے اور اپنی نئی زندگی کو فخر اور حوصلے کے ساتھ ویلکم کرنا ہے۔ یہی ہے تمہاری اور آنے والے بچے کی سیکورٹی۔

ضمیر کی بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈاکٹر آصف ہر پل جیسے گا اور مرے گا۔ کیونکہ وہ دھوکے باز اور بے حس نکلا۔ تم نے تو اسے پیار کیا تھا۔ تم نے پسند کی شادی کرلی۔ کوئی گناہ نہیں کیا۔ معاشرہ معاف کرتا ہے یا نہیں' تمہیں اپنے کیے پر پشیمان نہیں ہونا چاہیے۔ تم نے جو بھی کیا اسے غلط رنگ دے کر خود کو اذیت میں مبتلا کرنا چھوڑ دو۔ اس بچے کے لیے درست نہیں ہوگا' تم تو جانتی ہو کہ ماں کے مزاج کا بچے کے ذہن پر کیسا اثر پڑتا ہے۔" وہ مسکرا دی۔

"جی۔" وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔ "اللہ تعالیٰ کسی حاجت مند کو تنہا نہیں چھوڑتا۔ اس کے لیے کہیں نہ کہیں سے غیبی مدد ضرور پہنچتی ہے۔" وہ عقیدت بھرے لہجے میں بولی۔

"تمہاری خوش آئند زندگی کی شروعات ہو چکی ہے' بیسٹ آف لک۔" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا تو صدیقہ نے اپنا سرد ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر کہا۔

"آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ سچ ہے کہ ڈاکٹرز زندگی بخشتا ہے' لیتا نہیں۔"

وہ آپا کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔ کمرے سے باہر دروازے پر چاچا کا جھکا ہوا سر دیکھ کر اس کا دل بیٹھنے لگا۔ مگر فوراً ہی خود پر قابو پا کر قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔ چاچا خاموش تھا۔ آنکھوں میں بے پناہ اداسی و مایوسی کی پرچھائیں دیکھ کر ہمت سے بولی۔

"اچھا ہوا چاچا' آپ نے اپنی خواہش پوری کرلی۔ کیا فرمایا ہے انہوں نے؟"

"بتانے کے قابل نہیں' سن کر کیا کریں گی بیگم صاحب۔ پہلے کیا کم دکھی ہیں آپ۔ بس اتنا سا جاننا بہت ضروری ہے۔ انہوں نے گاؤں میں سب کو یہ کہہ کر خاموش کرا دیا تھا کہ آپ کی جاب دبئی ہوگئی تھی۔ وہیں روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا۔ ان کے وسائل آپ کی باڈی یہاں لانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس لیے وہیں دفن کردیا۔" وہ مری ہوئی آواز میں بول رہا تھا۔

"چاچا میں جانتی تھی کہ میں ان کے لیے مر گئی ہوں۔ بات بھی سچ ہے۔ میں نے ان کے ساتھ کون سا اچھا سلوک کیا ہے۔ میں خود ان کا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔ اس کالے اور بھیانک چہرے کے ساتھ۔" وہ کرسی سے کھڑی ہوگئی اور اپنائیت سے بولی۔

"آپ اپنے بیوی' بچوں سے مل کر واپس میرے پاس آجائیں۔ امید ہے مجھے اسی اسپتال میں نوکری اور رہنے کو جگہ مل جائے گی۔ آپ کے لیے بھی اسپتال میں گارڈ کی نوکری کی درخواست دیتی ہوں۔ آپ کا سایہ میرے لیے بہت ضروری ہے چاچا۔ آپ کو بتانا بھول گئی۔ خیر سے آپ نانا بننے والے ہیں۔"

"بیگم صاحب! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" وہ چونک کر بولا۔

"ہاں چاچا۔" وہ قدرے مسکرائی۔

"بیگم صاحب اس بچے کے آنے کا اعلان کردیجیے۔ یہ بڑا ضروری ہے۔ ورنہ بچے کی آمد کے ساتھ ہی ایک پہاڑ جیسی بڑی تہمت آپ کو اور آنے والے بچے کو عمر

بھر کے لیے نادم کردے گی۔ دنیا اسی کا نام ہے۔ اس کے ساتھ چلنا بڑا ہی مشکل کام ہے جی۔" وہ جو قدرے بہتر موڈ میں آچکی تھی۔ اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ حیرت و تاسف سے اسے دیکھنے لگی۔

"میں نے تو یہ نہ سوچا تھا چاچا۔"

"کہیں آپ نے برا تو نہیں مانا۔" وہ ہاتھ جوڑ کر مودبانہ انداز میں کھڑا تھا۔

"چاچا! کیسی بات کرتے ہیں۔ میں اپنے ہمدرد اور محسن کی بات پر کیونکر شک کروں گی۔ آپ جو کر رہے ہیں اور جو کہہ رہے ہیں۔ اس میں میرے لیے بھلائی ہے۔ اپنے تو منہ موڑ گئے۔ آپ ہی تو میرے لیے سب کچھ ہیں۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"میری عزت افزائی ہے جی۔" وہ منہ دوسری طرف پھیر کر بولا۔ "بیگم صاحبہ ہو سکتا ہے یہ بچہ ڈاکٹر صاحب کو آپ کے قریب لے آئے۔ یہ اولاد بڑی ظالم شے ہے۔ بڑے بڑے پھنے خان اس کے سامنے جھک جاتے ہیں۔"

"چاچا! آصف کا مجھے چھوڑ کر جانے کا طریقہ تو آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔ نہ اپنا ایڈریس' نہ کانٹیکٹ نمبر' کچھ بھی تو نہ بتایا۔ جاتے وقت مل کر بھی نہ گئے۔ میں مزید خوش فہمیوں کی دنیا میں رہ کر خود کو بے وقوف نہیں بناؤں گی۔ میں نے بھی فیصلہ کرلیا ہے۔ اب وہ میرے پاؤں پڑ کر اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی معافی بھی مانگیں گے تو مجھ پر رتی بھر اثر نہیں ہوگا۔ دوسرا طلاق کی ڈیمانڈ اس لیے نہیں کروں گی کہ میں نے دوسری شادی کرنی ہے نہ ہی ڈرائیوری کہلانے کو اچھا سمجھتی ہوں اور اب اپنی اولاد کی خاطر ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔" وہ سوچتے ہوئے بے تحاشا مضبوطی سے بول رہی تھی اور چاچا اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ ماں بننے کی خبر نے ہی اس لڑکی کو کس قدر توانا اور مستحکم بنا دیا تھا۔ اس کی منور آنکھیں نئی زندگی کا پیغام دے رہی تھیں اور چہرے پر بلا کی طمانیت اور تسکین رچی بسی تھی۔ وہ مسکرا کر بولا۔

"بیگم صاحبہ! اوپر والے کا بھی کیا کہنا کہ دلوں کو سکون دینا چاہے تو انسان کے اپنے ہی ارادوں کو بدل ڈالتا ہے۔ بیگم صاحبہ اب آپ آرام فرمائیں۔ میں چلتا ہوں۔ یہ ہے میرے گھر کا پتا اور ٹیلی فون کی سہولت تو ہمارے گاؤں میں نہیں ہے۔ کوئی بھی مشکل آن پڑی تو مجھے خط یا تار کے ذریعے بتا دیجیے گا۔ فوراً" حاضر ہو جاؤں گا۔ میں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ کبھی نمک حرامی نہ کروں گا۔ وعدہ اس لیے نہیں کروں گا۔ کیونکہ ہم اخلاقی طور پر اتنے گر چکے ہیں کہ وعدہ اک لطیفہ بن کر رہ گیا ہے۔ کوشش کروں گا کہ آپ کا ساتھ کبھی نہ چھوڑوں۔" وہ نگاہیں جھکائے بول رہا تھا۔ وہ اسے عقیدت سے دیکھنے لگی اور وہ خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔

"آصف دیکھا تم نے ایک اوسط طبقے کا انسان ہر طرح کے لالچ و طمع سے پاک' بے لوث اور بے غرض نکلا۔ تمہارے اعلا و ارفع اسٹیٹس اور اس شان و شوکت کا کیا فائدہ کہ شخصیت میں اخلاقیات کا ہلکا سا گزر بھی نہیں۔

تم سمجھتے ہو کہ تم نے اپنی چال بازی اور عیاریوں کی بدولت مجھ سے جان چھڑالی ہے۔ بہت خوب' دیکھنا ایک دن تمہیں' اپنی شکست کا احساس جینے دے گا نہ مرنے دے گا۔ تمہیں آج والدین سے چیٹنگ کرنے کے احساس نے جھنجوڑ دیا۔ تو کل مجھ پر ڈھائے گئے ظلم کو کیسے قبول کرلو گے۔" وہ طنزیہ مسکرائی اور تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور اپنی نئی زندگی کو ویلکم کہنے کے منصوبے بنانے لگی۔ چہرہ فتح مندی کے احساس سے روشن تھا۔

☼ ☼ ☼

"مسز صدیقہ! بیٹی چاند کا ٹکڑا ہے۔ ہو سو تمہاری کاپی۔" ڈاکٹر سحرش نے آکر خبر سنائی تو وہ کچھ اداس سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیا تم بھی۔ جاہلانہ سوچ رکھنے والی عورتوں کی طرح بیٹے کی خواہش مند تھیں۔" وہ چہرے پر اداسی اور خاموشی کے سائے دیکھ کر بولی۔

"ڈاکٹر صاحب! میں اپنی قسمت کو نہ بدل سکی۔ یہ صدمہ ہی میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اب تنہا اس کی عزت و تکریم کی نگہداشت کیسے کروں گی۔ اسے دنیا کی ریاکاریوں اور مکاریوں سے کیسے محفوظ رکھوں گی اور اس کی تقدیر کی تختی پر اس کی مرضی کے مطابق کیسے اس کا نصیب لکھ پاؤں گی؟ مجھے آج اس بات کا احساس ہوا ہے کہ ہر ماں بیٹی کی پیدائش پر بے سکون ہو کر اپنی نظریں کیوں جھکا لیتی ہے؟ ایسی ماؤں کو میں ڈانٹ دیا کرتی تھی۔ ان کو اس تخلیق پر فخر و مسرت کا لیکچر دینے لگتی تھی۔ لیکن ان کی زبان گنگ ہی رہا کرتی تھی۔ جیسے قوت گویائی کسی نے سلب کرلی ہو۔"

اسی اثنا میں نرس بچی کو تولیے میں لپیٹے قریب آگئی۔ اس نے بے چینی سے سر اوپر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی کھلی آنکھوں کو دیکھتے ہی وہ ماستا کی بے لوث محبت میں مقید ہوتی چلی گئی۔ المناک سوچیں اور انجانے خدشے ہولے ہولے اس کے ذہن سے دور ہوتے چلے گئے اور اس نے اسے بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگالیا۔

وہ اسپتال سے ڈسچارج ہو کر اپنے دو کمروں کے فلیٹ میں آگئی تھی جو اسپتال کے عقب میں ہی تھا۔ تمام شادی شدہ نرسز ان ہی فلیٹس میں رہائش پذیر تھیں۔ رات تک اس کے پاس انہی پڑوسیوں کا آنا جانا رہا۔ کسی نے یخنی پلائی، تو کوئی دودھ بادام لے کر آگئی۔ اگلی صبح طلوع ہوئے کئی گھنٹے گزر گئے تھے، لیکن ابھی تک ماں بیٹی سوئی ہوئی تھیں۔ رات بھر بچی نے اسے سونے نہ دیا تھا۔ اسے چپ کرانے کے تمام دیسی ٹوٹکے ناکام رہے تو وہ اسے گود میں اٹھائے کمرے میں ٹہلتی ہوئی اسے لوری سنانے لگی۔ بچی لوری کی مدھر لے میں رونا بھول گئی اور سونے لگی۔ معاً دروازے پر بیل کی گونجتی ہوئی آواز سے صدیقہ ہڑبڑا گئی۔ وال کلاک پر نظر دوڑائی، دوپٹا درست کر رہی تھی کہ پھر سے بیل ہوئی۔ نجانے کون ہے۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی دروازے تک پہنچ گئی۔ دروازہ کھولا تو یہ دیکھ کر حیران ہوگئی۔ چاچا ایک عمر رسیدہ خاتون کے ساتھ کھڑا تھا اور خاتون اسے سر سے لے کر پاؤں تک گھورے جارہی تھی۔

"السلام علیکم بیگم صاحبہ! یہ میری ہمشیرہ ہیں۔ آپ کی چاچی بیٹیوں کو اکیلا چھوڑنے پر راضی نہ ہوئی تو میں انہیں لے آیا۔ ان کے سر پر ایسی کوئی گھریلو ذمہ داری نہیں۔"

"بہت اچھا کیا آپ نے۔ ماسی آپ اندر آجائیں۔" وہ جمائی لیتے ہوئے بولی۔

صدیقہ ماسی کو اپنے چھوٹے سے گھر کے بارے میں بتانے لگی۔ دوسرے کمرے میں جو اس نے آنے والے بچے کے لیے سیٹ کیا تھا۔ وہاں اس کے لیے چارپائی بچھوائی اور اسے آرام کرنے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آکر بچی کو اٹھا کر گود میں ڈالا اور فیڈ کراتے ہوئے بچی کے نام کے بارے میں سوچنے لگی۔

"کاش! تم میرے پاس ہوتے اور اپنی بیٹی کا نام اپنی پسند سے رکھتے ہوئے تم شاداں و فرحاں ہو کر اسے اپنے سینے سے لگا لیتے۔ میں تو اپنے نصیب جیسے بھی لکھوا کر لائی تھی۔ خوش نصیب تو تم بھی نہ ٹھہرے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے بخشے ہوئے اس خوب صورت تحفے سے تم محروم ہوئے ہو۔ میں تو اس کا پل پل انجوائے کروں گی۔ بولو بدقسمت کون ہوا۔" وہ خود کلامی کرتے ہوئے بچی کو دیکھ رہی تھی کہ ایکدم سے پھر گویا ہوئی۔ "میری گڑیا کا نام اس کے ابا کی پسند کا ہونا چاہیے۔ تاکہ میں اس کو بتا سکوں کہ تم ایک ایسے باپ کی اولاد ہو جس نے تمہاری پیدائش سے پہلے ہی اپنی پسند کا نام تمہیں سونپ دیا تھا۔ حدیقہ زیدی" اس کے کانوں میں آصف کی چاشنی سے بھرپور باتیں گونجنے لگیں "آج سے تم میری حدیقہ ہو آئی لائیک دس نیم۔" آنسو اس کے رخساروں پر پھسل آئے۔

"باپ کی شفقت اور توجہ نہ سہی۔

باپ کی پسند کا نام ہی سہی۔ کیوں میری رانی، میری گڑیا۔" وہ بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بے اختیار ہو کر چومنے لگی۔

☆ ☆ ☆

صدیقہ نے دو سال سے صدیقہ کو اسکول میں داخل کروادیا تھا۔ مگر روز وہاں سے شکایتیں آتیں۔ وہ کسی ٹیچر کی سنتی تھی' نہ ہی ماں کی۔ باپ کی محرومی اور اکیلے پن کی وجہ سے وہ گھر میں تو شہزادی تھی جو دل میں آتا کرتی۔ کسی کی ایک نہ سنتی۔ دن بھر ماسی اس کی ہاں میں ہاں ملاتی رہتی' جبکہ صدیقہ کے ساتھ گزرے ہوئے چند گھنٹے اس کے لیے کافی بھاری ہوجاتے تھے' کیونکہ اسے کسی بات میں نہ سننے کی عادت تھی' نہ ہی اس سے زبردستی کوئی کام کرایا جاسکتا تھا۔

ایگزامز سے چند دن پہلے وہ کتابوں میں کھو کر بمشکل پاسنگ مارکس لے کر نئی کلاس میں چلی جاتی۔ اس کی پڑھائی کا یہی طریقہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

وقت کے ساتھ ماسی کی عمر بھی اتنی بڑھ چکی تھی کہ اس سے گھر سنبھالنا دو بھر ہوگیا۔ جوان بچی کی ذمہ داری مشکل لگنے لگی۔ اتھری تو وہ باپ جیسی ہی تھی۔ پل میں خفگی اور اگلے پل شیرو شکر اس کی فطرت کا خاصہ تھی۔ پڑھائی میں بھی لگاؤ نہ ہونے کے برابر تھا۔ ماسی جہاندیدہ عورت تھی۔

جب ماسی نے صدیقہ کو اپنی بڑھتی ہوئی عمر کے تقاضے بتائے تو وہ چونک اٹھی۔ اسے لگا جیسے وہ اور صدیقہ ننگے سر کھلے آسمان کے نیچے تپتی دھوپ میں کھڑی ہیں۔ کوئی مددگار نہیں' ہمدرد نہیں' بس وہ ہے اور اس کی جوان حسین و جمیل بیٹی۔

"ماسی! مجھے آپ نے اکیلا چھوڑنے کا کیسے سوچ لیا۔ آپ صدیقہ کی طبیعت سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ حد درجے کی جذباتی اور جلد باز بچی ہے۔ میں اس کی رکھوالی کیسے کروں گی۔" وہ روہانسی ہوگئی تھی۔

"بی بی! میں سب جانتی ہوں۔ اکیلی عورت کے لیے جوان بچی کو سنبھالنا آسان نہیں۔ باہر شکرے ایسی بچیوں کو ہتھیانے کے چکروں میں تاک لگائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ میری مانیں تو اس کی شادی کردیں۔" وہ اپنی عقل کے مطابق بولی۔

"شادی۔" وہ توقف کے بعد بولی۔ "بہت چھوٹی ہے عقل نام کی چیز تو اس میں ہے نہیں۔ دوسرے دن سب سے لڑ جھگڑ کر واپس آجائے گی۔ میرے ماضی کی وجہ سے اسے رشتہ بھی تو ڈھنگ کا نہیں ملے گا۔"

"جی بی بی۔ دنیا کا حافظہ بڑا تیز ہوتا ہے جی۔" وہ افسردگی سے بولی۔

"میں بھی کام کر کر کے تھک چکی ہوں۔ ماسی میری ہمت جواب دے گئی ہے۔ اوپر سے صدیقہ کا غم کھائے جارہا ہے۔ اب آپ جانے کو تیار بیٹھی ہیں۔"

"مجبوری ہے بی بی۔ میں بھی اپنی آل اولاد میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔ تمام زندگی ان کے لیے محنت مزدوری کی ہے۔ بی بی! اب ان کا فرض بنتا ہے کہ مجھے بڑھاپے میں سنبھال لیں۔ ورنہ وہ بالکل ہی بے مہار ہوجائیں گے۔ بہتر ہے ان کے پاس چلتی پھرتی ہی چلی جاؤں۔" اس کے خدشات درست تھے۔ صدیقہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر مری ہوئی سی آواز میں بولی۔

"ماسی! میں صدیقہ کو ڈاکٹر بنانا چاہتی تھی۔ جو کہ مجھے نظر آرہا ہے میرا یہ خواب پورا نہیں ہوگا۔ آج تک تو کوئی خواب پورا نہ ہوا' یہ کیا ہوگا؟ کیا کروں ماسی؟ کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ آخر والدین کے ساتھ کی گئی زیادتی اور نافرمانی کے کچھ تو حساب کتاب مجھے دینے ہوں گے۔

ماسی! اگر مجھ پر مہربانی کریں تو چند مہینوں کے لیے رک جائیے۔" وہ طویل توقف کے بعد سوچتے ہوئے بولی۔ "صدیقہ اپنا ایگزام کلیر کرلے۔ اسے ڈاکٹر نہ سہی نرسنگ کی سائیڈ پر لے آتی ہوں۔ اسی جاب نے مجھے دال روٹی دی ہے۔ عزت دی ہے۔ کیوں نہ میں اس کے بارے میں سوچوں۔ اونچی اڑان میرے مقدر میں کہاں وہ۔" آہ بھر کر بولی۔

"یہ ٹھیک سوچا ہے۔ میں رک جاتی ہوں چند مہینے۔" وہ تسلی بخش لہجے میں بولی۔

"یہ ٹریننگ کے لیے ہاسٹل چلی جائے گی تو آپ بھی چلی جائیے گا۔" وہ بھی تسلی سے بولی۔

"بی بی! میری تسلی بھی تو ضروری ہے۔ میں نے صدیقہ کو اپنی بیٹی سمجھ کر پالا پوسا ہے۔" وہ آنسو صاف کرنے لگی۔ صدیقہ اپنے دکھوں پر رو پڑی۔

"اب تمہارے دکھ اور غم ختم ہونے کے دن آ گئے ہیں۔" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"بھلا تمہیں اور حدیقہ کو کیسے بھول سکتی ہوں؟" وہ پیار سے بولی۔

"جانتی ہوں ماسی۔ اسے انگلی پکڑ کر چلانا کس نے سکھایا۔ گھنٹوں اسے کھانا کھلانے کی محنت کس نے کی۔ راتوں کو اس کے ساتھ کون جاگا۔ ہر وقت اس کے پیچھے بھاگنا' پارک لے جانا کس نے کیا۔ مجھے وہ منظر کبھی نہیں بھولتا' جب روٹی پک رہی ہوتی تھی تو آپ اس کے ہاتھ میں آٹے کا پیڑا دیا کرتی تھیں۔ وہ پیڑے سے ننھے منے ہاتھوں سے ٹیڑھی میڑھی روٹی بنایا کرتی تھی اور آپ نہال ہو جاتی تھیں۔ آپ نے حدیقہ کو اس کے نام کا مطلب دے دیا۔ وہ سرسبز و شاداب باغ ہے اور آپ ہیں اس کی چار دیواری اور تحفظ۔" اس نے ماسی کے ہاتھ چوم لیے۔

"لیکن اب وہ بڑی ہو گئی ہے تو میری چوکیداری پر بہت خفا ہوتی ہے۔ اسے چار دیواری سے چڑ ہونے لگی ہے بی بی! وہ ہواؤں میں اڑتے ہوئے پنچھی کی مانند ہے۔"

"اللہ تجھے زمانے کے تیز و تند طوفانوں سے بچائے میری بچی! تو سدا بہار شگفتہ رہنے والا باغ ثابت ہو۔ اپنے نام کی طرح۔" وہ بڑبڑائی اور ماسی کو بے بسی سے دیکھتی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

"اللہ تیرا لاکھ شکر ہے کہ میری حدیقہ نرس بننے پر رضامند ہو گئی۔" صدیقہ جائے نماز پر بیٹھی بڑبڑا رہی تھی۔

"ممی، مجھے ہاسٹل جانے کا شوق بھی ہے اور آپ سے بچھڑنے کا دکھ بھی ہے۔ ممی زندگی میں دونوں طرح کے احساسات ساتھ ساتھ کیوں چلتے ہیں۔" وہ پاس آ کر بے قراری سے بولی۔

"بیٹا انسان کو اللہ تعالیٰ نے اسی طرح کا بنایا ہے۔ جو اس کی نعمت پر خوش نہیں ہوتا۔ اگلی نعمت کے حصول کے لیے فکرمند ہو جاتا ہے۔ ایک کو پانے کی فتح مندی کا احساس اور دوسرے کے کھونے پر شکستگی کا احساس دونوں ہی ایک دوسرے کے ہم سفر ہیں۔" وہ جائے نماز سے اٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"تو پھر جلدی کیجیے نا۔ کب ہوگا میرا ایڈمیشن۔" اس کے اندر جوش نے غلبہ پالیا تھا۔

"بیٹے تم بھی ہتھیلی پر سرسوں جمانے لگی ہو۔ میرے بچے! یہ جلد بازی اچھی نہیں ہوتی۔ یہ آپ سے غلط فیصلے کروا کر زندگی کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔" وہ سمجھانے کے انداز میں بولی۔

"ممی یہ سب آپ کے دور کی باتیں ہیں۔ اب کمپیوٹر کا زمانہ ہے۔ تیزی اور ترقی کا۔ اس کے ساتھ قدم اٹھانے والے ہی کامیاب ہیں۔ ہر بات میں سوچ بچار کرنا' ارادوں میں ڈبل مائنڈڈ ہونا' فیصلوں میں کوتاہی اور دیری اسے ہی تو کہتے ہیں بزدلی اور کم ہمتی۔" وہ ماں سے الجھ کر بات کر رہی تھی۔

"تمہارے باپ کی ان ہی خصلتوں نے تو آج ہمیں اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ مگر تم نہ سمجھو گی' نہ سیکھو گی۔" وہ تلملا کر اکتاہٹ سے بولی۔

"ممی وہ زمانے کے ساتھ چلنے والے انسان تھے' تو ڈاکٹر بنے۔ آپ میں سستی تھی' کانفیڈنس کی کمی تھی۔ جس کی وجہ سے مار کھا گئیں۔ قصور ان کا نہیں' ڈرپوک اور بزدل آپ نکلیں۔ یہ کوئی بات ہے کہ ایک شخص نے آپ کے ساتھ شادی کی۔ چند مہینے ساتھ گزار کر یکدم غائب ہو گیا۔ سب افسانوی اور فلمی باتیں ہیں ممی۔ نجانے اندر کی اسٹوری کیا ہے؟ آپ کو آپ کے خاندان نے کیوں چھوڑ دیا؟ یہ معمہ تو حل ہونے سے رہا۔ جب تک آپ مجھ سے مکمل کر بات نہیں کریں گی۔" وہ آج پہلی بار ماں کی بتائی ہوئی من گھڑت کہانی پر شک کا اظہار کر رہی تھی۔ صدیقہ خاموشی سے اس کے چہرے پر اتار چڑھاؤ کا جائزہ لینے لگی۔ جلد ہی اسے اپنی نافرمانی کا احساس ہوا۔ تو ماں کو چوم کر پھر بولی۔

"آئی ایم سوری ممی۔ کاش میں اپنے ڈیڈی کو دیکھ

پاتی۔ ان کے پیار کو محسوس کر سکتی۔ میری تمام سہیلیوں کے ڈیڈی ان کے ناز نخرے اٹھاتے نہیں تھکتے۔ میرے لاڈ و پیار اور چاؤ چونچلے تو آپ ماں ہو کر کبھی نہ اٹھا سکیں۔ ایک گنوار عورت کے ہاتھ میں دینے سے پہلے سوچ لیا ہوتا کہ میرا قصور کیا تھا۔ اس دنیا میں لانے کے لیے میں نے درخواست تو نہیں بھیجی تھی آپ کو۔ آپ گناہ گار ہیں ممی۔ مجھے ڈیڈی کی شفقت کے بنا کیوں پیدا کیا۔" وہ زہر اگل رہی تھی۔ آج سے پہلے اس نے ایسے طعنے تو کبھی نہ دیے تھے۔ یہ یکدم اسے کیا ہو گیا۔ صدیقہ حواس باختہ سی منہ کھولے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"میری باتوں کا آپ کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔" وہ پھر تلخی سے بولی۔

"مجھے نہیں چاہیے تنہائی۔ مجھے اپنے خونی رشتوں کی چاہ ہے۔ سب کہاں ہیں ممی۔۔ کیا سب ہی مر چکے ہیں؟ تو بتایئے ان کی قبریں کہاں ہیں؟ میں قبرستان میں ہی ان سے ملاقات کر لیتی ہوں۔"

"حدیقہ! تم پاگل ہو گئی ہو۔ کیسی فضول باتیں کر رہی ہو؟" وہ قدرے نرمی سے بولی۔

"ایک ڈاکٹر کی بیٹی بننے چلی ہے نرس۔" وہ تنفر سے بولی۔

"کاش مجھے معلوم ہوتا کہ جسے میں اپنا سہارا سمجھ رہی ہوں۔ بیساکھی بنانے کے خواب دیکھ رہی ہوں۔ اف وہ سب میری سوچ تک ہی محدود تھا۔ جس کی تم اولاد ہو۔ جس کا تم خون ہو۔ وہ میرا نہ بن سکا تو تم میری ایک فرماں بردار بیٹی کیسے بن سکتی ہو۔ اف میں نے ناسمجھی اور کم عقلی میں کیا کیا امیدیں باندھ کر اس کوکھ میں تمہیں پیار سے پالا۔ محنت مزدوری کر کے تمہیں کسی چیز کی کمی نہ ہونے دی اور اپنی بساط سے بڑھ کر امیر کبیر بچوں کے ساتھ تمہیں تعلیم دلوائی۔ جتاؤ میں کہاں پر غلط ہوں۔ باپ کی طرح دھاندلی مچانا تمہارے خون میں شامل ہے۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔" وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

"آپ ہر طریقے اور ہر لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں۔ میں برے باپ کی بری بیٹی ہوں۔ مان لیا میں نے۔ اچھا ہی ہوا کہ میں آپ کی جان چھوڑ کر ہاسٹل جا رہی ہوں۔"

"بیٹا! میری جان تم پہلے ایسی تو نہ تھیں۔ کیا نرس بننا برا ہے۔" وہ اسے پچکارتے ہوئے بولی۔ "اگر تمہارا دل نہیں مان رہا تو چھوڑو رہنے دو' فرسٹ ایئر میں ایڈمیشن لے لو۔ مجھے تم تو اپنی جان سے بڑھ کر عزیز ہو۔ نہ تم جونک ہو' نہ ہی مجھ پر بوجھ ہو۔ میرا سب کچھ تم ہی تو ہو۔"

"ممی پڑھنا بھی تو پسند نہیں۔ میرے اندر کی حدیقہ دن میں کتنی دفعہ مرتی اور جیتی ہے۔ ممی ہماری زندگی نارمل کیوں نہیں ہو سکتی؟ اک گھر بڑا سا اس میں میری ماں کوئین' میرا باپ کنگ اور حدیقہ پرنسز بن کر کیوں نہیں رہ سکتی۔ جیسی میری فرینڈز کی زندگی ہے ماما۔ میں نے اس زندگی کو حسرت و یاس کی نظر سے دیکھا ہے۔ تنہائی میں ڈیڈی کو اپنا رازداں بنا کر فریادیں کی ہیں۔ ان کے واپس لوٹ آنے کی دعائیں کی ہیں۔ ماما ہم جیسے لوگوں کی نہ تو دعائیں قبول ہوتی ہیں' نہ ہی کوئی معجزہ ہماری زندگیوں کو روشن بنا جاتا ہے۔" وہ پژمردہ لہجے میں بولتی ہوئی سسکیاں بھرنے لگی۔ ماں نے اسے گلے لگا لیا اور اسے پیار کرتے ہوئے بولی۔

"بیٹا میں تمہارے باپ کی بے وفائی اور مکاری کو تمہاری قربت میں ہنس کر سہہ گئی تھی۔ اب تمہارے درد کو کیسے برداشت کروں گی۔ میں تو تمہیں ہمیشہ لاابالی' من موجی اور لاپروا بچی تصور کر کے مطمئن رہی' مگر تم تو مجھ سے بھی چار ہاتھ آگے نکلیں۔ حد درجہ حساس اور احساس محرومی کے شکنجے میں مقید اور معجزات کے رونما ہونے کی منتظر' میرے دل کے ٹکڑے ان تمام احساسات کو خیرباد کہہ کر اپنے حالات سے سمجھوتا کر لو۔ میں نے تو تمہارے دل کی دھڑکن کے ساتھ سانس لینا سیکھا تھا۔ تم ہی دل چھوٹا کر بیٹھیں تو میں کیسے جی پاؤں گی۔" دونوں کا غصہ ختم ہو چکا تھا۔ دونوں [illegible] سے روئے جا رہی تھیں۔ آخر ماں نے خود کو سنبھال کر اسے تسلی دینا چاہی تو وہ دکھ

سے بولی۔

"ممی آج مجھے جی بھر کر رو لینے دیں۔ شاید میرا دل ہلکا ہو جائے۔ بد قسمت ماں کی بیٹی قسمت کی دھنی کیسے ہو سکتی ہے؟ آپ نے میرے لیے جو فیصلہ کیا ہے درست ہے۔ مجھے معاف کر دیجیے گا ممی۔ میں نے آپ کو وہ کچھ کہہ دیا جو نہیں کہنا چاہیے تھا۔ لگتا ہے دماغ خراب ہو گیا تھا۔" وہ پرملال لہجے میں بولی اور ماں کے گلے لگ کر رونے لگی۔ صدیقہ ایک بار پھر پچھتاووں میں گھر گئی تھی کہ اسے اپنی حیثیت کے مطابق پروان چڑھاتی تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

☆ ☆ ☆

صدیقہ ہارے ہوئے جواری کی طرح سر جھکائے اپنے فلیٹ میں واپس پہنچی۔ ماسی اپنا سامان باندھے جانے کو تیار بیٹھی تھی۔ وہ چھوٹے سے برآمدے میں اسٹول پر ہی بیٹھ گئی۔ باہر کی گرمی نے اسے جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ ویگنوں اور بسوں میں دھکے کھاتی صدیقہ کو ٹریننگ کے لیے ہوسٹل چھوڑ کر آئی تھی۔ دل تھا کہ اس کی جدائی اور اس کی حسرتوں کے کرب کے گرداب میں الجھا ہوا۔ ماسی فوراً پانی کا گلاس لے آئی۔

"آپ جا رہی ہیں۔ کون میری شدت کی پیاس اور مچلتی ہوئی بھوک کو محسوس کرے گا ماسی۔" وہ گلاس پکڑے ہوئے آزردگی سے بولی۔

"بی بی! تمہیں اکیلا ہرگز نہ چھوڑتی' مگر مجبور ہوں' تمہارا چاچا چکر لگاتا رہے گا۔"

"آج کے بعد چاچا یہاں نہیں آسکتا۔ میں جس کمیونٹی میں رہتی ہوں۔ وہاں اسکینڈل کے سوا اور کچھ نہیں۔ اکیلی جان ہوں' اس گھر میں رات ہی تو گزارنے آتی ہوں۔ اب مجھے کون سا صدیقہ کی اس گھر میں موجودگی کی کشش آنے پر مجبور کرے گی۔" وہ پانی پی کر دکھی لہجے میں بولی۔

"بات تو ٹھیک ہے۔ مگر بی بی اپنی صحت و آرام کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ ہاں تو یہ تو بتائیں۔۔۔

صدیقہ زیادہ پریشان اور اداس تو نہیں تھی۔"

"بہت خوش ہمیشہ کی طرح۔ ایکٹنگ تو اس پر ختم ہے نا۔" وہ دوپٹا اتار کر دوسری طرف رکھتے ہوئے بولی۔

"کتنے سالوں سے مجھے بے وقوف بنا رہی تھی۔ میں سوچتی تھی باؤلی ہے' نادان ہے' بالکل لاپروا ہے۔"

"وہ بہت دکھی ہے بی بی۔ وہ مجھ سے بھی کئی بار پوچھ چکی ہے کہ ممی کی شادی کیوں ٹوٹ گئی؟ جبکہ لو میرج تھی۔ کیا لو اسے کہتے ہیں؟ وہ مجھے لو کے بارے میں لمبی لمبی کہانیاں سنایا کرتی تھی۔" وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

"ماسی آپ ہی بتائیں کہ میں اسے اس کا باپ کہاں سے ڈھونڈ کر لا دوں۔"

"میں نے جو بویا' وہی کاٹ رہی ہوں۔ مجھے اپنی تقدیر سے گلہ ہے' نہ ہی اپنے خدا سے۔ میں اسی سزا کی مستحق ہوں ماسی۔"

"بی بی! آپ کی جوانی گزر گئی دنیا کو جواب دیتے۔ بیٹی نے تو پہلی بار جواب مانگا تھا۔ اس سے سچ چھپا کر آپ نے اچھا نہیں کیا۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

"ماسی میں اسے کس منہ سے بتاؤں کہ تمہاری ماں تمہارے باپ کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ کورٹ میرج کرلی تھی۔ اس شادی میں نہ کوئی اپنا گواہ تھا' نہ ہی غیر موجود تھے اور پھر یہ بتاتے ہوئے مر نہ جاؤں گی کہ تمہارے باپ نے مجھے ناقابل اعتماد خود غرض اور وقت شناس کہا۔ اپنی جگہ پر وہ سچا تھا۔ کیونکہ میں نے اپنے ماں' باپ کو دغا جو دیا تھا۔ وہ یہ سن کر مزید مجھ سے دور ہو جائے گی۔ اگر دور نہ ہوئی تو میرے اس گھناؤنے کردار سے اسے شہ ملے گی۔ وہ عمر کے اس حصے میں ہے جہاں ہر پل شیطان تاک لگائے بیٹھا ہے۔" اس کے لہجے میں اتنی بے بسی اور رنجیدگی تھی کہ ماسی کے آنسو نکل آئے۔ اس کا دھیان بٹانے کو ماسی ادھر ادھر کی باتیں سنانے لگی۔ جبکہ صدیقہ کے کان دل و دماغ اس کی تمام باتوں سے محروم تھے۔ وہ صدیقہ کے بارے

میں سوچ جا رہی تھی۔ اس کی محرومیوں کا جان لیوا احساس اسے بچھو کے لگا کر زخمی کر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

آصف اسپتال ——— علی الصبح پہنچ گیا تھا۔ آنکھیں شب بے داری کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ بالوں میں چاندی کے تار خاصے نمایاں تھے۔ پیشانی پر گہری تین لائنیں اور ان گنت مہین سی شکنیں چہرے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ سگار انگلیوں میں دبا کر پل بھر کو سوچا اور واپس بکس میں ڈال دیا۔ کانوں میں صدیقہ کی اپنائیت کی چاشنی سے بھرپور آواز میٹھا رس گھولنے لگی۔

"آصف نہار منہ یہ سگریٹ سگار پینے والے لوگ کون ہیں۔ آپ کو اس کا علم ہے۔"

"ہاں۔" وہ قہقہہ لگا کر کہتا۔ "جانتا ہوں۔ اس مابدولت کو آصف زیدی کہتے ہیں۔"

"یعنی جاہل اور ان پڑھ۔" وہ قہقہہ لگا کر چھیڑتی۔

"ڈاکٹر آپ کو نہیں مجھے ہونا چاہیے تھا۔" ایکدم وہ نرس کی آواز پر چونک گیا اور اسے اس وقت اس کی آمد بہت ڈسٹرب کر گئی۔ وہ میز پر کمپیوٹر اور فائلیں درست کر کے باہر چلی گئی۔ وہ آفس سے ملحقہ چھوٹے سے کچن میں گیا اور کافی میکر میں کافی بنا کر مگ میں ڈال کر پھر آفس میں آ گیا۔ پہلا سپ لیا تھا کہ صدیقہ کی کھنکتی ہوئی آواز ابھری۔

"ہمارے گاؤں میں صبح سویرے دیسی ڈرنک کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ دیسی ڈرنک کسے کہتے ہیں۔"

"مجھے اتنا بھی اسٹوپڈ نہ سمجھو۔ دودھ کو کہتے ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے کہتا۔

"جی نہیں، لسی، پنجاب کے دیسی مشروبات کی ماں ہے، ہار گئے نا۔"

"تم سے جیتنا خاصا مشکل ہے۔" وہ خفیف سا ہو کر بولا۔

"تو پھر یہ کافی مجھے دیں اور یہ پی لیں صبح سویرے۔ دن بہت خوشگوار گزرے گا۔" وہ شوخی سے کافی کی پیالی اس کے ہاتھ سے لے کر لسی کا بڑا سا گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیتی۔ وہ محبت سے مغلوب ہو کر اسے لمبے بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچتا، تو وہ درد سے کراہتی۔ آصف چونک کر اپنے گردوپیش کا جائزہ لینے لگا۔ وہ تنہا آفس میں بیٹھا تھا۔ صدیقہ کی یادوں کا معطر جھونکا تھا، جو گزر گیا۔

"کاش۔ کاش یہ میرا بھولا بسرا خیال نہ ہوتا۔" وہ اپنی ہی سوچوں میں ڈوبا بے دلی سے کافی پینے لگا۔

☆ ☆ ☆

ڈینسی آصف کی سائیکاٹرسٹ تھی۔ دونوں ایک ہی اسپتال میں جاب کرتے تھے۔ فرینکفرٹ ڈینسی کا آبائی شہر تھا۔ اس کلچر کے مطابق والدین کے ساتھ رہنے کے بجائے اس نے ان ڈی پینڈڈ رہنے کی فوقیت دی تھی۔ اسپتال میں دن میں کئی بار ان کا آمنا سامنا ہوتا۔ کھڑے کھڑے گپ شپ بھی ہو جاتی۔ دھیرے دھیرے معاملہ آگے بڑھا تو باہر ڈنر اکٹھے ہونے لگے۔ ڈنر کے بعد کی قربت بڑھی تو راتیں اکٹھی گزرنے لگیں۔ یہ سلسلہ تقریباً دو سال تک جاری رہا اور آخر میں انہوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ آصف کے والدین اپنے بچے کی خوشی کی خاطر ڈینسی سے شادی کرنے پر سینے پر پتھر کی سل رکھے آمادہ ہو گئے تھے۔ کیونکہ آصف جب سے پاکستان سے واپس لندن آیا تھا۔ ڈپریشن کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ مشورے کے لیے ڈینسی کے پاس گیا تھا۔ ڈینسی ایک تجربہ کار ڈاکٹر تھی۔ عمر میں اس سے بڑی تھی۔ اس نے دو سٹنگ کے بعد ہی اس کی ڈیپریشن کی وجوہات کو بھانپ لیا تھا۔ یہ اس کا گلٹ تھا۔ جو اسے دن بہ دن زندگی کی دلچسپیوں سے دور کرتا جا رہا تھا۔ والدین الگ پریشان ہو اٹھے تھے۔ وہ حقیقت سے نا آشنا اسے پاکستان جانے کی تلقین کرنے لگے تھے۔ مگر وہ ہر بار والدین کو انکار کر دیتا۔ ڈینسی کے کہنے پر اس نے ثمینہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی کہ صدیقہ کا حال احوال معلوم

کرسکے۔ مگر وہ ہر بار ناکام ہی رہا۔ اپنے قریبی دوستوں سے رابطہ کیا تو وہ چاروں ہی اپنے ملک سے باہر سیٹلڈ تھے۔ صدیقہ کی کسی کو خبر نہ تھی۔ جستجوئے صادق میں خدا بھی مل جاتا ہے۔ ثمینہ تو ایک بے وقعت سی ہستی تھی۔ ایک دوست نے اسے ثمینہ کا نمبر لا دیا۔ جس پر بیسیوں بار ٹرائی کرنے کے بعد اس کی آواز سننے میں آئی۔ اس سے پہلے کہ فون کٹ جاتا۔ آصف بے قراری سے بولا۔

"مسز ثمینہ! مجھے صدیقہ کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔ وہ خیریت سے تو ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب! آپ اس کی فکر کرنا چھوڑ دیں۔ وہ اپنے پیرنٹس کے پاس جاچکی ہے۔" وہ خود اعتمادی سے جھوٹ بول رہی تھی۔

"اس کا حال کیسا ہے؟" وہ قدرے طمانیت سے بولا۔

"وہ خوش باش ہے ڈاکٹر صاحب۔ شکر کریں کہ آپ اس ناگن سے بچ گئے۔ ورنہ وہ ایسے ڈستی کہ آپ کو پاکستانیوں سے نفرت ہو جاتی۔" وہ تلخی سے بولی۔

"سوچتا ہوں کہ کہیں جلد بازی میں فیصلہ غلط تو نہیں کر بیٹھا۔ دل ہر وقت پریشان ہی رہتا۔" وہ افسردگی سے بولا۔

"وہ شادی رچا کر بہت خوش ہے اور آپ ہیں کہ عشق میں مجنوں بنے بیٹھے ہیں؟" وہ طنزیہ قہقہہ لگا کر بولی۔ "گاؤں جاتے ہی وہ ایک اسکول ٹیچر میں انوالو ہو گئی تھی۔ اس کے پیرنٹس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اسے فوراً سر سے اتارا۔ کیونکہ بات حد سے بڑھ چکی تھی۔ وہ بھی مزا چکھ لے گا اس دغا باز سے شادی کرنے کا۔"

"میں نے اسے طلاق نہیں دی تھی ثمینہ۔ بے شک ہماری علیحدگی ہو گئی ہے۔ مگر میرے اس پر اور اس کے مجھ پر حقوق ہیں وہ شادی ہرگز نہیں کر سکتی۔" وہ تلملا کر بے یقینی سے بولا۔

"ڈاکٹر صاحب آپ کس دنیا میں رہتے ہیں۔ وہ اس کے بچے کو آج کل میں ہی جننے والی ہے۔" اس نے حقارت و ذلالت سے بھرپور ایک اور پتا پھینکا۔

"یہ حرام ہے مسٹر وہ میری بیوی ہے۔" وہ چیخ اٹھا۔

"اس کے والد نے مولوی صاحب سے فتویٰ لے کر نکاح کیا ہے۔ آپ ادھر آنے کا تصور بھی نہ کریں۔ وہ لوگ آپ کو قتل کر دیں گے۔" وہ ہمدردانہ لہجے میں بولی۔

"ایک بے وفا عورت کی خاطر آپ کی جان کیوں کر جائے؟ کیا ایسی ہی سستی ہے آپ کی جان۔ میری بات پر بھروسہ رکھیں اور اس خاندان سے دور رہنے میں آپ کی بھلائی ہے۔ آپ کو لڑکیوں کی کمی نہیں۔ شادی کر لیجیے۔ ڈونٹ ویسٹ یور ٹائم۔"

"تھینک یو ثمینہ۔ میں قدرے ریلیکس ہو گیا ہوں' بائے۔" اس نے فون رکھ دیا۔ ثمینہ نے بند فون پر بوسہ دیا اور بڑبڑائی۔

"راہ چلتی چمارن چلی تھی مہارانی بننے۔"

آصف کی ڈپریشن نے یکدم پلٹا کھایا۔ گلٹ کی جگہ نفرت و حقارت اور غیظ و غضب نے لے لی تھی۔ اس نے ٹیبل پر پڑے ہوئے پھولوں کو کرسٹل کے گلدان سمیت فرش پر پٹخ دیا۔

☆ ☆ ☆

آصف کے گھر شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ڈیسنی بھی اتنی ایکسائیٹڈ تھی کہ وہ شادی انڈین رسم و رواج کے مطابق کرنے میں بے تحاشا فخر محسوس کر رہی تھی۔ مایوں کی رسم اسی کے گھر میں انڈین کمیونٹی نے مل کر ادا کی۔ پھر مہندی کی رسم بھی اپنے کلچر کے مطابق سیلی بریٹ کی گئی۔ گوروں کے لیے یہ سب کچھ نیا اور انوکھا تھا۔ پھر رخصتی فائیو اسٹار ہوٹل سے ہوئی۔ انڈین بوتیک سے خریدے گئے بھاری بھرکم جوڑے اور ڈیپ ریڈ غرارہ اور ولیمہ کا سفید اور سلور کام سے مزین لہنگا اور سونے کے ان گنت سیٹ' چوڑیاں' کڑے اور ڈائمنڈ کی انگوٹھیاں ڈیسنی کو حیران و پریشان کر گئیں۔ ایک رات میں وہ اتنی مال دار

ہو جانے کی اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ یہ مشرقی شادیاں تو خوب ہیں۔ وہ امپریس ہو گئی تھی۔ گو کہ وہ آصف سے پانچ، سات سال بڑی تھی۔ مگر گوری چٹی، بلو آئیز اور گولڈن بالوں میں ڈیسنی، آصف کے سامنے ایسے لگ رہی تھی جیسے لنگور کی بغل میں حور اور وہ اسے دیکھ کر غرور و تکبر سے تن گیا تھا۔ صدیقہ پل بھر کو خیالوں میں لہر کی طرح آئی اور روپوش ہو گئی۔

"یہ تھی مرد کی اصلیت، کھری اور سچی حقیقت۔ عورت اس کی بے وفائی پر نالاں ہوتے ہوئے بھی اس کے نام پر اپنی عمر بتا دیتی ہے۔ یہ کیسا ملن اور کیسی لگن ہے کہ نفرت کے باوجود اس کے انگ انگ سے ساتھی کی مہک اٹھتی ہے اور اس کی یادوں میں وہ آہیں بھرتی، تڑپتی بلکتی کسی اور کو دل سے قبول نہیں کر پاتی۔ اور کہیں وہ مختلف مزاج کے انسان ایک دوسرے کی رفاقت کے بندھن میں ذہنی مطابقت اور یکجائی کی جستجو میں اپنی عمریں گزار کر زندگی کے آخری لمحوں میں فرسٹریشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کیسا عجیب بھید ہے یہ زندگی کا۔

☼ ☼ ☼

"ممی! آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔" آصف کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔

"ہاں بولو بیٹا!"

"ممی۔ ڈیسنی دو بچوں کے ساتھ اس گھر میں نہیں رہنا چاہتی۔" وہ بمشکل ہی کہہ پایا۔

"مطلب یہ ہوا کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔" وہ بے اختیار ہی بولیں۔

"جی ممی۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"جہاں رہنا چاہتی ہے، ہزار بار جائے، مجھے کیوں اعتراض ہو گا۔ لیکن ایک شرط ہے میری۔" وہ سوچتے ہوئے بولیں۔

"تم نہیں جاؤ گے۔ ہم بوڑھے والدین تمہارے بغیر نہیں رہ سکتے۔ تمہارے ڈیڈی کی طبیعت ایکدم سے خراب ہو جاتی ہے۔ ہارٹ پیشنٹ ہیں۔ بروقت

بھی ملنا ہے تو پہنچنا ہی ہو سکتا ہے۔"

"آپ کی شرط۔ بسر و چشم۔ لیکن ایسا کسی بھی معاشرے میں نہیں ہوتا۔ گھر آباد ہی میاں، بیوی کے اکٹھے رہنے سے ہوتے ہیں۔ ورنہ بربادی منہ کھولے کھڑی ہوتی ہے۔" وہ فکرمندی سے بولا۔

"بیٹے، بہو چاہے ہندوستانی ہو یا انگریز، ان کی خو ہی نرالی ہے۔ میں اپنی کو تو پھر بھی قابو کر لیتی۔ یہ میرے کہنے میں کہاں۔ اب دونوں بچے میں نے پال دیے ہیں۔ اسکول بھی جانے لگے ہیں۔ اب اس بڑھیا کی اسے کیوں ضرورت محسوس ہوئی۔"

"آپ اطمینان رکھیں۔ بچوں کو چھٹی کے بعد ڈیڈی ہی پک کیا کریں گے۔ انہیں مصروف رہنے کا بہانہ بھی مل جائے گا۔ بچے آپ دونوں سے الیچ بھی رہیں گے اور دین کے نزدیک بھی ہوں گے۔ ہم اسپتال سے فارغ ہو کر انہیں گھر سے پک کر لیا کریں گے۔ ڈنر آپ کے ساتھ ہو گا۔ بس یوں سمجھیں کہ ہم دوسرے گھر سونے ہی جائیں گے۔" وہ تسلی دیتے ہوئے نہایت ملائمت سے کہہ رہا تھا۔

"بیٹا میں عورت ہوں۔ ڈیسنی کی خواہش کو ہرگز رد نہیں کر رہی۔ ہر عورت کو اپنا گھر، اپنی آزادی اور خود مختاری چاہیے ہوتی ہے۔ اس کی مہربانی ہے کہ اس نے اتنا عرصہ ہمارے ساتھ گزار لیا۔ مجھے تو ایک دن کی امید نہیں تھی۔ وہ اس معاشرے میں پیدا ہو کر جوان ہوتی ہے۔ اس کا اپنا ہی کلچر ہے۔ اپنے ہی اصول اور قانون ہیں۔ مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں بیٹا۔" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں۔ "ان پھول جیسے بچوں کو بھی اپنے ماں، باپ کے ساتھ وقت چاہیے۔ مجھے آج سمجھ آئی ہے کہ جب ہم یہاں شفٹ ہو رہے تھے تو تمہاری دادی غشی کی حالت میں چلی جاتی تھیں۔ میں اسے ایکٹنگ کا نام دے کر دل ہی دل میں ہنستی تھی۔ لیکن آج پتا چلا ہے کہ اف کتنا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ جب اپنے جسم کے ٹکڑے کو ماں کاٹ کر اک غیر اور انجان عورت کے جسم کا حصہ بنا دیتی ہے اور پھر اس کی آبادی و خوش حالی کی خاطر اسے اپنی نظروں سے بھی

دور کردیتی ہے۔ یہ ظلم ہی تو ہے؟ وہ مسلسل آنسو صاف کیے جارہی تھیں۔ آصف' ماں کے سر پر پیار کرکے باہر نکل گیا۔ دل اداسی میں گھرا ہوا تھا۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ بے بس تھا۔

اسی ویک اینڈ پر ان کے ضروری سامان کی پیکنگ ہونے لگی۔ ان کے کپڑے اور اسی طرح کا دوسرا ذاتی سامان ہی تو تھا۔ نئے گھر میں شام تک شفٹ ہوگئے۔ جب تک گھر سیٹ ہوکر رہنے کے قابل نہ ہوا۔ سب یہاں آتے جاتے رہے۔ آخر کار ایک لانگ ویک اینڈ پر یہ آباد گھونسلا اداس اور ویران ہوگیا۔ پنچھی تمام تر رونقوں سمیت اپنے نئے آشیانے میں چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

آصف وہ بچہ تھا۔ جو اسکول میں بھی اپنی ماں کو پکار کر رویا کرتا تھا۔ ٹیچرز اسے بہلا بہلا کر تنگ آجاتی تھیں۔ مگر اس کا منہ بند نہ ہوتا اور آخر وہ میز پر سر رکھ ہی سسکیاں بھرتے سوجایا کرتا تھا۔ جب ذرا بڑا ہوا تو بریک ٹائم میں وہ ماں کو فون کرکے لنچ اسکول منگوا کر ماں کے ہاتھوں سے کھایا کرتا تھا۔ تمام لڑکے اس کا مذاق اڑاتے۔ کئی بار باپ نے ڈانٹ پلائی۔ غیرت دلانے کی کوشش کی۔ مگر سب بے سود تھا۔

جب اس کا پاکستان ایڈمیشن ہوگیا تو باپ بہت خوش تھا۔ لیکن ماں رو' رو کر بے حال ہوجایا کرتی تھی۔ جب وہ چلا گیا تو ماں کو کتنی ہی بیماریوں نے آن گھیرا تھا۔ شوگر' بلڈ پریشر اور ڈپریشن کی میڈیسن ہمیشہ کے لیے ہم سفر بن گئیں۔

وقت نے ایسا ستم کیا تھا کہ اسی آصف نے پیرنٹس کو انفارم کیے بغیر صدیقہ سے شادی کرلی۔ جب اندر کا آصف محبت کے فسوں سے نکلا' تو اسے چھوڑ کر ماں کے گلے آلگا اور مزے کی بات یہ کہ پھر اسی آصف نے اپنی مرضی اور پسند کی دوسری شادی کی اور آج وہ تمام تر مجبوریوں کو سینے سے لگائے نئی دنیا بسائے اپنے بچوں اور بیوی سمیت ان سے دور چلا گیا تھا۔ آج ماں کی آہ و بکا نے رتی بھر کام نہ کیا۔ دل میں اپنے دونوں بچوں

ابراہیم اور آمنہ کو دیکھ کر خود غرضی بھی عود کر آئی تھی۔ بیوی کی خوشی کی خاطر دل میں سنگینی بھی آگئی تھی۔

یہ ایسا سرکل ہے' جو ماضی کو ساتھ لیے چلتا ہے۔ یہ سرکل ہے' مکافات عمل کا۔ یہ سرکل ہے جیسا کروگے ویسا بھروگے۔ ازل سے ابد تک کے اس سرکل میں انصاف ہے۔ اپنے اعمال کا حساب کتاب ہے۔ جوان بڑوں کے تجربات سے سیکھنے کے بجائے جوشیلے اور اس کی حدت و تپش میں اپنی ہی لے میں سرشار رواں دواں غیر ارادی اور غیر اختیاری طور پر گزرتے وقت کے اس سرکل کا حصہ بنتے چلے جاتے ہیں۔ یہ قدرتی امر ہے۔ بھلا اسے کون جھٹلا کر سکتا ہے۔ جس نے اس راز کو پالیا۔ اس نے اس مقدس اور پاکیزہ ذات کو پہچان لیا۔

آج نئے گھر میں پہلی صبح کا طلوع ہونا کس قدر مختلف تھا۔ وہ تیار ہوکر تیزی سے ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھا۔ ٹیبل پر استعمال شدہ گندے برتن ڈبل روٹی' انڈوں کے چھلکے اور استعمال شدہ ٹشو پیپرز بکھرے ہوئے تھے۔ وہ کچن کی طرف بڑھ گیا۔ خاموشی سے ادھر ادھر کا جائزہ لیتے ہوئے باہر نکل آیا اور اپنا بریف کیس اٹھا کر گاڑی کی چابی لیے گھر سے باہر نکل گیا۔ وہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے دکھ سے سوچے جارہا تھا کہ ماں نے آج تک اسے پانی بھی اپنے ہاتھوں سے پلایا تھا۔ ناشتا بنانا تو دور کی بات۔ گاڑی ماں کے گھر کے سامنے رک گئی۔ وہ بجھے دل اور بھاری قدموں کے ساتھ اندر چلا گیا۔

ماں' باپ صوفے پر خاموش بیٹھے تھے۔ چہرہ ان کی اندرونی کیفیت کی غمازی کررہا تھا۔ آنکھوں میں پرلے درجے کی اداسی و مایوسی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ دونوں چونک اٹھے۔ اور بیک زبان بولے۔

"ہم تمہارے ہی منتظر تھے۔ بچے کہاں ہیں؟" وہ دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

"وہ ڈیسنی کے ساتھ ہی اسکول جاچکے ہیں۔ میں سوتا ہی رہ گیا۔ آج تک تو ممی جگاتی آئی ہیں۔ مجھے علم ہی نہ ہوا کہ ڈیسنی کب اٹھی' کب تیار ہوئی اور کب

ڈیوٹی پہ چلی گئی۔" وہ مصنوعی مسکراہٹ سے بولا۔

"آئندہ میں اپنے بچے کو موبائل پر بیل کر دیا کروں گی۔" وہ اسے پیار کرتے ہوئے بولیں۔ "تم نے ناشتا بھی نہیں کیا ہوگا۔ ہم دونوں بھی تمہارا انتظار ہی کر رہے تھے۔" وہ کچن کی طرف چل پڑیں۔ پل بھر میں میز ناشتے کے لوازمات سے بھر گئی۔ تینوں نے ناشتا کیا اور آصف خدا حافظ کہہ کر تیزی سے اسپتال کی طرف چل دیا۔ نادانستگی میں وہ بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔

جب سے ڈیسنی اس گھر سے رخصت ہوئی تھی۔ اس نے اس طرف پلٹ کر دیکھا بھی نہ تھا۔ بچے صرف ایک دفعہ دادی اور دادا سے ملنے آئے تھے۔ جبکہ آصف بلاناغہ ناشتا ماں کے ہاتھ کا کرتا رہا۔ پانچ بجے چھٹی کے بعد والدین کے ساتھ افراتفری میں ڈنر کرتا اس کی موجودگی سے گھر کی ویرانی اور جان لیوا سکوت میں مسرت و انبساط کی لہر دوڑ جاتی۔ وہ ذہنی طور پر مطمئن اور پرسکون ہو کر گھر چلا جاتا۔ والدین کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی اور جذباتی وابستگی میں کمی تو نہ تھی۔ مگر حالات کے تقاضوں کو پورا کرنا بھی تو اہم تھا۔ ویک اینڈ گھر پر ہی ایک بہت بڑے طوفان کی نذر ہو جاتا ہے۔ وہ بچوں اور بیوی سمیت ویک اینڈ اپنے ضعیف والدین کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ جبکہ ڈیسنی ہر سنڈے بمعہ بچوں کے چرچ جانے پر بضد ہوتی۔ آصف کو یہ گوارا نہ تھا۔ وہ بچوں کو روکنے کی کوشش کرتا تو اک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔ جس میں ہار ہمیشہ آصف کی ہوتی رہی۔ کیونکہ زیادتی اور ہاتھا پائی اس کے مفاد میں نہیں جاتی تھی۔ ورنہ عمر بھر برٹش گورنمنٹ کے ہاتھوں خمیازہ بھگتنا پڑتا' کیونکہ یہ معاشرہ ہمیشہ سے عورت کی طرف داری کرتا آیا تھا۔ بے شک حقیقت تلخی سے بھرپور تھی۔

معاملہ دن بدن بگڑتا نظر آ رہا تھا۔ اسے ہر وقت اک انجانا سا خوف' ڈر اور خدشہ لاحق رہتا تھا کہ کسی بھی وقت ڈیسنی کا منفی رویہ اسے کٹہرے میں کھڑا کر سکتا تھا۔

وہ خالی الذہنی سے گھر کے باہر چھوٹے سے لان میں کھڑا تھا۔ آج پھر ڈیسنی بچے لے جانے میں کامیاب ہو گئی تھی اور وہ بے بسی سے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ والدین سے پردہ داری رکھنے میں ہی مصلحت سمجھ کر اکیلا اندر ہی اندر کڑھتا رہتا تھا۔ بھلا کس سے شیئر کرتا کہ اس کی اگلی نسل تو بے دین ہوگی۔ اسلام کے تمام ارکان سے بے خبر اور بے بہرہ۔ یہ قلق لیے مارے جا رہا تھا۔ اپنی اس چوائس پر ماتم کناں وہ گاڑی میں جا بیٹھا۔

زندگی کن کن کرائسز سے گزر رہی ہے۔ آگہی کی اذیت اور کرب میں وہ بڑبڑایا۔ دنیاوی مسرتوں کے حصول کی خاطر میں نے خود کو برا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اب دل ناداں مجروح ہے۔ روح تار تار ہو چکی ہے۔ ذہن مفلوج ہے اور وجود میں اٹھتے ہوئے آگ کے شعلوں میں' میں بے بس اور لاچار ہوں۔ مجھے صدیقہ کی بددعا کھا گئی۔ میں جہاں جاتا ہوں۔ اس کی تڑپ اور اس کی منتوں اور خوشامدوں کے حصار میں' مجھے شانتی کیسے مل سکتی ہے۔ میں غیر مذہب کی نجاست اور غلاظت میں بری طرح پھنس چکا ہوں۔ میں نہیں چاہتا میرے رب کہ میری اولاد بھی بے دین ہو کر بدبودار اور ناپاک کیچڑ کی دلدل میں اترتی چلی جائے۔ اس پستی اور ذلالت سے انہیں محفوظ کر لے میرے رب۔ میری عاقبت نااندیشی میں سرزد ہونے والی غلطی کو معاف کر دے۔ میرے دل کو اطمینان اور سکون بخش دے میرے رب! میں نے صدیقہ کی محبتوں اور چاہتوں کو ٹھکرا کر اس پر بدنامی کی جو مہر لگائی تھی۔ کس قدر غیر مناسب اور غیر مہذب تھی۔ اس پر کیا گزری ہوگی' جب وہ اپنے گاؤں لٹی لٹائی اپنے والد کے سامنے گئی ہوگی۔ اسے سنگسار کرنے چھرا گھونپ کر مارنے اور گولی کا نشانہ بنانے کی دھمکیوں نے اس کے حسین و پاکیزہ وجود میں بھونچال برپا کر دیا ہوگا۔ اس کے آنسو اور قلب سے رستا ہوا خون اور ندامت و شرمندگی سے بوجھل التجائیں میری زندگی کی روشن راہوں کو تاریک کر گئیں۔

میرے رب مجھے فقط اپنا غلام بنالے اور سکون دے دے اور عزت کی موت دے دے اور مجھے معاف کردے۔ میں نے تیری حکم عدولی کی۔ تو حکمت والا ہے۔ بھلا دو دنیاؤں کی یکجائی کیسے ممکن تھی؟ میری ہی عقل پر پردہ پڑ گیا تھا۔ وہ سسکیاں لینے لگا تھا۔ اسی اثنا شفقت سے بھرپور ہاتھ اس کے سر پر رک کر اسے چونکا گیا۔ اس نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ وہ والدین کے گھر کے بجائے مسجد میں جائے نماز پر سجدے میں گرا گڑگڑا رہا تھا۔ وہ سرعت سے بیٹھ گیا۔ مولانا صاحب اس کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ چہرے پر ہمدردانہ بکھری ہوئی مسکراہٹ دیکھ کر آصف نے اپنی آنکھوں کو ہتھیلی سے صاف کیا اور عقیدت سے سر جھکا لیا۔

"ناامیدی اور مایوسی کفر ہے۔ مسلمان وہ ہے جو اسلام کے قوانین کی حفاظت کرے۔ تم مسجد میں آئے ہو۔ خوش آمدید۔ اس مسجد کا مقصد جانتے ہو۔"

"جی۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"محض پانچ وقت کی نمازوں کی ادائیگی ہی مقصد نہیں۔ اس جگہ میں ہم اسلامی نقطہ نظر سے ایک دوسرے کے دکھوں اور غموں کا مداوا کرنے اکٹھے ہوتے ہیں' بولو' کیا مسئلہ ہے؟" وہ خود اعتمادی سے بولے۔ لیکن آصف کے پچھتاووں اور دکھوں کا پیمانہ اتنا لبریز ہو چکا تھا کہ آنکھوں سے خوف اور وحشت جھلکنے لگی تھی۔ مولانا صاحب وہاں سے اٹھے اور اسے ٹھنڈا پانی لاکر دیا۔ وہ غٹاغٹ پی کر قدرے سنبھلا۔

"اعصابی جنگ لڑنے سے یہ حال ہوتا ہے جو تمہارا ہے۔" انہوں نے اتنے پیار سے کہا کہ اس کی آنکھیں پھر سے اشکبار ہو گئیں۔

"رو لو بیٹا۔ جی بھر کر رو لو' تمہارا من ہلکا ہو جائے گا۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

"بیٹا جس نے اس فانی دنیا سے دل لگا لیا' وہ کبھی پرسکون نہیں رہتا۔ اس دنیا کی لذتوں سے آسائشوں میں مقید انسان کا انجام بہت عبرت ناک ہوتا ہے۔ اپنے پلے ایک بات باندھ لو۔ جذبہ خدمت خلق اور ہر

رشتے میں خلوص اسلام ہے۔ لاکھوں نفلی اذکار و عبادات سے بڑھ کر اس کا درجہ ہے اور یہی ہے حقیقی اور سچا سکون۔"

"جی۔" وہ سر جھکائے احترام سے بیٹھا تھا۔ دل کا غبار قدرے کم ہوا تھا۔ اس کا ذہن سکون کی طرف مائل ہو رہا تھا۔

"پچھتاووں سے چھٹکارا کیسے حاصل کیا جائے؟" وہ بمشکل بولا۔

"ازالہ کرنے کی کوشش کرو۔ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو گے تو غم و مصائب کے گرداب سے چھٹکارا حاصل کرلو گے۔" وہ اس کی نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے بولے۔

"میرے گناہوں کی فہرست بہت طویل ہے مولانا صاحب۔ شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے آپ سے ملی ہوئی گائیڈنس میری زندگی کا رخ بدل دے گی۔ مجھے آپ کی کونسلنگ کی ضرورت ہے۔" وہ ان کے ہاتھوں کو احتراماً پکڑ کر بولا تو وہ مسکرادیے۔

"کیوں نہیں سنوں گا؟" وہ اس کے سامنے اب آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ انہیں اس سے فوری طور پر ایسے ردعمل کی قطعاً توقع نہ تھی۔ کیونکہ ایک انسان کا دوسرے کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف چھوٹی بات نہ تھی۔ وہ اس کی روداد سنتے گئے اور اس کی سچائی سے متاثر ہوتے چلے گئے۔ سب کچھ کہنے کے بعد وہ خاموش بیٹھ گیا۔ مولانا صاحب سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کیونکہ آئے دن ایسے واقعات سننے میں بھی آتے رہتے تھے اور بہت سے کیس یہ خود بھی اپنی دانشمندی سے ہینڈل کیا کرتے تھے۔ لاتناہی سوچوں سے نکل کر وہ خوشگوار لہجے میں بولے۔

"اعتراف جرم کے معنی ہیں توبہ استغفار، بیٹا اب تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور فضل و کرم کا سایہ ہے۔ آج سے تمہارا شمار اللہ تعالیٰ کے پیاروں میں ہونے لگا ہے۔ میں تمہیں معطر پھولوں سے بھرپور رستہ اور روشنیوں سے ہمکنار گنبد کیسے دکھا سکتا ہوں۔ جبکہ تم خود اس کا تعین کرچکے ہو۔ دیکھا جائے تو تم قصور وار نہیں ہو۔ تم جس ماحول میں مقیم ہو۔ تمہیں وہاں اخلاقیات سے گرے ہوئے لوگ قدم قدم ملیں گے۔ جنہیں اقبال جرم تو کیا ہلکا سا اپنے گناہوں کا احساس تک نہیں ہوتا۔"

ایک نیک طبیعت، خلیق انسان کی زبانی اپنی تعریف سن کر اسے سکون محسوس ہوا۔ ہلکی مسکراہٹ اور بشاشت اس کے چہرے پر نمایاں تھی۔ وہ نہایت اپنائیت سے بولے۔

"اٹھو بیٹا۔ گھر جاؤ۔ تمہارے سامنے فقط ایک ہی رستہ ہے۔ کوئی چوائس نہیں ہے۔ احساس ہو گیا ہے کہ تمہارے مسائل تمہارے غلط فیصلوں کے سبب ہیں تو اب اس کا حل بھی تم ہی نکالو گے۔"

"مولانا صاحب! اس دل جوئی کا کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں؟" اس کے لہجے میں تشکر تھا۔

"شکریہ کس بات کا بیٹے۔ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔" ان کے لہجے میں کمال کا سکون و اطمینان تھا۔ وہ اس نصیحت کو محسوس کرتا ہوا کھڑا ہو گیا اور ان سے مصافحہ کر کے مسجد کے داخلی دروازے سے باہر نکل گیا۔

"فرشتہ خصائل، راہبر، مسیحا اور محسن آپ کو کن کن ناموں سے پکاروں۔" وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بڑبڑایا۔

✡ ✡ ✡

موبائل پر بیل ہوئی تو وہ چونک کر آنکھیں ملتا ہوا بیٹھ گیا۔ ڈیسنی اسپتال جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ اسے حقارت سے دیکھ کر بیگ اٹھانے لگی۔ تو آصف نے آگے بڑھ کر بازو پکڑ لیا اور پیار سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"ادھر آؤ، بہت حسین لگ رہی ہو۔ تھوڑا لیٹ ہو جاؤ گی تو کوئی قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔" ڈیسنی نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑایا اور قہر آلود نظروں سے دیکھ کر باہر نکل گئی۔ آصف حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔

تیار ہو کر وہ ماں کے کمرے کی طرف چل دیا۔ ایک آخری اور حتمی فیصلے کے ساتھ۔

"ممی! میں آپ کے پاس ہمیشہ کے لیے شفٹ ہونا چاہتا ہوں۔" وہ ہارے ہوئے لہجے میں بولا۔

"خیر تو ہے۔ وہ اس کے سامنے چائے رکھتے ہوئے بولیں۔" اپنے بچوں میں آباد خوش و خرم رہو۔ یہی ہماری خوشی ہے بیٹا' یہی ہماری دعا ہے تمہارے لیے۔"

"ممی۔۔۔ ڈیسنی سے پیدا ہونے والی اولاد آپ کی اور میری نہیں ہو سکتی۔ وہ بہت خودسر اور بدتمیز عورت ہے۔ اسے میری کوئی بات سمجھ نہیں آتی۔ میں جب بھی ابراہیم کو اپنے ساتھ نماز جمعہ کے لیے تیار کرتا ہوں تو گھر میں اک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ جبکہ وہ ہر سنڈے انہیں باقاعدگی سے چرچ لے جاتی ہے۔ کبھی آپ سے ملنے کی ضرورت محسوس کرتی ہے۔ نہ ہی سیدھے منہ مجھ سے بات کرتی ہے۔ بتائیے کہ کب تلک اسے برداشت کر سکتا ہوں۔ اب میرے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا ہے۔ میں ایسی عورت کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔" وہ مستحکم لہجے میں بولا۔

"سوچ لو بیٹا۔ بیوی اور گھر تو جائے گا ہی۔ بچے بھی ہاتھ سے نکل جائیں گے۔" وہ خوف سے لرز اٹھی تھیں۔

"ممی! بچے اب میرے ہیں نہ ہی کل میرے ہوں گے۔ آپ بھی انہیں بھول جائیں۔ باقی رہی بات ڈیسنی کی' تو میں جانتا ہوں کہ سراسر دنیاوی خسارہ ہمارا ہی ہو گا۔ ممی اللہ تعالیٰ بہتری کرے گا۔ مجھے ان دنیاوی عارضی اور وقتی آسائشات کا قطعاً" لالچ نہیں رہا۔ وہ جو لینا چاہتی ہے۔ حاضر ہے۔ اس کا حق بنتا ہے۔ اسے دینی اصول کے مطابق احسن طریقے سے رخصت کروں گا۔ وہ ماں ہے۔ بچے اس کے دل کا سکون اور آنکھوں کا نور ہیں۔ حالانکہ میں بچوں کو لے کر روپوش ہو سکتا ہوں۔ انہیں انڈین نیشنلٹی دلا کر وہاں سیٹل کر سکتا ہوں۔ لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ یہ زیادتی اور ظلم جہاں اسے دکھی کرے گا وہاں میں بھی دکھی ہو جاؤں گا۔ ممی ہمارے مذہب نے تمام مشکلات میں آسانیاں پیدا کی ہیں۔" وہ نہایت طمانیت بھرے لہجے میں بول رہا تھا۔

"تمہاری باتیں سن کر میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئیں۔

"اتنی بڑی تبدیلی کیسے؟ ہم اپنی اولاد نہیں چھوڑیں گے آصف۔"

"ممی! حوصلہ اور ہمت اولاد ماں سے ہی لیتی ہے۔ مجھے اس کی اس وقت اشد ضرورت ہے؟" وہ ماں کا سر سینے سے لگا کر بولا۔ تو پاپا کمرے سے باہر نکل آئے۔

"ارے یہ صبح سویرے رونا دھونا کیسا؟"

"ممی تمام سچویشن پاپا کو بتا دیجیے گا۔ مجھے اسپتال سے

دیر ہو رہی ہے اور پاپا کو میرا نہایت سوچ بچار سے کیا ہوا فیصلہ بھی سنا دیجیے گا۔" اور وہ ناشتے کی ٹیبل سے اٹھ گیا۔

"میں خود تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔" وہ قریب آکر بولے "میری طبیعت درست نہیں رہتی۔"

"اس وقت نہیں پاپا۔" وہ گھڑی کی طرف دیکھ کر بولا۔

"سی یو لیٹر پاپا۔ آئی ایم گیٹنگ لیٹ۔ آپ کی صحت کے بارے میں شام کو تفصیلاً گفتگو ہو گی۔ ذرا تمام رپورٹس نکال کر تیار رکھیں۔ کل صبح آپ کے تمام چیک اپس کروائے دیتا ہوں۔" عجلت میں کہہ کر آصف باہر نکل گیا۔

"تم کچھ بتاؤ گی کہ روتی ہی رہو گی۔" پاپا پیار سے بیگم کے قریب ڈائننگ چیئر پر بیٹھ گئے۔

"اللہ نے ایک ہی بیٹا دیا تھا مگر افسوس کہ وہ بھی بدنصیب ہے۔" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں۔

"ناشکری مت کرو۔ ذرا سوچو کہ ہمارے خاندان کا کون سا بچہ اس جیسی لائف گزار رہا ہے۔ اسے حسرت سے دیکھتے ہیں سب اور تم کتنی بدنصیب ہو۔ توبہ کرو اور اللہ سے معافی مانگو۔" وہ الجھ کر بولے۔

"کیا آپ کو اس کی فیملی لائف بہتر لگتی ہے۔ مجھے کیا سمجھانا چاہتے ہیں۔ پیسہ ہی دین و ایمان نہیں ہوتا۔ میاں بیوی کا اتفاق اصلی دولت ہے۔ مگر حسب عادت آپ میری کسی بات پر دھیان ہی نہیں دیں گے۔" وہ سینے کو مسلتے ہوئے بولیں۔ آج تو جیسے نوک دار کانٹا ہی دل کے آرپار ہو گیا ہے۔

"اچھے بھلے ایک ساتھ رہ رہے ہیں۔ اب تم کیا چاہتی ہو کہ بہو ہر وقت تمہارے آگے پیچھے پھرے، اب تو وہ زمانہ ہے کہ اپنے خاندان سے لائی ہوئی بہو بھی ہمیں گھاس نہیں ڈالے گی۔ آج بچیاں پڑھ لکھ کر میاں کے ساتھ کھڑی ہیں۔ ان کی دہری ڈیوٹی ہے گھر بھی سنبھالو۔ بچے بھی پالو۔ ان کی مہربانی ہے بھئی۔ تم نجانے کیا ڈیمانڈ کرتی ہو اس سے یہ تو ہے بھی فرنگیوں کی اولاد۔" وہ نرمی سے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"تو کیا ہماری نسل فرنگیوں سے اٹھے گی بے دین اور پلید۔" وہ بہت دکھی تھیں۔

"کیا آصف نے کوئی فیصلہ کرلیا ہے۔" وہ پریشانی سے بولے۔ ان کی حالت خراب ہونے لگی تھی۔

"ہاں آصف نے فیصلہ کیا ہے وہ بیوی بچوں کو چھوڑ دے گا۔"

"کیا۔" وہ دکھ کی شدت سے ان سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

"آپ فکر نہ کریں۔" وہ بمشکل بولیں۔ کیونکہ وہ ہارٹ پیشنٹ تھے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر پانی کا گلاس لے کر آئیں۔ وہ بھی قریبی کرسی پر بیٹھ کر پانی پینے لگے۔ مگر جوں ہی گلاس ٹیبل پر رکھا ساتھ ہی کرسی سے لڑھک کر فرش پر گر گئے۔ ان کی ہمت جواب دے گئی وہ لڑکھڑاتی ہوئی۔ اٹھیں اور انہیں پکارنے لگیں۔ ان کے سانس کی آواز کمرے میں منتشر ہو رہی تھی۔

"آنکھیں کھولیے۔" جواب نہ پا کر وہ چکرا گئیں اور ان ہی کے قریب ڈھے گئیں۔ کمرے میں موت کا سکوت تھا۔

باہر ہوا میں جھومتے ہوئے خزاں رسیدہ درختوں سے سوکھے پتوں کی بارش اور سڑک پر اڑتے ہوئے پتوں کی چرچراہٹ موت کا سماں پیش کر رہی تھی۔ ماحول میں پھیلی ہوئی اداسی اور اجنبیت اپنے ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔ نالہ و فغاں اور ماتم کناں در و دیوار نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ اس دیار غیر میں اپنوں سے دور لاچار و بے بس لاوارثوں کی طرح اوندھے منہ پڑے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی قسموں کو مان لیا تھا۔ عہد و پیمان کی لاج رکھ لی تھی۔ ساتھ جئیں گے ساتھ مریں گے۔ جسے مذاق ہی کہا جاتا ہے۔ آج باری تعالیٰ نے اس پر سچائی کی مہر لگا کر انہیں سرخروئی سے نواز دیا تھا۔

(باقی آئندہ)

☆ ☆

سویرا فلک
بدلتے چہرے

"سنیں۔ وہ منیرہ بھابھی کے پاس کب چلنا ہے کارڈ دینے کے لیے۔" میں نے دعوت ناموں پر نام لکھتے ہوئے اپنے شوہر سے پوچھا۔

"منیرہ بھابھی۔ ان کو بھی بلانا ہے کیا؟" سلمان کے حیرت بھرے انداز نے خود مجھے ہی حیرت میں مبتلا کردیا۔

"ظاہر ہے سلمان۔ اگر عابد بھائی نہیں رہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہمارا ان کی فیملی سے رشتہ ہی ختم ہوگیا۔" میں نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"یار وہ کوئی سگے تو نہیں ہیں ہمارے۔ اس لیے کہہ رہا تھا۔" سلمان نے کندھے اچکائے۔

"تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ عابد بھائی آپ کے منہ بولے بھائی ضرور تھے۔ مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہمارے آڑے وقتوں میں کتنا ساتھ دیا ہے۔ انہوں نے یہ گھر بنانے میں نہ صرف مالی معاونت کی، بلکہ جب آپ کا ٹرانسفر لاہور والی برانچ میں ہوگیا تو کام رک نہ جانے۔ انہوں نے اپنے آفس سے چھٹیاں لیں۔ کنزی کی ڈلیوری کے بعد میری طبیعت کتنی خراب ہوگئی تھی۔ انہوں نے بیٹی، بہن سمجھ کر گھر لے جاکر رکھا اور اتنا خیال کیا کہ میکے کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ میری ماں نہیں، بہن نہیں۔ اس کا احساس تک نہیں ہونے دیا۔ مجھے حقیقتاً" عابد بھائی اور منیرہ بھابھی کا کیا ہر احسان یاد تھا۔ میں تو تھی ہی پیرنٹس کی اکلوتی اولاد، اس پہ شادی کے چھ ماہ بعد ہی امی پاپا کا کار کے حادثے میں انتقال ہوگیا۔ سسرال میں کوئی عورت نہ تھی۔ ایک سسر اور ایک جیٹھ غیر شادی شدہ تھے۔ وہ بھی آدم بےزار ہی ہو چلے تھے۔ عابد بھائی ہمارے برے دنوں کے ساتھی تھے۔ وہ تھے تو ہمارے پڑوسی۔ مگر حالات نے ساتھ جوڑ دیا تھا۔ جب شادی کے بعد ایک نچلے طبقے میں دو کمروں کے مکان میں۔ میں اور سلمان، سامان لے کر اترے تو عابد بھائی اور منیرہ بھابھی ہی نے ہمیں خوش آمدید کہا اور ہمارے اکیلے پن کا جان کر انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "حنا بیٹی! تم مجھے اپنی بھابھی کو اپنا سسرالی سمجھو یا میکے والا۔ جان لو کہ ہم تمہارے اپنے ہیں اور آج کے بعد میں نہ سنوں کہ تم لوگوں کا کوئی نہیں۔" اور پھر ان لوگوں نے واقعی اپنوں سے بڑھ کر ہمارا ساتھ دیا۔ وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا، کچھ سلمان کی اپنی لگن تھی، کچھ میری دعاؤں کو قبولیت مل گئی کہ ہم پر سے کڑا وقت ڈھل ہی گیا۔ عابد بھائی ہی کی کوششوں سے سلمان کو سرکاری جاب مل گئی۔ وقتی طور پر جوائننگ دینے کے لیے لاہور جانا پڑا۔ پھر واپس کراچی آگئے۔ سلمان کے والد نے بیٹوں کے نام پلاٹ کیا ہوا تھا۔ بینک سے لون لے کر ہم نے سب سے پہلے اپنی چھت کا انتظام کیا۔ اس عرصے میں ہمارے کھانے پینے کی ذمہ داری عابد بھائی نے اپنے سر لے لی۔ پھر گھر کی تعمیر کے بعد ہم نسبتاً" بہتر علاقے میں شفٹ ہوگئے۔ سلمان کی پوسٹ اچھی تھی تو تنخواہ بھی ٹھیک ٹھاک تھی۔ سو ہم نے گاڑی بھی لے لی۔ کنزی کو اچھے اسکول میں داخل کروادیا۔ میں بلال اور علینہ کی اوپر تلے آمد کے باعث انتہائی مصروف ہوگئی۔ ادھر سلمان نے پارٹ ٹائم کے طور پر محلے میں ہی چھوٹی سی دکان بھی کرلی۔ اسی عرصے میں کسی اور واقف کار نے اطلاع دی کہ عابد بھائی کا انتقال ہوگیا۔ میں اور سلمان گئے، مگر میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ سلمان نے بے اختیاری طور پر آخری رسومات میں شرکت کی اور جانے کس احساس کے تحت محض دو، دو سو روپے ان کے چاروں بچوں کے ہاتھ پر رکھ آئے۔ میں نے منیرہ بھابھی کو اپنے آتے رہنے کی امید تو دلائی، مگر سلمان کی عدم دلچسپی کے باعث میں وہ وعدہ نبھا نہ پائی۔ مجھے سلمان کے بدلاؤ پر حیرت بھی تھی اور افسوس بھی۔ میں نے اس کا اظہار بھی کیا، مگر سلمان نے مجھے یہ کہہ کر چپ کرادیا کہ جو احسانات انہوں نے کیے، اس کے لیے ہم ہاتھ پیر نہیں پڑے اور عابد بھائی سے لیا جانے والا قرضہ بھی وہ اتار چکے ہیں اور میں چاہ کر بھی سلمان کو نہ سمجھا پائی کہ قرض صرف مال کی صورت میں تو نہیں ہوتا۔ کچھ حقوق بھی قرض کی طرح ہوتے ہیں جو

ادا کرنے ہوتے ہیں۔ مگر آج جب ہمارے گھر کی پہلی تقریب تھی اور ہم کنزی، بلال اور علینہ کا مشترکہ عقیقہ کرنے جارہے تھے اور میرے ذہن میں سارا ماضی گھوم رہا تھا تو میں نے دعوت ناموں میں منیرہ بھابھی کا نام بھی شامل کیا اور سلمان کو بھی ان کی اہمیت کا احساس دلایا۔ "ٹھیک ہے پھر تم چلی جانا۔ میرے پاس تو ٹائم نہیں ہے۔ مجھے انتظامات بھی فائنل کرنے ہیں۔" سلمان نے میرے اصرار کے باوجود عین وہی بہانہ تراشا جس کی مجھے توقع تھی۔ مجھے سخت نیند آرہی تھی۔ اس لیے میں نے کارڈز سمیٹ کر سائیڈ لیمپ آف کیا اور آنکھیں موند کر لیٹ گئی۔ سلمان دوبارہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوگئے ــــ سلمان میرے شوہر ضرور تھے اور مجھے اپنے شوہر سے محبت بھی تھی۔ مگر ان کی خود غرضی کی عادت مجھے بے حد کھٹکتی تھی اور میں ممکنہ حد تک انہیں اس حوالے سے روکتی ٹوکتی بھی رہتی تھی۔ کیوں کہ آپ اپنوں کو دلدل میں گرتا تو نہیں دیکھ سکتے نا۔ اب یہی دیکھیے نا بچوں کے عقیقہ پر میری خواہش تھی کہ تمام عزیز و اقارب ہی شریک ہوں۔ جبکہ سلمان کی خواہش صرف ان لوگوں کو مدعو کرنے کی تھی جنہیں اہم ہونے کا احساس دلا کر انہیں خوش کرنا مقصود تھا ــــ سچی اور بے لوث چاہتوں کے مفہوم سے تو شاید سلمان آگاہ تھے ہی نہیں۔ اس تقریب کے اختتام پر میں جہاں ایک فرض کی ادائیگی اور بچوں کو ملنے والی دعاؤں کے زیر اثر سرشار تھی وہیں سلمان نفع و نقصان کا حساب لگانے بیٹھے ہوئے تھے۔

"دیکھ لیا' اسجد کس قدر گفٹس لے کر آیا ہے۔ بچوں کے لیے کپڑے' کھلونے' میرے اور تمہارے لیے ڈریس اور سوٹس ــ اس کے علاوہ کیش' پھول' مٹھائی الگ۔" سلمان اپنے کولیگ اسجد کے گفٹس کھولے بیٹھے تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے اس کے گفٹس ہی چیک کیے "اور یہ دیکھو تمہاری وہ منیرہ بھابھی ــ چار چار بچے لے کر پہنچ گئیں اور سو' سو روپے لفافے میں ڈال کر پکڑا گئیں۔ ارے ایسے لوگ صرف کھانے پینے آتے ہیں۔" سلمان نے مزید لفافے کھولتے ہوئے کہا۔

"سلمان ہر بندہ اپنے رزق کا ہی کھاتا ہے۔ ہم کسی کو تھوڑا ہی کھلا رہے ہیں۔ اوپر والا کھلاتا ہے اور منیرہ بھابھی' بیوہ عورت ہیں۔ بہت ہے جو اتنے بھی دے دیے ــــ خود اپنا گزارہ کیسے ہوتا ہوگا ان کا۔ آپ اسجد بھائی سے کہاں ان کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ تحفوں سے انسان کی قدر و منزلت کو نہیں تولا جاتا۔ آپ نے سنا نہیں تحفے کو نہیں تحفے دینے والے کے خلوص کو دیکھنا چاہیے۔ منیرہ بھابھی اکیلی اتنی دور سے محض تقریب میں شرکت کے لیے آئی تھیں۔ کس قدر دعائیں دے رہی تھیں۔" میں نے پھر اپنی کوشش جاری کر دی۔ کیونکہ بھلائی کے راستے کی طرف بلانا میرا فرض تھا۔

"یار تم کس دنیا میں رہتی ہو۔ یہ سب ڈھکوسلے بازی ہے۔ جو زیادہ باتیں بناتے ہیں' وہی پورے ہوتے ہیں اندر سے۔ منیرہ بھابھی کو بھی تم غریب غرباء مت سمجھو۔ عابد بھائی کی پنشن آتی ہے اوپر کی منزل الگ اٹھائی ہے کرائے پر۔ اچھا اب یہ سب سمیٹو۔ مجھے نیند آرہی ہے' کل آفس بھی جانا ہے۔"

سلمان نے سارا سامان میری طرف دھکیلا اور جمائیاں لیتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ کھڑے ہوئے اور میں انہیں بیڈ روم کی طرف جاتا دیکھ کر انتہائی تاسف سے یہ سوچنے لگی۔ میں تو اسی دنیا میں رہتی ہوں' اس لیے جانتی ہوں کہ اولڈ ایج بینیفٹ کے طور پر ملنے والی رقم پنشن نہیں ہوتی اور نہ ہی تین ہزار ملنے والی کرائے کی رقم سے گھر چلا کرتے ہیں۔ کاش آپ نے میری طرح کبھی منیرہ بھابھی سے پوچھا ہوتا تو آپ سمجھ جاتے اور آپ کو مجھے سمجھانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

☼ ☼ ☼

وقت کا کام گزرنا ہے' سو وہ گزرتی جاتا ہے۔ کل ہم نے بچوں کا عقیقہ کیا تھا اور اب ان کی شادیاں کرنے

کا وقت آگیا تھا۔ میری کنزی کو رخصت کرنے کا وقت آگیا۔ میں خوشی و غم کے ملے جلے جذبات کے ساتھ شادی کی تیاریوں میں معروف تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے فقط ایک ماہ رہ گیا تھا۔ میں پہلی شادی اور اوپر سے بیٹی کی شادی کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی فکر مند اور ہلکان ہو رہی تھی۔ بار بار سلمان سے تصدیق کرتی رہتی۔

"سنیں آپ نے خود فون کیا تھا نا قاضی صاحب کو۔ ٹائم کو کنفرم کروایا ہے نا۔" میں نے تھکن سے بوجھل ہوتی آنکھوں سے چشمہ اتار کر آئی بروز کو انگلیوں سے پریس کیا۔

"ہاں بھئی کہہ دیا ہے۔ محب کل ہال اور کھانے کے انتظامات بھی دیکھ کر آجائے گا۔ میں اور تم بس جیولر کے پاس جاکر آرڈر کنفرم کردیں گے اور جو دس بارہ کارڈ باقی ہیں وہ دے کر آجائیں گے تم بے فکر ہو جاؤ اور ریلیکس رہو۔ اتنی ٹینشن مت لو یار۔"

سلمان نے آہستگی سے میرے بالوں کو سہلایا۔

"کیا کروں سلمان۔۔۔ بچے تو بچے ہیں۔۔۔ پھر لڑکی والے ہیں۔ دھڑکا رہتا ہے کہیں کوئی کمی نہ ہو جائے۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ کے سپرد کردو۔ سارے معاملات، تم تھک بھی بہت گئی ہو۔ اب سو جاؤ۔" سلمان نے لائٹس آف کیں تو میں نے بھی آنکھیں موند لیں۔

پھر دوسرے دن جب سلمان نے ڈرائیور سے کہہ کر گاڑی منیرہ بھابھی کے گھر کی طرف کروائی تو میں حیران ہو کر انہیں تکنے لگی۔

"ارے بھئی شادی بیاہ کا موقع ہے۔ کہیں بھابھی برا نہ مان جائیں۔ اس لیے میں نے سوچا تمہارے ساتھ مجھے بھی چلنا چاہیے۔"

کیا میری کوششیں رنگ لے آئی تھیں میں ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔ منیرہ بھابھی ہمیں ساتھ دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ بہت اصرار کرکے انہوں نے ہمیں پر تکلف ناشتا بھی کروایا۔ ان کا دو منزلہ مکان اب تین منزلہ خوب صورت پر آسائش گھر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ بچیاں یونیورسٹی سے ماسٹرز کر رہی تھیں۔ بڑا بیٹا فرحان ڈاکٹر بن گیا تھا، جبکہ چھوٹا بیٹا عدنان انجینئرنگ کرکے باہر سیٹل ہو گیا تھا۔ مگر آج کل اتفاق سے یہاں آیا ہوا تھا۔ منیرہ بھابھی کے بچے بھی ان کی طرح پر خلوص اور شائستہ طبیعت کے مالک تھے۔ باتوں کے دوران ہی سلمان نے بتایا کہ وہ فرحان سے اتفاقیہ طور پر ایک اسپتال میں ملاقات کرچکے ہیں اور وہ، تین بار خود بھی چکر لگا چکے ہیں۔ میں یہ سب جان کر خوش بھی تھی اور حیران بھی۔ مگر سلمان کا بدلاؤ اور مثبت رویہ مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ پھر مجھ سے رہا نہ گیا اور گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے سلمان سے وجہ جاننے کے لیے زبان ہلائی تھی کہ سلمان کے پے در پے انکشافات نے میری زبان سمیت میرے تمام وجود کو سن کردیا۔

"مسنو ڈھولکی سے پہلے ہی ڈرائیور بھیج کر سب کو بلوالینا۔ علینہ سے کہنا بھابھی کا خاص خیال رکھے۔ تم نے دیکھا گھر کا ایک بندہ بھی باہر چلا جائے تو سارے گھر والوں کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ میں شادی سے فارغ ہوتے ہی عدنان سے محب کے لیے بات کروں گا۔ تم بھی ذرا خود کو بدلو۔ تمہاری ممتا ایک طرف، مگر بچوں کے ماں، باپ کو ہی قربانی دینا پڑتی ہے۔ ڈرائیور طارق روڈ چلو۔ جیولری آرڈر بھی کنفرم کرلیں۔" سلمان نے ڈرائیور کو ہدایات دے کر موبائل پر Messags (پیغامات) چیک کرنا شروع کردیے اور میں حیرت سے اس انسان کو تکنے لگی جس کی فطرت میں نہیں بدل پائی۔

☆ ☆

ناولٹ
بی سحر ملک
سنہری خواب
www.paksociety.com
www.paksociety.com
SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی دھوپ صحن چھوڑ کر دیواروں پر جا بیٹھی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر سرکتی ہوئی ٹھنڈی دھوپ کو دیکھا اور دوبارہ سے گھٹنوں پر سر رکھ کر بیٹھ گئی۔ قریب ہی دانا چگتی مرغیوں کی آواز بھی اس کی محویت توڑنے میں ناکام تھی۔ حالانکہ مرغیوں کی آواز سے اسے بے حد چڑ تھی۔

"آمنہ۔۔۔ آمنہ۔۔۔" اس نے بے دلی سے اماں کی طرف دیکھا۔

"آمنہ۔۔۔ اٹھ میرا پتر نماز کا ٹائم نکلا جا رہا ہے۔" اماں یقیناً وضو کر کے آئی تھیں ان کے سلوٹ زدہ چہرے سے پانی کی ننھی اور شفاف بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ وہ ایک ٹک اماں کا چہرہ دیکھے جا رہی تھی۔ اماں نے آگے بڑھ کر اس کا کندھا ہلایا۔

"پتر اٹھ جانا۔۔۔ جان بوجھ کر نماز دیر سے پڑھنے سے اللہ سوہنا ناراض ہوتا ہے میری دھی۔"

وہ کچھ نہیں بولی اور ادھر سے اٹھ گئی۔ عصر کی نماز کا وقت واقعی تھوڑا رہ گیا تھا۔ مشینی انداز میں اٹھ کر اس نے وضو کے لیے لوٹا بھرا اور آہستہ آہستہ وضو کرنے لگی۔

"السلام علیکم" مراد علی کی آواز سنتے ہی وہ بجلی سی تیزی سے کھڑی ہو گئی' وہ اماں کے پاس کھڑا تھا۔ اماں کو جائے نماز بچھاتے دیکھ کر وہ اندر کی طرف آ گیا۔ مراد علی کو دیکھ کر خفگی کے اظہار کے لیے وہ گول کمرے میں چلی گئی۔

"ناراض ہو؟" اس نے آمنہ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔

"تمہیں کیا؟" حسب توقع جواب سن کر وہ زیر لب مسکرا اٹھا۔

"آج سارا رستہ خراب تھا۔ بارش کی وجہ سے کیچڑ اتنا تھا۔ میں ایک دو دن میں۔۔۔"

"پتا ہے مجھے سب۔۔۔" اس نے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔ "سارا دن جھوٹے بہانے ہی گھڑتے رہتے ہو۔ مجھے پتا ہے میرے لیے وقت ہی نہیں ہے تمہارے پاس۔۔۔ خیر جاؤ اب میں نے نماز پڑھنی ہے۔" اسے وہیں کھڑا دیکھ کر ناراضی سے وہ باہر نکل آئی۔ اس سے پہلے کہ مراد علی اس کے پیچھے آتا اس نے نماز شروع کر لی تھی اک ٹھنڈی سانس لے کر مراد علی گھر کی دہلیز پار کر گیا۔

☼ ☼ ☼

رنگین پیڑھے پر کھڑے ہو کر اس نے ہاتھ مضبوطی سے منڈیر پر جمائے اور دیوار کے دوسری طرف جھانکنے لگی۔ اپنے گھر کی طرح ساتھ والٹ کا زرد بلب ادھر بھی روشنی پھیلانے میں ناکام ہو رہا تھا' اگرچہ پوری تاریخوں کا چاند تھا پھر بھی مجموعی تاثر اندھیرے کا ہی تھا کیونکہ آج پھر بادلوں نے چاند کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس نے ساتھ والے گھر کے صحن میں نظر دوڑائی۔ جامن کے پیڑ کے نیچے مٹی کا گھڑا اور مٹی کا پیالہ پڑا تھا۔ اس کے ساتھ بڑی چارپائی خالی تھی۔ اس نے سیڑھیوں کی طرف نظر پھیری وہ بھی سنسان تھیں۔ اسے رہ رہ کر خود پر غصہ آنے لگا۔ کیا تھا اگر وہ مراد سے بات کر لیتی۔ وہ کتنا ہی ناراض ہوتی مراد اسے منا لیتا تھا اور خود وہ کبھی ناراض ہوتا نہیں تھا کیونکہ آمنہ کو منانا نہیں آتا تھا۔ وہ افسردگی سے نیچے اترنے لگی اچانک اس کا توازن بگڑ گیا۔ اس سے پہلے وہ دھڑام سے نیچے گرتی مضبوط ہاتھ نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ اس نے سختی سے آنکھیں میچ رکھی تھیں۔ اپنی کلائی پر گرفت محسوس ہوتے ہی اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں مراد اس کے سامنے کھڑا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ شکر گزار ہوتی وہ اس سے پھر ناراض ہو گئی۔

"میں نہیں بولتی تم سے۔" کلائی چھڑوا کر وہ مٹی سے لیپ کی گئی سیڑھیوں پر جا بیٹھی۔ انداز سے لاپرواہی عیاں تھی۔

"کان پکڑ لوں؟" اس نے شرارت سے آمنہ کا کان پکڑا۔ آمنہ نے بے مروتی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"بڑے نخرے ہو گئے ہیں آج کل اتنے اتنے گھنٹے پتا نہیں کہاں گم رہتے ہو۔"

"تو تم مجھے یاد کر رہی تھیں؟" مراد کی آنکھوں کی

چمک بڑھ گئی تھی۔

"کیوں مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔ وہ تو نازیہ نے دو تین بار تمہارا پوچھا تھا تو مجھے پتا چلا تم گھر پہ نہیں ہو۔" مراد کی آنکھوں سے سب جگنو ایک دم اڑ گئے تھے۔

"شہر گیا تھا۔ تمہارے لیے یہ کتابیں لایا ہوں۔" آمنہ نے بے دھیانی میں اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا پیکٹ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے کتابیں آمنہ کی گود میں رکھ دیں اور واپس مڑ گیا۔

"مراد۔" کتابیں کھول کر دیکھے بنا وہ اس کے پیچھے آگئی۔

"ہاں بولو۔"

"تم تب سے شہر گئے تھے؟ میرے لیے؟" اس کے لہجے میں مان تھا۔

تھوڑی دیر پہلے مراد نے اسی مان سے اس سے پوچھا تھا کہ تم مجھے یاد کر رہی تھیں۔ ہونٹوں پر اک نرم سی مسکراہٹ لا کر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسی لمحے چاند بھی بادلوں کی گرفت سے آزاد ہوا تھا۔ آمنہ کا چہرہ روشن ہو گیا تھا۔ اس کی بے داغ سرخ و سفید جلد چمک رہی تھی۔ مراد نے بمشکل اس کے چہرے سے نظریں ہٹائی تھیں۔

"اب پڑھنے نہ بیٹھ جانا کتابیں رکھ کر سو جاؤ۔" اس نے مسکرا کر جاتے ہوئے مراد علی کو دیکھا۔

☼ ☼ ☼

پانچ بہن بھائیوں میں آمنہ چوتھے نمبر پر تھی۔ بڑی دو بہنیں شادی شدہ تھیں۔ تیسری کی بھی منگنی ہو چکی تھی پھر آمنہ تھی۔ آمنہ کو پڑھنے کا بے انتہا شوق تھا۔ گاؤں کے اکلوتے اسکول سے میٹرک کے بعد سال بھر فارغ رہی اب پھر پڑھائی کا جنون ستا رہا تھا۔ گاؤں میں اگرچہ میٹرک کے بعد پڑھائی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا پھر بھی آمنہ کا شوق کچھ نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ وہ کہتی تھی میں گھر میں خود ہی پڑھ لوں گی۔ اپنا بھائی تو فقط پانچ سال کا تھا اور ابا گرتی ہوئی طبیعت کے باعث شہر جانے سے قاصر تھے سو ساتھ والے گھر میں مراد علی کا وجود اس کے لیے غنیمت تھا۔ مراد علی آمنہ کے تایا کا بیٹا تھا۔ نازیہ اور مراد علی دو ہی بہن بھائی تھے۔ مراد ہی کی بدولت آمنہ نے میٹرک کیا تھا کیونکہ وہ خود بھی میٹرک پاس تھا اور آمنہ کا شوق دیکھتے ہوئے اس کی ہر طرح سے مدد کر دیا کرتا تھا۔ شہر سے کتابیں، رسائل لا کر دینا اسے اپنی ذمہ داری محسوس ہوتا تھا۔ چاچا کا خیال رکھنے کی غرض سے وہ اکثر گھر باہر کے چھوٹے موٹے ڈھیروں کام نبٹا دیتا تھا۔ آمنہ کا وہ کچھ زیادہ ہی خیال رکھتا تھا۔ سب یہی سمجھتے تھے کہ آمنہ پڑھنے کی شوقین ہے اس لیے مراد اس کی پڑھائی میں مدد کرتا اور اس کا خیال رکھتا ہے۔ یوں بھی سنجیدہ، بردبار اور حلیم مزاج مراد علی کے بارے میں کوئی بھی غلط سوچ رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اب یہ مراد علی ہی جانتا تھا کہ اس کا دل کس راہ کا مسافر ہو گیا ہے۔ آمنہ کو وہ تب سے بے اختیار چاہ رہا تھا جب اسے چاہنے کا مطلب بھی معلوم نہیں تھا۔ بس ہر وقت اسے دیکھنے، خوش دیکھنے کی خواہش رہتی۔ ہزار تھکاوٹ کے بعد بھی آمنہ کے لیے کہیں بھی جانے اور کچھ بھی کرنے کو تیار رہتا۔ آمنہ کے چھوٹے چھوٹے کام کر کے اسے جو خوشی ملتی بیان سے باہر تھی۔ پتا نہیں آمنہ اس کی محبت کو سمجھتی تھی یا نہیں لیکن وہ دیوانہ وار اسے چاہے چلا جا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا نازیہ کی کہیں بات پکی ہو جائے تو وہ بھی گھر میں اپنی خواہش کا اظہار کر دے گا۔ وہ جانتا تھا چاچا، چاچی بہت خوش ہوں گے اور یہ بھی پتا تھا کہ انکار وہ بھی نہیں کرے گی۔

انسان جو گمان رکھے وہی سب ہونے لگے تو انسان کو کبھی خدا کے وجود کا احساس بھی نہ ہو۔

☼ ☼ ☼

جائے نماز تہ کر کے وہ پلٹی تو چارپائی پر اس کی کتابوں کے پاس مراد بیٹھا ہوا اس کا رجسٹر دیکھ رہا تھا اسے متوجہ پا کر ہولے سے مسکرا دیا۔

"تم نے تو تھوڑے دنوں میں ہی کافی سارا کورس پڑھ لیا ہے۔" اس کے لہجے میں ستائش تھی۔

مسکراتے ہوئے وہ بھی چارپائی کے اک کونے پر ٹک گئی۔ مراد نے رجسٹر واپس کتابوں کے پاس رکھ دیا۔
"ویسے آپ کب آئے؟" بے سوچے سمجھے اس کے ہونٹوں سے لفظ "آپ" ادا ہوا تھا۔ مراد کا دل لمحے میں کہیں اور جا پہنچا تھا۔
"جب تم لمبی سی دعا مانگنا شروع ہوئی تھیں۔"
"لمبی تو نہیں تھی دعا۔"
"ویسے مانگا کیا؟"
"بہت کچھ۔"
"جانتا ہوں پھر بھی کچھ تو بتا دو۔" آمنہ کی دبی دبی مسکراہٹ سے اس کا اصرار بڑھنے لگا تھا۔
"دعائیں بتایا نہیں کرتے نا تاثیر کم ہو جاتی ہے۔" اس کے اس بچکانہ سے جواب کو سن کر وہ کھل کر ہنس پڑا۔
"اچھا بابا مت بتاؤ۔۔۔ یہ دیکھو میں کیا لایا ہوں۔" چارپائی پر پڑا ہوا شاپر اٹھا کر اس نے اس میں سے ایک ڈبا نکالا۔ پہلے تو آمنہ سمجھی نہیں لیکن جب ڈبے پر بنا موبائل دیکھا تو خوشی سے تقریباً" چلا اٹھی۔
"یہ کب لیا؟"
"ابھی شہر سے لایا ہوں سوچا سب سے پہلے تمہیں دکھاؤں۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ سمپل اور سستا سا سیٹ تھا لیکن آمنہ نے زندگی میں پہلی بار کوئی موبائل چھوا تھا۔ اس کی خوشی دیدنی تھی۔
"سب سے پہلے مجھے کیوں دکھایا؟"
"پتا نہیں۔" مراد کی آواز اتنی آہستہ تھی کہ وہ خود بھی سن نہیں پایا۔
"اوہ میرے اللہ۔۔۔ پکڑو یہ۔ میں ذرا چاول دیکھ آؤں۔ دھو کر آئی ہوں مرغیوں نے کہیں ستیاناس نہ کر دیا ہو۔" موبائل مراد کے ہاتھ میں دے کر وہ تیزی سے باہر بھاگی تھی۔ مراد نے شاپر اور ڈبا اٹھایا اور خود بھی باہر آ گیا۔ بڑے سے کچے صحن میں لگے امرود اور جامن کے درختوں کے نیچے وہ کمر پر دوپٹا باندھے مرغیوں کو ڈراتی ہوئی ڈربے میں بند کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا شاخ سی لچک والا جسم پل میں ادھر جھکتا اور پل میں ادھر۔ اس کی چاندی جیسی رنگت دھوپ میں سنہری ہو رہی تھی۔ مراد کے دل میں بے تحاشا سکون اترا تھا۔ اس کے عنابی ہونٹ گول دائرے کی شکل میں سکڑے ہوئے تھے۔ چند لمحے بے خودی میں اسے تکتے رہنے کے بعد مراد اس کے قریب سے گزر کر مشترکہ دیوار والے گھر کے احاطے میں داخل ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

"مراد۔۔۔ مراد۔۔۔ کدھر ہو؟" دالان سے ہوتی وہ گھر کے ہر کمرے میں اسے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔
"کیا ہوا آمنہ کیوں شور مچا رہی ہو؟" نازیہ کونے میں چھوٹے سے کچن نما کمرے میں آٹا گوندھ رہی تھی۔ اس کی آواز سنی تو باہر آ گئی۔
"کیونکہ تمہارے بھائی سے کام ہے اور وہ مجھے مل نہیں رہا۔"
"میرا بھائی تمہارا کیا لگتا ہے؟" ہمیشہ کی طرح نازیہ چڑ کر بولی تھی۔
"جو بھی لگتا ہے' بھائی تو وہ پھر بھی تمہارا ہی ہے۔" مزے سے جواب دے کر وہ مراد کو آوازیں دیتی چوبی منقش دروازے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ دروازے پر ایک ہاتھ سے دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ کچی مٹی سے لیپ کی ہوئی صاف ستھری دیواروں پر سفید دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ چارپائی پر سفید بے داغ و بے شکن چادر بچھی تھی۔ چوبی سیاہ الماری کے ساتھ ہی زمین پر بچھے گدے پر وہ پین اور ڈائری لیے بیٹھا تھا۔ دروازے کو دھکیل کر پوری طرح کھولتے ہوئے وہ اندر آ گئی۔ مراد کی نظر اس پر پڑی تو یوں لگا جیسے سارے خواب پورے ہو گئے ہوں۔ وہ شاذ و نادر ہی اس کے کمرے تک آتی تھی۔ مراد نے یہ کمرہ اس کی مرضی کے مطابق سیٹ کیا ہوا تھا۔ آمنہ کو بلب کی زرد روشنی سے چڑ تھی سو اس نے اپنے کمرے میں ٹیوب لائٹ لگوا رکھی تھی۔ آمنہ کو سفید بستر اور سیاہ لکڑی کا فرنیچر پسند تھا۔

پڑھنے کے لیے لپائی کیے ہوئے فرش پر نرم گدا بچھا ہونا چاہیے ایک طرف دیوار گیری الماری میں سلیقے سے کتابیں لگی ہوں۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ ایسے میں صرف اس کی کمی رہ جاتی تھی اور جب کبھی وہ آتی تو یوں لگتا جیسے زندگی مکمل ہو گئی ہو۔ خواہش کے اک حرف کا اضافہ بھی گناہ لگتا۔

"کب سے آوازیں دے رہی ہوں اور تم ادھر بیٹھے محبت نامہ لکھ رہے ہو۔" اسے کھویا ہوا پا کر وہ ادھر دھرے موڑھے پر بیٹھ گئی۔

"میں نے کسے محبت نامے لکھنے ہیں۔ یوں ہی بس۔۔۔ تم سناؤ کیسے آنا ہوا؟" اس نے ڈائری رکھ دی۔ آمنہ نے لپک کر وہ ڈائری اٹھالی۔

"وہ جولاہوں کے گھر خالہ نجمہ کا فون آیا تھا۔ آج آرہی ہیں اور تمہیں تو پتا ہے وہ ہمیشہ سالوں بعد آتی ہیں اور جب آتی ہیں تو تھوڑے سے بدلاؤ کی وجہ سے ہی گھر کا راستہ بھول جاتی ہیں اسٹیشن سے جا کر لے آنا۔" وہ ہمیشہ اسے اسی طرح حکم دیا کرتی تھی۔

"لے آؤں گا کب آنا ہے؟"

"ابھی۔۔۔ میرا مطلب ہے ابھی نکل جاتے۔ پھر اسٹیشن تک جانے میں بھی وقت لگے گا۔" مصروف سے انداز میں کہتے وہ ڈائری کھول کر دیکھ رہی تھی۔ جہاں پین لگا ہوا تھا وہ وہیں سے پڑھنے لگی۔

سوچتے ہیں کہ بہت سادہ و معصوم ہے وہ
ہم ابھی اس کو شناسائے محبت نہ کریں
روح کو اس کی اسیر غم الفت نہ کریں
اس کو رسوا نہ کریں وقف مصیبت نہ کریں
سوچتے ہیں کہ ابھی رنج سے آزاد ہے وہ
واقف درد نہیں خوگر آلام نہیں
سحر عیش میں اس کے اثر شام نہیں
زندگی اس کے لیے زہر بھرا جام نہیں
سوچتے ہیں محبت ہے جوانی کی خزاں
اس نے دیکھا نہیں دنیا میں بہاروں کے سوا
نکہت و نور سے لبریز نظاروں کے سوا
سبزہ زاروں کے سوا اور ستاروں کے سوا
سوچتے ہیں کہ غم دل نہ سنائیں اس کو
سامنے اس کے کبھی راز کو عریاں نہ کریں
خلش دل سے اسے دست و گریباں نہ کریں
اس کے جذبات کو شعلہ بداماں نہ کریں
سوچتے ہیں کہ جلا دے گی محبت اس کو
وہ محبت کی بھلا تاب کہاں لائے گا
خود تو وہ آتش جذبات میں جل جائے گا
اور دنیا کو اس انجام پہ تڑپائے گا
سوچتے ہیں، بہت سادہ و معصوم ہے وہ
ہم اسے واقف الفت نہ کریں۔۔۔

نظم پڑھ کر اس کی عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی۔ کچھ سمجھ میں آئی اور کچھ نہیں۔ اس نے ڈائری وہیں رکھ دی۔ مراد اسے وہیں بیٹھے چھوڑ کر جانے کب وہاں سے چلا گیا تھا۔ وہ پڑھنے میں اتنی مگن تھی کہ اسے پتا ہی نہیں چلا۔ دل میں عجیب سے سوال اٹھ رہے تھے۔

مراد نے کس کے لیے یہ نظم لکھی تھی؟
کیا میرے لیے؟
اگر میرے لیے نہیں تو پھر کس کے لیے؟

اسے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ دل ہی دل میں مراد سے پوچھنے کا سوچ کر وہ وہاں سے واپس آ گئی۔ شام کو خالہ کے آجانے سے وقتی طور پر اس کا دھیان بٹ گیا تھا اور وہ مراد سے پوچھنا بھول گئی۔ خالہ نجمہ اپنی بیٹی عفت کے ساتھ پانچ سال بعد گاؤں آئی تھیں۔ آمنہ کو وہ بہت اچھی لگیں۔ انہوں نے بھی آمنہ کو خوب پیار کیا۔

"حفصہ تمہاری بیٹی تو ماشاء اللہ بڑی پیاری ہو گئی ہے۔" خالہ کی تعریف سن کر وہ شرما جاتی۔ عفت آپی تو اس کی دیوانی ہی ہو رہی تھیں۔

"امی کیا لگاتی ہو؟ تمہاری اسکن تو بہت فریش اور شائنی ہے۔"

"کچھ بھی نہیں لگاتی۔" وہ سادگی سے جواب دے دیتی۔

"او مائی گاڈ۔ امی تمہارے بال تو اتنے خوب صورت ہیں۔ ان کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرتی ہی

ہوگی۔" آمنہ گھبرا کر سر پر دوپٹا ڈال لیتی۔ آمنہ کی شرمانے گھبرانے کی کیفیت سے وہ بہت محظوظ ہوتیں۔ آمنہ کا نام انہوں نے خود ہی امی رکھی لیا تھا۔ آمنہ نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ آمنہ کو خالہ اور عفت آپی سے مل کر سب سے زیادہ خوشی ہوئی تھی۔ جدید تراش خراش کے کپڑے اور ان کے شہری انداز۔ "کاش میں بھی ان جیسی ہو سکتی۔" آمنہ کے دل سے آہ نکلی تھی۔

☼ ☼ ☼

"امی یہ کتابیں کون پڑھتا ہے؟"

امرود کے درخت پر مضبوط شاخوں سے بندھے جھولے پر وہ ایک طرف رسی سے سر ٹکائے جھول رہی تھی۔ زمین پر گلہریوں اور توتوں کے کھائے ہوئے امرود بکھرے تھے زمین پر امرود اور جامن کے پتے ہوا سے ادھر ادھر بھاگتے تو سرسراہٹ سی پیدا ہو رہی تھی۔ گھر سے تھوڑا پرے کھیتوں کو سیراب کرنے کی غرض سے لگا ٹیوب ویل چل رہا تھا۔ وہ محویت سے جھول رہی تھی جب عفت آپی کی آواز نے اس کا ارتکاز توڑا۔

"مراد اور میں ہی تو ہیں جنہیں کتابوں کا مرض لاحق ہے۔"

"مطلب تم۔ تم پڑھی لکھی ہو؟" عفت نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں پچھلے سال فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا تھا۔ اب ادھر لڑکیوں کا کوئی کالج نہیں ہے ورنہ ایف اے بھی کر ہی لیتی۔ خیر نہیں ہوتا ایف اے تو نہ سہی۔ دل کی تسلی کے لیے کتابیں تو پڑھ ہی لیتی ہوں۔" اس کی بات سے عفت مزید حیران ہوئی تھی۔

"اگر تمہیں پڑھنے کا اتنا شوق ہے تو ہمارے ساتھ لاہور چلو ادھر پڑھ لینا۔"

"تو جی۔ لاہور کون جانے دے گا مجھے۔" اس کے لہجے میں اک حسرت سی تھی۔

"میں بات کروں گی خالہ سے۔ تم ہمارے ساتھ چلنا۔ میں خود تمہاری مدد کروا دیا کروں گی۔" عفت کی بات پر اس نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ عفت کی بات اس کے لیے دیوانے کے خواب جیسی تھی تو اس نے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ رات کو کھانے اور عشا کی نماز سے فراغت کے بعد صحن کی کھلی ہوا میں بستر لگا دیے گئے تھے۔ مٹی پر پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا اس لیے زمین سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ ایک چارپائی پر ابا اور تایا فیض بیٹھے دن بھر کے معمولات پر تبصرہ کر رہے تھے تو دوسری چارپائی پر خالہ نجمہ، اماں اور تائی بیٹھی جانے کون کون سے رشتے داروں کی باتیں کر رہی تھیں۔ نازیہ اور عفت بھی خوب صورت نظر آنے کے لیے مروجہ ٹوٹکوں پر سیر حاصل گفتگو میں مشغول تھیں۔ محسن کب کا سو چکا تھا۔ ثمامہ اور آمنہ چھپر تلے کچن نما جگہ میں کام سمیٹ رہی تھیں۔ مراد جانے کہاں تھا۔ آمنہ نے نازیہ سے بھی پوچھا لیکن اسے خود نہیں پتا تھا آمنہ کا سارا دھیان مراد میں اٹکا ہوا تھا۔ بنا بتائے وہ کہیں جاتا تو نہیں تھا لیکن کبھی کبھی بے پروائی کر جاتا تھا۔ آمنہ کو اس پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے آمنہ کو رسالے لا کر دینے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔ دن بھر آمنہ عفت اور اس کے ملٹی میڈیا موبائل کے ساتھ مصروف رہی سو تایا کی طرف جانے کا ذہن سے نکل گیا اور مراد بھی ایسا نا مراد کہ دن میں شکل تک نہیں دکھا کر گیا ورنہ آمنہ اسے یاد ہی کروا دیتی۔ غصے میں وہ برتن ادھر سے ادھر پٹخ رہی تھی۔ اپنے حصے کا کام نبٹا کر ثمامہ بھی عفت اور نازیہ کے پاس چلی گئی تھی۔ اس کا بھی بس تھوڑا ہی کام رہ گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ہاتھ چلا رہی تھی۔ مراد کو اس نے خالی ہاتھ اندر آتے ہوئے دیکھ لیا اس کے غصے میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے کام کرنے کی رفتار مزید دھیمی ہو گئی تھی وہ کن انکھیوں سے باہر دیکھ رہی تھی۔ مراد تایا اور ابا کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک عفت اٹھی اور اماں کے پاس چلی گئی۔

جانے اس نے کیا بات کی تھی کہ وہ دور سے مدھم روشنی میں بھی اماں کے چہرے پر تذبذب کے آثار دیکھ رہی تھی۔ عفت چارپائیوں کے بیچوں بیچ کھڑی

تھی اب اس کا رخ ابا کی طرف تھا۔ پتا نہیں اس نے کیا کہا تھا لیکن آمنہ نے مراد کو ناگواری کے تاثرات چہرے پر لیے اٹھتے دیکھا تھا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ کچھ سن نہیں پا رہی تھی البتہ دیکھ ضرور رہی تھی۔ عفت کسی ماہر وکیل کی طرح دلائل دیتی کبھی اماں اور خالہ کی طرف مڑتی اور کبھی ابا کی طرف۔ خالہ نے کچھ کہا تھا جس کے جواب میں عفت مسکرا کر مطمئن سی دوبارہ تازیہ اور ثمامہ کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ جب تک وہ فارغ ہو کر آئی موضوع بدل چکا تھا۔

عفت کے موبائل پر ہینڈز فری لگا کر گانے سنتے ہوئے وہ بھی پوچھنا بھول گئی تھی لیکن جب سب سونے کے لیے اپنے اپنے بستر پر چلے گئے تو عفت اچانک اٹھ کر اس کے پاس آ گئی۔

"ابھی میں نے خالہ خالو سے تمہاری پڑھائی کے بارے میں بات کی تھی آج۔۔۔ یہی کہ تمہیں ہمارے ساتھ لاہور جانے دیں۔"

آمنہ کی آنکھوں میں الجھن دیکھ کر اس نے ذرا وضاحت سے بات بتائی۔ آمنہ کی آنکھوں میں مراد کا ناگواری سے اٹھ کر جانا گھوم گیا۔ اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آپی کوئی بھی نہیں ماننے گا آپ نے یوں ہی بات کی۔" آمنہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ کچھ دیر پہلے یہی بات ہو رہی تھی۔

"خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں۔۔۔ منا تو میں لوں گی۔"

وہ خاموشی سے لیٹی سیاہ رات کی گود میں مسکراتا چاند دیکھتی رہی۔

"دراصل میں تمہاری دلچسپی سے زیادہ مجھے اپنی فکر ہے۔ رفعت بھی کافی عرصہ ہوا ملک سے باہر چلی گئی ہے اور فرہاد بھائی کی پوسٹنگ بھی اسلام آباد ہو گئی ہے۔ سارا دن گھر میں امی اکیلی ہوتی ہیں شام کو میں اور ابو بھی ہوتے ہیں لیکن گھر میں رونق ذرا نہیں ہوتی۔ وہی ٹی وی پروگرام، وہی گانے، وہی سب کچھ پرانا۔ تم ساتھ چلو گی تو تمہاری پڑھائی کا مسئلہ حل ہو جائے گا اور ہم سب کی بے رنگ زندگی میں تھوڑی تبدیلی آ جائے گی۔"

اس کی لمبی چوڑی وضاحت پر بھی وہ خالی خالی آنکھوں سے اسے تکتی رہی۔

"تم بھی سوچ رہی ہو گی میں کتنی خود غرض ہوں لیکن یقین مانو امی تنہائی سے بڑی اذیت کوئی نہیں ہوتی۔" عفت کے لہجے میں اک اداسی سی جھلک رہی تھی۔

"آپی آپ مجھے لے جانے کا نہ ہی سوچیں کیونکہ گھر والوں کا پتا ہے مجھے۔۔۔"

"کیا تمہیں؟" عفت نے اسے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔ "نہیں جانے دیں گے۔۔۔؟ ابھی میرا وعدہ ہے تمہیں تو لاہور لے جا کر ہی رہوں گی۔ بس تم ذہنی طور پر خود کو تیار کر لو۔" عفت نے محبت سے اس کا ماتھا چوما اور اس کی چارپائی سے اٹھ گئی۔ آمنہ کی آنکھوں میں امید کے جگنو پھر بھی نہیں چمکے تھے۔ پتا نہیں کیوں اس کے حلق میں آنسوؤں کا نمکین سا گولا اٹک گیا تھا۔ گہرے گہرے سانس لے کر وہ خود کو نارمل کرتی رہی۔ ناکام ہو کر اس نے سلیپرز پہنے اور کچے گھڑے سے مٹی کا پیالہ پانی بھر کر منہ سے لگا لیا۔ گھڑے گھڑے اس نے ایک ہی سانس میں پیالہ خالی کر دیا۔ عام طور پر وہ دھیان رکھتی تھی کہ پانی بیٹھ کر گھونٹ گھونٹ کر کے تین سانس میں پیے لیکن آج پتا نہیں طلب کا کون سا جنگل اندر اگ آیا تھا جسے وہ پانی سے سیراب کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بے وجہ کی بے چینی سے گھبرا کر وہ سونے لیٹ گئی حالانکہ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

☆ ☆ ☆

فجر پڑھ کر حسب معمول ابا کھیتوں کی طرف نکل گئے۔ دیر تک جاگنے کی وجہ سے اماں کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ سو نماز پڑھ کر وہ دوبارہ لیٹ گئیں۔ نہ خالہ نجمہ نے نماز پڑھی نہ عفت نے۔ جس دن سے وہ گاؤں آئی تھیں انہوں نے ایک بھی نماز ادا نہیں کی تھی۔

آمنہ حیران تھی کہ وہ اسی اماں کی بہن ہیں جو نہ تو خود نماز چھوڑتی ہیں اور نہ ان میں سے کسی کو چھوڑنے دیتی ہیں۔ اس نے یہی بات اماں سے بھی کہی تھی تو وہ ہنس پڑیں۔ "میری جھلی دھی۔۔ شہروں میں سنا ہے زندگی بڑی مصروف ہوتی ہے۔ اسی مصروفیت میں لوگ رب سوہنے کو ہی بھول جاتے ہیں۔" وہ بڑی حیران ہوئی تھی۔ بھلا ایسی بھی کیا مصروفیت کہ پیدا کرنے والے رب کی بارگاہ میں حاضری لگوانے کا بھی وقت نہ ملے۔ وہی دن وہی رات وہی چوبیس گھنٹے۔۔ پھر بھی وقت کیوں نہیں ملتا حالانکہ شہروں میں گاؤں کی نسبت زیادہ آسائشیں' زیادہ آسانیاں ہوتی ہیں۔ وہ کم فہم سوچتی تھی رب کی بارگاہ میں حاضری وقت کی بدولت ہے یہ جانے بغیر کہ یہ تو اس پاک ذات کی توفیق ہے جسے چاہے توفیق بخش دے۔

ثمامہ قرآن پاک پڑھ رہی تھی۔ آمنہ سرخ آنکھوں سے بیٹھی سورہ یاسین پڑھ کر اٹھ گئی۔ دل کو پتا نہیں اک بے نام سی بے چینی ہو رہی تھی۔ رات بھر ٹھیک سے سو نہیں پائی تھی اس لیے وجود نڈھال سا تھا۔ گرمی کا زور اگرچہ ٹوٹ چکا تھا پھر بھی بہرحال گرمی تو تھی۔ وہ ثمامہ اور محسن ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔ اب چونکہ گرمیاں تھیں تو سب کے بستر صحن میں لگتے تھے۔ جب تک آمنہ نے پڑھنا ہوتا وہ کمرے میں رہتی پھر باہر جا کر سو جاتی۔ صبح اذان کے ساتھ ہی اٹھ جاتی اور نماز قرآن کمرے میں ہی بیٹھ کر پڑھتی تھی۔

آسمان ابھی تک ٹھیک سے اجالے سے آشنا نہیں ہوا تھا۔ اس کے کناروں پر کرنوں کی زرد کناری لگی ہوئی تھی۔ درختوں پر چڑیوں کے گھونسلوں سے چیں چیں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جیسے صبح کا سندیسہ پا کر بھوک چڑیوں کے گھونسلوں میں سوئے ننھے بچوں کے پیٹ میں اتر گئی تھی۔ چڑیا چہچہاتی ہوئی اس پیڑ سے دوسرے پیڑ تک اڑاریاں مار رہی تھیں۔ وہ تھکی تھکی سی سیڑھیوں پر اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گئی۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا وہ لمبے لمبے سانس بھرتی خود میں اتار رہی تھی۔ بڑے سے صحن کے وسط میں چھوٹی سی دیوار کے پار سیڑھیوں پر بالکل اسی پوزیشن میں اک اور وجود بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے حیرت سے مراد کو دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر ادھر جاتی اور اس سے بات کرتی ثمامہ آ گئی۔

"اٹھ کر آٹا گوندھ لو ابا آتے ہی ہوں گے۔ ناشتا کرتے ہی پھر دوائی کھائیں گے۔" محسن کا استری شدہ یونیفارم لے کر وہ واپس مڑ گئی۔ آمنہ بھی ساتھ ہی سیڑھیوں پر سے اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"آپی میں اک بات سوچ رہی تھی۔" گلاب اور چنبیلی کی مشترکہ کیاری کے پاس زمین پر بیٹھی وہ پودوں کی کاٹ چھانٹ میں مصروف تھی جب عفت اس کا انتظار کر کر کے ادھر ہی آ گئی تھی۔ آمنہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں تو یہاں مہمان ہوں میرے لیے سب کچھ نیا ہے اور ہر چیز میں Atraction بھی ہے۔ دو چار دن مزید رہ کر میں چلی جاؤں گی۔ تم لوگ یہاں کیسے رہ لیتے ہو؟"

"مطلب؟"

"مطلب گھر میں ٹی وی تو ہونا چاہیے۔ میرے پاس تو سیل ہے میں اس پہ گانے سن لیتی ہوں اور اگر سگنلز اچھے آ رہے ہوں تو نیٹ بھی استعمال کر لیتی ہوں پھر بھی ان تین چار دنوں میں ٹھیک ٹھاک بور ہو گئی ہوں۔" وہ کھسک کر آمنہ کے پاس ہو گئی۔ "سچ بتانا تمہارا دل نہیں کرتا ٹی وی ڈرامے' موویز اور گانے وغیرہ دیکھنے کو؟"

"کرتا ہے۔" آمنہ آہستہ سے بولی تھی۔ "ابا کو ٹی وی وغیرہ خرافات لگتے ہیں۔" وہ ناخن سے گلاب کی ڈنڈی پر لگے کانٹے نوچنے لگی۔

"تم ایک بار ہمارے ساتھ لاہور چلو۔ پھر دیکھنا زندگی کتنے مزے کی ہو گی۔ صبح جب جی چاہے اٹھو' مرضی کا ناشتا کرو۔ ٹی وی دیکھو گانے سنو۔ جی چاہے تو

کمپیوٹر پہ بیٹھ کر نیٹ سے اپنی مرضی اپنی پسند کا Stuff نکال لو یا کالج جاؤ عیش کرو۔ بچی بڑے مزے کی زندگی ہے۔" عفت نے مزے سے اپنی بات پوری کی۔ اس کی نظریں اپنے موبائل کی اسکرین پر تھیں ورنہ آمنہ کے چہرے پر پھیلا اضطراب اور اس کی انگلی کی پور میں چبھا ہوا کانٹا ضرور دیکھتی۔ کھوئے کھوئے انداز میں آمنہ نے بے دردی سے کھینچ کر کانٹا نکالا اور کیاری میں اچھال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

بعض اوقات جھیل کی طرح پرسکون زندگی میں کرب و اضطراب کے بھنور بننا شروع ہو جاتے ہیں لیکن ہلچل پیدا کرنے والے پتھر نہیں ملتے۔ شعوری طور پر آمنہ بھی اپنے اضطراب کی وجہ جان نہیں پا رہی تھی۔

✪ ✪ ✪

حسب توقع اسے لاہور جانے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اماں نے خالہ سے کہہ دیا تھا کہ گھر کی لپائی وغیرہ سے فارغ ہو کر آمنہ کو بھیج دیں گی۔ خالہ اور عفت کا تو پتا نہیں البتہ آمنہ کو یقین تھا کہ یہ صرف بہلاوا ہے۔ جاتے جاتے عفت یقین دلا کر گئی تھی کہ وہ اسے لاہور بلوا لے گی۔ آمنہ کو نہ پہلے یقین آیا تھا نہ اب مگر اب پتا نہیں کیوں اس کا کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ عجیب بدمزاج اور چڑچڑی سی ہو گئی تھی۔ مراد کو پتا تھا کہ گھر میں مہمانوں کے ساتھ مصروف ہو کر فی الحال وہ ڈائجسٹ وغیرہ بھول گئی ہے لیکن اب تو انہیں گئے ہوئے بھی ہفتہ ہونے کو آیا تھا مگر آمنہ نے ابھی تک رسالوں کا تقاضا تک نہیں کیا تھا حالانکہ مراد کو لائے ہوئے کافی دن ہو چلے تھے۔ پہلے دونوں کی بات چیت بھی ٹھیک ہوتی تھی مگر اب وہ ہوں ہاں نہیں کے علاوہ بات ہی نہیں کرتی تھی۔ مراد کو وہ مضطرب سی لگ رہی تھی۔ یہی بات اسے بے چین کر رہی تھی۔ وہ تو خوش تھا کہ آمنہ لاہور نہیں گئی لیکن اب اسے لگ رہا تھا کہ آمنہ کھو گئی ہے۔ یہ آمنہ اسے پہلے والی آمنہ لگتی ہی نہیں تھی۔ کھوئی کھوئی اور بے آواز۔ اب بھی اس نے صحن کے درمیان دیوار میں لگے مشترکہ دروازے سے داخل ہوتے ہی سلام کیا تھا لیکن پیڑ کے تنے سے ٹیک لگائے وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھی۔

"آمنہ۔"

"ہوں۔" آنکھیں کھولے بغیر اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

"کیا ہوا؟" وہ بھی اس کے برابر زمین پر بیٹھ گیا۔

"کچھ بھی نہیں۔"

"طبیعت ٹھیک ہے؟"

"ہاں" وہ جتنا اس کی حالت سے آگہی چاہ رہا تھا وہ اتنا ہی خود کو چھپا رہی تھی۔ مراد کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا بات کرے۔ یہ وہی آمنہ تھی جس سے گھنٹوں کے حساب سے وہ کبھی سیڑھیوں پر تو کبھی منڈیر پر بات کیا کرتا تھا۔

"آمنہ آج کل تم پڑھتی نہیں کیوں؟" اچانک اس کے ذہن میں یہ بات آئی تھی۔

"فائدہ؟ کون سی ڈگری مل جانی ہے مجھے یوں دماغ کھپا کے؟" وہ بے زاری سے بولی تو مراد حیران رہ گیا۔ یہ وہی آمنہ تھی جو کہتی تھی کتابیں انسان کو علم اور علم انسان کو شعور و آگاہی دیتا ہے اور شعور و آگہی کی کوئی ڈگری نہیں ہوتی۔

"تو تمہیں ڈگری چاہیے؟"

"میرے چاہنے سے کیا ہوگا۔ کون سا مل جائے گی اگر میں ہاں بھی کہہ دوں۔ ویسے بھی گھر بیٹھ کر ڈگری مل بھی گئی تو کیا ہوگا؟ جو تعمیر انسان کی ادارے یا استاد کرتے ہیں گھر بیٹھ کر تو نہیں ہو جاتی۔" مراد حیران ہو رہا تھا اس کی بدلی ہوئی سوچ پر۔

"پھر کیا ہو سکتا ہے۔" بڑی سوچ بچار کے بعد وہ بولا تھا۔

"اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ تمہیں پتا ہے اماں ابا سے عفت آپی اور خالہ نے بات کی تھی مجھے ساتھ لے کر جانے کی۔ عفت آپی کہہ رہی تھیں وہاں رہ کر پڑھ لیتا۔ لیکن میری اتنی اچھی قسمت ہوتی تو کیا میں اسی گھر میں پیدا ہوتی؟"

سانس لینا دو بھر ہو رہا تھا۔

"کیا ہوا اس گھر کو؟ ایسا کیوں سوچتی ہو؟"

"مراد مجھ سے پوچھ رہے ہو اس گھر کو کیا ہے؟" آنکھیں کھول کر اس نے مراد کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی مراد کا رہا سہا سکون بھی تباہ کر گئی تھی۔ "تم تو شہر آتے جاتے رہتے ہو۔ تمہیں نہیں پتا آج کے دور کے تقاضے کیا ہیں؟ ہم کس صدی میں جی رہے ہیں؟ ہمیں گھر میں ٹی وی تک دیکھنے کی اجازت نہیں۔ ریڈیو ہے تو وہ بھی ابا سے چھپ کر سننا پڑتا ہے۔ عفت آپی کے پاس جو موبائل تھا وہ اس میں نیٹ چلاتی ہیں۔ دنیا ان کی مٹھی میں ہے۔ جو چاہیں جیسے چاہیں کرتی ہیں۔ کیا وہ لڑکی نہیں ہیں؟ یا ہم دنیا کی انوکھی لڑکیاں ہیں جنہیں ابا کا بس چلے تو باہر کی ہوا میں سانس بھی نہ لینے دیں۔" مراد کو پتا نہیں تھا کہ وہ اتنی کڑواہٹ لیے بیٹھی ہے۔

"مراد میری مدد کرو گے؟" ایک دم اس کی آنکھوں میں چمک سی کوندی تھی۔ مراد نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "اماں ابا تمہاری بات سمجھتے ہیں، مانتے ہیں۔" اس کی بات کا مطلب سمجھ کر مراد نے شام کی ٹھنڈک گہری سانس بھر کر خود میں اتاری تھی۔

"تم بات کرو نا کہ مجھے خالہ کے گھر جانے دیں۔ دیکھو گھر میں خالہ، خالو اور عفت ہوتے ہیں۔ فرہاد شہر سے باہر ہوتا ہے تو کوئی مسئلہ بھی نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں دبا دبا جوش تھا۔ مراد کی نظریں گھروں کو لوٹتے شام کے پرندوں پر تھیں۔

"پرندوں کی چہچہاہٹ کانوں کو بھلی لگ رہی تھی۔" آمنہ کو لگا وہ اس کی بات نہیں سن رہا۔

"مراد۔" اک لمحے کے لیے اس کے نازک ہاتھ نے مراد کی ٹھوڑی کو چھوا تھا۔

"مراد میں کھلی ہوا میں سانس لینا چاہتی ہوں۔ میں اور نہیں برداشت کر سکتی۔ میرے اندر گھٹن بڑھتی جا رہی ہے۔ اندر ہی اندر مر جاؤں گی میں۔" فضا میں

"میں کرتا ہوں بات تم چلنے کی تیاری رکھو بس۔" وہ نہیں جانتا کہ اس نے کس طرح یہ الفاظ ادا کیے۔ آمنہ کے چہرے پر اک دم سکون پھیلا تھا۔ اس سکون کے لیے مراد نے اپنا سکون کھویا تھا۔

مغرب کی اذان فضا میں گونج رہی تھی۔

"اٹھ کر نماز پڑھ لو بہتری کی دعا کرنا۔" تھکے تھکے قدموں سے مراد باہر نکل گیا۔ اماں نے اسے آواز بھی دی لیکن وہ ان سنی کر گیا۔

حی علی الفلاح ——— کی آواز ہوا کے پروں پر سوار اس تک پہنچ رہی تھی لیکن آج یہ آواز بس کانوں تک محدود رہی۔ دل تک نہیں پہنچی تھی۔ وہ انجان سی وہیں بیٹھی رہی۔ اماں نے اسے نماز پڑھنے کا کہا بھی لیکن وہ اٹھی نہیں۔ خواہش کی زنجیر پاؤں میں بندھی تھی تو اٹھتی کیسے۔

☼ ☼ ☼

اسے نہیں پتا مراد نے کب اور کیا بات کی البتہ اتنا اسے پتا تھا کہ اسے لاہور جانے کی اجازت مل گئی ہے۔ وہ خوش تھی یا نہیں پتا نہیں لیکن اطمینان تھا سکون تھا۔ زندگی گزارنے کے لیے خوشی کی نہیں سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ پرسکون تھی یہ سکون مراد کا دیا ہوا تھا۔

مراد خود اسے لاہور چھوڑ کر گیا تھا۔ نہ کسی نے اسے روکنے کے لیے زیادہ اصرار کیا نہ ہی وہ خود رکنا چاہتا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے آمنہ کو اپنا موبائل دینا چاہا لیکن اس نے سہولت سے انکار کر دیا۔ "ادھر پی ٹی سی ایل بھی ہے اور موبائل بھی تو میں الگ فون رکھ کر کیا کروں گی؟" اصل میں عفت کے مہنگے موبائل کے سامنے یہ سادہ سا موبائل اسے کافی گھٹیا محسوس ہو رہا تھا لیکن کہہ کر وہ مراد کی دل آزاری نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جاتے جاتے مراد اسے کچھ پیسے اس یاددہانی کے ساتھ دے گیا تھا کہ وہ انہیں خرچ کرے۔ کچھ دنوں میں وہ مزید پیسے بھجوا دے گا۔ آمنہ نے نہ چاہتے

ہوئے بھی خاموشی سے پیسے رکھ لیے۔ خالہ کا گھر خاصا بڑا اور جدید طرز پر بنا ہوا خوبصورت اور ہوا دار تھا۔ سب کے الگ الگ کمرے تھے اس کے باوجود کچھ کمرے استعمال میں نہیں تھے۔ فرنچ ونڈوز والا اٹالین طرز پر بنا ہوا خوبصورت کچن جس میں زیادہ تر چیزیں ایسی تھیں جن کے بارے میں آمنہ کو کچھ پتا ہی نہیں تھا ان کا نام نہ استعمال۔ خوبصورت ساڈرائنگ روم جس میں قد آدم ونڈوز سے لان کا خوبصورت ترو تازہ کردینے والا منظر بخوبی دیکھا جاسکتا تھا۔ ٹی وی لاؤنج دیکھ کر تو آمنہ دنگ رہ گئی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی اتنا خوبصورت گھر نہیں تھا۔ پوشش والے مہنگے صوفوں کے ساتھ میچنگ بھاری پردے اور دبیز قالین' قیمتی ڈیکوریشن پیسز۔ قالین پر ترتیب سے کشنز پڑے تھے۔

لکڑی کے کام سے مزین لاؤنج کو تو آمنہ آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھی۔ اپنے گھر میں اس نے ٹی وی کی شکل نہیں دیکھی تھی اور یہاں بڑی اور قیمتی ایل سی ڈی پر چلنے والے پروگرام دیکھ کر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے سب اس کی آنکھوں کے سامنے براہ راست ہو رہا ہے۔ اسے بھی الگ سے اک کمرہ دیا گیا تھا۔ اس کے یہاں آنے سے سب ہی خوش ہوئے تھے۔

"مجھے پتا تھا کہ تم ضرور آؤ گی اسی لیے میں نے آتے ہی تمہارے لیے کمرہ سیٹ کروالیا تھا۔" عفت نے خوشی سے اسے ساتھ لپٹالیا۔ خالہ نے کھانے پر اچھا خاصا اہتمام کرلیا تھا۔ اسے شرم سی آرہی تھی۔ وہ دوسری بار خالہ کے گھر آئی تھی۔ پہلی بار جب وہ آئی تو کافی چھوٹی تھی۔ رفعت کی شادی پہ وہ بیمار تھی سو نہیں آئی۔

رات کو سفر کی تھکن کی وجہ سے نئی جگہ ہونے کے باوجود وہ جلدی سوئی تھی۔ اس کا وقت تو جیسے تھم گیا تھا۔ ایک ہفتہ جیسے صدیوں پر محیط تھا۔ عفت صبح کالج جاتی تو دوپہر کے بعد گھر آتی۔ شام کو پھر اکیڈمی چلی جاتی تو رات کو لوٹتی۔ آج اس نے سوچا ہوا تھا کہ عفت سے بات کرے گی کہ اسے کہیں ایڈمیشن لے دے۔ رات کے کھانے کے بعد حسب معمول خالہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ خالو باہر دوستوں سے ملنے چلے گئے۔ وہ اور عفت دونوں ٹی وی دیکھنے بیٹھ گئیں۔

"میں سوچ رہی تھی اب تمہیں کلاسز اسٹارٹ کردینی چاہئیں۔" آمنہ بات کرنے کے لیے مناسب الفاظ سوچ ہی رہی تھی جب عفت نے خود ہی بات کردی۔

"میں جس اکیڈمی میں پڑھانے جارہی ہوں۔ وہیں پر تم شارٹ کورس کرلو کیونکہ کالجز میں ایڈمیشن تو کب کے کلوز ہوگئے ہیں۔" موبائل پر میسج کرنے کے ساتھ ساتھ وہ آمنہ سے باتیں بھی کررہی تھی۔

"جیسے آپ کی مرضی۔"

"وہاں تو تمہیں میری وجہ سے مراعات بھی مل جائیں گی۔" ہنس کر اس نے گم سم بیٹھی آمنہ کو دیکھ کر کہا۔ آمنہ آہستگی سے مسکرادی۔

"میں پھر کل تمہیں ساتھ لے چلوں گی تم اپنی تیاری رکھنا۔" آمنہ نے اثبات میں سرہلادیا۔ عفت اٹھ کر کمرے میں چلی گئی تو آمنہ بھی ٹی وی بند کرکے اپنے کمرے میں آگئی۔ صبح کے لیے کپڑے تیار کرنے تھے اور ابھی تک اس نے بیگ سے چند ایک کپڑوں کے جوڑے ہی نکالے تھے۔ گلابی اور سفید کے امتزاج کا ایک خوبصورت سا سوٹ اس نے پہننے کے لیے نکالا۔ رات کے ساڑھے دس ہورہے تھے۔ اس نے وضو کیا' عشاء کی نماز ادا کی اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔

☆ ☆ ☆

روزانہ کالج سے آکر عفت کمرے میں فریش ہوکر کھانا کھا کر آتی تھی۔ آج کالج سے آکر اپنی چیزیں کمرے میں رکھ کر وہ آمنہ کے کمرے میں آگئی۔ آمنہ ظہر کی نماز پڑھ کر تاریخی ناول پڑھ رہی تھی۔ حال احوال کے بعد عفت نے اس کی تیاری کے بارے میں پوچھا۔ "آج جانا ہے تیاری کرلی؟" اس نے اثبات میں سرہلادیا۔

"کپڑے کون سے پہنو گی؟"

اس نے اٹھ کر نوکرانی سے استری کروا کر ہینگر میں لٹکایا سوٹ عفت کے سامنے کر دیا۔ عفت چپ ہو گئی اس نے سوٹ کو دوبارہ ادھر ہی لٹکا دیا۔

"امی اک بات کہوں؟" بڑی سوچ بچار کے بعد بولی تھی وہ۔

"جی کہیں۔"

"دیکھو مجھے غلط مت سمجھنا۔ میں تمہاری بہتری اور بھلائی کے لیے ہی کروں گی جو بھی کروں گی۔ اچھے طریقے سے رہنے کے لیے ضروری ہے آپ پراعتماد ہوں۔ پڑھائی کیا ہر کام کے لیے پراعتماد ہونا ضروری ہے۔ اپنی شخصیت میں کسی قسم کا جھول نہ ہونا انسان کو پراعتماد بناتا ہے۔" وہ سانس لینے کو رکی۔ "تمہاری شخصیت تمہارے کپڑوں سے بھی پتا چلتی ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہی تم میں کوئی کمی ہے۔ ماشاء اللہ اتنی پیاری ہو تم۔" آمنہ جو دھیان سے اس کی بات سن رہی تھی شرما گئی۔ "میں چاہتی ہوں تم جدید طرز کے اچھے اچھے کپڑے پہنو تاکہ یہاں کی لڑکیوں سے کسی طور بھی کم نہ لگو۔ تمہارے یہ کپڑے بہت اچھے ہیں لیکن۔" عفت خاموش ہو گئی تھی۔ اس ادھوری بات کا مطلب آمنہ اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اسے شرمندگی ہو رہی تھی۔ "امی دیکھو ادھر میری طرف۔" اس نے آمنہ کی تھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اپنے سامنے کیا۔

"میں تمہاری بہن ہوں۔ میری ہزار کوشش کے باوجود بھی کہ میں بات اس طرح کروں کہ تمہاری دل آزادی نہ ہو۔ تمہارا دل دکھا ہے اس بات پر لیکن یقین مانو دنیا بہت ظالم ہے۔ ان کی ذلت آمیز باتیں اور تحقیر آمیز رویہ تم برداشت کر سکتی ہو؟"

آمنہ نے بے اختیار نظریں جھکا لیں۔ بات تو وہ ٹھیک ہی کر رہی تھی۔ جس بات کا احساس لوگوں نے اس کی تذلیل کر کے دلاتا تھا وہ عفت نے اسے پیار سے اس کمرے میں دلا دیا تھا۔

"لیکن آپی میرے پاس سارے کپڑے اسی طرح کے ہیں۔" لہجے میں شرمندگی سموئے اس نے آہستہ سے کہا تو عفت نے محبت سے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"پاگل ہو تم اس میں فکر کی کیا بات ہے۔ اٹھو آؤ میرے ساتھ۔" اس کے ہاتھ میں ابھی بھی آمنہ کا ہاتھ تھا۔ آمنہ کو بھی اس کے ساتھ ہی اٹھنا پڑا۔ عفت اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ اسے بستر پر بٹھا کر وہ اپنی دیوار گیر الماری کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ آمنہ اس کے کمرے کو توصیفی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ خوبصورت ڈبل بیڈ کی سائیڈ ٹیبلز پر ایک طرف کرسٹلز میڈ خوبصورت لیمپ اور ایک دو کتابیں پڑی تھیں۔ دوسری ٹیبل پر ایک چھوٹا سا لیڈیز والٹ پڑا تھا۔ سامنے کی دیوار پر ایک وال کلاک بٹر فلائی کی شکل میں لگا ہوا تھا۔ اطراف کی دونوں دیواروں پر خوبصورت پینٹنگز جبکہ بیڈ کی پچھلی دیوار پر عفت کی قد آدم خوبصورت تصویر لگی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی پہلی نظر اس تصویر پر پڑتی تھی۔ جتنی دیر میں اس نے کمرے کا جائزہ لیا اتنی دیر میں عفت نے الماری سے کپڑے اور کچھ دوسری چیزیں نکال کر اس کے قریب ڈھیر کر دیں۔

"میں یہ ڈبے وغیرہ اٹھاتی ہوں تم کپڑے اٹھا لو تمہارے کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" عجلت میں کہہ کر چیزیں اٹھاتی وہ باہر نکل گئی تو وہ بھی اس کے پیچھے کپڑے اٹھا کر نکل آئی۔

جدید مہنگے ملبوسات وہ حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ کہیں سے بھی یہ کپڑے استعمال شدہ نہیں لگ رہے تھے۔ میچنگ سینڈلز بریسلیٹ وغیرہ ساتھ تھے۔ عفت اس کی حیرانی دیکھ رہی تھی۔

"مجھے ان چیزوں کا کریز ہے لیکن میری ماما ہیں نا۔ انہیں فضول خرچی لگتی ہیں میری یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں۔ اس لیے میں یہ چیزیں لے آتی ہوں اور ماما سے ـــــ چھپا کر استعمال کر لیتی ہوں۔ بلکہ یہ جو ڈریسز ہیں۔" اس نے ابرو سے اس کے سامنے بکھرے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ میں نے استعمال تو کیا کرنے تھے لانے کے بعد آج دیکھ رہی ہوں۔ تم کسی کو بھی مت بتانا کہ یہ کپڑے میں نے

تمہیں جیسے میں ملا تو بھی نہیں۔"

"تو کیا انہیں نہیں پتا کہ یہ آپ کے کپڑے ہیں؟" آمنہ شدید حیرت کا شکار تھی۔

"نہیں میں لا کر چیزیں چھپا دیتی ہوں۔" عفت کے لاپروائی سے کہنے پر آمنہ کا منہ کھلا رہ گیا۔ "اچھا میں نے پارلر جانا ہے۔ تم بھی چلو ساتھ۔ جس دن سے آئی ہو کہیں باہر نکلنے کا ٹائم ہی نہیں ملا۔"

شاک کی کیفیت میں اس نے سر ہلا دیا اور چیزیں وغیرہ سمیٹ کر رکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

شیشے کے سامنے گم سم سی کھڑی وہ نظر آنے والا عکس دیکھ رہی تھی۔ وہ خود کو پہچان نہیں پا رہی تھی حالانکہ وہی چہرہ' وہی خدوخال' وہی رنگ روپ تھا۔ سب کچھ وہی تھا سوائے جھالر کی شکل میں ماتھے پر پڑے بالوں کے' غائب دماغی میں وہ آہستگی سے کٹے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ پارلر میں عفت فیشل اور ہیئر ڈائی کروانے گئی تھی۔ منہ پر مختلف کریموں کا مساج کرواتے ہوئے وہ سامنے لگے دیوار گیر شیشے سے پیچھے بیٹھی آمنہ کی بے زاری نوٹ کر رہی تھی۔ یہ شہر کا مہنگا ترین پارلر تھا جہاں پر مصنوعی خوب صورتی مہیا کرنے کے لیے جدید سے جدید آلات اور اشیاء میسر تھیں۔ آمنہ کو دیکھ دیکھ کر ہی کوفت ہو رہی تھی۔ نرم ریشوں سے بنے تولیے سے منہ رگڑ رگڑ کر صاف کرتی عفت نے اس کے چہرے پر مساج کرنے والی لڑکی سے کچھ کہا تھا۔ وہ آمنہ کے پاس آئی۔ "چلیں میم۔ آپ سامنے چیئر پر بیٹھ جائیں۔"

"لیکن میں نے تو کچھ نہیں کروانا۔" لڑکی نے سر سے پاؤں تک کالی چادر میں لپٹی آمنہ کو غور سے دیکھا اور عفت کی طرف چلی گئی۔ عفت چند سیکنڈز میں اس کے پاس تھی۔ "کیا مسئلہ ہے تمہیں؟ کیوں مجھے ذلیل کروانے پر تلی ہو؟ تم نے ادھر اگلی بار نہیں آنا ہو گا لیکن میں نے آنا ہے۔ تمہاری مہربانی ہو گی اگر یہ اپنا پینڈوانہ اسٹائل گھر چھوڑ کر آؤ۔" آمنہ اس کے لہجہ اس کے انداز اور الفاظ پر ششدر رہ گئی تھی۔ اسے خود بھی پتا نہیں چلا وہ کب اٹھ کر سامنے بڑی سی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ کب اس کے سر سے چادر اتری کب اس کے بال کٹے۔ واپسی پر عفت نے بار بار اس سے معذرت کی تھی لیکن اس کا ذہن ماؤف سا ہو رہا تھا۔

"بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔" پارلر میں موجود سب کی طرح عفت نے بھی اس کی تعریف کی تھی اور پھر یہ تعریف اس نے ہر اس شخص سے سنی تھی جس سے وہ ملی۔ وہ تھی ہی اس قابل کہ اس کی تعریف کی جائے۔ آئینے کی طرح شفاف و بے داغ اجلی جلد' معصوم اور بھولا سا چہرہ۔ ہاتھ پاؤں یوں تھے جیسے کسی سانچے میں ڈھال کر بنائے گئے ہوں۔ متناسب سراپا اور قد بھی اس کا کم از کم ساڑھے پانچ فٹ تھا۔ بالوں کی لمبی سی سلکی چوٹی اس کی کمر پر جھولتی رہتی اور اب تو ماتھے پر تراشیدہ سایہ فگن بال اس کو اسٹائلش لک دے رہے تھے تو خوب صورت لگنا اس کا حق بنتا تھا۔ وہ مجسم حسن تھی۔ اس حسن کی ساری کشش اس کی جھجک' شرم اور حیا میں تھی۔ یہ الگ بات کہ اک عرصہ تک وہ اس سے لاعلم رہی۔

☼ ☼ ☼

"عفی" ناشتا کرتے ہوئے ماما نے اس کی طرف دیکھا۔

"جی ماما۔"

"میں سوچ رہی تھی تم تو کالج چلی جاتی ہو آمنہ گھر میں بور ہوتی رہتی ہے۔ اسے کسی کمپیوٹر کلاس میں ایڈمیشن کرا دو۔ دل لگا رہے گا اس کا اور کمپیوٹر بھی سیکھ لے گی۔"

"گریٹ آئیڈیا ماما۔ پتا نہیں مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا۔" وہ ایک دم پرجوش ہوئی۔ "میں آج ہی کہیں بات کرتی ہوں۔ آپ اسٹڈی کھلوا کر صفائی کروا دیں کیونکہ میرا سسٹم تو کتنے دن سے بیکار ہوئے گیا ہے اور مجھے لانے کا بھی ٹائم نہیں مل رہا۔ اسٹڈی والا سسٹم یہ استعمال کر لے گی کیوں ماما؟"

مگن سی ناشتا کرتی آمنہ نے آہستہ سے تائید میں سر ہلا دیا۔

"گڈ۔ اینڈ تھینکس ماما۔ ناؤ ایم گوئنگ۔" نزاکت سے ہونٹ ٹشو سے صاف کرتی بیگ اٹھا کر وہ دروازے کی طرف بھاگی۔

"دل لگ گیا تمہارا؟"

"جی خالہ لگ گیا ہے بلکہ دل تو انسانوں سے لگتا ہے، جگہوں سے نہیں۔ آپ لوگوں کے ساتھ تو تب ہی دل لگ گیا تھا جب آپ گاؤں آئے تھے۔" خالہ نے محبت سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"بہت پیاری بچی ہو تم اور ذہین بھی۔ مجھے تو خوشی ہوتی ہے تمہیں دیکھ کر کہ تم آسانی سے یہاں ایڈجسٹ ہو رہی ہو ورنہ جب میں گاؤں سے آئی تھی مجھے بہت وقت لگا تھا اچھی طرح ایڈجسٹ ہونے میں۔" خالہ نے پتا نہیں کیا سوچ کر کہا تھا۔ وہ مدھم سا مسکرائی۔

"ویسے شہری لک میں تم زیادہ خوب صورت لگتی ہو۔" جوس کا گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا تھا۔ خالہ جب بھی تعریف کرتیں وہ پتا نہیں کیوں ایسے ہی شرما جاتی تھی۔

☼ ☼ ☼

آمنہ کو لاہور آئے ہوئے مہینے سے زیادہ ہی ہو گیا تھا۔ زندگی ایک دم سے بے حد مصروف ہو گئی تھی۔ کمپیوٹر کلاس سے ظہر کے بعد واپس آتی۔ نماز پڑھ کر کھانا کھاتی۔ تھوڑی دیر پڑھتی۔ اتنے میں عصر کی اذان ہو جاتی نماز ادا کر کے اکیڈمی چلی جاتی اور پھر عشا سے کچھ دیر پہلے واپس آتی۔ رات کو جلدی سونے والی روٹین اب رہی نہیں تھی۔ دیر تک کمپیوٹر پر بیٹھی رہتی نتیجتاً صبح آنکھ بھی لیٹ کھلتی۔

شروع شروع ہونے والی بے چینی کی جگہ اب اطمینان تھا، تسلی تھی، زندگی کی اس نئے رخ سے اسے بھی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ زمین سے قدم اٹھاتے ہوئے جو ڈر لگ رہا تھا وہ ختم ہو گیا اب اس کے قدم ہواؤں میں تھے۔ گاؤں کی کبھی کبھار کوئی بات یاد آجاتی لیکن ابھی واپس جانے کا نہیں سوچا تھا۔

مراد نے دوبار چکر لگایا لیکن اس کی ملاقات نہ ہو سکی۔ ہفتے میں ایک دو بار جولا ہوں کے گھر فون کر کے اماں سے بات کر کے "سب خیریت ہے" کی رپورٹ دے دیتی۔ زندگی ایک دم بدلی تھی تو اسے مزا آ رہا تھا۔ ٹی وی شروع سے نہیں دیکھا تھا تو ٹی وی کا کوئی خاص شوق بھی نہیں تھا مگر کمپیوٹر کی بات الگ تھی۔ عفت نے فیس بک پر اسے اکاؤنٹ بنا دیا تھا سو رات کو گھنٹوں کے حساب سے وہ فیس بک پر آن لائن رہتی۔ شروع شروع میں اسے یہ بڑا ہی بے ہودہ سا لگا تھا لیکن دو چار دنوں میں ہی اسے اچھا لگنے لگا۔ عجیب و غریب پوسٹوں پر طرح طرح کے کمنٹس پڑھ کر وہ خوب ہنستی۔ لڑکے لڑکیوں کو Add کرتی، چیٹ کرتی۔۔۔ زندگی کو پوری طرح انجوائے کر رہی تھی۔ زندگی کا یہ پہلو اسے خوابناک اور خوب صورت لگا تھا۔

وہ یہ بات مکمل طور پر بھول گئی تھی کہ تصویر کا صرف ایک رخ ہی نہیں ہوتا دوسرا بھی ہوتا ہے جو کہ اکثر اوقات خوب صورت نہیں ہوتا۔

☼ ☼ ☼

لان کی چیئرز پر وہ اپنی کتابیں اور موبائل لیے دھوپ میں بیٹھی تھی۔ موبائل اس نے تھوڑے دن پہلے ہی گاؤں سے آنے کے بعد لیا تھا۔ اماں کی طبیعت خراب تھی اور وہ جولا ہوں کے گھر جا کر فون نہیں سن سکتی تھیں تو ایک استعمال شدہ سادہ سا موبائل لے لیا تھا۔ ایسا ہی ایک موبائل انہوں نے آمنہ کے لیے بھی لیا تھا لیکن آمنہ کو اسے اکیڈمی ساتھ لے جاتے ہوئے شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔ واپس آ کر اس نے خرچ کے لیے مراد کے دیے پیسوں میں کچھ اور پیسے ڈال کر مہنگا سا موبائل لے لیا اور اب وہ یہی موبائل استعمال کر رہی تھی اس نے سوچ رکھا تھا کہ جب گاؤں جانا ہو گا وہ اماں والا موبائل لے جائے گی۔

موبائل پر گانے سنتے ہوئے انگلش کی کتاب ہاتھ میں پکڑے وہ سرسری سی نظر ادھر ادھر دیکھ کر کتاب پڑھنے لگی ــــ اسے پتا نہیں چلا کہ پیچھے سے کسی نے دو ٹانگوں پر جھولتی کرسی کو پاؤں سے ٹھوکر لگائی اور وہ اپنا توازن کھو بیٹھی۔ اس نے پاؤں میز پر رکھے تھے سنبھلتے سنبھلتے بھی وہ آنے والے کی بانہوں میں جھول گئی۔ اس کے بازو نو وارد کی گرفت میں تھے۔ اک لمحے کے لیے اسے مراد یاد آگیا۔ سنبھل کر کھڑے ہوتے اس نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ وہ جو کوئی بھی تھا بلا کا خوب صورت اور سحر انگیز تھا۔ آمنہ شاک میں بھی تو وہ حیران تھا۔ آمنہ نے ہلکے آسمانی اور سفید رنگ کے امتزاج کا نفیس شلوار قمیص پہن رکھا تھا دوپٹا اس کے پاؤں میں تھا۔ اس کی خوب صورتی ہر طرح سے عیاں ہو رہی تھی۔ مرمریں سفید بازو کہنی سے اوپر تک عریاں تھے۔ اس کی لمبی گردن کو دیکھنے والے کو ہنس یاد آجاتا۔ اس کی آنکھیں تھیں یا جگنو۔ یا پھر ستارے۔ وہ بے خودی کے عالم میں اسے دیکھے چلا جارہا تھا۔ اس کی محویت کو محسوس کرکے آمنہ کنفیوژ ہوگئی۔ آہستگی سے جھک کر اس نے دوپٹا اٹھایا اور کندھوں پر پھیلا لیا۔ اب وہ اپنی کتابیں سمیٹ رہی تھی۔ اس کی محویت کا تسلسل دیکھ کر آمنہ کو جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ ہے کون ــــ لیکن اس کی شخصیت ایسی متاثر کن تھی کہ وہ پوچھ بھی نہیں پارہی تھی۔ وہ اس کے پاس سے گزر کر جانے ہی لگی تھی۔ جب وہ عین اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"مجھے نہیں پتا تھا ہمارے گھر کے لان میں پریاں اترتی ہیں۔"

آمنہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔ "آپ ــــ"

اس نے آمنہ کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

"مجھے فرہاد کہتے ہیں اور آپ ــــ آپ کو کوئی کچھ بھی کہے میں تو "شیریں" ہی کہوں گا۔" اس کی ذو معنی باتیں سن کر آمنہ کو عجیب سی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

"مجھے جانے دیں پلیز۔"

"میرا وعدہ ہے اب تمہیں اپنی زندگی سے کہیں جانے نہیں دوں گا۔" اس کے والہانہ انداز سے آمنہ کو گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

"ارے ــــ بھائی آپ کب آئے؟" عفت کو دیکھ کر آمنہ کی جان میں جان آئی۔

"مجھے اپنی خبر نہیں اور تم آنے کا پوچھ رہی ہو۔" مسکراتے ہوئے اک بھرپور نظر اس نے کنفیوژ سی مورت بنی آمنہ پر ڈالی۔

"بتا کر آتے نا ــــ لیکن آپ کی سرپرائز والی عادت حد ہے بھائی۔" آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے عفت سے آمنہ کے بارے میں پوچھا تھا۔

"یہ حفصہ خالہ کی بیٹی ہے آمنہ ــــ اور امی۔" وہ آمنہ کی طرف مڑی۔ "یہ ہمارے گھر کی رونق اور جان میرے پیارے فرہاد بھائی ہیں۔" عفت کی خوشی اس کے ہر انداز سے نمایاں ہو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"وعفی پتا ہے آج کیا ہوا؟" فرہاد کی آواز پر آمنہ نے بھی سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ بڑی پلیٹ میں چند چمچے چاول ایک طرف رائتہ وسلاد رکھ کر وہ چمچوں سے بڑی مہارت و نفاست سے وہ کھانا کھا رہا تھا۔

"کیا ہوا؟"

"میں جب گھر آیا تو مجھے لگا لان میں تم بیٹھی ہو۔ میں نے کرسی کو ٹھوکر لگائی تو بے چاری شیریں گرتے گرتے بچی۔" معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اس کی نظریں بری طرح کنفیوژ آمنہ پر تھیں۔

"شیریں ــــ وہ کون ہے؟" عفت نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ جو تمہارے پہلو میں چھوئی موئی بیٹھی ہے اس کا نام میں نے شیریں رکھا ہے۔" بڑے عام سے انداز میں اس نے اطلاع فراہم کی تھی۔

"کوئی وجہ بھی تو ہو۔"

"ضرورت سے زیادہ میٹھی ہے نا۔" اس نے شرارت سے آنکھ دبائی تو وہ اور عفت کھلکھلا کر ہنس

پڑے۔ آمنہ خفت سے سرخ ہو رہی تھی۔ آج خالہ اور خالو کھانے پر کہیں مدعو تھے۔ سو فرہاد کی آمد سے بھی بے خبر تھے اور اسی وجہ سے اسے ان دونوں کی لن ترانیاں سننے کو مل رہی تھیں۔

"ویسے فرہاد بھائی سچی بتائیں ایمی کیوٹ ہے نا؟"

عفت بڑی لگاوٹ سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"کیوٹ تو بہت چھوٹا لفظ ہے، کبھی فرصت میں بتاؤں گا کہ یہ اور کیا کیا ہے۔" آمنہ کے لیے یہ سب سننا اور وہاں مزید بیٹھنا دوبھر ہو گیا تھا۔ سو ان کے روکنے کے باوجود بھی کمرے میں آ گئی اور پھر تب تک کمرے سے نہیں نکلی جب تک فرہاد سونے کے لیے نہیں چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

"ارے۔ آج اکیڈمی نہیں گئیں تم؟" کسلمندی سے بالوں کو ربڑ بینڈ میں جکڑتی وہ کچن میں جا رہی تھی جب خالہ نے اسے دیکھ لیا۔ "نہیں خالہ۔ سر میں ذرا درد ہے اور شاید بخار بھی ہو رہا ہے۔" خالہ اور خالو رات دیر سے آئے تھے۔ عفت ناشتا کر کے کالج جا چکی تھی۔ فرہاد پتا نہیں کدھر تھا۔ آمنہ نے اس کی غیر موجودگی پر شکر ہی کیا تھا اس وقت۔

"میڈیسن لے آنا میرے ساتھ چل کے۔ یوں بھی میں بس فرہاد کا انتظار کر رہی ہوں مارکیٹ جانا ہے میں نے۔" فرہاد کے نام پر ہی آمنہ الرٹ ہو گئی تھی۔ رات والی اس کی باتیں اس کی نظریں ذہن کے پردے پر لہرائیں تو مسکراہٹ خود بہ خود اس کے ہونٹوں پر رینگ گئی۔ "جی خالہ" کہہ کر وہ ادھر ہی سے کمرے میں آ گئی۔ کپڑوں کی الماری کھولے وہ ان میں سب سے بہترین لباس کھوج رہی تھی۔ بڑی سوچ و بچار کے بعد اس نے سرخ و سیاہ امتزاج کا ایک اسٹائلش سا فراک نکال لیا۔ ہینگر پکڑ کر فراک کو خود سے لگا کر وہ شیشے میں دیکھ رہی تھی۔ یہ بھی عفت کے دیے ہوئے کپڑوں میں سے نکلا تھا۔ جالی کی ہاف سلیوز اور فراک کی سرخ پٹی پر سلور مقیش چمک رہی تھی۔ "زیادہ ہی شوخ لگ رہا ہے۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

"اور پیارا بھی۔" تصور کی آنکھ سے وہ خود کو یہ لباس پہنے اور فرہاد کو اپنی طرف متوجہ ہوتے دیکھ رہی تھی۔ پندرہ منٹ میں شاور لے کر اس نے وہ فراک پہنا۔ کاجل سے آنکھیں سجائیں اور کانوں میں میچنگ چھوٹے چھوٹے ٹاپس پہن لیے۔ اپنے طور پر وہ ٹھیک ٹھاک تیار ہوئی تھی۔ گیلے بال ہلکے سے خشک کر کے اس نے کیچر میں فولڈ کر دیے تھے۔ باہر خالہ آوازیں دے رہی تھیں۔ تیزی سے اس نے سیاہ چادر اوڑھی اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ خالہ اکیلی کھڑی تھیں۔

"تمہارے خالو آ گئے ہیں، چلو ان ہی کے ساتھ چلتے ہیں۔" آمنہ کے دل میں چھن سے کچھ ٹوٹا شاید کوئی آس۔

بے دلی سے وہ خالہ کے ساتھ خالو کی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی۔ ایک تو طبیعت ست تھی۔ دوسرا فرہاد کی وجہ سے ایک دم اس پر تھکن طاری ہو گئی تھی۔ پہلے خالہ نے اسے اک پرائیویٹ کلینک سے دوا۔ دلوائی، پھر اسے مارکیٹ میں وہ خوار کیا کہ وہ رونے والی ہو گئی۔ سبزیاں، پھل، مسالاجات، کپڑے، جوتے۔

پتا نہیں خالہ نے کیا کچھ خریدا تھا۔ وہ بے زاری سی ان کے ساتھ پھرتی رہی۔ اللہ اللہ کر کے ان کی شاپنگ اور دن ختم ہوا تو وہ گھر لوٹے۔ طبیعت سے زیادہ آمنہ کا موڈ خراب تھا۔ تھکن بھی وہ زیادہ گئی تھی۔ آتے ہی وہ سونے کے لیے چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرے کا راج تھا۔ چند ثانیے یوں ہی ساکت پڑے رہنے کے بعد اس نے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل پر پڑے لیمپ کو روشن کیا۔ کمرے میں مدھم سی روشنی بکھر گئی۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کا سوا ایک بج رہا تھا۔ شام کو آتے ہی وہ کمرے میں گھس گئی تھی۔ بستر پر پڑتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔

کھانا اس نے گیارہ بجے صبح ہی کھایا تھا۔ سو اب

بھوک سے بے حال ہو رہی تھی۔ کتنی دیر پڑی سوچتی رہی پھر جب بھوک برداشت نہ ہوئی تو منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر کچن میں آگئی۔ چائے بنا کر کیبن سے بسکٹ نکالے اور وہیں چیئر سرکا کر بیٹھ گئی۔ دل و دماغ پر اک بوجھل پن ساطاری تھا۔ اتنی دیر سونے کے بعد بھی ذہن تر و تازہ نہیں ہوا تھا۔ اتنی بھوک کے باوجود بھی وہ دو تین سے زیادہ بسکٹ نہیں کھا سکی۔ بے دلی سے چائے کا کپ اٹھا کر وہ اسٹڈی میں آگئی۔ پہلے بھی وہ تو می تو می رات تک اسٹڈی میں بیٹھی رہتی تھی' سو بلا جھجک وہ رات کے اس پہر اسٹڈی میں چلی آئی۔

کمپیوٹر آن کر کے وہ بیٹھ گئی اور ٹھنڈی چائے کے بدذائقہ گھونٹ حلق سے اتارنے لگی۔ دفعتاً" اسٹڈی سے ملحق کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھلا۔ آمنہ نے بے ساختہ گردن گھما کر پیچھے دیکھا سامنے فرہاد کھڑا تھا۔ بے اختیاری میں کپ رکھ کر وہ کھڑی ہو گئی۔ اس نے کئی بار اسٹڈی میں کھلنے والے اس دروازہ کو دیکھا تھا لیکن اسے پتا نہیں تھا کہ یہ فرہاد کے کمرے کا دروازہ ہے۔

"آپ۔" فرہاد کی آواز نے اس کا سکتہ توڑا۔

"جی۔ میں۔" باریک جالی کے دوپٹے میں وہ خود کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ سیاہ بال بے ترتیبی سے بندھے ہوئے تھے۔ کچھ بال ربڑ بینڈ میں مقید تھے اور کچھ کندھوں پر پڑے تھے۔ سیاہ بالوں میں اس کا اجلا شفاف چہرہ دمک رہا تھا۔ مرمریں سڈول گداز بازو بھی سیاہ نیٹ کے دوپٹے سے عیاں ہو رہے تھے۔ آنکھوں میں دلنشین سرخیاں تیر رہی تھیں۔ فرہاد کا انہماک دیکھتے ہوئے وہ سرخ کٹاؤ دار یاقوتی ہونٹ دانتوں تلے کچل رہی تھی۔

"آپ ہی آپ عیاشی ہو رہی ہے۔ اس وقت میں یہ کہنا چاہ رہا تھا لیکن تم۔" اس کی نظریں ابھی بھی آمنہ پر تھیں۔ آمنہ کو اس کی نگاہیں آرپار جاتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر وہ آگے بڑھ کر سسٹم کے سامنے پڑی چیئر پر بیٹھ گیا جہاں ابھی آمنہ بیٹھی تھی۔ آمنہ کو الجھن سی ہونے لگی تھی۔

"گھبرا کیوں رہی ہو؟ بیٹھو تم بھی۔" اسٹڈی میں ایک طرف سنگل بیڈ پڑا تھا۔ فرہاد نے اسے ادھر بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ بنا کچھ بولے وہ ادھر بیٹھ گئی۔

"عفی کہتی ہے تم اس سے بہت باتیں کرتی ہو تو میرے سامنے یہ خاموشی کیسی؟"

"نہیں تو۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔" نظریں جھکائے وہ اپنے پیروں کے ناخن گھور رہی تھی۔ فرہاد ماؤس پر ہاتھ رکھے کمپیوٹر پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

"تمہارا کوئی بوائے فرینڈ ہے؟" آمنہ کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ اس نے تیزی سے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور آہستگی سے نہیں کہہ کر اٹھ گئی۔

"ارے ایک منٹ بیٹھو تو سہی۔"

"نہیں۔ مجھے نیند آرہی ہے۔"

"جھوٹ۔"

"پھر اب۔؟" اصل میں فرہاد ایک دم اس کے دل سے اترا تھا۔ وہ تو کچھ اور سوچ رہی تھی جبکہ فرہاد کچھ اور تھا۔ اٹھ کر وہ اسٹڈی کے دروازے کی سمت بڑھی ہی تھی جب فرہاد ایک ہی جست میں اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"سوری یار۔ میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔" بڑی سرعت سے اس نے اپنا ہاتھ آمنہ کے کندھے پر رکھا اس کے جسم میں سرد سی اک لہر دوڑ گئی۔ بے اختیار اسے مراد یاد آیا تھا۔

"اٹس او کے۔ لیکن مجھے جانے دیں۔" اس کے لہجے میں بے اختیار سختی در آئی اور اس نے فرہاد کا ہاتھ جھٹکنا چاہا۔ لیکن اس کا ارادہ بھانپ کر وہ پہلے ہی اپنی گرفت مضبوط کر چکا تھا۔

"تمہیں اگر کسی نے بتایا نہیں کہ تم کتنی خوب صورت ہو تو تمہارے مزاج میں یہ غرور کہاں سے آیا؟" وہ آمنہ کے بے حد قریب کھڑا تھا۔ اس کی سانسوں کی گرمی سے آمنہ کو اپنا آپ جلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"مجھے جانے دیں' پلیز۔" وہ مضطرب سی اس سے

بچنے کی سعی کر رہی تھی۔

"میرا حسن کو خراج تحسین پیش کرنے کا اپنا ہی انداز ہے اور میں یہ خراج پیش کیے بغیر رہ نہیں سکتا۔ تم جب جب میرے سامنے آؤ گی میں تمہیں تمہاری خوب صورتی کا احساس ضرور دلاؤں گا۔" وہ اس کے بے انتہا قریب کھڑا اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ فرہاد کی مضبوط گرفت میں تھے۔ وہ جتنا خود کو چھڑوانے کی کوشش کر رہی تھی وہ اتنا اس پر حاوی ہوتا چلا جا رہا تھا۔ کرب کی شدت سے اس نے آنکھیں موند لیں۔ "یا اللہ! میری حفاظت فرما۔" الفاظ ٹوٹ کر اس کے ہونٹوں سے نکلے تھے۔

آمنہ کو کندھے سے پکڑ کر اس نے پیچھے کی طرف دھکیلا۔ آمنہ نے اسے دھکا دینے کی کوشش تو اس نے آمنہ کا بازو اپنے آہنی پنجے میں دبوچ لیا۔ اس کی انگلیاں آمنہ کے بازو میں پیوست ہو گئی تھیں۔ دھکیلتا ہوا وہ اسے اسٹڈی میں بچھے واحد بستر تک لے آیا۔ اس کی مزاحمت دم توڑتی جا رہی تھی۔ جیسے ہی اس نے اسے بیڈ پر گرایا عین اس لمحے لائٹ چلی گئی۔ جتنی دیر میں فرہاد کچھ سمجھ پاتا وہ اسے پوری قوت سے دھکا دے کر راستے سے ہٹاتی دروازے کی طرف بھاگی۔ دروازے کے دائیں طرف پڑا گلدان بد حواسی میں اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا تھا۔ بجلی کی تیزی سے وہ بھاگتی ہوئی اس کی دسترس سے دور نکل گئی تھی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ اندر سے لاک کر لیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ موسم میں اگرچہ خنکی موجود تھی لیکن اس کا سارا وجود پسینے میں تر تھا۔

اندھیرے نے اس کی زندگی میں اندھیرا ہونے سے بچا لیا تھا۔ لوگ یوں ہی اندھیرے سے خوف کھاتے ہیں۔ اندھیرا تو اپنے سینے میں بڑے بڑے راز و عیوب چھپا لیتا ہے۔ کمرے کی چھت پر اسے مدھم سی روشنی دکھائی دی تو اس نے سر اٹھا کر روشنی کے ماخذ کو دیکھا۔ اس کے موبائل پر کوئی کال آ رہی تھی۔ لیٹے لیٹے اس نے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل پر پڑے موبائل کو پکڑا تو غیر ارادتاً "کال ریسیو ہو گئی انجانا نمبر تھا۔ اس نے فون کان سے لگا لیا۔

"السلام علیکم۔" مراد کی آواز سنتے ہی وہ با آواز بلند رونے لگی۔

"آمنہ۔۔۔ کیا ہوا آمنہ۔۔۔ آمنہ۔" مراد اسے پکار رہا تھا۔ لیکن اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

"آمنہ سب ٹھیک تو ہے۔" اس کی آواز میں واضح پریشانی تھی۔

"ہاں۔۔۔" وہ بمشکل ہی بول پائی۔

"تو تم رو کیوں رہی ہو۔"

"کچھ نہیں، بس یوں ہی۔۔۔ اس وقت فون کیا، خیریت تو ہے۔" آنسو پونچھ کر وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ہاں۔۔۔ بس پتا نہیں کیا ہوا، میرا دل گھبرا رہا تھا۔ تم سو رہی تھیں۔"

"نہیں۔۔۔ سوئی تو نہیں، ہاں سوئی تھی میں۔" وہ بے ربط بول رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا مراد پاس ہوتا تو وہ اس کے سامنے سارے دکھ رو لیتی۔

"مجھے تمہاری طبیعت نہیں ٹھیک لگ رہی، کیا ہوا ہے؟" وہ نرمی سے اس کو پوچھ رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر رو پڑی۔

"مراد مجھے لے جاؤ ادھر سے۔ میرا دم گھٹتا ہے ادھر۔ یہ ہوائیں میرے لیے نہیں ہیں۔ مجھے اس روشنی میں بھی اندھیرا نظر آتا ہے۔ مراد مجھے لے جاؤ پلیز۔" وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

"تمہارا زندگی کی طرف رویہ نارمل نہیں ہے۔ تم ہو جاؤ گی نارمل، بس تھوڑا وقت لگے گا۔ آسودگی کی ذرا سی ہوا چلے گی تو تمہارے آنسو بھی خشک ہو جائیں گے۔ اپنے آپ کو موقع دو اس ماحول میں ڈھلنے کا۔ اس فضا سے مطابقت پیدا کرنے کا۔ فیصلے کرنے آسان ہوتے ہیں بہ نسبت ان پر عمل کرنے کے۔ میری باتوں پر غور کرنا اور اب سو جاؤ، تین بجنے والے ہیں۔" وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ میں اس ماحول کا حصہ نہیں۔ ساری زندگی بھی اس ماحول سے مطابقت کی

کوشش میں لگی رہوں تو نہیں کر سکتی مطابقت پیدا۔ میں اپنے آپ کو موقع دے سکتی ہوں۔ لیکن زندگی اک اور موقع نہیں دے گی۔ بدقسمتی اگر ایک بار زندگی میں داخل ہو گئی تو اپنے اعمال کی سیاہی وہ آب زم زم میں نہا کر بھی دور نہیں کر سکے گی لیکن مراد یہ سب سننے سے پہلے فون بند کر چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

لان میں کھلنے والی واحد کھڑکی اس نے کھولی تو سبک خرام نرم ہوا کے جھونکے اسے چھو کر گزر گئے۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ دوپہر رخصت ہو رہی تھی۔ چنبیلی اور گلاب کی باڑھ پر بہار کے قافلے اتر آئے تھے۔ گلاب کے پودوں پر کہیں کہیں سرخ و گلابی کلیاں نظر آ رہی تھیں۔ موتیا اور موگرے کی مہک اس کی سانسوں میں سما کر اسے تازگی بخش رہی تھی۔

وہ صبح سے اپنے کمرے میں قید تھی۔ باہر جانے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ فرہاد نامی عفریت کا سامنا! اس کے بس میں نہیں تھا۔ صبح عفت یا پتا نہیں خالہ اس کے کمرے کا دروازہ بجا بجا کر گئی تھیں۔ وہ جان بوجھ کر سوتی بنی رہی۔ رونے اور جاگتے رہنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ اور پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ کہنی سے ذرا اوپر جہاں سے فرہاد نے اسے پکڑا ہوا تھا۔ سرخ نشان واضح دکھائی دے رہے تھا۔ نہا کر اس نے فل سلیوز والا شلوار قمیص پہنا اور دھڑکتے دل کے ساتھ باہر آ گئی۔ دل ہی دل میں وہ دعا کر رہی تھی کہ فرہاد سے سامنا نہ ہو۔

"آپی۔ طبیعت ٹھیک ہے تمہاری۔" عفت اکیڈمی کے لیے تیار ہو کر باہر نکل رہی تھی۔ جب اسے لاؤنج کے پاس دیکھ کر رک گئی۔

"نہیں ذرا سر میں درد ہے۔" جھوٹ بولنے میں ہی عافیت تھی ورنہ اپنے حال کی کیا وجہ بتاتی۔

"ہاں وہ ماما نے بتایا تھا کل سے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ کوئی میڈیسن کھا لو ماما سے لے کر۔ آج ریسٹ کرو کل تمہیں فریش کرنے کے لیے کہیں گھما پھرا لاؤں گی۔" آمنہ کے گال پر چٹکی کاٹ کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی پھر کچھ یاد آنے پر پلٹ آئی۔

"آپی فریزر میں گوشت رکھا ہوا ہے تم پلیز بھون لینا۔ آج کام والی نہیں آئی اور ماما بھی صبح لیٹ سوئی ہیں شاید شام تک اٹھیں۔" آمنہ کی تو روح فنا ہو گئی تھی۔ شام تک اکیلے رہنے کا مطلب۔

"کیا ہوا؟ روٹیاں میں آتے ہوئے ہوٹل سے منگوا لوں گی کسی سے کیوں بھی آج تم، میں اور ماما ہی ہوں گے کھانے پر۔"

"خالو کدھر ہیں؟" فرہاد کا براہ راست پوچھنے سے وہ گریز برت رہی تھی۔

"وہ فرہاد بھائی کے ساتھ اسلام آباد گئے ہیں، کل صبح آئیں گے۔ فرہاد بھائی کو کال آ گئی تھی صبح پانچ بجے جانا پڑا انہیں۔" فرہاد کی غیر موجودگی کتنا جانفزا احساس تھا۔

عفت کے جانے کے بعد پہلے وہ اسٹڈی میں آئی۔ رات والی قیامت کے آثار ابھی بھی ویسے ہی تھے۔ گلدان کے ٹکڑے اٹھا کر اس نے کوڑے میں پھینک دیے۔ ہر جگہ سے اس نے رات کا تاثر زائل کرنے کے لیے اچھی طرح صفائی کی تھی۔ اللہ تعالیٰ کیسے اپنے بندوں کی مدد فرماتا ہے۔ وہ جیسے نیند سے جاگی تھی۔ اللہ تعالیٰ۔ نماز۔ قرآن ان چار، چھ مہینوں میں وہ اللہ کو بھلائے بیٹھی تھی۔ لیکن جب اس نے مدد کے لیے اسے پکارا تو اس نے مدد فرمائی۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس نے وضو کیا اور اس کے حضور جھک گئی۔ سجدہ شکر تو اس پر واجب تھا نا۔ آج سر کے ساتھ اس کا دل بھی جھکا تھا۔ اک اطمینان تھا جو اس کے سینے میں بھر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

دن بڑی سست روی سے گزر رہے تھے۔ وہ چاہ رہی تھی کہ جلدی سے پیپرز ہو جائیں تو وہ گاؤں واپس چلی جائے۔ جب سے وہ شہر آئی تھی اس کی مراد سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اچھا ہی ہوا نہیں ہوئی، ورنہ

اس کے بدلے رنگ دیکھ کر مراد کو دکھ ہوتا تھا۔ اب جبکہ شہرنام کا بھوت اس کے دماغ سے اتر چکا تھا۔ وہ پھر بھی مراد سے ملنا نہیں چاہ رہی تھی۔ دل ہی دل میں وہ مراد سے ناراض تھی۔ اس رات اگر اس نے مراد سے واپس آنے کی بات کی تھی تو کیا تھا۔ اگر وہ اسے اچھے لفظوں میں تسلی دے دیتا کہ جب پیپرز ختم ہو جائیں گے وہ آکر اسے لے جائے گا۔ یا یہ کہ گھر ملنے کے لیے ہی چلی جاتی اس کے پاس مراد کا نمبر بھی تھا۔ پھر بھی اس فون نہیں کیا تھا۔ گھر فون کرکے حال احوال سن لیتی اور کہہ لیتی۔

مراد کو بات بات پہ یاد کرتی لیکن ابھی تک اسے صرف ایک کزن یا ایک دوست کی حیثیت سے۔ اس کی محبت سے وہ ابھی بھی لاعلم ہی تھی۔

پیپرز میں کچھ دن ہی رہ گئے تھے۔ فرہاد کو گئے ہوئے مہینے سے اوپر ہو گیا تھا۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ پیپرز ختم ہونے تک وہ نہ ہی آئے۔ مکمل یکسوئی سے وہ پڑھائی پر دھیان دے رہی تھی۔ بے چینی سے وہ گاؤں جانے کی منتظر تھی۔ آج کل بات بات پہ اسے گاؤں یاد آجاتا۔ پانی پینے کے لیے فریج کھولتی تو گھڑونچی پر دھرے مٹکے یاد آجاتے۔ کانچ کے نفیس برتن اٹھاتی تو اپنے مٹی کے برتن یاد کرتی۔ لان دیکھتی تو گھر کے صحن میں لگے امرود اور جامن کے پیڑ یاد آتے۔ جن مرغیوں سے وہ تنگ آئی رہتی تھی۔ اب وہ بھی یاد آنے لگی تھیں۔ انگلیوں پر گن گن کے وہ دن گزار رہی تھی۔

پیپرز میں پندرہ دن تھے۔ جب عفت نے خوشی خوشی اسے اطلاع دی تھی۔ "فرہاد بھائی کی پوسٹنگ لاہور ہو گئی ہے۔ وہ آج شام آئیں گے۔ دو تین دن میں واپس جا کر مستقل طور پر لاہور آجائیں گے۔"

آمنہ کا دل سوکھے پتے کی طرح لرزنے لگا تھا۔ "کیا تھا اگر یہ مہینہ گزر ہی جاتا۔" اس نے دل ہی دل میں اللہ پاک سے شکوہ کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

جب سے فرہاد آیا تھا آمنہ کو زندگی ہی مشکل لگنے لگی تھی۔ ایک ہفتے میں مشکل سے وہ دو چار بار فرہاد کے سامنے آئی تھی۔ پیپرز کی تیاری کا بہانہ کرکے وہ مستقل طور پر کمرے میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔ اب بھی وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے کتاب گود میں رکھے پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب دروازہ ناک کرکے عفت اندر آگئی۔ اس نے چست لانگ پرنٹڈ شرٹ پہن رکھی تھی۔ دوپٹا نام کے تکلف سے وہ اکثر آزاد ہی رہتی تھی۔ پاؤں سمیٹ کر اس نے عفت کے لیے جگہ بنائی۔

"آج کل پوری توجہ پڑھائی پر دی جا رہی ہے۔"

"جی۔۔۔ بس سوچ رہی ہوں اچھا گریڈ بن جائے۔" اس نے ہلکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا تھا۔

"گڈ۔۔۔ لیکن کتابی کیڑا بن کر بھی پڑھائی کا نقصان ہوتا ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں آج کل کمرے میں ہی زیادہ تر ہوتی ہو۔ باہر نکلو، خود کو ریلیکس کرو، مائنڈ فریش ہوگا تو بہتر طریقے سے پڑھ سکو گی۔" بولتے ہوئے وہ مسلسل میسج ٹائپ کر رہی تھی۔

"باہر کہاں نکلوں؟ اکیڈمی بھی جا رہی ہوں اور کمپیوٹر کی کلاس کے لیے بھی۔"

"پاگل۔۔۔ میرا مطلب ہے آؤٹنگ کے لیے۔۔۔ بلکہ یوں کرو میں آج کچھ کام سے جا رہی ہوں، تم بھی ساتھ چلو۔"

"نہیں۔" اس نے بلا تامل جواب دیا تھا۔

"سر کا فون آیا تھا آج۔ وہ سیالکوٹ جا رہے ہیں، سو آج تمہیں پڑھا نہیں سکیں گے۔ یوں بھی یہ دن تو گھر میں پڑھنے کے ہوتے ہیں۔ ماما وغیرہ پھپھو کی بیٹی کی منگنی میں جا رہے ہیں۔ تم پھر ادھر چلی جانا۔"

"کون کون جا رہا ہے منگنی میں؟"

"میرے علاوہ سب۔" وہ ابھی تک موبائل پر مصروف تھی۔ "پھر یوں کریں مجھے آپ اپنے ساتھ ہی لے چلیں۔ میں کیا کروں گی منگنی میں جا کر۔" بڑی سوچ و بچار کے بعد اس نے کہا تھا۔

"ویری گڈ۔۔۔ یوں کرو کوئی بھی اچھا سا ڈریس نکال کر ریڈی ہو جاؤ۔ میں بھی بس تیار ہو کر آئی۔"

اس کے جانے کے بعد آمنہ نے گہری سانس لی اور کتاب بند کر کے تیار ہونے کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

☼ ☼ ☼

عفت اسے لے کر لاہور بورڈ آفس آئی تھی۔ پتا نہیں کیا کام تھا اسے۔ موسم اچھا خاصا گرم ہو رہا تھا۔ آمنہ مرکزی عمارت کے سائے میں مین گیٹ کے اندر کھڑی تھی۔ دائیں طرف ایک لمبی سی راہداری میں دو، تین ہال نما کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔ ان میں سے ایک دروازے میں عفت جا کر گم ہی ہو گئی تھی۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ ادھر گرمی میں کھڑی تھی۔ آتے جاتے لوگ اسے غور سے دیکھتے تو وہ مزید تپ جاتی۔ اللہ اللہ کر کے ہنستی مسکراتی عفت سامنے سیڑھیوں سے اتر کر اس کی طرف آتی دکھائی دی تو اس کی جان میں جان آئی۔

"تو یہ ہے... شکر ہے کام ہو گیا۔" نادیدہ پسینہ صاف کرتی وہ مین گیٹ کی طرف بڑھی تو آمنہ بھی اس کے ساتھ ہو لی۔ مین گیٹ سے باہر جا کر اس نے ہاتھ میں پکڑے سیل فون پر کچھ بٹن پریس کیے اور سیل کان سے لگا لیا۔

"یار کتنا ٹائم لگے گا اور... میرا گرمی سے حشر خراب ہو رہا ہے۔

ٹھیک ہے، میں رکشا لے کر گھر کو نکل رہی ہوں، اوکے ٹم گڈ۔" نرم گرم لہجے میں بات کر کے اس نے مسکرا کر فون بند کر دیا۔ اس سے پہلے کہ آمنہ کچھ سوال کرتی یا سمجھ پاتی۔ چمکیلے گرے کلر کی ونڑان کے پاس آ کر رک گئی۔ آمنہ اچھل کر پیچھے ہٹی تھی۔ عفت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ ہی گھسیٹ لیا۔ گاڑی کا بیک ڈور کھول کر اس نے پہلے آمنہ کو اندر دھکیلا، پھر خود بھی ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ وہ مزاحمت تک نہیں کر پائی تھی۔ سیاہ چادر میں خود کو اچھی طرح لپیٹ کر گلے شکوے کرتی عفت کو دیکھا۔ عفت نے دوپٹا ذرا اور سرکا دیا تھا۔

"اوہ سوری... یہ امی ہے میری کزن۔"

"اور امی... یہ میرے یونیورسٹی فیلو ہیں عمر۔" عفت چہک چہک کر تعارف کروا رہی تھی۔ عمر نامی لڑکے نے شاید اسے ہیلو کہا تھا۔ آمنہ نے مروتاً بھی سلام نہیں کیا۔

"یہ عمر کے دوست ہیں شیراز۔" عمر کی نسبت شیراز قدرے لمبے قد اور سانولے رنگ کا پختہ عمر آدمی تھا۔

"بہت مغرور ہیں آپ کی کزن۔" عمر نے بیک ویو مرر سے اسے نظروں کے حصار میں لے رکھا تھا۔

"نہیں تو... بس ذرا کنفیوژ ہو گئی ہے۔" عفت نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔

"ویسے آپ کی کزن آپ سے زیادہ کیوٹ ہے۔ میری ان سے دوستی کروا دیں۔" عمر نے شوخ لہجے میں کہا تو اک لمحے کے لیے عفت کی رنگت بدل گئی تھی۔

"آپ کے سامنے بیٹھی ہے، آپ کر لیں دوستی۔" عفت کی خفگی محسوس کر کے عمر کھل کر ہنس پڑا۔ گاڑی انجانی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ آمنہ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ البتہ اسے یہ سب ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ عمر اور عفت کی ذو معنی باتیں اسے زچ کیے دے رہی تھیں۔ "کاش میں منگنی میں ہی چلی جاتی" اسے اب افسوس ہو رہا تھا کہ وہ ادھر آئی ہی کیوں۔ کتنی دیر کی بحث اور ادھر ادھر گاڑی بھگانے کے بعد اب وہ ایک ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑے تھے۔

"یار میں نے کہا تھا کہ "ویلیج" کے علاوہ کہیں بھی چل لیں لیکن آپ کو پتا نہیں اس میں کیا نظر آتا ہے۔" عفت منہ بنا کر بڑبڑا رہی تھی۔

"جانِ من... جہاں آپ ہوں وہاں سب کچھ خاص ہوتا ہے۔ یوں بھی آپ کے سامنے مجھے کچھ بھی نظر کہاں آتا ہے۔" ان کی خالص عشقیہ گفتگو سے آمنہ کو چڑ سی ہو رہی تھی۔ اس نے بمشکل کھانے میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ عمر کی بے باک نگاہیں اس کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ اسے الجھن ہو رہی تھی۔ نہ وہ کبھی ریسٹورنٹ میں آئی تھی، نہ اسے اتنے مہذب آداب معلوم تھے۔ ہاتھ سے چاول کھانے والی سے چمچے سے چاول کھانا مشکل ہو رہا تھا۔ کچھ عمر کی نظریں، کچھ اس

کی باتیں... اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ کبھی چاول گرتے، کبھی کرسی ہل جاتی۔ کبھی پانی چھلک جاتا، شرمندگی کے احساس سے اس کی آنکھوں میں پانی بھر آرہا تھا۔

ریسٹورنٹ سے نکلتے ہی اس نے شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔ عفت اور عمر کی چہلیں جاری تھیں۔ شیراز سارے معاملے سے لاتعلق بنا ان کا ساتھ دے رہا تھا۔

"عفت گھر چلیں اب۔" گاڑی میں بیٹھتے ہوئے وہ ہولے سے منمنائی تھی۔ "بس آئس کریم کھالیں، پھر گھر چلی جائیے گا۔" پتا نہیں کیوں عمر کا سارا دھیان ان کی طرف ہی تھا۔ اس نے سرعت سے جواب دیا تھا۔ بادل ناخواستہ آمنہ نے تائید میں سر ہلا دیا۔ حضرت علی ہجویریؒ کے مزار کے قریب خستہ حال عمارتوں میں گھری پرانی طرز کی ایک شکستہ عمارت کے سامنے گاڑی رکی تھی۔ یہاں اور بھی کئی گاڑیاں پارک کی ہوئی تھیں۔

"میں اور عفت پانچ منٹ میں آئس کریم لے کر آتے ہیں، آپ دونوں تب تک باتیں کرو۔"

"آپ لوگ چاہیں تو ہمارے ساتھ ہی اوپر چلیں۔" عفت نے نظروں ہی نظروں میں عمر کو سرزنش کی تھی۔

آمنہ کو کچھ دیر پہلے کھایا جانے والا کھانا اور ذلت یاد آگئی۔ سو اس نے انکار کر دیا۔

"ہمیں گاڑی میں ہی ٹھیک ہے۔ بس آپ جلدی آیئے گا۔" "شیور" کہہ کر عمر نے ساتھ کھڑی عفت کا ہاتھ پکڑا اور عمارت کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

وقت گزاری کے لیے آمنہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اگرچہ وہ سڑک کے نزدیک تھے۔ لیکن اس طرف آمد و رفت خاصی کم تھی۔ بلکہ اگر اس حصے کو سنسان کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔ گاڑیوں کے جھرمٹ میں کھڑی اس گاڑی کے شیشوں سے وہ زیادہ دور تک نہیں دیکھ پا رہی تھی۔ شیراز بھی موبائل پر گیم کھیلنے میں مصروف تھا۔ آمنہ نے کلائی پر بندھی اسٹائلش ڈائل والی گھڑی پر ٹائم دیکھا۔ ان دونوں کو گئے ہوئے آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا۔ بے چینی سے پہلو بدلتے اس نے بیگ میں رکھا فون نکالا اور عفت کو ٹیکسٹ کیا۔ پانچ منٹ تک ریپلائے کا ویٹ کیا لیکن دوسری طرف خاموشی پا کر اس نے عفت کا نمبر ڈائل کیا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا عفت کا موبائل آف تھا۔

"آپ پلیز اپنے دوست کو فون کریں۔ عشا کی اذان ہونے والی ہے۔ ہم نے گھر جانا ہے۔" ہمت کر کے اس نے شیراز کو مخاطب کیا تھا۔ "فری ہوں گے تو آجائیں گے۔ کال کر کے کیا ڈسٹرب کرنا انہیں۔" بڑے عجیب سے لہجے میں اس نے کہا تھا۔ آمنہ چپ ہو گئی۔ زیرِ لب وہ مختلف دعاؤں کے ورد کر رہی تھی۔

"تم گاؤں سے آئی ہو۔"

اس کے سوال سے زیادہ حیرت اس کے طرزِ تخاطب پر ہوئی تھی۔ "جی۔"

"اسی لیے... اسی لیے میں کہوں۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"کیا؟"

"میں بھی کہوں عفت جیسی لڑکی کے ساتھ تم جیسی معصوم لڑکی کہاں پھنس گئی۔" اس کے لہجے کی نرمی سے اسے ایک بار پھر مرا دیاد آگیا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"مطلب صاف ہے۔ اگر تم واقعی اس کی کزن ہو تو بھی اس سے دور رہو۔ وہ ٹھیک لڑکی نہیں ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے اس بوسیدہ سی عمارت میں وہ دونوں آئس کریم لینے گئے ہیں۔" اس نے ناسمجھی سے اس کی طرف دیکھا۔ "بے وقوف لڑکی وہ دونوں اوپر ہوٹل کے کمرے میں عیاشی کرنے گئے ہیں۔"

کتنی آسانی سے وہ اتنی بڑی بات کہہ گیا تھا۔ آمنہ کی آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا تھا۔

"اگر مجھ پر یقین نہیں تو خود دیکھ لینا۔ وہ دونوں خالی ہاتھ واپس آئیں گے اور اگر تم میں تھوڑی بھی عقل ہوئی تو ان کے چہرے غور سے دیکھ لینا۔"

آمنہ کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول کر وہ باہر نکل گیا۔ چند ثانیے فون پر بات کرنے کے بعد وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر آگیا تھا۔

"حوصلہ رکھو یار۔۔۔ زندگی پتا نہیں کیا کچھ دکھاتی ہے۔ مہذب ماسک کے پیچھے پتا نہیں کیسا جنگلی چہرہ نکل آئے۔" وہ نرمی اور شائستگی سے اسے سمجھا رہا تھا۔ آمنہ نے بدقت اثبات میں گردن ہلائی۔ وہ آمنہ سے قدرے فاصلے پر بیٹھا تھا۔ لائٹ آف کر کے وہ آہستگی سے آمنہ کے قریب ہوا تھا۔ آمنہ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"چپ۔۔۔ کچھ نہیں کروں گا۔ تمہاری اجازت کے بغیر کچھ نہیں کروں گا۔" اس کا ہاتھ آمنہ کے ہونٹوں پر تھا۔ وحشت سے اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ کتنا مکروہ چہرہ تھا اس مہذب دنیا کا۔ ابھی وہ اسے کچھ کہہ رہا تھا اور ابھی۔۔۔

"میں تمہیں چھونا چاہتا ہوں، پیار کرنا چاہتا ہوں۔ میرا ساتھ دو تا زندگی کے نئے رنگ سے روشناس کروا دوں گا۔ تمہاری زندگی جنت بنا دوں گا۔" وہ اس کی طرف سرک رہا تھا اور وہ۔۔۔ گاڑی کے دروازے کے ساتھ لگی تھی۔ گھبراہٹ میں گاڑی کا دروازہ تک نہیں کھل رہا تھا۔ شدت کرب سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ "اللہ کا واسطہ مجھے جانے دو پلیز۔" وہ بری طرح سسک اٹھی تھی۔

"میری جان۔۔۔ صرف تمہارا تھوڑا سا پیار چاہیے۔ جو کہوگی، جیسے کہوگی، میں کرنے کو تیار ہوں۔" اچانک اس کا ہاتھ گاڑی کے دروازے پر پڑا تو پیچھے ہٹنے کی کوشش میں اس کا دباؤ ہاتھ پر بڑھ گیا۔ گاڑی کا شیشہ آہستگی سے نیچے ہوا تھا۔ وہ پوری قوت سے چلائی۔ "کوئی ہے۔ میری مدد کرو پلیز۔"

شیراز نے شیشہ بند کرنے میں اک لمحہ لگایا تھا۔ شیشہ بند کرتے ہی اس نے آمنہ کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ وہ اسے گالیاں دے رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اس کی چادر اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک کسی نے گاڑی کا شیشہ بجانا شروع کر دیا۔ دو پولیس اہلکار ادھر سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے آمنہ کے چلانے کی آواز سنی تھی اور اندازے سے ڈھونڈتے ہوئے ان تک پہنچے تھے۔

"اپنی زبان بند رکھنا، ورنہ جان سے مار دوں گا یا وہاں بیچ آؤں گا جہاں روز مروگی۔" اس کے دروازہ کھولتے ہی وہ پھر سے چیخ پڑی۔

"اللہ کا واسطہ مجھے بچا لیں۔ مجھے نکالیں یہاں سے۔" شیراز نے گھبرا کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن پولیس والے نے مستعدی سے اسے پکڑ لیا۔ ایک نے دروازہ کھول کر اسے باہر نکال لیا۔ جبکہ دوسرا شیراز سے نبٹ رہا تھا۔ اس نے شیراز کو کالر سے پکڑ کر دو، تین جھٹکے دیے اور اس کے پیٹ پر مکوں کی بارش کر دی۔ شیراز کے منہ سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ وہ سہمی ہوئی چڑیا کی طرح پولیس والے کے پیچھے کھڑی تھی۔

"دیکھ اگر آس پاس کوئی موبائل رابطے میں ہے تو ادھر بلا لے۔ تھانے لے چلتے ہیں انہیں۔ رپورٹ ادھر لکھوا لیں گے۔"

"مم۔۔۔ مجھے گھر جانے دیں۔ مجھے نہیں کروانی کوئی رپورٹ۔" اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ "بی بی تھانے تو اب جانا ہی پڑے گا۔ ویسے آدھی رات کو تم ادھر کر کیا رہی تھیں؟" نڈھال سا شیراز اب زمین پر دو زانو ہو کر بیٹھا تھا۔ اس کے گھٹنے پر پولیس والے نے اپنا پاؤں رکھا ہوا تھا۔

"میں نہیں آئی تھی۔" اچانک اسے عفت کا خیال آگیا۔ "میری کزن اس کے دوست کے ساتھ آئس کریم لینے گئی ہے اس عمارت میں۔" اس نے اشارے سے عمارت دکھائی تو پولیس والا باآواز بلند قہقہے لگانے لگا۔

"ہائے رے معصومیت۔۔۔ چل کاکا اپنے دوست کو فون کر کہ اس کی بارات باہر کھڑی ہے۔" اس نے پاؤں سے شیراز کے گھٹنے پر زوردار ضرب لگائی۔ شیراز بلبلا اٹھا۔

"اور سن۔۔۔ اسے اگر کوئی اشارہ دیا تو گنج تو ختم۔"

جو پولیس والا آمنہ کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے واقع طور پر شیراز کو دھمکایا تھا۔ اگلے آدھے گھنٹے میں وہ چاروں پولیس اسٹیشن میں بیٹھے تھے۔ شیراز اور عمر حوالات میں تھے۔ وہ اور عفت باہر اے ایس آئی کے کمرے میں تھے۔ اس کا رو رو کر برا حال تھا۔ کچھ نہ کر کے بھی وہ مجرم تھی۔ عفت نے بھی پہلے پہل اکڑ دکھائی لیکن اب وہ بھی پریشان حال بیٹھی تھی۔ اے ایس آئی کی ہزار منتوں کے بعد انہیں گھر فون کرنے کی اجازت ملی تھی۔ فرہاد نہ انہیں رات تھانے میں چھوڑنا چاہتا تھا اور نہ ہی اپنے سورسز استعمال کرنا چاہتا تھا۔ خدا جانے کیا معاملہ طے ہوا کیسے ہوا؟ بس یہ ہوا کہ رات کے ڈھائی بجے تک وہ اور عفت گھر پہنچ گئے تھے۔ پولیس اسٹیشن میں جو بھی بات کھلی اس سے آمنہ تو بے قصور۔ ثابت ہوئی تھی اور عفت! اپنے نام کے بالکل الٹ سب کی نظروں سے گری تھی۔ خالو کی تو طبیعت بگڑ گئی تھی۔ خالہ بھی انتہائی شاک کی کیفیت میں تھیں۔ فرہاد کا بس نہیں چل رہا تھا وہ عفت کو جان سے مار دے۔

"ایک مرد جو گناہ باہر کر کے آتا ہے وہ اصل میں اس گناہ کو اپنے گھر کا راستہ دکھاتا ہے۔ وہ گناہ کسی نہ کسی صورت اس مرد کی ماں، بہن، بیوی یا بیٹی تک پہنچ ہی جاتا ہے۔ آپ عفت کو جان سے مارنے کے درپے ہیں، اپنے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟ آبرو کی کتنی ردائیں تار تار کی ہیں آپ نے؟ اگر آپ اپنے ضمیر، اپنی غیرت کی عدالت سے بری ہیں تو فرد جرم عفت پر ہی کیوں عائد ہو۔ اس لیے کہ وہ لڑکی ہے۔ اسلام میں اگر عورت گناہ کرے تو اسے بھی سزا ہے۔ مرد گناہ کرے تو اسے بھی۔ آپ کون ہوتے ہیں پھر خود کو پاک باز سمجھنے والے؟"

عفت لاؤنج میں صوفے پر دبک کر بیٹھی تھی۔ فرہاد اس سے ذرا فاصلے پر تھا۔ مدھم آواز میں سوچ کے نئے در اس پر کھولتی وہ خالہ کے پاس سے ہو کر کمرے میں چلی گئی۔ اس گھر کے مکین بہتر طور پر فیصلہ کر سکتے تھے۔

عمر کی تمام اچھائیوں، برائیوں سے صرف نظر کرتے ہوئے عفت کا اس سے رشتہ طے کر دیا گیا تھا۔ عمر کا حوالات سے جیل تک کا سفر زیادہ دور نہیں تھا۔ لیکن فرہاد نے ایک ہی دن میں اسے بھی شادی کی ضمانت پر رہا کروا لیا تھا۔ وہ شرمندہ تھا۔ اس نے آمنہ سے معافی بھی مانگی تھی۔ لیکن آمنہ کی نظر میں بے معنی الفاظ تھے اگرچہ سچے تھے۔ صحیح وقت پر صحیح الفاظ ہر کوئی نہیں بول سکتا۔ وقت گزر جانے کے بعد جذبے کتنے ہی سچے کیوں نہ ہو جائیں الفاظ کی طرح بے معنی ہو جاتے ہیں۔ خالہ اتنی شرمندہ تھیں کہ اس سے نظریں بھی نہیں ملا رہی تھیں۔ سب اپنے اپنے کمروں میں قید تھے۔ ہمت کر کے وہ کمرے سے نکلی تھی۔ خالہ یقیناً اپنے کمرے میں تھیں۔ "خالہ میں شام کو واپس جا رہی ہوں۔" انہیں شرمندگی سے بچانے کے لیے وہ خود ہی نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔

"مجھے معاف کر دینا میری بچی۔" خالہ نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے تو وہ تڑپ اٹھی۔

"خالہ پلیز۔ ایسے تو نہ کریں۔" اس نے خالہ کے ہاتھ پکڑ لیے۔ "میں اپنی بیٹی کی حفاظت کرنے میں ناکام رہی تو تمہاری کیا حفاظت کرتی۔ میری کوتاہی کی وجہ سے تم نے پولیس اسٹیشن کا منہ دیکھا۔ گاؤں میں اپنی ماں کے پاس ہوتیں تو ایسا کبھی نہ ہوتا۔" خالہ کو رنجیدہ دیکھ کر اسے تکلیف ہوئی تھی۔

"ٹھیک کہا خالہ۔ میں اپنی خواہش۔ اپنے نفس کے کہنے پر یہاں آئی تھی اور نفس تو انسان کا دشمن ہی ہے نا۔ میں گاؤں میں کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کروں گی، آپ بھی نہ کیجیے گا۔" خالہ کچھ نہیں بولی تھیں۔

"میں کچھ کپڑے یہیں چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ عفت آپی کو دے دیجیے گا۔ گاؤں میں ایسے کپڑے نہیں پہن سکوں گی نا۔" اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی یہ بتانے کی کہ وہ کپڑے عفت ہی کے دیے ہوئے

www.paksociety.com

ہیں۔ "مطلب۔ اب تم پیپر زدینے نہیں آؤ گی۔"

"نہیں خالہ۔ جو سبق مجھے زندگی نے سکھا دیا ہے۔ اگر اس کی کوئی ڈگری ہوتی تو وہ لازما" ایف اے کی ڈگری سے بڑی ہوتی۔ اب مجھے ایف اے کی ڈگری کی ضرورت نہیں رہی۔ یوں بھی علم اک کیفیت کا نام ہے۔ ڈگری کا نام نہیں اور وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔ اب اسے معنی خیز باتوں کی نظروں کی سمجھ آنے لگی تھی۔ کمرے میں آکر اس نے اپنا مختصر سا سامان پیک کیا۔ عفت کی دی ہوئی ہر چیز وہ ادھر ہی چھوڑ کر جا رہی تھی۔ اپنے مہنگے موبائل سے سم نکال کر اس نے اماں والے موبائل میں سم ڈال لی تھی اور ملٹی میڈیا موبائل بیگ میں سامان کے ساتھ رکھ لیا تھا۔ جب سے وہ گاؤں سے آئی تھی آج پہلی بار مراد سے سامنا ہونا تھا۔ وہ چاہتی تھی وہ بالکل پہلے جیسی لگے۔ اس لیے گاؤں سے لائے ہوئے کپڑوں میں سے فیروزی اور سفید امتزاج کا لباس نکال لیا۔ اسے یاد تھا جب اس نے پہلی بار یہ کپڑے پہنے تھے وہ مراد سے بہت لڑی تھی اور مراد ایک ٹک اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ تب اسے ان نظروں کا مطلب نہیں پتا تھا سو جھنجلا کر وہ اندر چلی گئی تھی۔ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ لیے اس نے وہ کپڑے اٹھائے اور نہانے چل دی۔

☼ ☼ ☼

گاؤں کی سڑک پر قدم رکھتے ہی سکون اس کے دل میں اتر گیا تھا۔ مراد نے کہا بھی تھا کہ تانگے میں بیٹھ جاتے ہیں لیکن وہ نہیں مانی۔ اسے مراد کے ساتھ یوں پیدل چلنا اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے راستے میں کئی بار مراد کا چہرہ دیکھا لیکن وہ بے تاثر سپاٹ چہرہ لیے ساتھ چل رہا تھا۔ بس میں لوگوں کے سامنے کوئی بات نہیں ہو سکی اور گھر جانے تک کا اس سے انتظار نہیں ہو رہا تھا سو پیدل ہی چلنے لگی۔ کمال بے نیازی سے مراد نے اسے فراموش کیا ہوا تھا۔

"مجھ سے چلا نہیں جا رہا اب۔ پانچ منٹ رکیں ادھر؟" تھکن سے زیادہ اسے مراد کا رویہ نڈھال کر رہا

تھا۔

"مغرب کی اذان ہونے والی ہے ادھر رکنا ٹھیک نہیں۔" مراد نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا تھا۔ وہ تپ گئی۔

"تمہیں ہوا کیا ہے؟" وہ عین اس کے سامنے آکر رک گئی تھی۔ چہرے پر ہلکی سی خفگی اور ادھ کھلے یاقوتی ہونٹ۔ آنکھیں ادھر ادھر کھیتوں کی لہلہاتی فصلوں پر تھیں۔ مراد نے اب اس کے ماتھے پر پڑے تراشیدہ بال دیکھے تھے۔ خالہ کے گھر وہ اس کے سامنے ہی نہیں آئی تھی۔ مراد کے لیے اس پر سے نظریں ہٹانا مشکل ہو رہا تھا۔ اترتی ہوئی شام نے اس کے ملیح چہرے پر سانولا سا سوز پینٹ کر دیا تھا۔

"مراد! کیا ہوا ہے تمہیں؟ کیوں ٹھیک سے بات نہیں کر رہے؟" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"یا اللہ یہ لڑکی کون کون سے رنگ دکھائے گی۔" مراد زچ ہو کر سوچ رہا تھا۔ آمنہ کا یہ روپ اس کے لیے انوکھا اور دلچسپ تھا۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ مراد سے زبردستی بات منوانے کی بجائے رونے پر آمادہ ہو جائے۔

"کچھ نہیں ہوا۔ تمہارا وہم ہے چلو گھر اب۔"

"مراد تم اتنی آسانی سے کیسے میرا وہم قرار دے سکتے ہو؟ کیا تمہارا دل بدل گیا ہے اب؟"

مراد کو حیرت کا شدید ترین جھٹکا لگا تھا۔

"اب تم مجھ سے پیار نہیں کرتے۔"

مراد کا دل بند ہونے کو تھا۔ تو اسے سب خبر تھی۔

"آمنہ گھر چلو چپ کر کے، فضول باتیں نہیں کرو۔"

"اب یہ باتیں فضول ہو گئیں اور کیوں نہ کروں یہ فضول باتیں؟" آنسو اس کے گالوں پر بکھر رہے تھے "کھاؤ قسم تم مجھ سے پیار نہیں کرتے۔" وہ ابھی بھی مراد کے بالکل سامنے کھڑی تھی۔

"کہو مراد میں نے جو بھی محسوس کیا ہے وہ سب جھوٹ تھا، غلط تھا۔" اس نے ہاتھ مراد کے بیگ والے ہاتھ پر رکھا تو مراد کے ہاتھ سے بیگ چھوٹ گیا۔ اس کے آنسو مراد کو کمزور کر رہے تھے۔

بے خودی میں مراد کے ہونٹوں نے اس کے گال پر بہنے والے آنسو پی لیے۔ اس کے ہونٹ آمنہ کی پلکوں پر تھے۔ آمنہ کے اضطراب کو پل بھر میں سکون ملا تھا۔ ڈھلتی ہوئی شام، برگد کا پیڑ، سنسان راستہ اور پرندوں کی چہکار سب ہی چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ مراد اس سے اتنا پیار کرتا ہے جتنا وہ ساری زندگی سمیٹ نہ پائے گی۔ اگر چپ تھا تو وہ تھا مراد جو اس غیر ارادی فعل کے بعد منہ موڑ کر کھڑا تھا۔ آمنہ وہیں بت بن کر کھڑی تھی۔

"چلو اب۔" بیگ ہاتھ میں پکڑ کر وہ چل پڑا تو آمنہ بھی اس کے پیچھے چل پڑی۔ اس کے بعد سارے راستے خاموشی بولتی رہی اور وہ دونوں چپ چاپ سنتے اور چلتے رہے۔

☼ ☼ ☼

گھر پہنچ کر اسے حیرت کا شدید ترین جھٹکا لگا۔ گھر کسی دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ افراتفری مچی ہوئی تھی۔ کوئی آرہا ہے کوئی جا رہا ہے۔ وہ بھاگ کر اماں کے پاس پہنچی۔ "اماں یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"میری ثمامہ کی شادی کے دن رکھے ہیں اور تیرے بھی۔" اماں نے خوشی خوشی بتایا۔ وہ گرتے گرتے بچی۔

"میری؟ کس کے ساتھ اور مجھے بتایا کیوں نہیں؟" پھنسی پھنسی آواز اس کے حلق سے نکل رہی تھی۔

"شش چپ کوئی سنے گا تو پتا نہیں کیا سمجھے گا۔ تیری منگنی تو بچپن سے ہی طے تھی۔ بس سوچا بتا کر کیا کرنا ہے جب وقت آئے گا تب کی تب دیکھی جائے گی۔ اللہ سوہنے نے مجھے یہ کرموں والے دن دکھائے ہیں جتنا شکر کروں کم ہے۔" اماں اک سرور کی کیفیت میں بول رہی تھیں۔ اس کے دماغ پر ہتھوڑے سے برسنے لگے۔

"نازیہ کا بھی رشتہ ہو گیا ہے۔ ثمامہ اور تجھ سے وہ دن پہلے اس کی شادی رکھی ہے۔"

چھ سات مہینوں میں کتنا کچھ بدل گیا تھا۔ رشتے' ناتے' مان' محبت "اماں آپ میری شادی کیسے طے کر سکتی ہیں۔ میں نے تو مہینہ بعد آنا تھا اور یہ بات میں نے آپ کو فون پر بتائی بھی تھی۔"

"پگلی ہی رہنا نجمہ نے مجھے بتایا تھا کہ بیس بائیس دن میں تو آجائے گی۔ مہینے بھر کے دن ڈالے تھے ہفتہ گزر بھی گیا یہ دن بھی گزر ہی جائیں گے۔ یا اللہ میری بیٹیوں کے نصیب سوہنے کرنا۔" نم آنکھیں لیے اماں نے زبردستی اسے گلے سے لگا کر اس کا ماتھا چوما۔ وہ غمزدہ سی وہیں بیٹھی رہ گئی۔ جب انجان تھی تب محبتوں کی قدر نہیں کی اور اب جب وہ ان محبتوں سے زندگی کا پیالہ بھرنا چاہتی تھی تو یہ سیال کی طرح ادھر ادھر بہہ گئی تھیں ________ شادی میں ایک ہفتہ رہ گیا تھا اس کی مراد سے ملاقات ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔ پتا نہیں کہاں مصروف تھا وہ۔ اپنی بہن کی شادی تھی تو ایسے میں کزنز کی فکر کرتا یا بہن کی۔ ہو سکتا ہے میرا سامنا نہ کر پا رہا ہو۔

مجھے پیلے جوڑے میں... کسی اور کے نام کے پیلے جوڑے میں دیکھنے کی ہمت نہ کر پا رہا ہو۔

ذہن میں طرح طرح کی باتیں آرہی تھیں۔ جب سے وہ گاؤں آئی تھی۔ بری طرح رو پڑتی تھی ہر بات پر۔ سب سمجھ رہے تھے کہ شاید گھر والوں سے دوری کے خیال سے رو رہی ہے۔ محبت کو کھو دینے کا خوف اسے مسلسل آرے کی طرح کاٹ رہا تھا۔ اس کا وجود لہو میں نہا رہا تھا یہ خواہشوں کا' جذبات کا' امنگوں کا اور دعاؤں کا لہو۔ ہر نماز کے بعد وہ دعا کے نام پر چند آنسو گرا دیتی۔ الفاظ جانے کہاں کھو گئے تھے۔

٩

دور نزدیک کے سارے رشتے دار آگئے تھے۔ خالہ نجمہ بھی اپنی مختصر سی مکمل فیملی کے ساتھ آگئی تھیں۔ فرہاد تو کہیں باہر مردوں میں تھا۔ عفت چپ چپ سی تھی اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے تھے۔ آمنہ کو دیکھ کر افسوس سا ہوا تھا۔

"آمنہ تم خوش ہو؟" عفت نے اس کی آنکھوں میں جھلکتا کرب دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک بار پھر رو پڑی۔

"آپی آپ کسی طرح میری مراد سے بات کروا دیں آپ کا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔" اذیت سے چور ہو کر یہ لفظ اس کے ہونٹوں سے نکلے تھے۔ عفت نے تائید میں سر ہلا دیا۔ "فون پر بات کروا دوں"

"نہیں فون پر نہیں۔" فون کرنا ہوتا تو وہ کب کا کر چکی ہوتی۔ ویسے بھی گھر آتے ہی اماں نے اس کا فون ابا کو دے دیا تھا۔ وہ انتظار میں ہی رہی کہ کب اس کی مراد سے بات ہوتی ہے۔ قسمت میں بات کرنا لکھا ہی نہیں تھا تو وہ کیسے بات کر لیتی۔

نکاح والے دن فجر پڑھ کر وہ بے تحاشا روئی تھی۔ اپنے ہاتھوں پر کسی اور کے نام کی مہندی کا سیاہ رنگ دیکھ دیکھ کر اسے ہول اٹھ رہے تھے۔ ثمامہ' نازیہ اور اسے ایک ہی مہندی لگائی گئی تھی۔ لیکن جو رنگ اس کے ہاتھوں پر آیا تھا وہ ثمامہ یا نازیہ کے ہاتھوں پر نہیں تھا۔ اک گڑیا کی طرح کھلونا بنی وہ تیار ہو رہی تھی۔ جب اسے تیار کر کے سرخ کامدانی لہنگے میں شیشے کے سامنے کھڑا کیا گیا اس کے دل سے دعا نکلی تھی "اللہ

کرے میں مرجاؤں۔" اسے لگا تھا نکاح کے وقت تو لازمی اس کا دل دھڑکنا چھوڑ دے گا۔ لیکن "مراد علی ولد فیض محمد" سن کر اس کا خود بخود اقرار میں سرہلا گیا تھا۔ اس کا وجود سن ہو رہا تھا۔

"میں ابھی بھی اتنی بے وقوف ہوں کہ مجھے آسانی سے الو بنایا جائے۔" اس نے کلس کر سوچا تھا۔

اس کے چہرے پر ابھی بھی خوشی کے آثار نہیں تھے۔ مراد علی سے بدلہ لینا تو اس کا حق تھا نا۔ ثمامہ کی رخصتی کے ساتھ ہی اس کی رخصتی ہو گئی اور وہ آنگن میں لگا چھوٹا سا دروازہ پار کر کے مراد علی کے گھر اور زندگی میں داخل ہو گئی۔ چند ایک رسموں کے بعد اسے مراد کے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ مراد ابھی تک اس کے سامنے نہیں آیا تھا۔ ان کے ہاں دولہا دلہن کو ایک ساتھ بٹھانے کا رواج نہیں تھا اس لیے ابھی تک مراد بچا ہوا تھا ورنہ وہ اپنے دلہا پے کا لحاظ کیے بغیر شروع ہو جاتی۔

گلاب کے پھولوں کی سیج پر بیٹھی وہ بھی ایک گلاب ہی لگ رہی تھی۔ ڈبل بیڈ پر بچھی سفید چادر پر سرخ گلابوں کی پتیاں بکھری بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔ دیواروں پر مہنگے پینٹ کے رنگ سجے تھے۔ چاروں دیواروں پر گلابوں کی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ سفید دودھیا روشنی میں ہر منظر واضح نظر آ رہا تھا۔ اسے پتا نہیں چلا کب بنا آواز کے لکڑی کا دروازہ کھلا اور مراد اندر آ گیا۔

"السلام علیکم" وہ اس کے قریب بیڈ پر بیٹھا تھا۔

"وعلیکم السلام مراد تم۔۔۔ تم کدھر تھے اتنے دن سے؟" وہ یہ بھول بیٹھی تھی کہ وہ دلہن ہے اور اپنے دولہا کے ساتھ ہے۔

"گھر میں ہی تھا۔"

"تمہارے گھر کیوں نہیں آئے مجھے تم سے بات کرنی تھی اتنی ضروری" اس کے لہجے میں اتنی بے ساختگی اور بھولپن تھا کہ مراد بے خود ہونے لگا۔

"آنا تو چاہتا تھا لیکن چاچی، چاچے کی وجہ سے نہیں آیا کہ انہیں برا نہ لگ جائے۔"

اتنی سی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"کیا ضروری بات کرنی تھی؟"

"وہ میری شادی کسی اور سے ہو رہی تھی نا" مراد نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "نہیں میرا مطلب مجھے ایسا لگا تھا۔"

مراد نے آہستگی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"چھ سات مہینے سزا کاٹ لی میں نے۔ پوری زندگی کی سزا ملتی تو مر جاتا میں۔" مراد کے لہجے کی وارفتگی نے اسے سمٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ "تم پوچھ رہی تھیں نا میں تم سے پیار کرتا ہوں یا نہیں تو سنو پیار بہت چھوٹا لفظ ہے میرے جذبات کے اظہار کے لیے۔ بس اتنا سمجھ لو کہ میری دنیا صرف تم تک محدود ہے۔" محبت کے اس سادہ اور جامع اظہار نے اسے اندر تک سرشار کر دیا تھا۔

"آؤ تمہیں دکھاؤں کچھ۔" مراد نے اس کا ہاتھ پکڑا اور لہنگا سمیٹتی سہج سہج قدم اٹھاتی آمنہ کو شیشے کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔

کلائیوں میں کہنی کہنی تک بھری سرخ کانچ کی چوڑیاں اور مہندی کا رنگ سیاہ۔ آنکھوں میں نفاست سے لگا ہوا کاجل ہونٹوں پر خوبصورتی سے لگائی گئی میچنگ لپ اسٹک۔ ہر ہر چیز اس کے روپ پر کھل رہی تھی۔ وہ نظر لگ جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔ وہ محویت سے شیشہ دیکھ رہی تھی۔

"کیوں حیران رہ گئیں نا میری قسمت دیکھ کر؟" مراد نے میرون شیروانی پہن رکھی تھی۔ اس کے برابر کھڑا وہ بھی اتنا ہی پیارا لگ رہا تھا جتنی وہ لگ رہی تھی۔ بڑی محبت سے وہ شیشے میں نظر آنے والا عکس دیکھ رہی تھی۔

"اب کیا نظر لگانے کا ارادہ ہے؟" مراد نے شوخی سے کہا تو وہ جھینپ کر مڑی۔ مراد سے ٹکرا کر گرنے لگی تو اس نے شاخ گل کی طرح اس کا وجود ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ اب کی بار اس نے آنکھیں تکلیف سے نہیں شرم سے موند لی تھیں۔

☆ ☆

بہترین نصیحت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ علیہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "کیا میں تمہیں ایسی بات نہ بتاؤں کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے تمہارے گناہوں کو معاف کردے اور تمہارے درجے بلند کردے؟" صحابہ کرامؓ نے عرض کیا" "ضرور اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ناگواری اور مشقت کے باوجود کامل طریقے پر وضو کرنا' مسجد کی طرف چل کر جانا ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا پس یہ تمام اعمال اللہ کی حفاظت اور پناہ میں آنے کا ذریعہ ہیں۔"

(مشکوۃ المصابیح)

صغریٰ یاسین۔ کراچی

بہترین رہنمائی

امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمہ کا معمول تھا کہ جب سن کے کھیت کے اندر سے گزرتے تو اپنے جوتے ہاتھ میں لے لیتے اور ننگے پاؤں چلتے' کسی شخص نے وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ "سن سے کاغذ بنتا ہے' کیا پتا' اس کھیت کے سن سے کاغذ بنے اور اس کاغذ پر قرآن پاک لکھا جائے' اس وجہ سے احتیاطاً" کھیت سے ننگے پاؤں گزرتا ہوں' تاکہ بے ادبی نہ ہو۔"
حضرت داؤد طائی فرماتے ہیں کہ "میں بیس سال تک امام اعظم کی خدمت میں رہا' خلوت و جلوت میں کر آپ کو دیکھنے کا موقع ملا' مگر طویل مدت کے دوران کبھی "آپ کو پاؤں پھیلاتے نہیں دیکھا میں نے عرض کی کہ حضرت! اگر تنہائی میں آپ آرام کے لیے پاؤں پھیلائیں' تو کیا حرج ہے" امام اعظم نے فرمایا کہ "تنہائی میں اللہ کے سامنے ادب سے رہنا زیادہ مناسب ہے۔" (اسلاف کے زریں کارنامے' مولانا عبدالسلام)

کشور منیر۔ کراچی

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ جو شخص تم سے دوسروں کے عیب بیان کرتا ہے وہ یقیناً" دوسروں کے سامنے تمہاری برائی بھی کرتا ہوگا۔

(حسن بصری)

☆ وہ محبت یقیناً" عظیم ہوتی ہے' جو ایک دوسرے کی عزت پر مبنی ہو۔

(جانسن)۔

☆ ہم ایک دوسرے کے ساتھ تو رہتے ہیں' لیکن ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

(اسٹیفن لیکا)

☆ بے موقع گفتگو انسان کو لے ڈوبتی ہے۔

(جبران)

☆ محبت میں یہ قباحت ہوتی ہے کہ جس سے محبت کی جائے اسے خود سے جدا کرتے وقت بہت تکلیف ہوتی ہے۔

(واصف علی واصف)

☆ سکھ اور مسرت ایسے عطر ہیں جنہیں جتنا زیادہ آپ دوسروں پر چھڑکیں گے اتنی ہی زیادہ آپ کے

اندر سے خوشبو آئے گی۔

(امیرسن)

☆ اس دنیا میں کسی کام کے اندر اس وقت تک تبدیلی پیدا نہیں ہوتی جب تک کوئی شخص اس میں خود تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔

(کارفیلا)

☆ لکڑیاں ایک ایک جلاؤ تو دھواں دیتی ہیں، اکٹھی جلاؤ تو روشنی پیدا ہوتی ہے۔

(کارلٹن)

☆ آپ خواہ کوئی اور کچھ بھی ہوں اس چیز سے ضرور اتفاق کریں گے کہ جہاں ہر شخص بزعم خود "کچھ" ہوتا ہے وہاں دوسرا کوئی کچھ نہیں۔

(گلبرگ)

☆ بے حد زیادہ کی امید مت رکھو، کم کی امید کرنا اور اسے بھی زیادہ کرنا کامیابی کی چابی ہے۔

(گیتی)

☆ انسان کی قدر و قیمت اس چیز سے نہیں جو اسے حاصل ہو جائے بلکہ اس چیز سے ہے جس کے حصول کے لیے وہ تڑپتا ہے۔

(سطامی)

☆ زندگی کے دوراہے پر چلتے چلتے بعض اوقات ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب اپنے جذبات کچل کر دوسرے کے جذبات کا احترام کرنا پڑتا ہے۔ یہ بھی وہ مقام ہے جہاں انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اپنی انسانیت کی تکمیل کریں۔ آپ کی زندگی خود بخود مکمل ہو جائے گی۔

گڑیا شاہ۔ کمروڑپکا

اقوال حضرت علی کرم اللہ وجہہ

☆ پریشانی خاموش ہونے سے کم، صبر کرنے سے ختم اور شکر کرنے سے خوشی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

☆ یہ ایام تمہاری زندگی کے صفحات ہیں انہیں نیک اعمال سے زینت بخشو۔

☆ جو پسند ہے اسے حاصل کر لو یا جو حاصل ہے اسے پسند کر لو۔

☆ معاف کرنا اور باعمل ہونا ان دو اعمال کے برابر کوئی عمل نہیں۔

☆ نادانوں کی بات پر تحمل، عقل کی زکوٰۃ ہے۔

☆ یہ نا بتاؤ کہ میری پریشانی کتنی بڑی ہے، بلکہ پریشانی کو بتاؤ کہ میرا اللہ کتنا بڑا ہے۔

☆ صبر ایسی سواری ہے جو کبھی گرنے نہیں دیتی، نہ کسی کے "قدموں میں" نہ کسی کی "نظروں" میں۔

☆ کوئی تمہارا دل دکھائے تو ناراض مت ہونا، کیونکہ قدرت کا قانون ہے جس درخت کا پھل زیادہ میٹھا ہوتا ہے لوگ پتھر بھی اسی کو مارتے ہیں۔

☆ اگر کسی سوال کا جواب معلوم نہ ہو تو لاعلمی کا اقرار نصف علم ہے۔

☆ ہم اللہ تعالیٰ کی اس تقسیم پر راضی ہیں کہ اس نے ہمیں علم عطا کیا اور جاہلوں کو دولت دی، کیونکہ دولت تو عنقریب فنا ہو جائے گی اور علم کو زوال نہیں۔

☆ غصے کے وقت نفس کو قابو میں رکھنا ہلاکت سے بچاتا ہے۔

☆ اطاعت خداوندی میں اپنے نفسوں کو صابر بناؤ اور گناہوں کی آلودگی سے پاک رکھو، تاکہ ایمان کی شیرینی حاصل کرو۔

☆ جو شخص تمہارا غصہ برداشت کرے اور ثابت قدم رہے تو وہ تمہارا سچا دوست ہے۔

☆ سخاوت وہ خوبی ہے جو انسان کی قدر اس کے دشمن کے دل میں بھی پیدا کر دیتی ہے۔

☆ تم دوسروں کے لیے دل سے دعا مانگا کرو۔ تمہیں اپنے لیے دعا مانگنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔

☆ سچے انسان کے جھوٹ میں کوئی اچھا مقصد ہو سکتا ہے، لیکن جھوٹے انسان کا سچ صرف آگ لگانے کے لیے ہوتا ہے۔

☆ مومن کا یقین اس کے عمل میں ظاہر ہو جاتا ہے اور منافق کے عمل میں اس کا شک ظاہر ہو جاتا ہے۔

سیدہ نسبت زہرا۔ کھوڑ پکا

اک نظر ادھر بھی

☆ محبت کی عمارت میں شک کی دراڑ پڑ جائے تو وہ معذرت کے گارے سے بھر تو سکتی ہے، مگر نشان باقی رہتا ہے۔

☆ اگر کچھ لوگ ساتھ چھوڑ دیں تو ان لوگوں کو سفر نہیں چھوڑنا چاہیے جنہیں راستہ معلوم ہو۔

☆ نئی بنیادیں وہی لوگ بھر سکتے ہیں جو اس راز سے واقف ہوں کہ پرانی بنیادیں کیوں بیٹھ گئیں۔

☆ افراد اور اقوام، واقعات سے ہمیشہ اپنے مزاج کے مطابق سبق حاصل کرتے ہیں۔

☆ جو مخلوق سے فاصلے پر ہے، وہ خالق سے کیونکر قریب رہ سکتا ہے۔

☆ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے اٹھنے سے پہلے پرندے اٹھ جاتے ہیں۔

☆ کسی شخصیت کو پرکھنا اتنا ہی مشکل کام ہے جتنی وقت کی شناخت۔

☆ غم کتنا ہی سنگین کیوں نہ ہو، مگر نیند سے پہلے تھک جاتا ہے۔

☆ کسی پر کیچڑ مت اچھالو کیونکہ اس تک کیچڑ بعد میں پہنچے گا، پہلے تمہارے ہاتھ گندے ہوں گے۔

☆ اپنے لفظوں پر قابو رکھو اور بات کرنے سے پہلے اس کے نتائج کے بارے میں فکر کر لو کیونکہ الفاظ تمہیں عزت اور ذلت دینے پر قادر ہیں۔

الماس شاکر۔ کراچی

مہمان خدا کی رحمت

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا۔ "میرے مالک! جب تو خوش ہوتا ہے تو کیا کام کرتا ہے؟"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "جب میں خوش ہوتا ہوں تو بارش برساتا ہوں۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر عرض کیا۔ "جب تو اور زیادہ خوش ہو تو؟"

فرمایا۔ "تو میں بیٹیاں پیدا کرتا ہوں۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوبارہ عرض کیا۔ "اے مالک دو جہاں تو جب سب سے زیادہ خوش ہو تو کیا کرتا ہے؟"

فرمایا۔ "پھر میں مہمان بھیجتا ہوں۔"

ارم۔ کراچی

شور و شر

کوئی اس دل کا حال کیا جانے
ایک خواہش، ہزار تہ خانے

آپ سمجھے نہ ہم ہی پہچانے
کتنے مبہم تھے دل کے افسانے
زیست کے شور و شر میں ڈوب گئے
وقت کو ناپنے کے پیمانے

(شکیب جلالی)
ردا۔ کراچی

ساون

بستہ پھینک کے لوچی بھاگا، روشن آرا باغ کی جانب
چلاتا چل گذی چل!
آج بہت سے بچے جامن ٹپکیں گے
آنگن کی رسی سے ماں نے کپڑے کھولے
اور تنور پہ لا کے ٹین کی چادر ڈالی
سارا دن کے سوکھے پاپڑ
لچھی نے چادر میں لپیٹے
بچ گئی رہا۔ کیا کرایا دھل جاتا تھا
خیرو نے اپنے کھیتوں کی سوکھی مٹی
جھریوں والے ہاتھ میں لے کر
بھیگی بھیگی آنکھوں سے پھر اوپر دیکھا
جھوم کے پھر آئے ہیں بادل
ٹوٹ کے پھر بارش برسے گی

(گلزار)
نصیف۔ کراچی

کیا آپ واقعی ڈاکٹر ہیں

مریضہ نسخہ لینے کے بعد کمرے سے جا رہی تھی کہ دروازے پر پہنچ کر وہ اچانک رکی اور اس نے پلٹ کر غور سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

"کیا ہوا خاتون۔۔۔؟" ڈاکٹر سمجھا کہ شاید وہ کوئی بات کرنا چاہتی ہے۔

"کچھ نہیں۔" وہ دھیرے سے بولی۔ "میں مقررہ وقت سے دس منٹ بعد آئی، لیکن آپ نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ پھر ایک گھنٹہ مرض کی تشخیص پر لگایا آپ نے نسخہ لکھا، جس کا ایک ایک لفظ میں پڑھ سکتی ہوں۔ کیا آپ واقعی ڈاکٹر ہیں۔"

نسبت، سنبعل۔۔۔ کھوڑکا

لفظوں کی خوشبو

1 ۔ سب سے بڑی خواہش انسان کو خوش کرنے اور اسے متاثر کرنے کی خواہش ہے اور اس کی سزا یہ ہے کہ انسان نہ متاثر ہوں گے نہ خوش۔

2 ۔ ہم پرانے لوگوں کو یاد کرتے ہیں اور نئے لوگوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہم ماضی کو معیار بنا لیتے ہیں اور حال کی زندگی کو اس معیار پر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمیں سکون کیسے مل سکتا ہے۔ وہ لوگ چلے گئے، وہ زمانہ بیت گئے اس کی یاد حال کو بدحال کر دے گی۔

3 ۔ جب لوگوں کو پتا چلتا ہے کہ زندگی کیا ہے تو یہ آدھی خرچ ہو چکی ہوتی ہے۔

4 ۔ یہ بھی سخاوت اور کرم میں داخل ہے کہ لوگوں پر ظلم نہ کیا جائے اور ان کے عیبوں کو معلوم کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

5 ۔ جھگڑا نہ کرنا، کمزوری نہیں، بلکہ اعلا ترین اصول ہے۔

6 ۔ احسان کر کے نہ جتانا احسان کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔

7 ۔ دشمن کے حسن سلوک پر بھروسا مت کرو پانی کو آگ سے کتنا ہی گرم کیا جائے وہ اس کو بجھانے کو کافی ہے۔

فوزیہ ثمروٹ۔۔۔ گجرات

کام کی باتیں

☆ اگر انسان نیک جذبات اور پر خلوص لگن سے کوشش کرے تو اسے منزل مل ہی جاتی ہے۔

☆ محبت کبھی محبوب کو اپنے سامنے جھکانا پسند نہیں کرتی۔ خود اس کے سامنے جھک جانے پر فخر محسوس کرتی ہے۔

☆ جو چیز اللہ نہ دے اسے انسانوں سے نہیں مانگنا چاہیے۔۔۔ ورنہ انسان بڑا خوار ہوتا ہے۔

☆ اعتبار کے بغیر محبت کچھ بھی نہیں۔ آپ جسے چاہتے ہیں، جسے اپناتے ہیں اگر اس پہ اعتبار نہیں کرتے تو "آپ کی محبت اندھی ہے بصارتوں سے محروم ہے۔

لیلیٰ شاہ۔۔۔ چک ساہ، گجرات

سخاوت

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بادشاہ اپنے وزیر کے ساتھ جنگل کی سیر کو گیا۔ سیر کے دوران اس نے ایک بوڑھے کو دیکھا جو باغ میں گٹھلیاں بو رہا تھا۔ بادشاہ نے وزیر سے کہا کہ "اس سے پوچھو کیا بو رہا ہے؟" وزیر نے بوڑھے سے پوچھا تو اس نے کہا کہ "کھجور کی گٹھلیاں بو رہا ہوں۔" بادشاہ نے پوچھا کہ "یہ گٹھلیاں کتنے برس میں پھل لے آئیں گی؟" بوڑھے نے کہا کہ "بیس پچیس سال کے بعد۔۔۔ بادشاہ ہنسا کہ "بڑے میاں کے پیر قبر میں لٹک رہے ہیں اور بیس پچیس سال بعد کا سامان کر رہے ہیں۔" وزیر نے یہ بات بوڑھے سے کہی تو وہ کہنے لگا کہ "اگر سب لگانے والے یہی سوچا کرتے جو تم سوچتے ہو تو آج تمہیں ایک کھجور بھی نصیب نہ ہوتی۔ میاں! دنیا کا کام یوں ہی چلتا ہے کہ کوئی لگاتا ہے کوئی کھاتا ہے۔" بادشاہ نے یہ معقول جواب سن کر کہا۔ "

"بے شک صحیح ہے۔" بادشاہ کا یہ قاعدہ تھا کہ جس شخص کی بات پر "بے شک صحیح ہے" کہہ دیتا تھا اسے ایک ہزار دینار بطور انعام دیے جاتے تھے چناں چہ وزیر نے اسی وقت ایک ہزار دینار اس بوڑھے کے حوالے کیے اور پھر بادشاہ اور وزیر آگے چل پڑے۔ تھوڑی دور آگے بڑھے تو بوڑھے نے صدا لگائی کہ "میری ایک بات سنتے جاؤ۔" وزیر نے کہا "کہو کیا بات ہے؟" بوڑھے نے کہا کہ "کسی کا بیج تو بیس پچیس سال میں پھل لاتا ہے، لیکن میرا بویا ہوا بیج تو ایک ہی ساعت میں پھل لے آیا۔" بادشاہ نے پھر کہا "بے شک صحیح ہے" وزیر نے یہ سن کر مزید ایک ہزار دینار اس بوڑھے کے حوالے کیے۔ پھر آگے چلنے لگے تو بوڑھے نے کہا کہ "چلتے چلتے میری ایک اور بات سنیے اور وہ بات یہ ہے کہ کسی کا بیج تو سال میں ایک مرتبہ پھل لاتا ہے اور میرا بیج تو ایک ہی ساعت میں دو مرتبہ پھل لے آیا۔" بادشاہ نے خوش ہو کر پھر کہا۔ "بے شک صحیح ہے" وزیر نے مزید ایک ہزار دینار بڑے میاں کے حوالے کیے اور بادشاہ سے عرض کیا کہ "بادشاہ سلامت! ہمیں اب یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔ کیوں کہ ہم نے اس بوڑھے کو بے وقوف سمجھا تھا لیکن یہ تو بہت عقل مند نکلا، کچھ دیر اور یہاں رکے تو یہ باتوں باتوں میں ہم کو لوٹ لے گا۔"

محترم قارئین! جب دنیوی بادشاہوں کی یہ عطا ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر خوش ہو کر اتنا دیتے ہیں تو اللہ رب العزت جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے اگر بے شمار عطا فرمائے تو کیا عجب ہے؟ اگر ہم سب یہ عزم کریں کہ ہر وقت اور ہر جگہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بڑائی بیان کریں تو اللہ تعالیٰ ہماری ان باتوں سے خوش ہو کر کتنا بڑا انعام عطا فرمائے گا۔ (منتخب حکایات 'نور الدین صہبائی)

شبانہ افضل۔۔۔ قصور

محبت کی تھی

ساری دنیا کے رواجوں سے عداوت کی تھی
تم کو یاد ہے جب میں نے محبت کی تھی
اسے ہنستا ہوا چھوڑ کے گھر آ کے
اتنا روئے کہ آنکھوں نے قیامت کی تھی
میرے اجڑنے کا سبب جب بھی کسی نے پوچھا
تو میں نے بس اتنا بتایا محبت کی تھی

حافظہ سمیرا۔ 157 این بی

تنہائی پسند

ہمارے ایک علاقے کا رقبہ اس کی آبادی کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ بعض جگہ تو پچاسوں کلو میٹر تک آدمی نظر نہیں آتا۔ ایسے ہی ایک صحرائی میدان سے ایک سیاح کا گزر ہوا تو اس نے ایک جھاڑی کے قریب ایک آدمی کو بیٹھے دیکھا۔ سیاح نے ٹوٹی پھوٹی مقامی زبان میں اس سے پوچھا۔ "تمہارا گھر کہاں ہے؟"

"گھر۔۔۔؟ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔" آدمی نے جواب دیا۔

"تو پھر تم رہتے کہاں ہو؟" سیاح نے کہا۔

"بس یہیں کہیں۔ کبھی کسی درخت کے نیچے، کبھی کسی جھاڑی کے پاس رہتا ہوں۔ کوئی جانور شکار کر کے آگ پر بھون کر کھا لیتا ہوں۔ چشمے سے پانی پی لیتا ہوں۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"تنہائی سے تمہارا دل نہیں گھبراتا؟" سیاح نے حیرت سے پوچھا۔

"تنہائی؟" وہ شخص قدرے خفگی سے بولا۔ "آبادی میں اضافے کی رفتار دیکھ کر میرا تو دل گھبرانے لگا ہے۔ سال میں تم دوسرے آدمی ہو، جس سے مجھے بات کرنی پڑ رہی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے سنا ہے کہ یہاں سے صرف پچاس کلو میٹر دور ایک آدمی نے باقاعدہ گھر بنا لیا ہے اور اپنے خاندان سمیت وہاں رہنے لگا ہے۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ اگر آبادی اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو مجھے واپس پہاڑ پر جا کر رہنا پڑے گا۔"

بشریٰ مزمل فاطمہ۔۔۔ پھول نگر

✿ ✿

بشریٰ محمود

شکیلہ شہزادی شالو، کی ڈائری میں تحریر
رسا چغتائی کی غزل

تیرے آنے کا انتظار رہا
عمر بھر موسمِ بہار رہا

پا بہ زنجیرِ زلف یار رہی
دل اسیرِ خیالِ یار رہا

ساتھ اپنے غموں کی دھوپ رہی
ساتھ اک سرو سایہ دار رہا

آئینہ آئینہ رہا پھر بھی
لاکھ در پردہ غبار رہا

کب ہوا میں تہِ کمند آئیں
کب نگاہوں پہ اختیار رہا

سدرہ شاہین، کی ڈائری میں تحریر
خالد معین کی نظم

سرگوشی،

تمہاری آنکھوں کے سرخ ڈورے
وہ بات کہنے کے منتظر ہیں
جو تم نے اب تک کہی نہیں ہے
مگر تمہیں کچھ خبر نہیں ہے
تمہارا چہرہ اک آئینہ ہے
کہ جس پہ لکھی
شکستہ دل کی عبارتوں نے
بہت سی باتوں کو بن کہے بھی
ہماری آنکھوں سے کہہ دیا ہے

مدیحہ نورین مہک، کی ڈائری میں تحریر
انور شعور کی غزل،

یہ مت پوچھو کہ کیسا آدمی ہوں
کرو گے یاد، ایسا آدمی ہوں

مرا نام و نسب کیا پوچھتے ہو
ذلیل و خوار و رسوا آدمی ہوں

تعارف اور کیا اس کے سوا ہو
کہ میں بھی آپ جیسا آدمی ہوں

زمانے کے جھمیلوں سے مجھے کیا
مری جان! میں تمہارا آدمی ہوں

چلے آیا کرو میری طرف بھی
محبت کرنے والا آدمی ہوں

گزاروں ایک جیسا وقت کب تک
کوئی پتھر ہوں میں یا آدمی ہوں

شعور آ جاؤ میرے ساتھ لیکن
میں اک بھٹکا ہوا سا آدمی ہوں

نوشین اقبال نوشی، کی ڈائری میں تحریر
فرحت عباس شاہ کی نظم

کوئی پوچھے تو میں کیا کہوں؟
اُسے کیا بتاؤں؟
یہ روز و شب تو جنم جنم پر محیط ہیں
میرے زخم زخم دل و نظر
مجھے اس جنم کہیں نہیں ملے
میرے رتجگے میرے ہمسفر
میرے ساتھ آج نہیں چلے
یہ مہیب وحشت فکر جو

میرے نقش نقش کی روح ہے
کوئی بے ثبات بیاں نہیں
یہ تو آسمانوں کا عکس ہے
یہ تو دیوتاؤں کا دھیان ہے
یہ تو جانے کسی صدی صدی کی
اذیتوں کا گیان ہے
یہ عجب میرے غم و الم
یہ نصیب سنگ سیاہ پر
یہ ورق ورق پہ گرے قلم
یہ کوئی احساس نیا نہیں
میرا انتظار قدیم ہے
میرا اس سے پیار قدیم ہے
یہ عجیب میری محبتیں
یہ عجیب میرے غم و الم!!

روبینہ شریف، کی ڈائری میں تحریر
اجمل سراج کی غزل

اور تو خیر کیا رہ گیا
ہاں مگر اک خلا رہ گیا

غم سبھی دل سے رخصت ہوئے
درد بے انتہا رہ گیا

زخم سب مندمل ہو گئے
اک دریچہ کھلا رہ گیا

رنگ جانے کہاں اڑ گئے
صرف اک داغ سا رہ گیا

آرزوؤں کا مرکز تھا دل
حسرتوں سے بھرا رہ گیا

زندگی سے تعلق میرا
ٹوٹ کر بھی جڑا رہ گیا

کس کو چھوڑا خزاں نے مگر
زخم دل کا ہرا رہ گیا

کام اجمل بہت تھے ہمیں
ہاتھ دل پر دھرا رہ گیا

فوزیہ ثمر بٹ، کی ڈائری میں تحریر
سلیمان قیصر کی نظم

یہ جو زیست کا سفر ہے
یہ جو رستہ ہے میرا
تم اگر نہ ساتھ دو گے
تو یہ کس طرح کٹے گا
میری سوچ کی حدوں تک

یہ گماں بھی کیسے آئے، کوئی پل بنا تمہارے
بھلا کیسے بیت جائے
میرے پاس تم نہیں ہو، میرے پاس کب نہیں ہو
میری یاد کے نگر میں، میرے خواب کے سفر میں
میری سوچ کی تہوں تک
میری آنکھ کے بھنور میں، میرے دل میں تن میں
میری حسرتوں کے بن میں، میرے دل کی تیرگی میں
میری شب کی روشنی میں، ہاں کہتی ہوں ہر کہیں ہو
میرے پاس تم نہیں ہو۔ میرے پاس کب نہیں ہو
میری ہر دعا کا محور، بس اک آرزو تمہاری
اسی آرزو سے آگے
کوئی راستہ نہیں ہے، تمہیں کس قدر ہے چاہا،
یہ تمہیں پتا نہیں ہے

ثمینہ اکرم، کی ڈائری میں تحریر
سلیم کوثر کی غزل

میں خیال ہوں کسی اور کا مجھے سوچتا کوئی اور ہے
سرِ آئینہ میرا عکس ہے پسِ آئینہ کوئی اور ہے

میں کسی کے دستِ طلب میں ہوں تو کسی کے حرفِ دعا میں ہے
میں نصیب ہوں کسی اور کا مجھے مانگتا کوئی اور ہے

کبھی لوٹ آئیں تو پوچھنا نہیں دیکھنا انہیں غور سے
جنہیں راستے میں خبر ہوئی کہ یہ راستہ کوئی اور ہے

مجھے دشمنوں کی خبر نہ تھی تجھے دوستوں کا پتہ نہیں
تیری داستاں کوئی اور تھی میرا واقعہ کوئی اور ہے

میری روشنی تیرے خدوخال سے مختلف تو نہیں مگر
تو قریب آ تجھے دیکھ لوں تو وہی ہے یا کوئی اور ہے

خالدہ، کی ڈائری میں تحریر
احمد فراز کی غزل

سبھی شریکِ سفر ہیں،

یہ مملکت تو سبھی کی ہے خواب سب کا ہے
یہاں پہ قافلۂ رنگ و بو اگر ٹھہرے

تو حسنِ خیمۂ برگ و گلاب سب کا ہے
یہاں خزاں کے بگولے اٹھیں تو ہم نفسو

چراغ سب کے بجھیں گے عذاب سب کا ہے
تمہیں خبر ہے کہ جنگ جب پکارتی ہے

تو غازیانِ وطن ہی فقط نہیں جاتے
تمام قوم ہی لشکر کا روپ دھارتی ہے

محاذِ جنگ پہ مردانِ حر، تو شہروں میں
تمام خلق بدن پر زرہ سنوارتی ہے

ملوں میں چہرۂ مزدور تمتماتا ہے
تو کھیتیوں میں کسان اور خون بھرتے ہیں

وطن پہ جب بھی کوئی سخت وقت آتا ہے
تو شاعرانِ دل افگار کا غیور قلم

مجاہدانِ جری کے رجز سناتا ہے
چلیں گے ساتھ سبھی کیمیا سبھی ہوں گے

اور اب جو آگ لگی ہے مرے دیاروں میں
تو اس بلا سے نبرد آزما سبھی ہوں گے

سپاہیوں کے علم ہوں کہ شاعروں کے قلم
مرے وطن تیرے درد آشنا سبھی ہوں گے

[illegible] سلیمان

ایمن عامر ——— کراچی

پہلے اس میں اک ادا تھی ناز تھا انداز تھا
روٹھنا اب تو تری عادت میں شامل ہو گیا

کرن سرمد ——— برسنگم

اب پیار کی ادا پہ جھنجلا رہے ہیں وہ
کہتے ہیں مجھ کو فکر ہے کچھ کاروبار کی

یاسمین رؤف ——— کراچی

ترے سکوت سے لفظ و بیاں کے بھول کھلے
حیا نے بات کہی اور ادا نے سمجھائی

روزی سلیم ——— شریف آباد

آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

گڑیا شاہ ——— کھروڑ پکا

محبتوں کے یہ دریا اتر نہ جائیں کہیں
جو دل گلاب ہیں زخموں سے بھر نہ جائیں کہیں
چھلک رہا ہے جن آنکھوں میں اب وجود مرا
یہ آنکھیں ہائے یہ آنکھیں مکر نہ جائیں کہیں

حمنہ حبیب ——— عبدالحکیم

اک دوجے کی ضد ہی ہے
ہم کبھی "ہم" نہ ہوئے

ثمرہ، اقصیٰ ——— کراچی

دکھ اٹھانے میں ہے کمال ہمیں
کر گیا فن یہ لازوال ہمیں

قدر شہزاد ——— کراچی

امید تو بندھ جاتی تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے وعدہ تو کیا ہوتا

آسیہ جاوید ——— علی پور چٹھہ

یونہی امید دلاتے ہیں زمانے والے
کب پلٹتے ہیں بھلا چھوڑ کر جانے والے
تو کبھی دیکھ جھلستے ہوئے صحرا میں درخت
کیسے جلتے ہیں وفاؤں کو نبھانے والے

مدیحہ یوسف ——— کراچی

زندگی تجھ سے امید وفا کیا رکھوں
جب مجھے چھوڑ گئے دوست پرانے میرے

خالدہ ادیب ——— بھاگٹانوالہ

نزدیکیوں میں دور کا منظر تلاش کر
جو ہاتھ میں نہیں ہے وہ پتھر تلاش کر
کوشش بھی کر امید بھی رکھ راستہ بھی چن
پھر اس کے بعد تھوڑا مقدر تلاش کر

عائشہ، تحریم ——— گوجرہ

اسی امید پہ روشن ہے خواہشوں کا نگر
وہ آ بھی جائے پلٹ کر عجب نہیں کوئی

عذرا ناصر ——— کراچی

ہم کو ان سے ہے وفا کی امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

مریم شہباز ——— کراچی

اب فراز اپنے مسیحا سے بھی امید نہ رکھ
وہ تنگ دل ہے ترے زخم میں گہرائی بہت

نوشابہ منظور جٹ ——— جھریاں والہ

اس نے توڑا وہ تعلق جو میری ذات سے تھا
اس کو رنج نہ جانے میری کس بات سے تھا
لاتعلق رہا لوگوں کی طرح وہ بھی
جو اچھی طرح واقف میرے حالات سے تھا

زبیدہ ریاض ___ کوئٹہ
لو آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ امید
لو اب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم

صدف نور ___ جھنگ
تمام رات امیدوں کے چاک سلتے رہے
تمام شب ترے قدموں کی چاپ آتی رہی

نداء فقضہ ___ فیصل آباد
شاید کہ چاند بھول پڑے راستہ کبھی
رکھتے ہیں اس امید پر کچھ لوگ گھر کھلے

نجمہ کاشف ___ لاہور
نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

نسرین ___ سرگودھا
سحر سے رشتۂ امید باندھنے والے
چراغِ زیست کی لو شام ہی سے مدھم ہے

صائمہ جبیں ___ کے ڈی اے
پھر باندھ لی کسی سے امید وفا قتیل
پھر اک محل ہواؤں میں تعمیر ہو گیا

مدیحہ نورین مہک ___ برنالی
میں زندگی کی جنگ میں ہارا ضرور ہوں
مگر کسی محاذ پر بھی پسپا نہیں ہوا

امبر عارف ___ کراچی
کب عشق کیا، کس سے کیا جھوٹ ہے یارو
بس بھول بھی جاؤ جو بھی ہم سے سنا ہو
اب میری غزل کا بھی تقاضا ہے یہ تجھ سے
انداز وادا کا کوئی اسلوب نیا ہو

اقصیٰ ناصر ___ کراچی
ڈستے ہیں چشم و زلف نگاہ و ادا سے ہم
ہر دم پناہ مانگتے ہیں ہر بلا سے ہم

ملک تاج ___ محراب پور
کیا جانیے کیا ہو گیا اربابِ جنوں کو
مرنے کی ادا یاد نہ جینے کی ادا یاد

جمیلہ ___ کراچی
بیٹھے ہیں اس ادا سے کہ گویا خفا نہیں
کیا آپ کی نظر سے میں آشنا نہیں

ثانیہ ___ بہاول نگر
چھلک پڑتے ہیں آنسو جب تمہاری یاد آتی ہے
یہ وہ برسات ہے جس کا کوئی موسم نہیں ہوتا

آمنہ ___ لیہ
کوئی درد آشنا ملتا نہیں ہے
اگرچہ آشنا ہر سو بہت ہیں
دُھلے گی اپنے دامن کی سیاہی
مقدر آنکھ میں آنسو بہت ہیں

عارفہ ___ کراچی
ہم بے زباں نہیں تھے مگر بے زباں رہے
آنسو ہی حسرتوں کے سدا ترجماں رہے

صدف عمران ___ کراچی
سینے میں ایک درد تو اٹھتا ہے بار بار
اس کی خبر نہیں کہ آنسو رواں ہیں کیوں

کہکشاں ___ سیالکوٹ
مل کے جدا ہوئے تو نہ سویا کریں گے ہم
اک دوسرے کی یاد میں رویا کریں گے ہم
آنسو چھلک چھلک کے ستائیں گے رات بھر
موتی پلک پلک میں پرویا کریں گے ہم

روبینہ ناز ___ کراچی
شکستہ دل ہے لوں آنسو بہانا چھوڑ دے ساقی
دیارِ سنگ میں شیشے کبھی سالم نہیں ہوتے

صائمہ جبیں ___ کراچی
کبھی تو روئے گا وہ بھی کسی کی باہوں میں
کبھی تو اس کی ہنسی کو زوال ہونا ہے
ملیں گی ہم کو بھی اپنے نصیب کی خوشیاں
بس انتظار ہے کب یہ کمال ہونا ہے

حسن و صحت

ادارہ

چہرے کی جلد کی صفائی کے ساتھ ساتھ خواتین کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے ہونٹ سرخ ہوں۔ پلکیں لمبی اور گھنی ہوں، بال لمبے ہوں، یہ سب چہرے کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں، صاف و شفاف جلد پر لمبی پلکیں اور گلابی ہونٹ حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔ آیئے ہم آپ کو بتائیں کہ آپ اپنے ہونٹوں کو کس طرح گلابی کر سکتے ہیں، لیکن سب سے پہلی بات یہ ہے کہ خواتین کو لپ اسٹک اگر استعمال کرنا ہو تو ہمیشہ کسی اچھی کمپنی کی لپ اسٹک خریدیں، سستی اور غیر معیاری لپ اسٹک آپ کے ہونٹوں کو خراب کر دے گی اور اس بات کا خیال رکھیں کہ لپ اسٹک رات کو سونے سے پہلے اتار لیں، ورنہ اس سے بھی ہونٹ کالے پڑنے لگتے ہیں۔ اگر آپ کو اپنے چہرے کو خوب صورت رکھنا ہے تو رات کو سونے سے پہلے چہرے پر میک اپ بالکل نہ رہنے دیں۔ کسی اچھے صابن سے منہ دھو کر خشک کر لیں اور کوئی بھی کریم لوشن وغیرہ جو گھر پر ہی تیار کی گئی ہو یا پھر دودھ کی بالائی چہرے پر لگائیں۔ اگر آپ میک اپ اتارے بغیر ہی سو جائیں گے تو اس سے آپ کے چہرے کی جلد خراب ہو جائے گی۔ اس لیے سونے سے پہلے میک اپ اتارنا بہت ضروری ہے۔ آیئے اب ہم آپ کو ہونٹ گلابی کرنے کی ترکیبیں بتاتے ہیں۔

1 ۔ رات کو سونے سے پہلے ویسلین ہونٹوں پر لگا کر سونا چاہیے۔ اس سے ہونٹ سرخ ہو جاتے ہیں۔

2 ۔ روزانہ رات کو سونے سے پہلے زعفران چٹکی بھر لے کر پانی میں بھگو کر ہونٹوں پر لگائیں اور پانچ، دس منٹ بعد دھو لیں۔

3 ۔ پسی ہوئی پھٹکری، گلاب کا عرق اور چار قطرے لیموں کا رس لیں۔ تینوں کو ملا کر ہونٹوں پر لگائیں، ہونٹ سرخ ہو جائیں گے۔

4 ۔ تھوڑی سی بالائی میں چند قطرے لیموں کا عرق ملا کر ہونٹوں پر لگائیں، ہونٹ سرخ ہو جائیں گے۔

5 ۔ پھٹکری اور گلیسرین ملا کر لگانے سے بھی ہونٹ خوب صورت ہو جاتے ہیں۔

6 ۔ سردیوں میں اگر ہونٹ پھٹ جاتے ہیں، اس لیے گائے کا کچا دودھ روزانہ ہونٹوں پر لگائیں۔
7 ۔ ٹماٹر کاٹ کر ہونٹوں پر ملنے سے ہونٹوں کی سیاہی دور ہو جاتی ہے۔
8 ۔ لیموں کے چھلکے ہونٹوں پر رگڑنے سے ہونٹوں کی سیاہی دور ہو جاتی ہے۔
9 ۔ گلاب کی پتیوں کو پیس کر دودھ میں ملالیں اور انہیں اچھی طرح مکس کر کے ہونٹوں پر لگائیں۔

بالوں کی خوب صورتی

بالوں کی خوب صورتی کا راز ان کے گھنے پن نرمی اور چمک میں پوشیدہ ہے اور یہ چمک بالوں کی صحت سے ہے۔ بال اگر اچھی طرح دھوئے جائیں تو ان میں چمک خود بخود پیدا ہو جاتی ہے اور اگر انہیں باقاعدہ اچھی طرح نہ دھویا جائے تو وہ بیمار ہو جائیں گے۔ کیونکہ میل جلد پر اثر ڈالتا ہے اور صحت مند بال صرف صحت اور صاف ستھری جگہ پر ہی نمو پا سکتے ہیں، یعنی ایسی جلد جس پر خشکی کا نام و نشان بھی نہ ہو۔ بال ہمیشہ وہی صحت مند ہوں گے، جنہیں اپنی پوری خوراک ملتی رہتی ہو۔ اگر باقاعدہ کنگھا کیا جائے اور ان کی مالش کی جائے تو دوران خون تیز ہو کر بالوں کو ان کی خوراک مطلوبہ وٹامن خود بخود پہنچتا رہے گا۔ یہیں پہنچ کر آپ کی خوراک کا اثر آپ کے بالوں پر ظاہر ہوتا ہے۔ بالوں کی صحت کے لیے پروٹین بے انتہا ضروری ہے انڈے، گاجریں، پھل اور ہری سبزیوں میں زیادہ پروٹین ہوتے ہیں، جس سے بالوں کی خوب صورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔

آپ بالوں میں چاہے ہزار چیزیں لگائیں، مگر ان سے فائدہ صرف وقتی ہی ہو گا۔ ویسے تو وقتی طور پر بے جان اور بے روح بالوں کی مالش اکثر فائدہ دیتی ہے۔ برش کرنا ہر قسم کے بالوں کے لیے ضروری ہے۔ بال چاہے خشک ہوں یا چکنے سیدھے ہوں یا لہردار ان کو صحت مند دیکھنے کی خواہش صرف اسی صورت میں پوری ہو سکتی ہے کہ برش کرنے کے عمل کو اپنی زندگی کا ایک جزو بنا لیا جائے۔ برش کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ بالوں کے ناہموار سرے اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہر بال کے مختلف ریشے جو جڑ کے قریب تو بال سے ملے ہوتے ہیں، لمبائی کی طرف جاتے ہوئے علیحدہ علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ انہیں ہموار کرنے کا واحد ذریعہ برش ہے۔ کھردرے اور خشک بال کسی بھی صورت میں کنگھی میں نہیں سماتے۔ وہ اسی عمل سے خوب صورت ہیں، لیکن چند دن کی کوشش کافی نہیں ہوگی۔ اسے زندگی کا لازمہ بنانا ہوگا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ضرورت سے زیادہ چکنے بالوں کو برش کرنا خطرناک ہے کیونکہ اس سے تیل اور چربی کے غدود حرکت میں آجاتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے، مگر برش نہ کرنے سے یہی تیل بالوں کی جڑوں میں جمع ہو کر کئی بیماریوں کا سبب بنتا ہے۔ اس لیے برش ضرور کرنا چاہیے۔ جب چکنائی برش سے پھیل کر بالوں میں آجائے تو بال دھو ڈالیے۔ صحت مند بال دھونے سے یا شیمپو کرنے سے خود بخود چمک اٹھتے ہیں، لیکن بسا اوقات اچھے بھلے صحت مند بال بھی دھونے سے نہیں چمکتے۔ صرف اس لیے کہ بال صحیح طریقے سے دھوئے نہیں جاتے۔ بالوں کو دھونے کے لیے اول تو اچھی قسم کا شیمپو چاہیے۔ دوسری چیز صحت سا پانی ہے۔ تھوڑے سے پانی سے شیمپو کے ذرات بالوں میں باقی رہ جاتے ہیں اور نقصان پہنچاتے ہیں۔ بالوں میں کبھی صابن استعمال نہ کریں۔

اکثر اوقات پانی کے بھاری ہونے کی وجہ سے یہ صابن بالوں میں جم جاتا ہے اور بال تباہ ہو جاتے ہیں۔ خشک بالوں کے لیے کریم والے شیمپو ٹھیک رہتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق بال گرنے کی رفتار پچاس سے ستر کے درمیان ہوتی ہے۔ اگر آپ کو اپنے تکیے کپڑوں وغیرہ پر گرے ہوئے بال زیادہ مقدار میں دکھائی دیں تو سمجھ لیجیے کہ آپ گنجے پن کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس بیماری کو شروع سے ہی پکڑ لیجیے اور ان ممکنہ اسباب کا پتا چلانے کی کوشش کریں جن کے باعث آپ کے بال جھڑنے شروع ہوئے ہیں۔ گنجا

پن ایک موروثی بیماری ہے، مگر یہ قابل علاج مرض ہے۔ یہ مرض روکنے کے لیے ڈاکٹر سے بھی مشورہ کریں اور غذائی صورت حال بہتر کریں اور بال ہمیشہ میٹھے پانی سے دھوئیں۔ کھارا پانی بالوں کے لیے مضر ہے۔

بالوں کی دیکھ بھال میں ان کی بیماریوں سے بھی بچانا شامل ہے۔ بالوں میں خشکی ایک عام مرض ہے۔ اس بیماری میں سر کی جلد پر چھوٹے چھوٹے سفید رنگ کے چھلکے سے پیدا ہوجاتے ہیں جو بالوں کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ خشکی پیدا ہونے کی کئی وجوہات بتائی گئی ہیں۔ جن میں بہت عرصے تک جذباتی تناؤ میں مبتلا رہنا، مناسب غذا کا جسم کے اندر نہ پہنچنا۔ بالوں کو ٹھیک خوراک کا فراہم نہ ہونا وغیرہ شامل ہے۔ اس لیے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ سر میں خشکی کس وجہ سے ہے اور اسی مناسبت سے علاج کریں۔

روزانہ سیب کھانے کے فائدے

اگر آپ کا جسم حد سے زیادہ دبلا پتلا ہے یا آپ نقاہت، کمزوری اور سستی کا شکار ہیں تو روزانہ ایک عدد میٹھا سیب باریک کاٹ کر قاشیں بنالیں اور کسی چھلنی یا ململ کے کپڑے سے ڈھک کر کھلے آسمان تلے رکھ دیں۔ صبح دودھ کے ساتھ اسی سیب کا ناشتا کریں۔ صرف ایک ماہ میں آپ بالکل تندرست اور اسمارٹ ہوجائیں گے۔ اگر دل کمزور ہو اور دل میں طاقت محسوس نہ ہوتی ہو تو اپنے دل کو قوت فراہم کرنے کے لیے سیب کھایا کریں۔ دل کو طاقت میسر آئے گی۔ سیب میں موجود غذائی اجزا دماغ کو قوت فراہم کرتے ہیں کیونکہ دوسرے پھلوں کی نسبت اس میں فولاد اور فاسفورس کی بہت زیادہ مقدار پائی جاتی ہے اور فاسفورس دماغ کی قوت کو بہت تیزی سے بڑھاتا ہے۔ آج کل ہر گھر میں کوئی نہ کوئی ہائی بلڈ پریشر کا مریض موجود ہے اور ہر گھرانہ اس مرض کے ہاتھوں پریشان ہے۔ سیب ایک ایسا پھل ہے، جس میں کچھ مخصوص معدنی نمکیات پائے جاتے ہیں، جن میں سوڈیم کافی کم ہوتا ہے۔ اس لیے بلڈ پریشر بڑھنے کے بجائے نارمل رہتا ہے اور سیب میں پایا جانے والا ایک خاص جزو "پکٹن" بلڈ پریشر کے مریضوں کے لیے بہت مفید ہے۔ سیب انسانی جسم کو کولیسٹرول کی زیادتی سے محفوظ رکھتا ہے، کیونکہ سیب کے اندرونی مواد میں پایا جانے والا "پکٹن" ایک قسم کا کاربوہائیڈریٹ ہوتا ہے۔ جو انسانی جسم میں کولیسٹرول کی مقدار کو بہت کم کردیتا ہے۔ اس طرح آپ فکر سے بے نیاز ہوکر سیب کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرسکتی ہیں۔ نیز موٹے افراد دل اور ہائی بلڈ پریشر کے مریض بھی بے فکر ہوکر سیب کا استعمال کرسکتے ہیں۔ سیب سے نظام ہاضمہ پر کسی قسم کا بوجھ نہیں پڑتا۔ اکثر اوقات مقوی اور اعلا و عمدہ غذا میں زود ہضم نہیں ہوتیں۔ جس سے معدہ پر گرانی اور بوجھ محسوس ہوتا ہے، مگر سیب بہت جلدی ہضم ہوجاتا ہے۔ سیب میں تیزابیت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے اور اس کی یہی خوبی ہے کہ یہ بہت تیزی سے ہضم ہوتا ہے اور نظام ہاضمہ پر بھاری نہیں ہوتا۔
سیب کو چہرے کی جلد کے نکھار کے لیے بھی اکسیر کا درجہ دیا جاتا ہے۔ سیب کو کچل کر براہ راست چہرے پر لگانے سے چہرے کی جلد تروتازہ، شاداب اور شگفتہ ہوجاتی ہے۔ اس کے علاوہ سیب کا غذا میں استعمال بھی چہرے کی جلد پر بہت اچھے اثرات مرتب کرتا ہے۔ سیب نہ صرف انسانی جسم میں موجود پرانے خون کو صاف کرکے سرخ ذرات میں اضافہ کرتا ہے بلکہ سیب کھانے سے انسانی جسم میں نیا اور تازہ خون پیدا ہوتا ہے جو پورے انسانی جسم کے لیے ضروری اور مفید ترین عمل ہے۔ اگر قبض کی شکایت لاحق ہوجائے تو معالج اسے دور کرنے کے لیے سیب کھانے کا مشورہ دیتے ہیں کیونکہ سیب میں ریشے یا بھوسے کی خاصی مقدار پائی جاتی ہے جو قبض کے مرض کو جڑ سے ختم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

✿ ✿

پائی قدمی

ایک شخص اپنے محلے کی نہایت معمولی شکل و صورت کی لڑکی کو بھگا کر لے جارہا تھا۔ دونوں چھپتے چھپاتے گلی سے نکلے اور کونے پر کھڑی ہوئی ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئے۔ اسٹیشن پہنچ کر دونوں ٹیکسی سے اترے۔ اس شخص نے خوف زدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھ کر ڈرائیور سے دریافت کیا۔ "ہاں بھئی۔ کتنا کرایہ دوں؟"

"اس کی ضرورت نہیں صاحب۔" ٹیکسی ڈرائیور نے جواب دیا۔ پھر لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "ان کے ابا جی نے مجھے کرایہ پہلے ہی دے دیا تھا۔"

روبینہ اسامہ۔ فیصل آباد

ہردلعزیز

کسی گاؤں میں ایک کسان کے سرکش خچر نے اس کی ساس کو اتنی زور سے لات ماری کہ وہ بے چاری چل بسی' جنازہ اٹھتے اٹھتے بہت ہجوم جمع ہوگیا۔

مولانا بولے۔ "معلوم ہوتا ہے کہ مرحومہ اس گاؤں میں کافی ہردلعزیز تھیں' جب ہی اتنے سارے لوگ اپنا کام چھوڑ کر جنازے میں شرکت کرنے آئے ہیں۔"

کسان نے کہا۔ "اس کی وجہ مرحومہ کی ہردلعزیزی نہیں ہے۔ یہ لوگ یہاں اس لیے آئے ہیں کہ ان میں سے ہر شخص میرے خچر کو خریدنے کے لیے بے تاب ہے۔"

حنا فرحان۔ راجن پور

کاریات

○ آپ کی بیگم کی ڈرائیو کیسی ہے۔

☆ وہ جس طرف گاڑی موڑتی ہے' کبھی کبھی اتفاقاً" سڑک بھی اسی طرف مڑ رہی ہوتی ہے۔

○ باجی کل ڈیڈی کی سالگرہ ہے' اس سالگرہ پر ہم کیا انہیں تحفہ دیں؟

☆ میرا خیال ہے اس سالگرہ پر ہم انہیں ان کی کار چلانے کا موقع دے ہی دیں۔

○ آپ نے کار کے ایک طرف نیلا اور دوسری طرف سفید پینٹ کیوں کروا رکھا ہے؟

☆ تاکہ جب ایکسیڈنٹ ہو۔ گواہوں کے بیانات میں تضاد پیدا ہو جائے۔

○ یہ خاتون سامنے سے اپنی گاڑی میں آرہی تھی' اگر آپ انہیں گزرنے کے لیے راستہ دے دیتے تو یہ حادثہ نہ ہوتا۔

☆ میں ضرور راستہ دے دیتا۔ جناب بشرطیکہ مجھے اندازا ہو جاتا انہیں جانا کس راستہ پر تھا۔

فوزیہ ثمر بٹ۔ گجرات

ناچتا قالین

ایک انسپکٹر نے سب انسپکٹر کو ایک علاقے کے مکان کے سامان کی فہرست بنانے کے لیے بھیجا۔ جب وہ کئی گھنٹے بعد بھی واپس نہ آیا تو انسپکٹر خود وہاں جا پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ سب انسپکٹر ایک کمرے میں گہری نیند سو رہا ہے۔ تاہم اس نے فہرست بنانے کی کوشش ضرور کی تھی۔

اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے کاغذ پر لکھا تھا۔

"ایک الماری' ایک مسہری' ایک بوتل شراب سے

بھری ہوئی۔۔۔ پھر شراب سے بھری ہوئی کاٹ کر لکھا تھا' شراب سے آدمی بھری ہوئی۔۔۔ اس کے بعد آدمی بھری ہوئی کاٹ کر بالکل خالی درج کیا گیا تھا۔ آخر میں ٹیڑھے' ترچھے حروف میں لکھا تھا اور ایک ناچتا ہوا قالین۔"

رفعت انجم۔۔۔ ملتان

لائسنس

آوارہ کتوں کے خلاف بلدیہ کی مہم زوروں پر تھی۔ ایک صاحب اپنے کتے کو نہلا دھلا کر ٹہلانے کے لیے نکلے تو ایک پولیس والے نے انہیں روک کر سوال کیا۔ "کیا آپ نے کتے کا لائسنس بنوالیا ہے؟"

وہ صاحب بے نیازی سے بولے۔ "نہیں! اس نے ابھی ڈرائیونگ نہیں سیکھی ہے۔"

کہکشاں اشفاق۔۔۔ فیصل آباد

کوئی فائدہ نہیں

ایک جاپانی سیاح بھارت کے شہر امرتسر میں تھا۔ ایک روز گھومتے ہوئے اپنے ہوٹل کا راستہ بھول گیا۔ قریب دو کانسٹیبل کھڑے تھے۔ سیاح نے ان سے انگریزی زبان میں اپنے ہوٹل کا راستہ دریافت کیا۔ سپاہی کچھ نہ سمجھے۔ انہوں نے سر ہلا کر معذرت کی کہ وہ انگریزی نہیں جانتے۔ سیاح نے اپنا سوال فرانسیسی میں دہرایا۔ سپاہیوں نے پھر معذرت کی کہ وہ یہ زبان بھی نہیں جانتے۔

چنانچہ سیاح نے اپنا سوال پہلے جاپانی میں' پھر فرانسیسی میں' پھر روسی زبان میں دہرایا' مگر کانسٹیبل ہر بار منہ لٹکا کر رہ گئے اور سیاح مایوس ہو کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد ایک کانسٹیبل دوسرے سے بولا۔ "مہتا جی! ہمیں کوئی غیر ملکی زبان ضرور سیکھ لینی چاہیے' تاکہ ہم سیاحوں کی مدد کر سکیں۔"

"کوئی فائدہ نہیں رنجیت سنگھ جی۔" دوسرا کانسٹیبل بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "تم نے دیکھا نہیں' یہ سیاح کتنی زبانیں جانتا تھا' مگر ایک بھی اس کے کام نہیں آئی۔"

عائشہ بشیر۔۔۔ پھول نگر

اس سادگی پہ۔۔۔۔!

ہائی وے پر نہایت تیز رفتاری سے جاتے ہوئے ایک صاحب کی گاڑی کو ٹریفک سارجنٹ نے کافی دیر تک تعاقب کرنے کے بعد روکا تو وہ صاحب انجان اور معصوم بنتے ہوئے بولے۔ "مجھے کس لیے روکا گیا ہے؟ اس سے پہلے تو کبھی مجھے اس طرح نہیں روکا گیا۔"

"جی ہاں۔۔۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔" سارجنٹ نے دانت پیس کر کہا۔ "اس سے پہلے جس نے بھی آپ کو روکا ہو گا گاڑی کے پچھلے ٹائروں پر گولی چلا کر ہی روکا ہو گا۔"

سعدیہ یاسین۔۔۔ کراچی

ڈراپ سین

شادی کے کچھ دن بعد دلہن نے اپنے شوہر کو بتایا۔ "وہ ہر وقت میرے پیچھے لگا رہتا ہے۔ گھر کے بھی چکر لگاتا ہے' چھٹی والے دن تو کئی بار گھر آجاتا ہے۔ میں تو اس سے بہت عاجز آگئی ہوں۔ کل میں شاپنگ کے لیے جا رہی تھی تو اس نے مجھے راستے میں گھیر لیا اور گڑگڑانے لگا۔ اپنی بات منوانے کے لیے۔"

"اس کو تو میں اچھی طرح دیکھ لوں گا۔ مگر معلوم تو ہو کہ وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے؟" شوہر نے طیش میں آتے ہوئے کہا۔

"کہتا ہے انشورنس کروالو۔" دلہن نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

فرح بشیر۔۔۔ بھائی پھیرو

راگ رنگ

میوزک بڑے کمال کی چیز ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو ہمارے جدید و شدید گلوکار مائیک پکڑ کر جو کچھ کرتے ہیں' انہیں اس پر پاگل خانے کی ہوا کھانی پڑتی۔ لوگ ان کے گانے بھی پسند کرتے ہیں۔ ظاہر ہے بندہ اچھے گانے سن سن کر بھی اکتا بھی جاتا ہے۔

یہ نوجوان گلوکار گاتے گاتے کھو جاتے ہیں' پھر کہیں سے ڈھونڈ کر انہیں لانا پڑتا ہے۔ نوجوان'

گروپ کی صورت میں مل کر اس لیے گاتے ہیں کہ تاکہ پتا نہ چل سکے کہ سب سے بے سرا کون گا رہا ہے۔ یہ بھاگتے ہوئے گاتے ہیں' واقعی ایسا گانا سنانے والے کو بھاگنا ہی چاہیے۔

ڈاکٹر یونس بٹ کی کتاب "کلاہ بازیاں" سے اقتباس۔

انشاں۔۔۔ کراچی

مہارت

ایک صاحب نے ایک جگہ مجمع لگا دیکھا تو تجسس کے تحت قریب جا پہنچے۔ انہوں نے دیکھا کہ دیہاتیوں جیسے حلیے اور بے وقوف سا دکھائی دینے والا ایک شخص لوگوں کو اپنے کتے کے کرتب دکھا رہا تھا۔ جو واقعی بڑے حیرت انگیز تھے اور لوگ ان سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

مجمع چھٹنے کے بعد وہ صاحب اس شخص کے پاس پہنچے اور حیرت سے بولے۔ "بھئی تم نے اپنے کتے کو اتنے کرتب کیسے سکھا دیے۔ میں نے تو اپنے کتے کے ساتھ بڑی مغز ماری کی' میں تو اسے ایک کرتب بھی نہیں سکھا سکا۔"

"سیدھی سی بات ہے۔" سیدھے سادے شخص نے جواب دیا۔ "کتے کو کرتب سکھانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کو کتے سے زیادہ کرتب آتے ہوں۔"

یاسمین۔۔۔ کراچی

لاجواب

فریدہ نے نسیمہ سے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے کیا سوچ کر باری صاحب سے شادی کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ تو تمہارے مقابلے میں بہت بڑی عمر کے ہیں۔ ان کے منہ میں دانت تک نہیں اور وہ گنجے بھی ہیں۔"

"یہ تو کوئی عیب نہیں ہے۔" نسیمہ نے بے پروائی سے کہا۔ "وہ تو پیدائش کے وقت بھی ایسے ہی تھے۔"

شازیہ مریم۔۔۔ لاہور

اصل کاروبار

ایک صاحب آلات موسیقی کی دکان میں داخل ہوئے اور وہاں اسلحہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہوں نے دکاندار سے پوچھا۔ "جناب! آلات موسیقی کی دکان پر اسلحے کی موجودگی میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ آپ ذرا اس کی وضاحت تو کیجیے۔"

"میرا اصل کاروبار یہی ہے۔" دکاندار نے مسکرا کر جواب دیا۔ "جب کوئی نوجوان کوئی ساز خرید کر جاتا ہے تو اگلے ہی دن اس کے گھر والے اور ہمسائے پستول اور رائفل خریدنے آجاتے ہیں۔"

عظمیٰ آفتاب۔۔۔ کراچی

مجبور

سخت مزاج اور کج خلق مالکن نے اپنی نوجوان ملازمہ کو آواز دے کر کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ تم گھر چھوڑ کر جا رہی ہو؟"

"جی ہاں مالکن! یہ درست ہے۔" ملازم نے مودبانہ جواب دیا۔

"مگر کیوں۔۔۔؟ یہ تو غلط بات ہے نا! میں نے تو ہمیشہ کوشش کی ہے کہ تم سے گھر کے افراد کی طرح پیش آؤں۔" مالکن نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن گھر کے افراد تو یہاں پر رہنے کے لیے مجبور ہیں۔۔۔ مگر میں تو نہیں۔" ملازمہ نے جواب دیا۔

نسرین۔۔۔ شور کوٹ

وضاحت طلب

ایک لڑکی نے اپنی سہیلی سے کہا۔ "میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ صرف میرے شوہر ہی وہ مرد ہیں' جو زندگی میں میرے قریب آئے۔"

"یہ تم فخر کا اظہار کر رہی ہو یا اپنی تقدیر سے شکوہ؟" سہیلی نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

غزل۔۔۔ فیصل آباد

✲ ✲

کرن کا دسترخوان

خالدہ جیلانی

کشمیری بریانی

اشیا :

چاول	ایک کلو
گھی	آدھا پاؤ
نمک	حسب ذائقہ
پیاز	ایک چھٹانک
ثابت گرم مسالا	دو کھانے کے چمچے
خربوزہ (چھلکا اترا ہوا)	آدھا پاؤ
خوبانی	ایک چھٹانک
بادام	آدھا پاؤ
لہسن	آدھا چھٹانک
ادرک	آدھا چھٹانک
یخنی	ایک کلو

ترکیب :

چاول صاف کرکے ایک گھنٹے کے لیے بھگو دیں۔ دیگچی میں گھی گرم کرکے پیاز باریک کاٹ کر تل لیں۔ یہاں تک کہ پیاز براؤن ہو جائے۔ پسی ہوئی ادرک، لہسن اور ثابت گرم مسالا ڈال کر بھون لیں۔ پھر یخنی ڈال دیں۔ یخنی آپ کو پہلے سے بنا کر رکھنی ہوگی۔ جب یخنی میں ابال آجائے تو اس میں نمک اور چاول ڈال دیں۔ آنچ تیز رکھیں۔ جب چاولوں کا پانی خشک ہونے لگے تو اس میں خشک اور تازہ پھل کاٹ کر شامل کرلیں۔ اس کے بعد برتن کو اچھی طرح ڈھانپ کر چاول ہلکی آنچ کرکے دم پر رکھ دیں۔ پانچ سے دس منٹ کے بعد دم کھولیں۔ دہی کے رائتہ اور سلاد کے ساتھ مزے دار کشمیری بریانی تیار ہے۔

دال پراٹھا

اشیا :

چنے کی دال	ایک پیالی
نمک	حسب ذائقہ
لیموں	دو عدد
پودینہ	ایک گٹھی باریک کٹا ہوا
ہری مرچ	چار عدد باریک کٹی ہوئی
تیل	تین کھانے کے چمچے
آٹا	آدھا کلو

ترکیب :

چنے کی دال کو نیم گرم پانی سے دھو کر ابالیں، لیکن دال بہت نرم نہ ہو، بکھری بکھری رہے۔ جب دال گل جائے تو اسے ٹھنڈا کرکے چوپر میں پیس لیں۔ پھر اس میں حسب ذائقہ نمک، پسی لال مرچ، لیموں کا رس، پودینہ اور باریک کٹی ہری مرچ شامل کرکے رکھ دیں۔ اب کڑاہی میں تیل گرم کرکے اس میں مسالا ملی دال کو ہلکا سا بھون لیں۔ اس کے بعد آٹے میں نمک ملا کر تسلے میں نیم گرم پانی کے ساتھ گوندھیں اور تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں۔ ساتھ ہی توا گرم کرلیں۔ پھر آٹے کا ایک پیڑا بنائیں اور روٹی کی طرح بیل کر اس پر تھوڑی دال پھیلا دیں۔ کنارے تھوڑے تھوڑے چھوڑ دیں۔ اس کے بعد کناروں پر گیلا میدہ لگا کر دوسری روٹی بیل لیں اور اسے اوپر رکھ کر کناروں کو ہلکا سا دبا کر بند کردیں۔ اب گرم توے پر اسے روٹی کی طرح سینک کر لکڑی کے چمچے سے تیل لگائیں۔ سینکنے کے بعد اسے اتار کر املی کی چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

ہاٹ اینڈ ساور بیف

اشیا :

گوشت چھوٹی بوٹی	آدھا کلو
ادرک لہسن پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ

ثابت لال مرچ — چھ عدد
گرم مسالا پاؤڈر — ایک چائے کا چمچہ
پیاز کٹی ہوئی — دو عدد
ٹماٹر کٹے ہوئے — ایک پاؤ
سرکہ — ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
چینی — چٹکی بھر
نمک — حسب ذائقہ
تیل — آدھا کپ

ترکیب :

ثابت لال مرچ توڑ کر بیج اور ڈنڈی نکال دیں اور سرکہ میں بھگو کر آدھا گھنٹہ رکھیں۔ آدھا گھنٹہ بعد مرچ، ادرک، لہسن کے ساتھ پیس لیں۔

گوشت کو لال مرچ، ادرک، لہسن کا پیسٹ، نمک، ہلدی اور گرم مسالا لگا کر تقریباً ایک گھنٹہ رکھیں۔ اب تیل گرم کر کے پیاز ہلکی پکی کریں اور گوشت کا مکسچر ڈال کر بھون لیں۔ اچھی طرح سے بھون کر ٹماٹر ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر تقریباً ایک گھنٹہ پکنے کے لیے رکھ دیں۔ ایک گھنٹے کے بعد ڈھکن ہٹا کر دیکھیں، اگر گوشت گل چکا ہو تو اچھی طرح بھونیں اور چینی ڈال دیں اور سرکہ کی ضرورت ہو تو ڈالیں، ورنہ نہیں۔ اب ہرا دھنیا ڈال دیں اور سرو کریں۔

پالک چاول

اشیا :

بغیر ہڈی کے مرغی کا گوشت (کیوبز) آدھا کلو
چاول — تین سو گرام
تیل — چوتھائی کپ
پالک (بغیر ٹہنی کے) — ایک گٹھی
ادرک لہسن پیسٹ — ایک کھانے کا چمچہ
پیاز (باریک کٹی) — ایک عدد
ہری مرچ — تین سے چار عدد
ٹماٹر — دو عدد
پانی — سوا گلاس
نمک — حسب ذائقہ

پالک کاٹ لیں اور اسے پانی میں دو منٹ ابالیں پھر چھلنی میں ڈال دیں اور اوپر ٹھنڈا پانی ڈالیں۔ ٹماٹر کو لمبائی میں کاٹ لیں کہ ایک ٹماٹر کے چار حصے ہوں۔ چاولوں کو تیس منٹ کے لیے پانی میں بھگو دیں۔ دیگچی میں تیل گرم کر کے ادرک لہسن پیسٹ کو مکس کریں کہ اس کا کچا پن ختم ہو جائے۔ اب چکن ڈال کر پکائیں اور جب چکن کی رنگت بدل جائے تو اس میں پیاز اور ثابت ہری مرچ شامل کر کے اتنا پکائیں کہ پیاز نرم ہو جائے۔ پھر سوا گلاس پانی ڈال دیں پانی میں ابال آنے لگے تو چاول شامل کریں۔ چاول پکنے دیں اور چاولوں میں بلبلے بننے لگیں ——— پانی تھوڑا سا رہ جائے تو ابلی پالک اور ٹماٹر کو ہلکے ہاتھوں سے مکس کریں۔ اسے آنچ سے دس منٹ دم پر رکھ دیں۔ دم سے ہٹا کر ڈش میں نکال کر سرو کریں۔

چائنیز گولڈن چکن

اشیا :

سالم چکن، 3تا2 کلوگرام
ہری مرچ — تین عدد
سویا ساس — چار کھانے کے چمچے
نمک — حسب ذائقہ
چینی — ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
مرغ کی یخنی — ڈیڑھ کپ
ہری پیاز — تین عدد
سفید سرکہ — چھ کھانے کے چمچے
پسی ہوئی ادرک — ایک چائے کا چمچہ
سیاہ مرچ — ڈیڑھ چائے کا چمچہ
زردہ رنگ — ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
کوکنگ آئل — ایک کپ

ترکیب :

سالم چکن کو اچھی طرح سے اندر باہر سے صاف کر کے دھو لیں۔ پانی خشک کر کے سرکہ تین چائے کے چمچے چکن پر مل دیں۔ پسی سیاہ مرچ اور نمک ملا کر اسے

بھی اس کے اور اچھی طرح سے لگائیں اور کانٹے کی مدد سے گوشت کو گودیں۔ ہری پیاز، ہری مرچ اور پسی ہوئی ادرک اور تھوڑا سا نمک ملا کر اس آمیزے کو پیس لیں اور اسے چکن کے پیٹ میں بھر کر ٹوتھ پک لگا کر بند کر دیں۔ چکن کو آدھ گھنٹہ تک پڑا رہنے دیں۔ ایک دیگچی میں آدھا کپ پانی ڈال کر ابالیں۔ جب پانی ابلنے لگے تو چکن کو اس میں رکھ کر ڈھکن لگائیں اور بھاپ میں پکنے دیں۔ آنچ ہلکی رکھیں تاکہ گوشت گل جائے۔ آدھا گھنٹہ بعد جب چکن گل جائے تو اس کے پیٹ سے پیاز، سبز مرچ اور ادرک نکال دیں۔ تین عدد چمچے سرکے میں ڈیڑھ چمچہ چینی، سویا ساس، زردہ رنگ ملائیں اور مرغی کی یخنی اور آئل ڈال کر چولہے پر چڑھائیں اور اس میں بوائل چکن ڈال دیں۔ اب اسے دھیمی آنچ پر پکائیں۔ جب یخنی خشک ہو جائے اور آئل نکل آئے تو اسے آہستہ آہستہ بھونیں۔ تیار ہونے پر ڈش نکال لیں۔ سلاد اور ٹماٹو ساس کے ساتھ کھانے کی ٹیبل پر سجائیں۔

پاکستانی ڈرائی فروٹ قورمہ

اجزا:

مٹن (چھوٹی بوٹی)	آدھا کلو
تیل	آدھا کلو
دار چینی	دو سے تین ڈنڈیاں
لونگ	تین سے چار عدد
چھوٹی الائچی	چار سے پانچ عدد
ادرک لہسن کا پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
ٹماٹر	دو سے تین عدد (کٹے ہوئے)
دھنیا	ایک چائے کا چمچہ (پسا ہوا)
زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ (پسا ہوا)
لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ (پسی ہوئی)
گرم مسالا (پسا ہوا)	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ (کٹی ہوئی)
نمک	حسب ذائقہ
دہی	ڈیڑھ کپ
پیاز	دو عدد (کٹی ہوئی)
خوبانی	ایک کپ
بادام	ایک کپ
کاجو	آدھا کپ
کشمش	بیس گرام
آلو بخارے	آدھا کپ
اخروٹ	دس گرام

ترکیب:

ایک پتیلی میں تیل گرم کر کے اس میں دار چینی، لونگ اور چھوٹی الائچی ڈال کر کڑکڑا لیں۔ پھر اس میں ادرک، لہسن کا پیسٹ، مٹن ڈال کر بھون لیں اور ٹماٹر شامل کریں۔ اس کے بعد دھنیا، زیرہ، لال مرچ، گرم مسالا، کالی مرچ اور نمک مکس کر کے بھون لیں۔ اور گلنے تک پکائیں۔ اب اس میں دہی شامل کر کے اچھی طرح مکس کر لیں۔ دہی جذب ہو جائے تو اس میں تلی پیاز، خوبانی، بادام، کاجو، کشمش، آلو بخارے اور اخروٹ شامل کر کے اچھی طرح مکس کریں اور اسے اتنا پکائیں کہ یہ پیسٹ کی شکل میں آجائے۔ قورمہ تیار ہے۔

چکن جنجر

اشیا:

مرغی	دو کلو
(بغیر ہڈی موٹی اور لمبی بوٹیاں بنالیں)	
ٹماٹر	چار عدد (کاٹ لیں)
لونگ	تین عدد
دار چینی	ایک ٹکڑا
پیاز چھوٹی	ایک عدد (باریک کاٹ لیں)
ہرا دھنیا	دو سے تین کھانے کے چمچے (کٹا ہوا)
ادرک	تین کھانے کے چمچے
(باریک کٹی ہوئی)	
چائنیز نمک	ایک چائے کا چمچہ
چلی پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
زردے کا رنگ	آدھا چائے کا چمچہ
زیرہ بھنا اور پسا ہوا	آدھا چائے کا چمچہ

ہری مرچ سالم	چار عدد
ہری پیاز (پتوں کے ساتھ کٹی ہوئی)	دو سے تین کھانے کے چمچے۔
تیل یا گھی	آدھا کپ
بڑی الائچی	ایک عدد
چھوٹی الائچی	تین عدد۔
سفید زیرہ ثابت	آدھا کلو
سفید مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	آدھا چائے کا چمچہ
لہسن ہر ادرک	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
دہی	دو کھانے کے چمچے

ترکیب :

ایک فرائی پین میں ٹماٹر، تیل یا گھی، لونگ، بڑی الائچی، دار چینی، چھوٹی الائچی، سفید زیرہ، ثابت ادرک، باریک کٹی ہوئی، چائنیز نمک، سفید مرچ، چلی پاؤڈر، نمک، زردے کا رنگ، لہسن ہر ادرک، زیرہ بھنا اور پسا ہوا، گرم مسالا اور دہی ڈال کر اس وقت تک بھونیں جب تک چکنائی اوپر نہ تیرنے لگے پھر اس میں مرغی ڈال دیں اور مزید دس منٹ تک بھونیں حتیٰ کہ گوشت گل جائے اور تیل اوپر آجائے۔ آخر میں کٹی ہوئی پیاز اور سالم ہری مرچیں ڈال کر مزید پانچ منٹ تک بھونیں۔ آخر میں ہرا دھنیا اور ہری پیاز ڈال دیں اور گرم گرم سرو کریں۔

اچاری آلو

اشیا :

آلو	750 گرام
تیل	ڈیپ فرائی کے لیے
پیاز	آدھا کپ
ادرک لہسن پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ضرورت
املی کا گودا	1/4 کپ
ہلدی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
لال مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
کٹی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
کری پتہ	پندرہ سے دس عدد
رائی دانہ	آدھا چائے کا چمچہ
ثابت سوکھی لال مرچ	آٹھ عدد
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
کلونجی	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب :

ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں پھر اس میں آلو فرائی کر کے پیپر پر نکال لیں اور دو کھانے کے چمچے تیل باقی رہنے دیں۔ اب کڑاہی میں پیاز کا پیسٹ، ادرک لہسن کا پیسٹ، نمک، ہلدی پاؤڈر، لال مرچ پاؤڈر، کٹی لال مرچ، املی کا پیسٹ اور آلو شامل کریں۔ ساتھ میں پانی ڈال کر پانچ سے چھ منٹ تک پکنے دیں۔ ایک پین میں دو کھانے کے چمچے تیل گرم کر کے لال مرچ، رائی دانہ، بھنا کٹا زیرہ، کری پتہ اور اجوائن ڈال کر بگھار دیں۔ آلوؤں پر بگھار لگائیں اور گرم گرم سرو کریں۔

آلو بخارے کی چٹنی

خشک آلو بخارے	ایک پاؤ
پانی	دو کپ
چینی	آدھا کپ
کٹی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
سرکہ	آدھا کپ
لال رنگ کھانے کا	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

پانی، نمک، شکر، لال مرچ پاؤڈر اور آلو بخارا ڈال کر اتنا پکائیں کہ آلو بخارے گل جائیں اور گاڑھی گریوی بن جائے تو اس میں لال رنگ، سرکہ ملائیں اور پانچ منٹ تک مزید پکائیں۔ لیجیے مزیدار چٹنی تیار ہے۔ آپ اسے ٹھنڈا کر کے صاف مرتبان میں بھر لیں۔

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ ۱۹۷۷ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔

ذوالقرنین

عنبر بھائی کا در بار

س - بھیا ہم پر اتنا بڑا سانحہ گزر گیا۔ ہم سے ہماری عزیز ترین ہستی ہمارے والد صاحب بچھڑ گئے آپ سے اتنا نہ ہوا کہ ہم بہنوں کو تسلی کے دو بول لکھ دیتے۔ آپ کیسے بھائی ہیں کہ تعزیت کا خط نہ لکھا۔ خیر غیروں سے شکایت کون کرے

ج - آپ کے دکھ پر میرا دل بھی دکھی ہو گیا۔ اللہ آپ کو صبر و تحمل دے اور مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔

لال پری۔۔۔ پرستان

س - اگر آپ عقل سے پیدل ہوتے تو کیا کرتے؟

ج - تم سے لفٹ مانگ لیتا۔

شبانہ آرزو۔۔۔ نوشہرو کینٹ

س - میں اکثر سوچتی ہوں کہ جب مجھ پہ بڑھاپا آئے گا۔ تو میں کیسی لگوں گی؟

ج - کیوں بھئی! آپ کو کوئی اور کام نہیں ہے؟

غزالہ علی نصرت علی۔۔۔ کھلابٹ ٹاؤن شپ

س - بھیا جی! خبردار سگریٹ نوشی صحت کے لیے مضر ہے؟

ج - میں نے ایسی باتیں پڑھنا ہی چھوڑ دیں۔

نائلہ محمود۔۔۔ کراچی

س - نین بھیا! میری مشکل یہ ہے کہ جب میں چشمہ لگا کر نکلتی ہوں، تو لڑکے "دو اور دو کتنے ہیں" کی آوازیں کسنے لگتے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں کیا کروں؟

ج - کیا واقعی آپ کو نہیں پتا دو اور دو کتنے ہوتے ہیں۔

خالدہ ادیب وارثی۔۔۔ ٹھٹھو

س - آنکھیں خراب ہو جائیں تو عینک لگاتے ہیں اگر دل خراب ہو جائے تو؟

ج - پھر کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

آمنہ حمید۔۔۔ کراچی

س - سگریٹ پیتی عورتیں ایسے لگتی ہیں نا۔ جیسے مرغیاں اذان دے رہی ہوں ہے نا؟

ج - ایسی بات نہ کریں۔ مرغوں نے سن لیا تو وہ ناراض ہو جائیں گے۔

شہناز فیضی۔۔۔ کراچی

س - دل میں اتر جانے کا سب سے آسان طریقہ کیا

ہے جی؟

ج ۔ کس کے دل میں اترنے کا جی؟

ہاجرہ گل ۔۔۔ کراچی

س ۔ چل چنبیلی باغ میں جھولا جھلاؤں گی؟

ج ۔ انڈین گانے کم سنا کرو۔

خالدہ سلطانہ نگار ۔۔۔ چونیاں

س ۔ بھائی جان کیا ہماری بھابھی اس بات کا نوٹس نہیں لیتیں کہ آپ ہر ماہ خواتین کی محفل میں شریک ہوتے ہیں۔

ج ۔ کیوں نہیں لیتیں بھئی۔ مگر ہم بھی ایک ہی ڈھیٹ ہیں۔

قندیل سحر ۔۔۔۔۔ ملتان

س: شب کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی میں کہ صبح امید نے آکر مجھے جگایا!!

ج: پھر بھی آپ سوتی رہیں علی الصبح دوپہر تک۔

شمعونہ رحمن ۔۔۔۔۔ پیرکوٹ جھنگ

س: ذوالقرنین بھیا! آئیڈیل اگر چکنا چور ہو جائے تو کیا کیا جائے؟"

ج: یہ تو بعد کی بات ہے ویسے یہ "آئیڈیل" ہوتا کیسا ہے۔ اور ہوتا کیا ہے؟

رضوانہ کلثوم ۔۔۔۔۔۔ چیچہ وطنی

س: ذوق بھیا! یہ بتائیں کہ بیوی اپنی عمر اور میاں اپنی تنخواہ چھپاتے ہیں۔ لیکن بچے کیا چھپاتے ہیں؟

ج: ان دونوں کے جھوٹ۔

ناصرہ مقصود ۔۔۔۔۔۔ کراچی

س: کنوارے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اور شادی شدہ خودکشی۔ کیا وجہ ہے؟

ج: کنواروں کو کچھ نہ کہو، جنہیں تم جیسے لوگوں نے ابھی تک گھر بٹھایا ہوا ہے۔

نزہت ذاکر ۔۔۔۔۔ سیدرہ

س : "بھیا جی، مرد کہتے ہیں عورت کو چاند پر اس لیے نہیں بھیجا گیا کہ وہ وہاں بھی فساد برپا کر دے گی کیا یہ درست ہے؟"

ج : "زن، زر اور زمین فساد کی جڑ ہے" اس خیال سے کہا ہوگا، ورنہ ماں کے قدموں کی جنت سے بھلا کس کافر کو انکار ہو سکتا ہے۔"

نازی حنا ناز ۔۔۔۔ لاہور

س : "نین بھیا! کہتے ہیں کہ جدائی کیسی بھی ہو بری ہوتی ہے، چاہے مرنے کے بعد ملے، چاہے زندگی میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

ج : "بات تو سچ ہے مگر کہتے ہیں نا کہ بات ہے رسوائی کی کیونکہ بات نکلے گی تو دور تلک جائے گی۔"

سیدہ صغریٰ فاطمہ ۔۔۔۔ گجرات

س : "لالہ کا پھول اتنا خوب صورت ہونے کے باوجود درمیاں سے سیاہ کیوں ہوتا ہے؟"

ج : "خاصی گہرائی سے دیکھا ہے بے چارے پھول کو، ہو سکے تو بھیجنا ذرا، میں بھی اس کی سیاہی سے قلم بھر لوں۔"

صبا عمران ۔۔۔۔ کراچی

س : "شادی کے بعد عورتوں کی پہلی خواہش؟"

ج : "میرے لیے دنیا چھوڑ دیں۔"

فرزانہ ۔۔۔۔ لاہور

س : "زندگی کے کتنے رنگ ہیں؟"

ج : "آج کل تو پرنٹڈ کا زیادہ فیشن ہے۔"

سائرہ پروا علی۔۔۔ راجن پور

"کرن" 15 مئی کو جھلسا دینے والی گرمی میں ایک تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند ثابت ہوا۔ "کرن" نے مجھے دیوانہ بنا دیا ہے۔ "کرن" ایک ایسا پھول ہے جو دل کے باغ میں تمام پھولوں سے نمایاں نظر آتا ہے۔ جس کے رنگ میں ایسی کشش ہے کہ زندگی کے باغ میں قدم رکھنے والا پہلی نگاہ میں اس پھول (کرن) کو دیکھنے پر مجبور ہے۔ اس کی خوشبو ایسی تیز رفتار ہے اس کے کھلتے (شائع) ہی ساری کائنات کا ماحول معطر ہو جاتا ہے۔ یہ اس باد صبا کا نام ہے جس سے ہر ذی روح لطف اندوز ہوتا ہے۔ دل تو چاہ رہا ہے کہ "کرن" کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دوں، مگر آپ کا وقت اور صفحات دونوں قیمتی ہیں۔

اب کچھ بات "کرن" کے بارے میں ہو جائے۔ ٹائٹل ونڈر فل تھا۔ میں نے "مقابل ہے آئینہ" میں اپنے جوابات بھیجے تھے۔ اب تک تو انہیں شائع ہو جانا چاہیے تھا۔

سلسلے وار ناولز دونوں بیسٹ جا رہے ہیں۔ میمونہ صدف ہر بار کی طرح اس بار بھی بازی لے گئیں۔ ان کا مکمل ناول "جھوٹ سچائیوں سے ڈرتا ہے" رسالے کی جان تھا۔

سندس خان، شازیہ خان، کرن خان۔۔۔ شاہدرہ لاہور

سب سے پہلے شکریہ میرا خط شائع کرنے کے لیے اپنا نام رسالے میں دیکھ کے مجھے انتہائی خوشی ہوئی۔ میری بہن شازیہ خان نے کہا سندس خان! تم تو اس طرح خوش ہو رہی ہو جیسے خط نہیں تمہاری تحریر شائع ہو گئی ہے۔ اب اسے کیا پتا خط کے شائع ہونے سے ہی تو مجھے حوصلہ ملا ہے۔

اب کرن ڈائجسٹ پر بھی کچھ تبصرہ ہو جائے اس بار کرن ڈائجسٹ میں 19 تاریخ کو لے کر آئی ماموں کی شادی تھی نا تو مصروف رہی لانے کا ٹائم ہی نہیں ملا۔ اس ماہ کا ٹائٹل انتہائی خوب صورت تھا۔ دیکھتے ہی دل خوش ہو گیا۔ پھر جلدی سے رسالہ کھولا اور "در دل" پر فٹ سے پہنچے۔ نبیلہ جی یہ کیا دینے دیتیں دل آور شاہ کو طلاق خیر اب اگلی قسط کا انتظار ہے اور دل چاہ رہا ہے کہ دل آور کی شرائط میں یہ بھی شرط شامل ہو کہ میں زری سے شادی کروں گا۔

میں نے افسانہ اور ناولٹ لکھا ہے آپ شائع کریں گی اور کرن رسالہ گھر پر لگوانے کے لیے کیا کروں؟

ج ۔ پیاری بہن! آپ اپنا افسانہ اور ناولٹ دونوں ہمیں پوسٹ کر دیں۔ قابل اشاعت ہونے کی صورت میں شائع کر دیا جائے گا۔ سالانہ خریدار بننے کے لیے اس پتے پہ 700 کا منی آرڈر ارسال کر دیں۔ ہر ماہ "کرن" آپ کو بھجوا دیا جائے گا۔

فائزہ بھٹی۔۔۔ پتوکی

موسلا دھار بارش کے بعد خوب صورت چمکتی، دلکش سہ پہر کو کرن کی آمد کا اعلان کیا ہوا۔ مجھے بے چین وجود کو کچھ لمحوں کے لیے سہی، مگر قرار ضرور حاصل ہوا۔ سرورق نہ جانے کیوں دل کو چھو نہ سکا۔ اب خبر نہیں کہ یہ صرف ہمارے پاگل دل کو ہی اچھا نہیں لگا یا پھر واقعی اچھا نہیں تھا۔ فہرست پر نظر

دو ہائی "" در دل "" کو پا کر بے اختیار سکون کی سانس خارج کی۔ (اب یہ نہیں بتاؤں گی کہ کیوں) پھر آذر صاحب کی حالت ملاحظہ فرمانے کے لیے سب سے پہلے اس کہانی کا ہی رخ کیا۔ ارے واہ۔ آفندی خاندان کے افراد کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ کمال ہے۔ جودت آفندی تم نے واقعی میں حیران کیا ہے۔ آذر صاحب نے بھی مریم کے بے گناہ وجود کو تحفظ دینے کا وعدہ کیا۔ اب دیکھتے ہیں وعدہ کہاں تک وفا ہوتا ہے۔ علیزے تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا جو کہ یقیناً" بہت اچھا ثابت ہو گا۔ نبیلہ عزیز آپ کا ناول لاجواب ہے۔ مجھے تو ایک ہی غم ہے جب یہ ختم ہو گیا تو ہمیں تو دل آور ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔

"شام آرزو" بہت عمدہ فرحانہ ناز پڑھ کر مزا آگیا۔ عقیدت سب سے بہترین کردار ہے۔ خدا کرے آپ کا یہ ناول بہترین ثابت ہو۔

اب اگر بات کی جائے مکمل ناولز پر تو "میرے زخم" نگہت سیما کیا کہوں۔ کمال کرتی ہیں آپ تو۔ خدا پاک آپ کو خوش رکھے "آباد رکھے۔

"جھوٹ سچائیوں" بہت اچھی تحریر تھی۔ صدف آپ نے ٹھیک کہا۔ اپنوں کے رویے زہر میں بھیگے ہوئے تیر کی طرح تکلیف دیتے ہیں۔ خوب صورتی اگر انسان کے بس میں ہو تو ہر انسان خود کو دنیا کا بہترین انسان بنانے میں ذرا تامل نہ کرے۔ مگر نہ جانے کیوں اتنی سی بات ہم نہیں سمجھتے۔

اب آجاتے ہیں ناولٹ کی دنیا میں "تیرے دھیان کی" بہت ہلکی پھلکی کہانی واقعی مزا دے گئی۔ فرح بخاری خوش رہیں۔ "محبت یوں نہیں اچھی" نازیہ جمال کی کہانی بس سو' سو تھی۔ نازیہ کا نام دیکھ کر جو توقعات تھیں بالکل غلط ثابت ہوئیں۔ نازیہ معذرت کے ساتھ مگر کہانی پسند نہیں آئی۔

اب کچھ بات ہو جائے مستقل سلسلوں کی۔ "یادوں کے دریچے" بشریٰ مزمل فاطمہ، تسلیم ملک، مصباح ارم' فرح دیبا راؤ کی ڈائری میں موجود غزلیں اچھی لگیں اور روبینہ علی کی ڈائری میں موجود خاطر غزنوی کی غزل کا سیکنڈ لاسٹ شعر بازی لے گیا۔ "مجھے شعر پسند ہے" نسبت زہرہ' سونیا ربانی' مدیحہ گوہر' فرحی بنت اکرم' نورین اسرار کا انتخاب اچھا لگا۔ "نامے میرے نام" میں فوزیہ اور شمع نے اچھا لکھا۔ نگہت اسلم کو "مقابل ہے آئینہ" میں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ خدا پاک اس ملک اور اس کے باسیوں پر رحمت نازل فرمائے۔ (آمین)

عدیلہ نواز بلوچ۔ ڈیرہ اسماعیل خان

میں پہلی مرتبہ کرن میں خط لکھ رہی ہوں۔ ٹائٹل کی لڑکی بہت خوب صورت تھی۔ اس کی چمک دار اسکن کو دیکھ کر بہت رشک آیا۔ مکمل ناول پڑھنے کا ٹائم نہیں ملا۔ البتہ ناولٹ دونوں پڑھ لیے۔ نازیہ جمال کا ناولٹ بھی بہت اچھا تھا۔ ہمیں دیہاتی انداز کی کہانیاں بہت پسند ہیں۔ لیکن جس کہانی نے خط لکھنے پر مجبور کر دیا وہ فرح بخاری کا ناولٹ "تیرے دھیان کی تیز ہوا" تھا۔ بہت خوشی ہوئی یہ جان کر کہ فرح بخاری کا تعلق بھی غالباً "ڈیرہ اسماعیل خان سے ہے۔ کیونکہ ڈیرہ کی اتنی حقیقی تصویر کھینچنے والے کا تعلق یقیناً" اسی شہر سے ہو گا۔ افسانوں میں "ڈگڈگی یوں بھی ہوتا ہے اور بوجھ اچھے لگے۔ "ڈگڈگی" کو اور بہتر بنایا جا سکتا تھا۔

انت حفیظ۔ نامعلوم

میں تقریباً" سات سال سے کرن ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں۔ سلسلے وار ناول "در دل" میرا فیورٹ ناول ہے۔ دل آور اور علیزے میرے فیورٹ ہیں۔ "دست کوزہ گر" کا بہت اچھا اینڈ کیا۔ مستقل سلسلوں میں "کرن کرن خوشبو" بہت پسند ہے۔ "مسکراتی کرنیں" بہت ہی کم ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتی ہیں۔ شاعری البتہ اچھی ہوتی ہے۔ کرن ڈائجسٹ بہت لیٹ

ملتا ہے۔ کرن کتاب ہر دفعہ ہی منفرد ہوتی ہے۔ اس کے لیے آپ لوگوں کا بہت شکریہ۔

عائشہ خان۔ ٹنڈو محمد خان

تمام پڑھنے والوں کو السلام علیکم۔ خیریت نیک مطلوب ہوں۔

ٹائٹل قابل قبول تھا۔ افسانوں میں "بوجھ" رابعہ افتخار کی سبق آموز کہانی ماں جو بچوں کو دکھ سکھ سے پال پوس کر جوان کرتی ہے۔ مگر اولاد اپنی ماں کی ایک سخت بات بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ "تاوان" کبھی کبھی انسان کتنا بھی عقل مند ہو اس کی عقل پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ "پیرانی بی بی" پیرانی بی بی خود دوسروں کو وظائف بتاتیں۔ مگر وہی چراغ تلے اندھیرا۔ ویسے مجھے اندازا ہو گیا تھا کہ گھر کا تالا توڑ کر ثوبیہ کو لے جانے والا اس کا شوہر ہی ہوگا۔

"سکھ کے موسم" الفاظ کا چناؤ اچھا لگا۔ رفاقت جاوید کا "ڈوبتا سورج" پر حیرت ہوئی۔ کیا اس معاشرے میں کوئی ایسا بھی ہے کہ اتنا بڑا نقصان ہنس کے ٹال دیا اور ایک جگہ مجھے ہنسی آئی جب چاچا جی بھی جلدی سے ایپرن اتار کر سائیکل پر روانہ ہوئے۔ کبھی نہ واپس آنے کے لیے۔ "یوں بھی ہوا" مزا آگیا پڑھ کر، عرفان کی نیکی پر تو بہت خوشی ہوئی۔

نازیہ جمال کا ناولٹ "محبت یوں نہیں اچھی" زبردست تھا۔ لیکن اختتام میں تھوڑی سی کمی تھی۔ نگہت سیما کا مکمل ناول ابھی زیر مطالعہ ہے۔ مگر اتنا طویل دیکھ کر آخری صفحہ دیکھا تو آگے یہ کیا باقی آئندہ۔ جب ہی شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ خیر قسط وار میرے تو فیورٹ ہیں۔ مزا آتا ہے انتظار میں۔ نگہت سیما جی ہیں تو یقیناً اچھا ہی ہوگا۔

"دردِ دل" اچھی قسط ہے۔ شروع ہی ہوا کہ قسط ختم۔ میمونہ صدف کا بھی زیر مطالعہ ہے۔

"مجھے یہ شعر پسند ہیں" تمام اشعار پسند آئے۔

"مل تجھے سلام" میں تمام کے جوابات اچھے لگے۔ سب سے زیادہ موئل کا جواب پسند آیا۔ انٹرویو میں رؤف لالہ اور آغا دونوں پسند آئے۔ رؤف لالہ کافی سادگی پسند ہیں۔

خط لیٹ بھیجا ہے، مگر کوشش کیجیے گا کہ شائع کردیں۔

حافظ فوزیہ سلیم۔ چیچہ وطنی

ان رائٹر کے بارے میں جو پچھلے چند ماہ سے مسلسل ہمارے ساتھ تھیں۔ اب ان کے ناولز ختم ہو گئے ہیں۔ تو وہ غائب ہو گئی ہیں۔

سب سے پہلے تو ریحانہ امجد بخاری کا سلسلہ وار ناول "وہ اک پری ہے" سب ناولز سے ہٹ کر تھا۔ اردو ادب کا جس طرح محبت کے ساتھ انہوں نے استعمال کیا۔ کیا سمجھ دار ہی سمجھ سکتے ہیں۔ قارئین نے کوئی خاص رسپانس نہیں دیا۔ اس ناول پر لیکن میرا خیال ہے لوگ تصوف کی طرف اتنی گہرائی میں نہیں جاتے۔ اس لیے اس ناول کی خاص تفہیم نہ سمجھ سکے! لیکن ریحانہ کی تو کیا ہی بات' برسوں سے کرن سے وابستہ ہیں' انگستان کو نہیں آنا ہوگا تو کس کو آنا ہوگا۔

دوسرا ناول فوزیہ یاسمین کا ناول "دست کوزہ گر" تھا جو بہت آہستہ آہستہ چلا۔ کچھ قاری پڑھنے سے اکتائے بھی' لیکن فوزیہ نے بھی کمال غضب سے قلم تھام کر رکھا اور بہت پیارا اینڈ کیا۔

تیسرا ناول "میرے ہمنوا کو خبر کرو" فاخرہ گل کا تھا۔ اتنا لمبا تو نہیں گیا۔ لیکن اس ناولز کے تمام کردار کو فاخرہ گل نے بہت اچھا اختتام دیا ہے۔ فاخرہ گل کی بہت اچھی کاوش تھی۔

"در دل" نبیلہ عزیز کے اس ناول نے مسلسل دھوم مچائی ہوئی ہے۔ اب جب کردار کھلے ہیں تو بے ساختہ نبیلہ کو شاباش دینے کا دل کرتا ہے۔

مستقل سلسلے تو سارے ہی سونے پر سہاگہ ہیں۔ کرن نے واقعی عروج کی بلندیوں کو چھو لیا ہے۔

فوزیہ ثمرشد۔ گجرات

مئی کا شمارہ 12 تاریخ کو ہی مل گیا تھا۔ سرورق بالکل بھی پسند نہیں آیا۔ حسب عادت حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول سے ذہن کو معطر کیا۔ انٹرویوز حسب منشا تھے۔ "ماں تجھے سلام" سب کے خیالات اچھے تھے۔ لفظ ماں میں اتنی مٹھاس ہے کہ شاید ہی کسی اور آفاقی رشتے میں ہو۔ ماواں تے ٹھنڈیاں چھاواں اللہ پاک مجھ سمیت سب کی ماؤں کو صحت مند زندگی عطا فرمائے۔

"میری بھی سنیے میں۔" شاہین صاحب سے درخواست ہے۔ اب تو میڈیا میں نئے چہروں کی بھرمار ہے۔ نئے لوگ کا انٹرویوز کریں نا۔ کیوں ہمیں بور کرنے کی قسم اٹھا رکھی ہے آپ نے۔

مکمل ناول "جھوٹ سچائیوں" اچھی تحریر تھی۔ سچ کہا ہے۔ رائٹر صاحبہ نے۔ ہمارے معاشرے میں اکثریت ایسے ہی انسانوں کی پائی جاتی ہے۔ جن کے نزدیک سیرت سے زیادہ صورت ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ رامین کا عورت ہو کر خود کو پیش کرنا اچھا نہیں لگا۔ ویسے تو سب سے پہلے نگہت سیما کو پڑھا تھا۔ "زخم پھر گلاب ہوں" کہانی اتنی انٹرسٹنگ تھی۔ عینا کے ساتھ ساتھ مجھے بھی فکر ہو رہی تھی کہ ایسا کیا۔ ارحم کے ساتھ ہو گیا کہ وہ زندگی سے ہی بے زار ہو چلا۔ پڑھتے پڑھتے جب نظروں کے سامنے باقی آئندہ پڑھا تو خود کو خوب ڈانٹا کہ فوزیہ تمہیں کب عقل شریف آئے گی۔ کیوں نہیں پہلے دیکھ لیتیں کہ کہیں باقی آئندہ کا دم چھلا تو نہیں لگا ہوا اتنی اچھی تحریر کو۔ ناولٹ میں "تیرے دھیان کی" تحریر اچھی تھی۔ کہانی کے کرداروں کی مستقل مزاجی دل کو بھا گئی اور ایک چھوٹی سی خواہش۔ کیا زین جیسے ہیرو ایسی سرزمین میں بستے ہوں — ہائے سانوں کیوں نہیں ملا۔ "محبت یوں نہیں اچھی" یہ بھی اس بار کرن کی بیسٹ تحریر تھی۔ افسانے اس ماہ تقریباً سب ہی اچھے اور سبق آموز تھے۔ "سکھ کے موسم" رائٹر نے اچھا موضوع چنا۔ "پیراتی بی بی" زندگی گزارنے کے کیا کیا طریقے اپنائے ہوئے ہیں لوگوں نے۔

"ڈگڈگی' یوں بھی ہوا" دونوں تحریر ایک جیسی تھیں۔ مطلب وہی مرد کی انا' اناپرستی اور عورت کو تین لفظوں کے بدلے اپنے اشاروں پہ نچاتے رہنا۔ ساری زندگی "نادان" بھی اچھا تھا۔ "بوجھ" رابعہ افتخار کی حساس تحریر تھی۔

"کرن کا دسترخوان" پسند آیا۔ اور "کرن کتاب" تو بہت اچھی لگی۔ حسب ضرورت تھی کرن کتاب۔ "مسکراتی کرنیں" اس بار بھی ہلکی پھلکی رہیں۔

✲ ✲